اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

زندگی

رامپور

سالانہ آٹھ روپے

فی پرچہ ۵۰ پیسے

(کتاب و سنت کی روشنی میں)

از

سید احمد عروج قادری - مدیر زندگی

جس میں

امت مسلمہ کے نصب العین - اقامت دین - پر کتاب و سنت کے دلائل یکجا کرنے کی سعی کی گئی ھے اور لوگوں کے شکوک و شبہات دور کئے گئے ھیں - جو لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ ھیں اُنھیں ایک ھی جگہ تشفی بخش اور مفصل دلائل ملیں گے اور جو لوگ اس نصب العین کے صحیح ھونے پر اطمینان حاصل کرنا چاھیں وہ اس کی دلیلوں پر غور کر سکیں گے —

سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۱۹۲ عمدہ طباعت اور مجلد

قیمت 1.75

منیجر زندگی - رامپور

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-		غیر ممالک سے
پاکستان سے ۸/-		۱۲ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے ۴/-		۴۰ شلنگ
پاکستان سے ۴/-		
فی پرچہ: ۷۵ پیسے		

(مدیر: سید احمد قادری)

جلد ۲۰	شوال المکرم ۱۳۸۹ھ مطابق جنوری ۱۹۷۰ء	شمارہ: ۱

اس دائرے میں ◯ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہوگئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رام پور۔ یوپی

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر۔ سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع روہیلا پرنٹنگ پریس۔ رام پور۔ یوپی
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی، رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

ہندوستان کی سب سے بڑی اور بیس برسوں تک پورے ملک پر حکمراں سیاسی پارٹی کانگریس، آخر کار دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک حصہ بڑا ہے اور ایک چھوٹا۔ دہلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے حالیہ اجلاس نے اس تقسیم کو مستحکم کیا اور اس مہینے کے آخر تک احمد آباد اور بمبئی کے اجتماعات اس کی تکمیل کر دیں گے۔ دونوں کے دو مستقل صدر ہوں گے۔ دو مستقل ورکنگ کمیٹیاں ہوں گی اور اسی طرح تمام شعبے الگ الگ منظم ہو جائیں گے۔ یہ سب کچھ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے نام اور اس کے جھنڈے کے ساتھ ہوگا۔ اس وقت بھی ہر حصہ مدعی ہے کہ اصل کانگریس وہی ہے اور ان اجلاسوں میں یہ دعویٰ کچھ اور زیادہ زور و شور کے ساتھ ہر اسٹیج سے بلند ہوگا۔ سنڈیکیٹ سے تعلق رکھنے والے گروپ کا اجلاس احمد آباد میں وزیر اعظم کے حامی گروپ کے بمبئی میں ہونے والے اجلاس سے پہلے ہو رہا ہے۔ اس اجلاس سے زیادہ صحیح طور پر یہ اندازہ ہو سکے گا کہ نام اور جھنڈے کا جھگڑا جلد طے ہو جائے گا یا اس میں دیر لگے گی۔ اگر سنڈیکیٹ اندرا گروپ کے کچھ بااثر ممبروں کو اپنے ساتھ ملا لینے میں کامیاب ہو گیا تو یہ جھگڑا طویل ہو جائے گا اور اگر اندرا گروپ کی موجودہ اکثریت اپنی جگہ قائم رہی یا کچھ اور بڑھ گئی تو پھر سنڈیکیٹ کا اقلیتی گروپ زیادہ دنوں تک اس نام اور جھنڈے کو استعمال نہیں کر سکے گا! اس نام اور جھنڈے کے ساتھ تحریک آزادی کی شاندار تاریخ بھی وابستہ ہے اور گاندھی جی کا نام بھی۔ وہ جب زندہ تھے تو "مہاتما گاندھی کی جے" کا نعرہ، کانگریس کی جے کے مترادف تھا اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے تو ان کا نام ہر الکشن میں استعمال ہوتا اور کانگریس کو فائدہ پہنچاتا رہا ہے

اگرچہ آر ایس ایس اور جن سنگھ نے گاندھی جی سے عوام کی عقیدت کو کافی مجروح کیا ہے لیکن اب بھی اس

نام کا بہت کچھ اثر باقی ہے اس لیے کوئی گروپ بھی کانگریس کے نام، اس کے جھنڈے اور الکشنی نشان کو چھوڑ دینے پر آسانی سے تیار نہ ہوگا اور ہر گروپ اپنے آپ کو اس کا مستحق ثابت کرنے کے لیے پورا زور صرف کرے گا۔ ورنہ جہاں تک کانگریس کے اصولوں پر عمل کا تعلق ہے دونوں میں سے کسی گروپ کو بھی اس سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ گاندھی جی ملک کو جس رخ پر لے جانا چاہتے تھے اور ہندو مسلم تعلقات کے بارے میں ان کے سوچنے کا جو انداز تھا وہ تو آزادی ملنے سے پہلے ہی قصہ ماضی بن چکا تھا۔ نمایاں اور با اثر کانگریسی نیتاؤں میں کوئی ایک نیتا بھی ایسا نہ تھا جو واقعۃً اس ملک کی ترقی اور اس کے استحکام کے بارے میں اس طرح سوچتا ہو جس طرح گاندھی جی سوچتے تھے حالانکہ ہندوستان کے عوام کانگریس کو ووٹ اس لیے دیتے رہے کہ گاندھی جی اس کے ساتھ تھے بلکہ اس کی سب سے بڑی طاقت اور آخری اتھارٹی وہی تھے۔

آزادی کے بائیس سال بعد کانگریس کے دو گروپوں میں بٹ جانے کا اصل سبب سمجھنا اس وقت تک مشکل ہوگا جب تک گاندھی جی کے خیالات اور کانگریس کا مختصر جائزہ نہ لیا جائے۔

میں نے گاندھی جی کی زندگی کا جو مطالعہ کیا ہے اس کے لحاظ سے وہ ہندوستان کے سب سے زیادہ کامیاب اور سب سے زیادہ ناکام انسان تھے۔ کامیاب اس پہلو سے کہ انھوں نے اپنے اخلاق و کردار اپنی مذہبیت، اپنے جوش عمل، اپنی سادہ زندگی اور قوم و وطن کی مخلصانہ محبت و خدمت کی وجہ سے اپنی قوم میں ایک دیوتا اور مہاتما کی حیثیت حاصل کی اور بہت سے مسلمانوں کو بھی متاثر کیا۔ انھوں نے اپنی قوم کی بہت بڑی اکثریت میں حصول آزادی کا جذبہ بیدار کیا اور اس کو انگریزی حکومت کے خلاف صف آرا کر دیا۔ ہندوستان کے دور دراز دیہاتوں میں ان کا نام گونجا اور ان کے کام کی روشنی پہنچی اور جب وہ اس دنیا سے چلے گئے تو پورے ملک میں ان کے سیکڑوں بت کھڑے کر دیے گئے۔ ان کی ہزاروں تصویریں دفتروں اور گھروں میں لٹکائی گئیں اور ان پر پھول مالائیں چڑھائی جانے لگیں۔

ان کی ناکامی اس لحاظ سے ہے کہ خود ان کے ماننے والوں، ان سے عقیدت رکھنے والوں، ان کو اپنا لیڈر تسلیم کرنے والوں اور ان سے تربیت حاصل کرنے والوں میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکلا جو عملاً ان کی مکمل پیروی کرنے والا ہو۔ حد یہ ہے کہ جدوجہد آزادی کے آخر میں ان کے عقیدت مندوں نے انھیں ایک ایسی چیز قبول کرنے پر مجبور کر دیا جو ان کے اپنے تصورات و خیالات کے بالکل برعکس تھی۔ سب جانتے ہیں کہ ملک کی

تقسیم ان کی آئیڈیالوجی کے خلاف تھی لیکن وہ خود اپنے قریب ترین ساتھیوں کے ہاتھوں بے بس ہو گئے تھے۔ ان کے عدم تشدد کا عقیدہ، ہندو مسلم اتحاد کا نصب العین اور ملک کو مذہب و اخلاق کی راہ پر لگانے اور لے چلنے کی آرزو قطعاً ناکام ہوگئی اور ان لوگوں کے نظریات غالب آگئے جو گاندھی جی کی روش اور ان کے خیالات کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ خود ان کی اپنی زندگی، تشدد کا شکار ہوگئی۔ بایں حال کہ پورے ملک پر کانگریس کی حکومت چھائی ہوئی تھی اور مرکزی وزارت داخلہ کے منصب پر وہ شخص فائز تھا جس کو گاندھی جی کی آشیرواد نے ہندوستان کا دوسرا بڑا لیڈر بنا دیا تھا۔ گاندھی جی ہندوستان کے پایۂ تخت میں گوڈسے کے پستول کا شکار بن گئے۔ یہ بھید اب تک پوری طرح نہیں کھل سکا ہے اور شاید کبھی نہ کھل سکے کہ گوڈسے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں کس طرح کامیاب ہو سکا۔

گاندھی جی اس ملک پر مسلمانوں کے حقوق تسلیم کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ ہندو مسلم مل جل کر رہیں اور مشترکہ و متحدہ کوششوں سے ہندوستان کو آگے بڑھائیں۔ اس خیال کے بالکل برعکس تقسیم ملک کے چالیس پچاس سال پہلے ہی سے جس خیال کا زور دار پرچار کیا جانے لگا تھا وہ یہ تھا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے۔ یہاں خالص ہندو راج قائم ہونا چاہیے اور مسلمانوں کو یہاں صرف ایک حقیر اقلیت کی طرح رہنے کی اجازت دی جا سکتی ہے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس خیال کا پرچار کیا جا رہا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندو بنا لیا جائے اور ہم سرحد ملک افغانستان پر قبضہ کرکے وہاں کے مسلمانوں کو بھی شدھ کر لیا جائے۔ ریڈینس دہلی عید نمبر (دسمبر ۶۹ء) میں تری کے ال۔ گابا سینئر ایڈوکیٹ سپریم کورٹ کا ایک معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔ میں یہاں اس کے چند اقتباسات کا ترجمہ پیش کرتا ہوں۔

"وی۔ ڈی۔ ساورکر ۱۹۰۷ء ہی سے علی الاعلان آزادی کے ساتھ ہندو راشٹر کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ہندوؤں کو مشورہ دے رہے تھے کہ وہ طاقت پر قبضہ کرکے خالص ہندو راج کی بنیادیں مضبوط کریں۔ انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان، ہم جنس اور متحدہ قوموں سے آباد نہیں ہے بلکہ یہاں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ انھوں نے مسلمانوں سے بڑی صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ ہندوستان میں ان کا اس کے سوا کوئی مستقبل نہیں ہے کہ وہ ایک اقلیت کی طرح یہاں رہیں۔"

(بحوالہ نیشنل موومنٹ" مصنفہ آر ان اگروال)

"اس سے پہلے کہ ساورکر ہندوؤں میں "بے تاج بادشاہ" کہے جائیں تعصب اور مسلم دشمنی کی تبلیغ ہندوؤں کے

متعدد حلقوں میں جاری تھی" ــــــ ہندو مہاسبھا کے ایک ممتاز لیڈر نے اعلان کیا تھا کہ "ہندوستان کے مالک ہندو ہیں اور مسلمانوں کی حیثیت محض مہمانوں کی ہے اور انہیں یہ سیکھنا ہے کہ مہمانوں کو میزبانوں کے یہاں کس طرح رہنا چاہیے"

انڈین سول سروس کے ایک سابق ممبر ہردیال نے اسی موضوع پر زیادہ آزادی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا انھوں نے کہا تھا "سوراج حاصل کرنے کے لیے ہمیں مسلمانوں کے ساتھ تعاون کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہماری خواہش ہے کہ یہاں مشترکہ حکومت قائم ہو، ہندو اور مسلم کی مشترکہ حکومت بالکل واہیات چیز ہے جو کسی حال میں قائم نہیں رہ سکتی"

ہردیال نے اپنے کثیر الاشاعت اخبار "میرے وچار" میں لکھا تھا:-

"میں اعلان کرتا ہوں کہ ہندوؤں کا مستقبل ان چار ستونوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

(۱) ہندو سنگھٹن (۲) ہندو راج (۳) مسلمانوں کی شدھی (۴) افغانستان پر قبضہ اور افغانستان و سرحد کے مسلمانوں کی شدھی۔ جب تک ہندو قوم ان چار بنیادوں کی تکمیل نہیں کر لیتی اس وقت تک ہندو نسل کا تحفظ ناممکن رہے گا"

یہ اعلانات اور بیانات اس وقت سے جاری تھے جب کہ ابھی تقسیم ملک کے خیال کا کہیں نشان بھی موجود نہ تھا" (ریڈینس دہلی عید نمبر دسمبر ۶۹ء)

آں جہانی وی ڈی ساورکر اور شری ہردیال نے جو وچار پیش کیا ہے انہیں پڑھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ گروگولوالکر کی کتاب "بنچ آف تھاٹ" میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں یا جس کا پرچار شری مدھوک کر رہے ہیں وہ نئے ہیں۔ آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ طاقت پر قبضہ کر کے یہاں خالص ہندو راج قائم کیا جائے اور مسلمانوں کو قومیا لیا جائے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو انہیں ذلیل اور حقیر اقلیت کی طرح رکھا جائے۔ مسٹر مدھوک نے "شدھی" کے بجائے "قومیانا" استعمال کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آر۔ایس۔ایس اسی سابق ہردیالی خیال کا عملی ظہور ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس خیال کا کانگریس سے کیا تعلق ہے؟ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ ان خیالات کا اثر صرف انہیں لوگوں پر نہیں پڑا جو کانگریس سے باہر تھے، بلکہ خود کانگریس کے متعدد چوٹی کے لیڈر اس سے متاثر ہو گئے اور اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ بہت سے وہ لوگ جو یہ خیالات رکھتے تھے کانگریس میں گھس آئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عوام کو گاندھی جی سے جو عقیدت تھی اور ان کے واسطے سے کانگریس کا ملک پر

جو اثر تھا وہ کسی کی دال نہیں گلنے دیتا تھا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کانگریس میں گھس کر اس کو گاندھی جی کے خیالات سے آزاد کرایا جائے۔

روس میں اشتراکی انقلاب جب کامیاب ہو گیا تو اس انقلاب سے ہندوستان بھی متاثر ہوا۔ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جو مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب سے آراستہ بلکہ اسی کے ساختہ پرداختہ تھے، سب سے زیادہ اس انقلاب سے متاثر ہوئے یہاں تک کہ مذہبی عقائد و افکار سے ان کا رشتہ ٹوٹ گیا۔ ہندوازم اور اسلام اسی طرح ہندو راج اور مسلم راج کی اصطلاحیں ان کے نزدیک بے معنی ہو گئیں۔ وہ اپنے ملک کی ترقی کے بارے میں خالص سیکولر ذہن سے سوچنے لگے۔ ایک طرف انھوں نے اپنی جدید تعلیم، مذہب سے آزاد خیالات اور مغربی طریق زندگی کی وجہ سے بین الاقوامی شخصیت کا درجہ حاصل کر لیا اور دوسری طرف وہ ملک کی آزادی کے لیے ایثار و قربانی، ان تھک محنت، خالص وطن پرستی اور گاندھی جی کی آشیرواد کی وجہ سے ہندوستان کے سب سے بڑے لیڈر بن گئے۔ اشتراکی خیالات کی اشاعت اور خود پنڈت جی کے اثر سے بہت سے لوگ کانگریس سے باہر اور اس کے اندر اسی طرح سوچنے لگے جیسے پنڈت جی سوچتے تھے۔ یہ سب کچھ گاندھی جی کی زندگی ہی میں ہوا اور انہیں کے وقت میں کانگریس کے اندر دو گروپ بن چکے تھے۔ ایک کے لیڈر پنڈت جی تھے اور دوسرے کے رہنما سردار ولبھ بھائی پٹیل۔

گاندھی جی سے زیادہ کوئی دوسرا شخص اس حقیقت سے واقف نہ تھا کہ ان دو گروپوں کے نظریات و خیالات ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں اور ان میں اس وقت تک ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کوئی ایک گروپ اپنے نظریات کو بدل نہ دے۔ صرف آزادیٔ وطن کے مشترک مقصد نے ان کو یکجا کر دیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے حصولِ آزادی کے بعد کانگریس کو توڑ دینے کا مشورہ دیا تھا اگر ان کا یہ صائب مشورہ مان لیا گیا ہوتا تو اب تک اس ملک کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھ چکا ہوتا اور اس کی ترقی و استحکام میں وہ رکاوٹیں پیدا نہ ہوتیں جو ان دو گروپوں کے نظریات کی کشمکش سے پیدا ہوئیں۔

گاندھی جی کے مقتول [illegible] کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی بہت جلد اس دنیا سے گزر گئے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی قیادت کو آنکھ دکھلانے والا کوئی شخص باقی نہ رہا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آنجہانی سردار پٹیل پانچ سات سال اور زندہ رہ جاتے تو کانگریس کی تقسیم کا یہ واقعہ

شاید آج سے بہت پہلے رونما ہو چکا ہوتا۔ پنڈت جی نے اپنی دیو قامت شخصیت کے اثر سے سوشلسٹ پیٹرن آف سوسائٹی کا نصب العین کانگریس سے پاس تو کرا لیا لیکن اس پر عمل کرانا آسان تھا کیوں آسان نہ تھا؟ اس سوال کا جواب اب ان دونوں گروپوں کے بیانات میں پڑھا جا سکتا ہے۔

گاندھی جی نے کانگریس کو توڑنے کا جو مشورہ دیا تھا، میرا خیال ہے کہ اگر اس وقت بھی یہ مشورہ مان لیا جائے تو یہ بات ان دونوں گروپوں کے حق میں بھی مفید ہوگی اور پورے ملک کے حق میں بھی۔ اس سلسلے میں شریمتی مسز اندرا گاندھی کی حکومت کے ایک ممبر کا درج ذیل بیان دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

> پٹنہ۔ ۱۴؍دسمبر ۶۹ء مرکزی وزیر برائے وزارت خارجہ مسٹر بلی رام بھگت نے آج یہاں کہا کہ اب تینوں ایس (س) مل گئے ہیں۔ سنڈیکیٹ، سنگھ اور سوتنترا اور رجعت پسندانہ کردار کے سلسلے میں تینوں بے نقاب ہو چکے ہیں۔
>
> مسٹر بھگت نے کہا وہی مسٹر نجلنگپا جو صدارتی الکشن کے زمانے میں اپنی جن سنگھ اور سوتنترا پارٹی سے ساز باز چھپاتے پھر رہے تھے اور پر زور تردید کر رہے تھے اب وہ سنڈیکیٹ کانگریس کے بازوؤں میں ان دونوں کو چھپائے ہوئے ہیں۔
>
> مسٹر بھگت پٹنہ ضلع، شہر اور ضلع کے کانگریسی کارکنوں کے ایک مشترکہ جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا کہ:۔
>
> "اگر یہ تینوں پارٹیاں مل کر بھی اب ایک پارٹی بن جائیں تب بھی انہیں کوئی حیرت نہ ہوگی۔"
>
> (قومی آواز لکھنؤ ۱۶؍دسمبر ۶۹ء)

اسی طرح کے بیانات نجلنگپا گروپ کے نیتا مسز اندرا گاندھی کے بارے میں دے رہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وہ کمیونسٹ ہیں اور کانگریس کو غلط راستے پر لے جا رہی ہیں۔ اس وقت کانگریس کی اس پھوٹ میں ذاتی پرخاش اور اقتدار کی جنگ بھی ایک عامل ہے لیکن اس کا اصل سبب نظریات ہی کا اختلاف ہے جو گاندھی جی کی زندگی ہی میں پیدا ہو چکا تھا۔

(۲)

اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا بڑا حصہ ۱۴؍دسمبر ۶۹ء ۱۰ بجے دن سے پہلے مکمل ہو گیا تھا۔ یعنی کانگریس

کے مختصر جائزے کے بعد یہ لکھنا چاہتا تھا کہ اس صورت حال میں مسلمانوں کے لیے صحیح طرزِ عمل کیا ہے لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، ویسے اس ذیل میں ہمارے خیالات ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔

۱۴ر دسمبر کو میں اشارات کی تسوید میں مشغول تھا کہ دس بجے دن کو ایک پولیس افسر جیپ اور چند سپاہیوں کے ساتھ میرے گھر پر آئے اور میرا نام دریافت کرنے کے بعد مجھ سے زندگی اگست، ستمبر اور اکتوبر ۶۹ء کے شمارے طلب کیے اور پریس کا ڈکلریشن مانگا۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ میرا گھر ہے، دفتر زندگی نہیں ہے۔ پھر میں انہیں ساتھ لے کر دفتر پہنچا۔ اگرچہ وہ عید کی تعطیل کا آخری دن تھا مگر حسن اتفاق سے برادرم محمد مخدوم صاحب منیجر زندگی دفتر میں موجود تھے۔ انھوں نے پولیس افسر کے مطالبات پورے کیے۔ انھوں نے تینوں شمارے حاصل کیے، ڈکلریشن دیکھا، پھر بتایا کہ وہ جس مضمون کے سلسلے میں کارروائی پر متعین کیے گئے ہیں وہ پروفیسر عبدالمغنی صاحب کا ہے جو اکتوبر ۶۹ء کے شمارے میں شائع ہوا ہے۔ یہ ہمارے لیے بالکل نئی اطلاع تھی۔ ہم یہ جانتے تھے کہ مولانا جلال الدین انصر صاحب کے مضمون کی چھان بین ہو رہی ہے جو جنوری ۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ دفتر میں پولیس کی آمد کی خبر سنکر متعدد رفقاء دفتر پہنچ گئے تھے۔ میں پولیس کے ساتھ اس کی جیپ میں بیٹھ گیا۔ پھر وہ جیپ برادرم ماسٹر احمد حسن صاحب پرنٹر پبلشر زندگی کی دکان پہنچی، وہ بھی تیار تھے۔ ہم کوتوالی پہنچائے گئے۔ یہاں کے منتظمین ہم دونوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنے پر مصر تھے لیکن ایک ٹیلی فونی اطلاع کی وجہ سے انھوں نے اصرار ترک کر دیا اور ہم اس سے بچ گئے۔ اب چونکہ خبر پھیل چکی تھی، اس لیے کوتوالی میں کچھ زیادہ رفقاء پہنچ گئے۔ ہم ایک محترم رفیق کے موٹر میں کچہری پہنچے وہاں اے ڈی ایم (جے) نے وارنٹ گرفتاری پر دستخط کیے۔ اتوار کی وجہ سے ضمانت نہیں ہو سکی۔ میں اور ماسٹر احمد حسن صاحب جیل خانے پہنچا دیے گئے۔ کرمی جناب اقبال حسین صاحب ایڈوکیٹ کوتوالی سے لیکر جیل خانے تک ہر موقع پر موجود رہے۔ ہم ۲۶ گھنٹے جیل میں رہ کر دوسرے دن بعد مغرب جیل خانے سے باہر آگئے۔ کافی رفقاء گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ سے ہماری رہائی کے منتظر تھے۔ مجھے رفقاء کی دوڑ بھاگ کا اندازہ تھا اس لیے میں نے ان سے معانقہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ لوگوں نے مجھ سے زیادہ زحمت برداشت کی ہے۔ میرا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا، متعدد رفقاء دن کا کھانا تک نہیں کھا سکے تھے۔ موٹر جب شہر کی طرف روانہ ہوئی تو رفیق محترم ماسٹر احمد حسن صاحب نے اپنے گھر چائے کی دعوت دی اور ہم سب ان کے گھر پہنچ گئے۔ موٹر میں جو رفقاء ساتھ تھے ان کے علاوہ اور رفقاء بھی خبر سنکر پہنچ گئے۔ ناشتہ چائے کے بعد ان کے گھر سے رخصت ہوئے اور میں عشاء کی نماز سے کچھ پہلے اپنے گھر پہنچا۔ فالحمد للہ علی ذالک۔

(باقی ص [illegible] پر)

تعلیم یافتہ غیرمسلموں سے دعوتی مذاکرات

جناب انعام الرحمٰن خاں (بھوپال)

ابھی حال میں آر، ایس، ایس اور آریہ سماج کے دو تعلیم یافتہ اور سرگرم کارکنوں سے ہمارے محترم رفیق جناب انعام الرحمٰن خاں کی مسلسل گفتگو ہوئی تھی۔ ان مذاکرات کو انھوں نے ایک مقالے کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔ جو لوگ اس ملک میں اقامت دین کا فریضہ انجام دینا اور غیرمسلموں میں دعوتی کام کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ مقالہ ان شاء اللہ بہت مفید ہوگا انہیں غور سے پڑھنا چاہیے اور ان مذاکرات میں اگر کوئی بات مزید توضیح کی محتاج ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ ہمیں لکھنے کے بجائے براہ راست فاضل مقالہ نگار کو محلہ تلیا۔ بھوپال کے پتہ پر خط لکھا جائے البتہ انھوں نے اس مقالے سے متعلق کوئی سوال جواب ہمیں ارسال کیا تو زندگی کے صفحات اس کی اشاعت کے لیے حاضر ہیں۔ (ادارہ)

دعوتی کام کے سلسلے میں اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جن کے ذریعے بعض کارآمد باتیں سامنے آجاتی ہیں۔ ایسے مفید نکات تعلیم یافتہ اصحاب سے گفتگو میں بھی نکلتے ہیں اور ان پڑھ دیہاتیوں سے گفتگو میں بھی لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو باتیں ایک کی نظر میں مفید و کارآمد ہوں وہ دوسروں کے نزدیک بھی درست ہی ہوں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ افلاطون کی رائے کے مطابق بے ادبوں سے بھی ادب سیکھا جا سکتا ہے۔ ایسی ہی ایک مسلسل گفتگو پچھلے دنوں آر، ایس، ایس اور آریہ سماج کے دو سرگرم کارکنوں سے ہوئی جن میں سے ایک صاحب اپنی صلاحیت اور تعلقات کے اعتبار سے اور دوسرے اپنی صلاحیت اور عہدے کے اعتبار سے رہنمائی کے منصب پر فائز ہیں۔ آئندہ سطور میں اس کا خلاصہ اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ ممکن ہے اس میں ہندوستان میں اقامت دین

اور غیر مسلموں میں دعوتی کام " کے تعلق سے کچھ کام کی باتیں نکل آئیں ۔

ایک روز میرے دو مسلمان دوست ایک پنڈت جی کو ساتھ لیے ہوئے تشریف لائے اور کہا کہ یہ پنڈت جی اپنے ایک معاملے میں آپ سے مشورہ کرنے آئے ہیں ۔ چنانچہ پنڈت جی نے بہت تفصیل سے اپنا ایک واقعہ سنایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کا ایک لڑکا بیمار تھا جس کو کسی علاج سے صحت نہیں ہو رہی تھی ۔ اتفاق سے ایک مسلمان شاہ صاحب مل گئے جنھوں نے خود بھی کچھ عمل کیا اور انھیں درگاہ اجمیر کی رہبری کی ۔ چنانچہ وہ لڑکا اجمیر گیا اور وہاں سے صحت یاب ہو کر ہی نہیں آیا بلکہ اس کے اندر آتنی خدا رسیدگی پیدا ہوگئی کہ ایک کمرہ میں لوبان وغیرہ کا انتظام کر کے بیٹھ گیا اور بیماروں کو راکھ وغیرہ دینے کا اور لوگوں کی گم شدہ چیزیں بتانے کا کام کرنے لگا ۔ کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلا ۔ پھر اچانک ایک روز غائب ہو گیا ۔ پنڈت جی کے رہبر شاہ صاحب کے ذریعے ان کو تاج الدین بابا کی ایک چادر مل گئی تھی اس کو کسی طرح استعمال کر کے انھوں نے کچھ عمل کیا تیسری رات ان کو خواب میں ایک بزرگ نظر آئے جنھوں نے بتایا کہ ان کا لڑکا اندور میں اپنی ماں کے پاس پہنچ گیا ہے اور اچھا ہے ۔ ساتھ ہی ان بزرگ نے پنڈت جی سے کہا کہ تم مسلمان ہو جاؤ اور ان سے تین بار مسلمان ہونے کا وعدہ لیا ۔

یہ خواب سنا کر پنڈت جی نے کہا کہ ۱۹۳۵ء سے آر۔ایس۔ایس کا کام کر رہا ہوں جبکہ میری عمر پندرہ سال تھی اور میری ذہنی نشو و نما اسی کرٹا کے ماحول میں ہوئی ہے کہ کبھی میں نے مسلمانوں کے لیے کوئی اچھی بات نہیں سوچی ۔ ایک مسلمان کا حسن اخلاق دیکھ کر ایک بار میں حیران رہ گیا کہ مسلمان اور بھلا آدمی ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے ۔ انھوں نے کہا کہ ایسے شخص کو حکم ملا ہے کہ مسلمان ہو جاؤ ۔ یہ بات حیرت انگیز تو ہے ہی لیکن مجھے ڈر ہے کہ اگر میں نے خواب میں دیا ہوا وچن پورا نہ کیا تو مجھے نقصان نہ پہنچ جائے ۔

نقصان سے پنڈت جی کی مراد کوئی دنیوی نقصان ہی تھا ۔ اور چونکہ خوابوں اور بشارتوں کی دنیا میری رسائی سے باہر ہے ۔ اس لیے میں یہ پوری داستان بس احتراماً ہی سنتا رہا کہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کا ذہن جیسے ایک تحریک کا علمبردار اور لا گریجویٹ ہونے کی وجہ سے مرتب ہونا چاہیے کس طرح متضاد چیزوں کا مجموعہ بن گیا ہے ۔ چنانچہ مختلف طریقوں سے ٹالنے کی کوشش کی ان سے عرض کیا کہ میں ایک معمولی آدمی ہوں اور خوابوں وغیرہ سے مجھے دل چسپی بھی نہیں ہے ۔ اس لیے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا ۔ گروہ گولوالکر اور شاکرے صاحب جیسے صاحبان سے آپ کے قریبی تعلقات ہیں ۔ آپ ان سے مشورہ کیجیے ۔ مگر انھوں نے اصرار کیا

کہ میں ہی انہیں بتاؤں کہ خواب میں ملے ہوئے حکم کی تعمیل نہ کرنے سے انہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچ جائے گا؟ میں نے کہا کہ پنڈت جی! خوابوں کی بات تو علیحدہ ہے مجھے اس سے نہ دلچسپی ہے نہ واقفیت۔ البتہ اس سے ہٹ کر میں پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ مسلمان نہ ہونے سے سخت نقصان ہوگا۔ اتنا بڑا نقصان جس کا ابھی آپ تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اور آپ ہی نہیں کوئی بھی شخص جو اسلام کی نعمت سے محروم رہ جائے گا وہ سخت ٹوٹے میں رہے گا۔

یہ بات انھوں نے ایک خاص کیفیت کے ساتھ سنی اور کچھ ڈوب سے گئے۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر میں نے مزید کہا کہ دیکھیے پنڈت جی! زندگی ایک سنجیدہ چیز ہے۔ اس کا فیصلہ خوابوں میں نہیں ہوتا، نہ کوئی دوسرا کرتا ہے۔ زندگی کا فیصلہ تو ہر شخص کو خود کرنا چاہیے اور جاگتے ہوئے کرنا چاہیے۔ زندگی آدمی کو ایک ہی بار ملتی ہے۔ یہ اگر غلط مصرف میں صرف ہوجائے تو بتائیے کتنے خسارے کی بات ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ کوشش کرکے پہلے تو اپنے دل و دماغ کو نفرت و جانبداری سے پاک کرکے خالی الذہن ہوجائیں۔ پھر نہایت خود غرضی کے ساتھ اپنی ذات کے مسئلے کی حیثیت سے ان نظاموں اور مذہبوں کا مطالعہ کریں جو انسان کی ایک حیثیت متعین کرتے ہیں اور اس کی ہدایت و نجات کے دعوے دار ہیں۔ خود اپنے مذہب کے اصولوں پر اور اس کے دعوے پر غور کیجیے کسی جانبداری کے بغیر اگر آپ اس نتیجے پر پہنچیں کہ اس مذہب کے اصول صحیح اور اپنے ماننے والے کی نجات کے ضامن ہیں تو ان پر جمے رہیے۔ لیکن اگر آپ کو مطالعہ اور غور و فکر کے بعد کسی اور مذہب مثلاً اسلام میں یہ بات نظر آئے کہ اس نے انسان کو جو حیثیت دی ہے وہ زیادہ بلند ہے اور اس نے نجات کی جو ضمانت دی ہے وہ زیادہ دل لگتی ہے تو چاہے آپ کی آبائی روایات اور اب تک کا ماحول اس کے مخالف ہی کیوں نہ رہے ہوں ہمت کرکے اسے قبول کرلیں اور کسی مخالفت کی پروا نہ کریں۔ کیونکہ یہ آپ کی اپنی نجات کا مسئلہ ہے۔

اس کے بعد میں نے اسلام کے بنیادی عقائد کی تشریح کی اور خاص طور پر یہ بات واضح کی کہ مسلم قوم کے افکار و اعمال کا نام اسلام نہیں ہے بلکہ ان عقائد کو ماننے والوں کا نام مسلم ہے۔ یہ بھی بتایا کہ اسلام کی یہ بنیادیں اب بھی ہر قابلِ ذکر مذہب کے اندر کسی نہ کسی نام سے موجود ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہر قوم کی ہدایت کا انتظام کیا گیا ہے۔ اور یہ اسی کے اثرات ہیں۔

اس گفتگو میں پنڈت جی نے دو باتیں ایسی کہیں جن کو پیش نظر رکھا جائے تو غیر مسلموں سے اشتراک کے تعلق

سے کچھ نئی راہیں کھلتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ خدا پر یقین کے بغیر خالی اخلاق کوئی چیز نہیں۔ اگر اخلاق کا رشتہ خدا پر یقین سے نہ جڑا ہو تو ایسے اخلاق کو ایک خوبصورت عورت، وزارت کی ایک کرسی اور نوٹوں کی ایک گڈی اپنی جگہ سے ہلا سکتی ہے۔

دوسری بات انھوں نے کمیونسٹوں اور مسلمانوں کے تعلق سے کہی۔ میں نے ان سے دریافت کیا کہ اگر کبھی مسلمانوں اور کمیونسٹوں میں ایسی ٹکر ہو جو ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنے والی ہو تو آپ کی ہمدردیاں کس کے ساتھ ہوں گی۔ انھوں نے کہا: مسلمانوں کے ساتھ۔ میں نے تعجب سے کہا۔ ایسی شکایتوں اور نفرتوں کے باوجود؟ فرمایا۔ ہاں اس کے باوجود۔ کیونکہ مسلمان خدا کو تو مانتے ہیں یہ تو سرے سے خدا ہی کو نہیں مانتے۔ پھر فرمایا۔ یہ میری ذاتی رائے نہیں ہے بلکہ ہماری پارٹی اسی طرح سوچتی ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۷ء میں جب کیرلا میں عیسائیوں اور کمیونسٹوں کا مقابلہ ہوا اس وقت گرو گولوالکر جی یہ سوچ رہے تھے کہ عیسائیوں کو کس طرح مدد پہنچائی جائے۔ میں نے حیرت سے کہا کہ عیسائی تو غیر ملکی اور ہمارے دشمن ہیں ان کی مدد کے کیا معنیٰ؟ گرو جی نے جواب دیا کہ یہ بات ٹھیک ہے لیکن عیسائی خدا کو تو مانتے ہیں۔ یہ کمیونسٹ تو خدا ہی کو نہیں مانتے۔ اس لیے یہ بڑے دشمن ہیں۔

اس بات پر بھی گفتگو رہی کہ ہندو مسلم تعلقات کی نوعیت کیا ہے اور اس معاملہ میں طرفین کی جانب سے کیا کیا غلطیاں ہوئی ہیں۔ میں نے بھی اس سلسلے میں کچھ عرض کیا لیکن پنڈت جی نے تفصیل سے اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ موصوف نے بتایا کہ آر۔ایس۔ایس اور جن سنگھ کے ذمہ داروں نے سب سے پہلے اس سوال پر غور کیا کہ مذہبی خیالات میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف ہے اس سے زیادہ اختلاف خود ہندوؤں کے درمیان ہے۔ پھر کیا بات ہے کہ ہندو تو سب ایک ہیں اور مسلمان علیحدہ ہیں؟ اس علیحدگی کے دو سبب ان کی نظر میں آئے۔ ایک یہ کہ اس ملک پر کئی سو سال حکومت کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ وہ دوسروں سے برتر ہیں۔ دوسرا یہ کہ بیرون ہند کے مسلمانوں سے ان کا ربط قائم ہے جو انھیں اپنے ملک سے پوری طرح وابستہ نہیں ہوتے دیتا۔ اس کا علاج یہ ہے کہ کلچر چونکہ ہر جگہ کے جغرافی ماحول اور حالات وروایات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس لیے ملک کی دوسری اکائیوں کی طرح مسلمانوں کو یہاں کا کلچر اپنانا چاہیے۔ ان کا مذہب جو ہے وہ رہے بس ہندوستان کے کلچر کو اپنا لیں۔ اس کے بغیر ہندو مسلم مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ (یہ ان کے مفصل بیان کا خلاصہ میرے الفاظ میں ہے جس میں انھوں نے انڈونیشیا اور جاپان وغیرہ کی مثالیں بھی دی تھیں۔)

میں نے عرض کیا کہ آپ کی اس تشخیص کے اور اس علاج کے سلسلے میں جو بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں ان سب کو چھوڑتے ہوئے میں صرف وہ باتیں جاننا چاہتا ہوں جنہیں ترک اور اختیار کرکے میں آپ کے لیے قابل قبول بن سکوں۔ یہ میری داڑھی ہے کیا اسے منڈوانا ہوگا؟ فرمایا نہیں۔ میں پاجامہ پہنتا ہوں کیا دھوتی باندھنا ہوگی؟ بولے نہیں۔ کیا نماز اور روزہ چھوڑ دینا پڑے گا؟ کہنے لگے نہیں۔ میرے بچوں کی شادی ہوگی تو کیا نکاح میں کچھ اشلوک پڑھوانا ہوں گے؟ جواب ملا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جب یہ کچھ نہیں تو پھر کیا ہوگا میں رام اور کرشن کو لائق احترام بزرگ انسان سمجھتا ہوں بھیم اور ارجن کو نہایت بہادر آدمی مانتا ہوں۔ اس صورت میں مجھے متعین طور پر بتلایئے کہ یہاں کا کلچر اپنانے کے لیے مجھے کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا؟—— اب وقت بھی کافی ہوگیا تھا اس لیے پنڈت جی نے اس کا جواب کسی اور وقت کے لیے ملتوی کر دیا۔

ایک ہفتہ بعد پنڈت جی پھر تشریف لائے۔ آج میں نے ہی ابتدا کی اور قدرے تفصیل سے اسلام کی بنیادی تعلیم بیان کرکے انہیں بتایا کہ اسلام خیالی بلندیوں پر نہیں اڑتا اور نہیں کہتا کہ سارے انسان ہر معنے میں یکساں ہیں۔ وہ بھی انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن یہ تقسیم نسل و وطن اور رنگ و زبان یا روٹی جیسی کسی چیز پر نہیں ہوتی بلکہ عقیدے کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ عقیدہ کے ایک ہوجانے سے کل کا غیر اور دشمن آج بھائی بن جاتا ہے اور عقیدے کے مختلف ہوجانے سے حقیقی بھائی غیر ہوجاتا ہے بلکہ کبھی دشمن بن جاتا ہے اور اسی کٹنے اور جڑنے میں اسلام اپنے ماننے والوں کے عقیدے کی پختگی جانچتا ہے۔

پنڈت جی نے اس فرق کو تسلیم کیا کہ عقیدے سے بنے ہوئے معاشرے میں آفاقیت ہوتی ہے اور دوسری چیزوں سے بنی ہوئی قومیتوں میں محدودیت۔ اور آفاقیت بہرحال محدودیت سے افضل ہے کیونکہ اس سے انسان کی نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے اور چونکہ ان کی رائے میں بھی اصل چیز خدا کو ماننا نہ ماننا ہے اس لیے خود انہوں نے میرے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ افریقہ کا رہنے والا خدا پرست ہمارے لیے اپنا ہے اور اپنے ملک میں رہنے والا ملحد ہمارے لیے غیر بلکہ دشمنی کا مستحق ہے یعنی کاٹنے اور جوڑنے والی چیز خاک وطن نہیں بلکہ عقیدہ ہے۔

آج کی گفتگو میں ان کی طرف سے ایک ایسی قابل قدر بات سامنے آئی جو بہت کمیاب ہے یعنی یہ کہ انہوں نے دو ایسی چیزیں جن پر ان کی پوری تحریک چل رہی ہے۔ میرے سامنے سوالیہ انداز میں اس طرح پیش کیں کہ گویا یہ مسلمات ہیں جن کو ہر معقول آدمی ماننے گا اور جب ان کا بے اصل ہونا ان پر واضح ہوگیا تو

انھوں نے واضح الفاظ میں تسلیم کرلیا۔

انھوں نے فرمایا کہ ۔ ۔ ۔ "ایک بار ایک تعلیم یافتہ آدمی نے مجھ سے کہا کہ ہندوستان اتنا عظیم ملک ہے اور ہندوستانی اتنی عظیم قوم ہیں لیکن کیا بات ہے کہ یہ ہمیشہ دوسروں سے بچھڑے ہوئے اور مغلوب رہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ بات غلط ہے۔ وہ بولے کیسے؟ میں نے کہا دیکھیے ہندوستان رقبہ میں یورپ سے کچھ ہی کم ہے۔ یہی حال مردم شماری کا ہے۔ گویا ہندوستان ایک برِاعظم ہے لیکن اتنا بڑا ملک ہوتے ہوئے بھی پورا ملک ایک مرکز سے وابستہ ہے جب کہ یورپ بہت سی ٹکڑیوں میں بٹا ہوا ہے۔ اب آپ بتائیے آگے ہم ہوئے یا یورپ؟ معترض نے یہ بات مان لی۔"

یہ گفتگو سنا کر انھوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ بات صحیح ہے نا؟ میں نے عرض کیا کہ جب آپ صحیح کہہ رہے ہیں اور معترض نے مان بھی لیا تو بات درست ہی ہوگی۔ کسی بات کے صحیح ہونے کے لیے ضروری تو نہیں کہ وہ میری بھی سمجھ میں آئے۔ اس پر انھوں نے حیرت کے ساتھ مجسّم سوال بنکر وضاحت چاہی۔

میں نے کہا پنڈت جی! پہلے ایک اصولی بات سمجھ لیجیے۔ یہ بات فرد کے لیے بھی صحیح ہے اور قوم کے لیے بھی کہ اپنی تعریف اور فخر کے لیے جتنی صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے اس سے بہت زیادہ صلاحیت وہمت کی ضرورت اپنی کمزوریوں کو پکڑنے کے لیے ہوتی ہے۔ اور جو لوگ اپنی کمزوریوں کو سمجھنے اور سدھارنے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ کبھی ترقی نہیں کرسکتے۔ میں مسلمان ہوں اور میری آرزو ہے کہ میں انھیں طاقتور دیکھوں لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ آج مسلمان ہر جگہ کمزور ہیں۔ جہاں ان کی آزاد حکومتیں قائم ہیں۔ وہ بھی دوسروں کا منہ تک رہی ہیں۔ پنڈت جی نے اس اصولی بات کو تسلیم کیا۔ پھر میں نے کہا کہ جہاں تک مجھے معلوم ہے انگریزوں سے پہلے پورا ہندوستان کبھی ایک مرکز کے تابع نہیں رہا۔ ہندوؤں کے دور میں چندرگپت سوریہ اور راشوک اعظم سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ رہے ہیں لیکن ان کی حکومت بھی پورے ملک پر نہیں تھی۔ ان کے بعد انگریز آئے اور پورے ملک کو ایک مرکز سے وابستہ انگریزوں نے کیا جس پر آپ فخر کررہے ہیں۔ ان کے بعد اب برما اور نیپال اور پاکستان کے ہوتے ہوئے پورے ہندوستان کو ایک مرکز سے وابستہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔

انھوں نے اپنی رائے کے غلط ہونے کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔ میں نے مزید کہا کہ اگر آپ کہیں تو ایک تاریخی حقیقت کا بیان ہوگا کہ کلیسائی نظام جیسا کچھ بھی تھا مگر پورے یورپ کو کسی نہ کسی شکل میں ایک مرکز سے جوڑے ہوئے تھا۔ جوں ہی یہ رشتہ ٹوٹا کہ تمام دانے بکھر گئے اور ہر ہر خطہ کو ایک ایک قومیت ایجاد کرکے

سے اپنا مرکز اجتماع بنانا پڑا۔ اسی طرح بعض باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو جب تک اپنے مذہب کی بنیادی تعلیم سے قریب رہے ان میں پورے ملک کو نہ بھی ملک کے بڑے حصہ کو ایک مرکز سے وابستہ رکھنے والے لوگ پیدا ہوتے رہے اور مسلمانوں کا معاملہ تو بالکل واضح ہے۔ جیسے جیسے وہ مذہب کی طاقتور رہنمائی سے محروم ہوتے گئے انتشار و ذلت کی دلدل میں پھنستے چلے گئے۔

اس بات کو بھی انھوں نے مانا۔ پھر مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے خیال میں ہندوستان میں ایک نیشن ہے یا ایک سے زیادہ؟ میں نے کہا نیشن کی تعریف کیجیے، تب میں جواب دے سکوں گا۔ فرمایا۔ پانچ چیزوں سے نیشن بنتا ہے۔ زبان، تاریخ، مذہب، کلچر اور جغرافی حدود۔ میں نے دریافت کیا اگر ان میں سے ایک دو چیزیں نہ ہوں تو؟ جواب دیا۔ ایسا نیشن ادھورا ہوگا۔ کمپلیٹ نیشن کے لیے پانچوں چیزیں ضروری ہیں۔ میں نے مزید وضاحت چاہی کہ آپ کے سوال میں آپ کی مراد کمپلیٹ نیشن ہے یا ادھورا نیشن؟ تھوڑے تامل کے بعد فرمایا۔ کمپلیٹ نیشن۔ میں نے کہا۔ اب میرے لیے جواب دینا آسان ہے اور شاید جواب کی ضرورت بھی نہیں آپ خود کہہ دیں گے کہ پورے ملک میں پانچوں شرطیں پوری کرنے والا نیشن موجود نہیں ہے۔ کیونکہ زبان اور مذہب وغیرہ کے جو اختلافات ہیں وہ ظاہر ہیں۔ اس بات کو ماننے کے بعد بھی انھوں نے فرمایا کہ زبان کا اختلاف کوئی چیز نہیں کیونکہ ہندوستان کی سب زبانیں ایک سنسکرت سے نکلی ہیں۔ میں نے کہا۔ پنڈت جی آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں مانے لیتا ہوں کہ ملک کی سب زبانوں کی ماں سنسکرت ہے اور یہ سب اس کی بیٹیاں ہیں۔ مگر مجھے تو آپ کا یہ اصول بے حد پسند آیا کہ ایک ماں کی بہت سی بیٹیاں ماں کے ایک ہونے کی وجہ سے ایک ہیں۔ اور اسی اصول کی روشنی میں مجھے کہنے کی اجازت دیجیے کہ ساری دنیا کا نیشن ایک ہے کیونکہ ساری دنیا کے آدمی ایک آدم کی اولاد ہیں۔ جب ایک ماں کی بہت سی بیٹیاں ایک ہو سکتی ہیں تو ایک باپ کے بہت سے بیٹے ایک کیوں نہ ہوں۔

یہاں انھوں نے اپنے سوال کے کمزور ہونے کو عالی ظرفی کے ساتھ مان لیا۔

دوسرے ہفتہ پنڈت جی کے ساتھ ایک آریہ سماجی لیڈر بھی تشریف لائے۔ آریہ سماج کے بنائے ہوئے مناظرانہ مزاج اور گذشتہ ہفتہ کی گفتگو کے پیش نظر مجھے اندیشہ ہوا کہ آج مناظرہ ہوگا لیکن گفتگو کے بعد جب میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا تو مجھے اپنی بدگمانی پر بہت افسوس ہوا۔ دونوں اصحاب اس خیال سے فکرمند تھے کہ اب تو مرکزی حکومت پر بھی کمیونزم کے اثرات غالب آ رہے ہیں۔ اور انھیں اس بات پر گفتگو کرنا تھی کہ الحاد و کمیونزم کے اس بڑھتے

سیلاب کو کیسے روکا جائے اور وہ کیا طریقہ ہو کہ خدا کو ماننے والے سب لوگ مل کر اس مشترکہ دشمن کا مقابلہ کریں۔ کمیونزم کے مفاسد پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کچھ ایسی ہی تدابیر کی نشاندہی کی جو عام طور پر سوچی جاتی ہیں اور جن کا حاصل کچھ سیاسی انداز کی الٹ پلٹ ہی ہو سکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ سب باتیں بھی ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ ایک بنیادی بات سامنے رہے۔ وقتی تدبیریں اس وقت کارگر ہوتی ہیں جبکہ مستقل علاج کا کوئی طویل المیعاد پروگرام ان کی پشت پر ہو۔ اگر ہم اس طرح سوچیں تو پہلے قدم پر ہمیں دو کام کرنا ہوں گے۔ ایک تو اس بات پر ہمیں غور کرنا چاہیے کہ یہ کمیونزم انسانی فطرت کے خلاف ہوتے ہوئے بھی کیوں اتنی تیزی سے پھیل رہا ہے اور بڑے بڑے خدا پرستوں تک کے گھروں میں گھس گیا ہے۔ دوسرا کام یہ کہ ہم خدا پرستوں کو جرأت کے ساتھ اپنی وہ کمزوری تلاش کرنا چاہیے جس کی وجہ سے ہم ہر میدان میں پسپا ہو رہے ہیں۔ دونوں اصحاب نے اس رائے سے اتفاق کیا اور دونوں باتوں کے تعلق سے فرمایا کہ کمیونزم کی طاقت یہ ہے کہ اس کی پشت پر دنیا کی دو بڑی حکومتیں ہیں اور یہ لوگ باہم متحد رہتے ہیں اور ہم خدا پرستوں کی کمزوری یہ ہے کہ ہم دل سے خدا کو نہیں مانتے اور پھر اس بد اخلاقی میں مبتلا ہیں جسے مذہب روکتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کی یہ دونوں باتیں صحیح ہیں لیکن بات بس اتنی ہی نہیں ہے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ متحد کیوں ہیں اور ہم کیوں نہیں ہیں اور یہ کہ دنیا کی یہ بڑی طاقتیں کیسے وجود میں آگئیں؟ کمیونزم کی طاقت کا راز ہم ان اوپری چیزوں میں دریافت نہیں کر سکیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں ذہنی امامت اور عملی قیادت یورپ کو حاصل ہے اور جو نظریات زندگی پر چھائے ہوئے ہیں وہ سب یورپ سے آئے ہیں اس لیے ہم کو ان نظریات کی طاقت یا کمزوری یورپ ہی کے تاریخی ارتقا میں تلاش کرنا چاہیے۔

یورپ میں کلیسا کی تنگ نظری اور احساس کمتری نے جب ظلم و جبر کا طریقہ اختیار کیا تو اس کا ردعمل اس شکل میں ظاہر ہوا کہ مذہبی اجارہ داری کا مارا ہوا انسان لبرلزم کا نظریہ ایجاد کر کے خود مختار اور غیر ذمہ دار بن گیا اور سیکولرزم کے نام سے خدا اور مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اپنی زندگی کے تمام معاملات اس نے اپنے ہاتھ میں لیکر انسانی خواہش کے حوالے کر دیے جس کا نام اس نے ارادۂ اجتماعی رکھا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر تمام علوم و فنون اس تصور کے ساتھ مدون ہوئے کہ خدا اگر ہے بھی تو اسے دنیوی معاملات سے الگ رہنا چاہیے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا کہ اس طرح کی سیکولر تعلیم سے جو ذہن تیار ہوں ان میں خدا اور مذہب کی اس حیثیت سے کوئی گنجائش نہ رہے کہ عملی زندگی میں بھی اس سے کوئی رہنمائی مل سکتی ہے۔ دوسری

طرف اسی سیکولرزم کی بخشی ہوئی بے قید آزادی نے دنیا کا یہ نقشہ بنا دیا کہ ساری دنیا چند سرمایہ داروں کے چنگل میں پھنس کر کراہنے لگی اور یہ بات ظاہر ہے کہ انسان کو کتنا ہی لبرل اور سیکولر بنا دیا جائے تاہم اس کی نیچرل خیر پسندی کو بالکل ہی نہیں مٹایا جا سکتا۔ ظلم کو دیکھ کر اس کی فطرت تڑپ ہی جاتی ہے۔ چنانچہ سرمایہ داری کے اس ظلم کو دیکھ کر نوجوانوں کا گرم خون کھول جاتا ہے اور مظلوم کے لیے ان کے دلوں میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ پھر جب وہ ان جذبات کے ساتھ دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو انھیں نظر آتا ہے کہ اس ظلم کے مقابلے میں کمیونسٹ تو سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں اور خدا پرست یا تو مذہب کے نام پر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں یا اپنی ذاتی نجات کی دھن میں مگن ہو کر کہیں آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں یا ظلم کرنے والوں کو آشیرباد دے رہے ہیں۔ یہ تماشہ دیکھ کر ان کی ہمدردیاں کمیونسٹوں کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور چونکہ ان کا ذہنی سانچہ پہلے سے سیکولر بن چکا ہوتا ہے جس میں خدا اور مذہب کا مقام ایک رسمیات سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ان کا ذہن آسانی سے کمیونزم کے بنیادی فلسفہ کو بھی قبول کر لیتا ہے اور کسی ذہنی کشمکش سے دوچار نہیں ہوتا۔

اسی کے ساتھ ایک بات اور بھی ہے۔ کمیونزم کے مادی فلسفہ اور تاریخ کی مادی تعبیر نے روٹی کی بنیاد پر لڑنے کو عصری تقاضا بنا دیا ہے اور یہ بات ایک سیکولر ذہن میں ایمان بن کر بیٹھ جاتی ہے کہ یہ عصری تقاضا بہر حال پورا ہونا ہے۔ پھر اشتراکی نظام کی جو تفصیلات مرتب کی گئی ہیں وہ اس کے بنیادی فلسفہ یا عقیدہ سے جڑی ہوئی ہیں۔ پھر یہ کہ عصری تقاضے پر یہ ایمان اور ظلم کے خلاف نفرت و انتقام کا جذبہ انہیں بھوت بنا دیتا ہے اور وہ قربانیاں دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں اور ذرا غور کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تین چیزیں کسی غلط نظام کو بھی مل جائیں تو اس کے اندر پھیلنے اور چھا جانے کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔ یعنی کسی چیز پر پختہ یقین اور اس یقین سے اس کے نظام کی تفصیلات کا ایسا ربط کہ گویا یہ سب چیزیں اس عقیدے سے خود بخود پھوٹتی ہیں اور پھر اس عقیدے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی خاطر چوٹ سہنے کا بل بوتہ۔ اور یہ بات ماننا چاہیے کہ موجودہ دنیا میں کمیونزم یہ تینوں شرطیں پوری کر رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار کے بنگلوں سے اور مذہبی خانوادوں تک سے اس کو فدا کار مل رہے ہیں۔ بات یہ نہیں ہے کہ ان سرفروش نوجوانوں کے پیٹ میں درد اٹھتا ہے جیسا کہ کمیونزم کا فلسفہ بتاتا ہے کیونکہ سرمایہ دار کی اولاد تو بھوکی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بات یہ ہے کہ ان کے پیٹ میں نہیں دل میں درد اٹھتا ہے اور انسان کو حرکت میں لے آنے والی طاقت در اصل

دل ہی کے درد میں ہوتی ہے ۔

اس بیان پر کچھ سوالات کرنے اور ان کے جواب پالینے کے بعد دونوں اصحاب نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ یہ طاقت جو کمیونسٹوں کی ہم کو معلوم ہوئی اس کا خدا پرستوں میں نہ ہونا ہی درحقیقت ان کی کمزوری ہے۔ خدا پرست عام طور پر غور و فکر کرکے اس نتیجے پر نہیں پہنچتے کہ خدا ہے اور ہم کو اس کی بندگی کرنی چاہیے۔ بلکہ ان کو دوسری روایات کی طرح خدا پرستی بھی وراثت میں مل جاتی ہے ۔ اسی وجہ سے خدا پر ہمارے یقین میں وہ گرمی نہیں ہے جو یقین و عقیدہ کا خاصہ ہے۔ پھر ہماری عملی زندگی کا اور زندگی کے تفصیلی نظام کا کوئی تعلق اس یقین سے نہیں ہے۔ سیکولرزم کے نظریہ کو قبول کرکے ہم نے بھی اپنے عملی زندگی کے نظام کو خدا اور مذہب سے علیحدہ کرلیا ہے اور عام طور پر مذہبی جذبات کو اپنے سیاسی اور گروہی مقاصد کے لیے استعمال کیا جارہا ہے ۔

اس کے بعد یہ نتیجہ نکلنا ہی چاہیے کہ ہمارے دل میں خدا اور مذہب کے لیے کوئی گرمی اور ان کی خاطر کوئی چوٹ کھانے کا بل بوتہ نہ رہے۔ یہی ہماری بنیادی کمزوری ہے اور جب تک یہ کمزوری باقی ہے ہم کمیونزم کے سیلاب کو روک نہیں سکیں گے۔ اگر دوزخ میں لے جانے والے اس سیلاب سے خدا کے بندوں کو بچانا ہے تو ہمیں پہلا کام یہ کرنا ہوگا کہ خدا پر سچے دل سے ایمان لائیں اور اس ایمان کے تقاضوں کو اپنی زندگی پر اور اپنے اجتماعی اداروں پر حکمراں بنائیں ۔

پھر میں نے انہیں بتایا کہ سیکولرزم کو اپنا کر کمیونزم سے نفرت کرنا ایسا ہی ہے جیسے گڑ کھانا اور گلگلوں سے پرہیز کرنا۔ کیونکہ کمیونزم سیکولرزم کے پیٹ ہی سے پیدا ہوا ہے۔ سیکولرزم کو مان لینے کے بعد منطقی نتیجہ کے طور پر آپ سے آپ کمیونزم نکل آتا ہے۔ میں کمیونزم کو شیطان کا شاہکار مانتے ہوئے تسلیم کرتا ہوں کہ اجتماعی زندگی سے خدا کو بے دخل کرکے آپ سیکولرزم کو اپنا لیجیے اس کے بعد کمیونزم کے علاوہ کوئی نظام آپ کو معقول نظر نہیں آئے گا۔ ہندوستان میں لوگوں کو جب مذہبی مناقشوں کا کوئی حل نظر نہیں آیا تو انھوں نے سیکولرزم کو ایک سمجھوتہ کے طور پر اپنا لیا کیونکہ آزادیٔ وطن اور تعمیر ملک کے لیے سب کا مل کر قدم بڑھانا ضروری تھا اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی نکلنا تھا اور یہی نکلا کہ جیسے جیسے مختلف مذاہب کے لوگ ملے جلے اداروں میں آگے بڑھتے گئے انہیں اتحاد کی خاطر سیکولرزم کے نام پر اپنے اپنے مذہبی احکام سے دست بردار رہنا پڑا۔ تا آنکہ اب مذہب پس پشت پڑ گیا ہے اور اجتماعی زندگی میں مذہب کا کوئی نشان تک نظر نہیں آرہا ہے۔ میں نے ان سے

کہا کہ دیہاتی لوگ تک اس بات کو ان الفاظ میں مانتے ہیں کہ "چور کو نہیں چور کی ماں کو مارو"۔ اس اصول کے مطابق آپ کمیونزم سے مقابلہ کی بات سوچنے سے پہلے اس کی مادر مہربان سیکولرزم کی خبر لیجیے کسی خار دار درخت کی جڑوں کو تو آپ پانی اور کھاد دیتے رہیں اور اس کے کانٹوں سے الجھیں تو نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں نکلے گا کہ آپ کے ہاتھ زخمی ہو جائیں۔ جب تک سیکولرزم آپ کی ہماری زندگی پر حکمراں رہے گا۔ اس وقت تک آپ کمیونزم کا مقابلہ کر نہیں سکتے۔ ایسے مذہب کی بات تو دوسری ہے جس میں خدا کو پرسنل گاڈ کی حیثیت سے مانا جاتا ہے۔ ایسے مذہب میں البتہ سیکولرزم کا جوڑ لگ سکتا ہے۔ ایسی صورت میں زندگی بسر کرنے کا ضابطہ اگر عوام کے نمائندے عوام کے نام پر اپنی خواہش سے نہیں بنائیں گے تو مذہب کے پجاری خدا کے نام پر اپنی خواہش سے بنائیں گے

آپ جانتے ہیں کہ کوئی بھی چیز ادھوری اچھی نہیں ہوتی۔ اسی طرح ادھوری خدا پرستی بھی ناقص ہوتی ہے۔ خدا کو ہماری اس بے جان خدا پرستی کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم کو واقعی خدا کو ماننا اور سچائی کے ساتھ اس کی عبادت کر کے نجات حاصل کرنا ہے تو ہمیں اپنی ساورنیٹی سے دست بردار ہو کر اپنے آپ کو خدا کے سامنے سرینڈر کر دینا ہوگا اور اسی کی عبادت و بندگی کو اپنی پوری زندگی پر پھیلانا ہوگا۔ اسلام کا خدا جو اپنے ماننے والوں کو حنیف و یکسو ہو جانے کا حکم دیتا ہے اس کا یہی مطلب ہے۔ اب تو زمانہ اپنے الجھے ہوئے مسائل کے ساتھ خود اس مقام پر آگیا ہے کہ اب نہ ادھوری دنیا پرستی چلے گی، نہ ادھوری خدا پرستی۔ انسان کے لیے اب دو ہی راستے رہ گئے ہیں، بیچ کی کوئی راہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خدا کا انکار کر کے اسٹیٹ کا پجاری بن کر کمیونزم کی بنائی ہوئی مشین کا بے جان پرزہ بن جائے یا پھر خدا کو اس طرح مانے جس طرح اس کے ماننے کا حق ہے اور اپنی پوری ہستی کو خدا کی بندگی میں دے کر اپنے ضمیر اور اپنے ارادوں کو آزاد کرے اور خدا کی رحمت و جبروت کا نمائندہ بن جائے۔

ہمیں چاہیے کہ کام چلانے کے لیے متضاد چیزوں میں سمجھوتے کرنے کے بجائے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ ایک خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت ہر جگہ ایک ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ہم سچی لگن کے ساتھ تلاش کریں اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت میں جو انسانی فلسفے اور جذبات شامل ہو گئے ہیں انھیں ہمت کر کے چھانٹ دیں تو یہ مذہبی اختلافات جو مذہبوں کے درمیان بھی چل رہے ہیں اور ایک ہی مذہب کو ماننے والوں کے درمیان بھی وہ دیکھتے دیکھتے ختم ہو جائیں۔ اور سب مل کر ایک ہی رسی کو تھام لیں لیکن اس کام کے لیے ایسی خدا پرستی کی ضرورت ہے جو سچائی کے ساتھ اپنی مکتی کے لیے اور اخلاص کے ساتھ دنیا والوں کی نجات کے لیے ہو نہ کہ کسی قوم کی سربلندی کے لیے اور کسی پیش آمدہ مصیبت

سے بچنے کے لیے۔

یہ پوری گفتگو انھوں نے توجہ سے سنی اور اتفاق ہی نہیں اچھے تاثرات کا اظہار کیا۔ مگر جب گفتگو آگے بڑھی تو اندازہ ہوا کہ جو تصورات ذہنوں میں رچ بس جاتے ہیں وہ آسانی سے نہیں نکلتے۔ اگرچہ میں نے مندرجہ بالا باتیں مثالوں سے بھی واضح کی تھیں لیکن ایک صاحب کے ذہن پر مذہب کی وہی خرابی چھائی رہی جو سب کو نظر آتی ہے کہ مذہب کی اخلاقی تعلیمات پر عمل نہیں ہو رہا ہے اور دوسرے صاحب اس میں الجھے رہے کہ کسی مذہبی کتاب کو حکمراں بنا دیا جائے تو ان لوگوں کا کیا بنے گا جو اس کو نہیں مانتے ہیں۔ بالآخر مجھے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہنا پڑا کہ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہندو گیتا یا ویدکی بس ان تعلیمات پر عمل شروع کر دیں جو پرائیویٹ زندگی سے متعلق ہیں۔ یہ تو ہونا ہی چاہیے مگر اس کے ساتھ ہی ان کتابوں کو الہامی ماننے کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ان کو ملک کا دستور بنائیں اور ان کے مطالب کو اپنی خواہش و ضرورت کے سانچے میں ڈھالنے کے بجائے سیدھی طرح اپنے معاملات اور اپنی زندگی کو اس کے حوالے کر دیں۔ رہے وہ لوگ جو گیتا یا وید کو الہامی کتابیں نہیں مانتے ان کے ساتھ آپ وہی سلوک کریں جو وہ کتابیں سکھاتی ہوں۔ کتاب ہدایت کو عملی زندگی پر حکمراں بنانے کا یہ عمل کسی کتاب کو الہامی کتاب ماننے کا تقاضا تو ہے ہی مگر ساتھ ہی کسی کتاب کے الہامی ہونے نہ ہونے کو جانچنے کی کسوٹی بھی یہی ہے کہ اسے عمل کی دنیا میں نافذ کر کے دیکھا جائے سکہ کو ہمیانی میں سے نکال کر بازار میں لائیے معلوم ہو جائے گا کہ وہ کھرا ہے یا نہیں۔ میں بحیثیت مسلمان کے کہتا ہوں کہ اگر کسی جگہ ہمارا اختیار چلے تو ہم قرآن کو ملک کا دستور بنائیں۔ اس صورت میں جو لوگ قرآن پر ایمان نہیں رکھتے انھیں ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا بلکہ عقیدہ و مذہب کی آزادی اور مساویانہ شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ کیونکہ قرآن کی تعلیم بھی ہے کہ دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عقیدہ کا تعلق دل سے ہے، اسے اوپر سے نہیں لادا جا سکتا۔ اور تاریخ گواہ ہے کہ صدیوں تک اس تعلیم پر بڑی کامیابی کے ساتھ عمل ہوتا رہا کہ شہری حقوق میں عملی طور پر کوئی فرق و امتیاز نہیں رہا۔

میں نے کہا کہ یہاں پہنچ کر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ عام طور پر مسلمانوں کا ذہن بھی اس معاملہ میں صاف نہیں ہے۔ سیکولرزم نے اپنی حکمراں طاقت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی برتر پوزیشن حاصل کر لی ہے کہ وہ اسلام کا حریف ہوتے ہوئے بھی دوسرے مذاہب کی طرح اس کا بھی سرپرست بن بیٹھا ہے اور مذہبی مزاج رکھنے والے اصحاب کو بھی اس نے ایسا مسحور یا مجبور کر دیا ہے کہ وہ اس کو دوسرے مذاہب کے

مقابلہ میں اپنا دوست بلکہ محافظ سمجھنے لگے ہیں۔ چنانچہ مسلمان کبھی اس بات پر راضی نہیں ہوں گے کہ ایک سیکولر دستور کے بجائے گیتا یا وید ملک کا قانون ہو۔ حالانکہ قرآن کے نقطۂ نظر سے دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔ مجھے اگر مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ہو تو میں آپ سے کہوں کہ آپ اپنی الہامی کتابوں کو سچائی کے ساتھ اپنے ایمان کے تقاضے سے اپنا حکمراں بنائیے اور ہمارے ساتھ وہی سلوک کیجیے جو وہ کتاب بتائے۔

اس گفتگو کے بعد یہ دونوں اصحاب کچھ سوچ میں پڑ گئے۔ بالآخر تھوڑی گفتگو کے بعد ہم تینوں اس بات پر متفق ہوئے کہ مل جل کر کام کرنے کا کوئی نقشہ ضرور سوچا جائے اور ایک دوسرے سے استفادے کے طریقے بھی اختیار کیے جائیں لیکن ابتدائی قدم کے طور پر اتنا تو ہم میں سے ہر ایک کو کرنا ہی چاہیے کہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں لوگوں کے جذبات کا رخ موڑنے کی اور ان کے اندر دوست اور دشمن میں تمیز پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد ایک ہفتہ میں تین چار بار آر۔ ایس۔ ایس کے پنڈت جی یہ تجویز لے کر تشریف لائے کہ ایک ایسی بیٹھک ہونا چاہیے جس میں جماعت اسلامی، جمیعۃ العلماء، آر۔ ایس۔ ایس، جن سنگھ اور مسیحی چرچ کے دو دو نمائندے شریک ہوں اور خدا پرستوں کے متحدہ محاذ کا کوئی عملی نقشہ بنائیں۔ انھوں نے فرمایا کہ میں ان سے گفتگو کر چکا ہوں۔ یہ سب لوگ اس طرح کام کرنے پر آمادہ ہیں۔ ایک ہندی ہفتہ وار میں سے یہ خبر سنا کر کہ بھوپال میں کمیونسٹوں کے خلاف خدا پرستوں کا ایک محاذ بن رہا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم نے تو یہ کام شروع بھی کر دیا ہے۔

میں نے انھیں سمجھایا کہ یہ طریقہ کچھ مفید نہیں ہے کہ کام کچھ بھی نہ ہو اور شور مچ جائے۔ پریس سے اگر کام لینا ہو تو پہلے خود اس کی اصلاح ہونا چاہیے جو پریس نفرت و عداوت کا پرچار کر رہا ہے اسے پریم و آشتی کا امرت برسانا چاہیے۔ عرصہ سے یہ کمزوری چل رہی ہے کہ کوئی بھی تعمیری کام ہو وہ بہت جلدی سیاسی طرز اختیار کر لیتا ہے اور پروپیگنڈے کو کام سمجھا جانے لگتا ہے۔ حالانکہ تعمیری کام ایسا مزاج چاہتا ہے جو شہرت سے بے نیاز ہو کر کام کرے۔ آپ ہی نے آر۔ ایس۔ ایس کا یہ کتنا عمدہ طریقہ بتایا تھا کہ ہم تشہیر سے بچ کر کام کرتے ہیں حتی کہ صوبہ کے ذمہ دار کا نام تک پریس میں نہیں آتا۔ پھر اس کام میں آپ جلد بازی اور پروپیگنڈا کیوں پسند کر رہے ہیں۔ میں نے ان کا یہ خیال بھی انہیں یاد دلایا کہ ہندوؤں کا ایک بڑا طبقہ مسلمانوں کے خلاف جذبات رکھتا ہے۔ اسی بات سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانوں پر بھی اس کا ردعمل ہوگا۔ ہمیں اس ناگوار حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ اپنی غلطیوں بلکہ کوششوں کے نتیجے میں عام ذہن اس درجہ مسموم ہو چکے ہیں کہ اگر اس حال میں آپ مندر علوم

سے جاکر کہیں کہ اب ہم کو جماعت اسلامی سے یا مسلمانوں سے گلے ملنا ہے تو شاید آپ کا منہ نوچ دیا جائے۔ اسی طرح ہم اگر مسلمانوں سے کہیں کہ اب ہمیں آر۔ایس۔ایس سے مل کر چلنا ہے تو مسلمان ہم کو دماغی علاج کا مشورہ دیں گے۔ کوئی بھی نقشہ کار رہا اس کی کامیابی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ قابل عمل ہو۔ اس بات سے کون انکار کرے گا کہ خدا پرستوں کے مختلف گروہوں کے درمیان جو ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلی ہوئی ہے اس میں بڑا ہاتھ پریس کا ہے۔ اب ہماری اور آپ کی پہلی کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہمارا پریس کاٹنے اور پھاڑنے والے اسباب کا کھوج لگانے کے بجائے میل ملاپ کے اسباب سامنے لائے۔

آج انھوں نے نفرت و عداوت کے ذکر میں فرمایا کہ مسلمان اگر قرآن کی تعلیمات پر عمل شروع کر دیں تو موجودہ فضا بہت جلد بدل سکتی ہے۔ میں نے جواب میں یہ نہیں کہا کہ اپنے مذہب کی اخلاقی تعلیم پر دوسروں کو بھی عمل کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ کہا کہ اگر قرآن کی تعلیمات پر پوری طرح عمل ہونے لگے تو چاہے وہ جھگڑے ختم ہو جائیں جو مادی مفادات کے لیے مذہب کے نام پر ہوتے ہیں بشرطیکہ دوسرے لوگ بھی ایسا ہی کریں لیکن ایمان اور غیر ایمان کا نزاع کھڑا ہو جائے گا۔ کیونکہ قرآن محض حسن اخلاق کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ پہلے وہ عقیدہ پیش کرتا ہے جس سے دوسری اچھی صفات کے ساتھ اچھا اخلاق بھی پیدا ہوتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ تم اسی کے مسلم یعنی مطیع و فرماں بردار بن جاؤ جو تمھارا رب ہے تو دوسرے مدعیانِ اطاعت پر ضرب پڑتی ہے اور وہ تلملا کر اس آواز کو گھونٹ دینے کے لیے نکل آتے ہیں۔ آپ ذرا غور کیجیے۔ ہماری تاریخ میں جو انبیاء اور بزرگان دین کو ستایا گیا اور آپ کی تاریخ میں بڑے بڑے مہا پرش ستائے گئے تو اس کی وجہ کیا تھی؟ کیا یہ مہا پرش پڑوسیوں کو ستاتے تھے؟ بہو بیٹیوں پر بری نگاہ ڈالتے تھے؟ یا ایسی ہی دوسری بداخلاقیوں میں مبتلا تھے؟ بات دراصل وہی ہے کہ شیطان کی اطاعت پر راضی ہو کر اچھی زندگی بسر کرنے کے لیے تو خالی حسن اخلاق کافی ہے لیکن اپنی بندگی کو خدا کے لیے خالص کرنے اور اس کی بندگی کو عام کرنے کے لیے تو آدمی کو چوٹ کھانے اور ستائے جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ یہ جو باتیں ہو رہی ہیں کہ خدا کو ماننے والے خدا کے نام پر جمع ہوں۔ اس میں کسی قومی یا گروہی غرض کی آلودگی نہیں ہونا چاہیے' بلکہ اخلاص کے ساتھ خود اپنی نجات کے لیے یہ کوشش ہونا چاہیے کہ خدا کے بندوں کا تعلق اس سے جڑ جائے۔ خالی اتحاد دوا کوئی چیز نہیں۔ اتحاد تو چوروں اور ڈاکوؤں میں بھی ہوتا ہے۔ دیکھنے کی اصل چیز وہ مقصد ہے جس کے لیے اتحاد ہو۔ یہ باتیں کہ لوگوں کے اخلاق سدھر جائیں تاکہ ملک ترقی کر سکے۔

یا یہ کہ لوگوں میں اتحاد و ایکتا ہو کہ قوم کا سر اونچا ہو سکے۔ یہ اور ایسی ہی تمام کوششوں کی ہم قدر کرتے ہیں۔ خود بھی ان اچھے کاموں کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی تعاون کرتے ہیں لیکن محض ملک و قوم کی ترقی کے لیے اخلاقی سدھار اور اتحاد کو ہم اتنی اہمیت نہیں دیتے کہ وہ زندگی کا مقصد و مصرف بن جائیں۔ زندگی کا مقصد و مصرف بننے کے لائق تو ہماری رائے میں صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے خدا کی مکمل بندگی ۔

ان صاف صاف باتوں کا انھوں نے کچھ اچھا ہی اثر قبول کیا۔ اسی مجلس میں انھوں نے آر۔ ایس۔ ایس کے کچھ اصولوں اور طریقوں کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نوعمر بچوں کو پیار و محبت کے ذریعہ مانوس کر کے ان کی ذہنی و جذباتی تربیت اپنے اصولوں کے مطابق کرتے ہیں اور ایک نوجوان اس وقت تک اس جماعت میں رہتا ہے جب تک وہ شادی نہ کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص گرہست آشرم میں جانا چاہے تو اسے برا نہیں سمجھا جاتا۔ البتہ اس صورت میں وہ سنگھٹن کا باضابطہ ممبر نہیں رہتا اور اسے اختیار رہتا ہے کہ زندگی کی جو لائن چاہے اختیار کرے اور ہمیں اطمینان رہتا ہے کہ اس کے ذہن اور جذبات کی اتنی تربیت ہو چکی ہے کہ وہ زندگی کے جس شعبے میں بھی جائے گا اپنی محبوب سنگھٹن کا کام کرتا رہے گا اور اس سے ذہنی و قلبی لگاؤ رکھے گا۔ انھوں نے نوعمر بچوں کو اپنے سے مانوس کرنے کے طریقے اور اپنے کئی تجربات بتائے اور مجھ سے اصرار کیا کہ آپ لوگ بھی یہی طریقے اختیار کریں ۔

اس سلسلے میں ان سے یہ معلوم ہونے پر کہ ان کی جماعت میں جینی، ہریجن اور سکھ بھی شامل ہیں میں نے دریافت کیا کہ کیا آپ مجھے اپنی جماعت میں لے لیں گے فرمایا نہیں۔ پھر میرے سوالات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم پہلے اپنوں کا سدھار کر رہے ہیں۔ اس "اپنے اور غیر" میں جو تصور کار فرما ہے اس کو نہ چھیڑتے ہوئے میں نے کہا کہ ہماری جماعت کا معاملہ بالکل صاف ہے۔ چند اصول ہیں آپ انھیں اپنا لیجیے۔ اس کے بعد آپ جماعت کے قائد بھی بن سکتے ہیں۔ اس تقابل سے وہ چونک سے گئے ۔

اسی طرح اپنی جماعت کے طریقے بتاتے ہوئے انھوں نے یہ بھی بتایا کہ ہمارے یہاں غیر مشروط اطاعت ہے، نہ انتخاب ہے نہ احتساب۔ کیونکہ اس کے بغیر کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔ اس موقع پر بھی میں نے یہ نہیں کہا کہ یہ بھی آمریت ہے۔ مزدور ڈکٹیٹر شپ نہ سہی لیکن نازی ازم کی پیروی ضروری ہے۔ اس لیے اس کا ردعمل اور انجام بھی نازی ازم سے مختلف نہیں ہونا چاہیے ۔ لیکن بعد کی ملاقات میں ان سے میں نے کہا کہ عام طور پر انسان نے فرد اور جماعت کا صحیح تعلق دریافت کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔ دوسرے الفاظ میں امیر و مامور کے

اختیار و حقوق متعین کرنے میں وہ افراط و تفریط کا شکار ہوتا رہا ہے۔ اسلام نے جماعت کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنانے کے ساتھ ہی فرد کی آزادی کا بے حد احترام کیا ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں وقت کا سب سے طاقتور حکمراں جب کہتا ہے کہ سنو اور اطاعت کرو، تو جماعت کا ایک معمولی ممبر بول اٹھتا ہے کہ ہم نہ سنیں گے، نہ اطاعت کریں گے۔ پہلے یہ بتلایئے کہ کل جب چادریں تقسیم ہوئی تھیں تو آپ کے حصے میں بھی ایک ہی چادر آئی تھی۔ اور اس چادر میں اتنا بڑا کرتا نہیں بن سکتا جو آپ پہنے ہوئے ہیں۔ جب وہ حکمراں جس کے رعب و جلال سے بڑے بڑے بادشاہ لرزرہے تھے یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اس نے اپنے بیٹے کے حصے کی چادر لے کر کرتے میں شامل کی ہے تب وہ ٹوکنے والا کہتا ہے کہ ہاں اب ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے —— اس بات کا انھوں نے کوئی خاص اثر نہیں لیا۔

پنڈت جی سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ ان سے گفتگو کے اس خلاصے میں کچھ باتیں چھوٹ تو گئی ہیں اور ترتیب بھی کچھ بدل گئی ہے لیکن اضافہ بالکل نہیں ہے۔ اور اس اہتمام سے اس کو قلمبند کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس گفتگو میں کچھ باتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے اور کچھ باتیں اس سے اخذ ہوتی ہیں۔ جو میرے خیال میں اہل علم ونظر کے غور وفکر کی مستحق ہیں۔

۱۔ عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ اسلام اور غیر مسلموں کے درمیان مسلمانوں کی بداعمالیاں حائل ہیں۔ اگر مسلمان اخلاق کا اچھا نمونہ پیش کریں تو غیر مسلموں کے لیے اسلام میں کشش پیدا ہو جائے۔ یہ بات کہتے ہوئے کہنے والے کے پیش نظر انفرادی اخلاق اور ٹھنڈے حالات کا کردار ہوتا ہے۔ حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حسن اخلاق بھی اگرچہ ایک عامل ضرور ہے لیکن اسلام کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے تنہا یہ عامل کافی نہیں ہے —— مگر اس بات کو سمجھنے کے لیے کچھ اور باتوں کو نظر میں رکھنا ضروری ہے۔

انسان کی فطرت میں اخلاقی حس موجود ہے۔ اسی طرح ہر مذہب اخلاقی تعلیم دیتا ہے۔ اخلاق کے تصور اور حدود میں اور اس کی گہرائی و گیرائی میں چاہے فرق ہو لیکن کوئی مذہب اخلاقی تعلیم سے خالی نہیں۔ پھر یہ کہ ہر انسان کے دل میں اپنے دین اور اپنی تہذیب سے والہانہ محبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کسی غیر معمولی قلبی تحریک کے بغیر اپنا دین چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اب فرض کیجیے کہ میں ایک سچا آدمی ہوں لیکن کسی رام کشن کے دل میں مجھے سچ بولتے ہوئے اور سچ پر قائم رہتے ہوئے دیکھ کر میرا دین قبول کر لینے کی تحریک کیوں پیدا ہو جبکہ اس کے مذہب میں بھی سچ کی تعلیم موجود ہے۔ وہ مجھے ایک سچا آدمی پا کر مجھ پر اعتماد کر سکتا ہے۔ میری عزت کر سکتا

ہے مجھ سے محبت کرسکتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اس کے اندر سچ بولنے کا داعیہ بھی پیدا ہوسکتا ہے لیکن آخر وہ اپنا مذہب تبدیل کرنے کا ارادہ کیوں کرے اور اپنے ہی مذہب کا سچ بول کر سچا آدمی کیوں نہ بن جائے اتنے غیر معمولی اقدام کے لیے تو اس کے سامنے اسلام کو اس کی اپنی غرض اور ایسی غرض بن کر آنا چاہیے جو کسی اور جگہ اور کسی اور طریقے سے پوری نہ ہوسکتی ہو اور وہ ہے توحید کی بے لاگ دعوت قرآن کے انداز میں توحید کے دلائل، ہدایت کی ضرورت اور آخرت کی ہولناکیوں اور مسرتوں کے ساتھ۔ پھر اس توحید کی دعوت میں انقلابی روح اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب خدا کی تکوینی حاکمیت کے ساتھ اس کی تشریعی حاکمیت پر بھی اتنا ہی زور دیا جائے جتنا قرآن نے دیا ہے اور جو توحید الٰہی اور صفات خداوندی کو مان لینے کا بدیہی اور عملی تقاضا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ عقیدہ اور مذہب کو عمل کی دنیا سے علیحدہ ایک روحانی دنیا کی چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ توحید کی دعوت بھی محض ایک نظری مسئلہ اور روحانی چیز بن کر رہ جاتی ہے اور انسان کے وجود کو گرم کرنے کے بجائے محض نرم کرنے کا کام کرتی رہتی ہے۔ اگر حاکمیت کا پہلو اس طرح اجاگر نہ کیا جائے کہ زبان سے ربنا اللہ کہہ کر عملی طور پر ثم استقاموا والا منظر سامنے آجائے۔ پھر یہ توحید کی انقلابی دعوت دلوں کو تسخیر کر لینے والی طاقت اور خرمنوں کو پھونک دینے والی بجلی بن جاتی ہے جب اس کو پیش کرنے والے کے دل سے اس کا یقین ابل رہا ہو اور انسانیت کی سچی محبت کے سوز سے خود داعی کا وجود جلا جا رہا ہو اور وہ انسانوں کو دوزخ کی راہ پر جاتا ہوا دیکھ کر اس طرح تڑپ رہا ہو جس طرح کسی کو آگ میں جلتا ہوا دیکھ کر تڑپتا ہے۔ توحید کی اس انقلابی روح کے ساتھ جب داعی کا قلبی سوز اور جم جانے والی صلابت شامل ہو تب ہی اس میں مقناطیسی اثر پیدا ہوتا ہے۔ ورنہ محض نرم اخلاق اور ملائم کردار لوگوں سے محبت و عقیدت کا خراج تو وصول کر سکتا ہے ان کے اندر اپنی دنیا بدل دینے کا جذبہ پیدا نہیں کرسکتا۔ صحابہ کرام کے حسن اخلاق کی تاثیر کے واقعات سب جانتے ہیں اور بیان بھی کرتے ہیں لیکن اس فرق کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ وہ کوئی مجبور و مقہور آدمیوں کا گروہ نہیں تھا جنھوں نے وقت کے دباؤ کو تسلیم کرکے سپر ڈال دی ہو۔ بلکہ وہ ابھرتی ہوئی طاقت تھے جو مخالف حالات سے نبرد آزما تھے۔ ان کی اذان میں اللہ کے حضور سجدے کی پکار کے ساتھ غیر اللہ سے بغاوت کا اعلان بھی تھا۔ اسی وجہ سے ان کی ملائمت میں بھی صلابت تھی۔ اگر حضرت علی کہیں بیٹھے ہوتے اور یہودی ان کے چہرے پر تھوک کر چلا جاتا اور حضرت علی مجبوری میں دانت پیستے ہوئے اپنی چادر سے چہرہ صاف کرکے خاموش ہو جاتے تو اس پر کوئی بھی اثر نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اکڑتا ہوا جاتا لیکن جب اس نے دیکھا کہ جس شخص نے

اسے زیر کیا ہے وہ اپنے غصہ اور اپنی طاقت پر بھی اتنا قابو رکھتا ہے کہ ان دونوں کو بھی اللہ کی جناب میں سجدہ ریز کیے ہوئے ہے تو اس کا دل اسلام کے لیے کھل گیا۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اخلاق کی اثر انگیزی پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے نتیجے میں غیر شعوری طور پر ایسے ذہن بن سکتے ہیں کہ حسن اخلاق کا نمونہ دلوں کی زمین میں سے اگنے والا پھل دار درخت نہ بننے پائے اور اوپر سے اوڑھنے والا خوشنما لبادہ بن جائے جس کا رنگ ذرا سی دھوپ اور بارش سے اڑ جاتا ہے۔ پھر یہ کہ محض حسن اخلاق پر زور دینے سے بات قدرتی طور پر مذاہب کے مشترک اخلاق تک پہنچ جاتی ہے جو اسلام کا نہیں وحدت ادیان اور گاندھی ازم کا راستہ ہے اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچتی ہے کہ "اگر مسلمان سچا مسلمان اور ہندو سچا ہندو بن جائے تو سارے جھگڑے ختم ہو جائیں" حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان دونوں جو خدا کو اپنے اپنے طور پر مانتے ہیں اگر صحیح طریقے سے مان لیں اور اس ماننے کے تقاضے پورے کرنے لگیں تو دونوں اللہ کے سچے مسلم بن جائیں گے۔ جو جھگڑے مادی مفادات پر اور روایتی مذہبی جذبات پر ہوتے ہیں انھیں ختم ہونا چاہیے لیکن جو نزاع خدا کو ماننے نہ ماننے پر ہو اس میں تو اقرار خدا کی جیت یقینی ہے۔ ولو کرہ المشرکون

۲۔ یہ خیال بھی مسلمانوں میں عام ہے کہ مذہبی مزاج رکھنے والے غیر مسلم کے مقابلہ میں سیکولر ذہن رکھنے والا غیر مسلم ہم سے قریب ہے اور جب بھی مسلمان غیر مسلموں سے ملنے کی کوئی بات سوچتے ہیں تو ان کی نظر سیکولر غیر مسلم تک پہنچ کر رک جاتی ہے۔ مذہبی ذہن رکھنے والے غیر مسلم تک جاتی ہی نہیں۔ اگر مقصد دنیا ہی کا بنانا ہو اور دین وایمان کی حیثیت ایک ضمیمہ کی ہو تب تو بات دوسری ہے۔ اس صورت میں تو سیکولر یعنی دنیا دار لوگ ہی مناسب ہیں۔ مفادات کے حصے بانٹ کر لیجیے جب تک اغراض مشترک رہیں گی ایک کو دوسرے کا خوف رہے گا اور طاقت میں توازن باقی رہے گا۔ اس وقت تک کام چلتا رہے گا لیکن اگر مسلمان کی اصل پونجی اس کا دین ہے اور وہ ایک اعلیٰ مقصد کا خادم ہے اور اس کے لیے قرآن کا بتایا ہوا راستہ ہی صراط مستقیم ہے تو پھر یہ سیکولر انتخاب اس راہ کا پہلا قدم نہیں الٹا قدم ہوگا

ظاہر ہے کہ غیر مسلموں سے مل کر کام کرنے کے لیے کوئی ایسی چیز ہونا ضروری ہے جو ہمارے اور ان کے درمیان مشترک ہو کسی قدر مشترک اور کلمہ سوا کے بغیر کسی اشتراک کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن جب ہم سیکولر ذہن رکھنے والے غیر مسلم کے اور اپنے درمیان ایک کلمہ سوا تلاش کرتے ہیں تو کسی دنیوی مقصد کے علاوہ کوئی چیز سامنے نہیں آتی۔ یا پھر رواداری جیسی کوئی بظاہر اخلاقی چیز ہو سکتی ہے جس کی غرض ملکی یا قومی مفاد ہو حالانکہ قرآن

جس کلمۂ سواء کی تعلیم دیتا ہے وہ ہے بندگیِ رب اور اجتناب عن الشرک۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ جب کسی سے معاملہ کرو تو کسی چیز کو کلمۂ سواء ضرور بناؤ۔ بلکہ وہ ایک متعین کلمۂ سواء ہی کی تعلیم دیتا ہے کہ تمہارے اور دوسروں کے درمیان اشتراک کے لیے یہ قدرِ مشترک ہونا چاہیے۔ کسی اسلامی تنظیم کا کسی غیر مسلم ادارہ سے کسی مسئلے پر واضح حدود و شرائط کے ساتھ معاہدہ کر کے اشتراک کرنا دوسری بات ہے جیسے مدینہ میں یہودیوں کے ساتھ ہوا تھا۔ یہاں اس نقطۂ نظر سے کہ مسلمان کی اصل ڈیوٹی دعوتِ توحید ہے مشترک مقاصد کے لیے مشترک جدوجہد کی بات ہو رہی ہے۔ ایسی مشترک جدوجہد میں جب ہم کسی دنیوی مفاد کو کلمۂ سواء بنائیں گے تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ کہ ایسے اشتراک سے پہلے ہمارا تحت الشعور اس دنیوی مفاد کو اور غیر مسلموں سے اتحاد و اشتراک کو عقیدے سے زیادہ اہمیت دے چکا ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اس طرح وہ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے بلکہ ہم ان کے ساتھ چل کر ان کے میدان میں پہنچ جائیں گے جس میں ہمارے لیے پسپا ہو کر اپنے موقف سے ہٹ جانے کے سوا کوئی چیز مقدر نہیں ہوگی۔ کیونکہ جب ہم مشترک دنیوی مقاصد کی طرف آگے بڑھیں گے تو بہت سے وہ مسائل بھی سامنے آئیں گے جن کے متعلق اسلام کا نقطہ دوسرا ہے اور اس کے واضح احکام موجود ہیں۔ ایسے ہر موقع پر اس آواز کا اٹھنا ایک فطری بات ہوگی کہ اپنے عقیدہ اور اس کے تقاضوں کو درمیان میں نہ لاؤ کیونکہ یہ مشترک مقاصد کے لیے مشترک جدوجہد ہے۔ اور عقیدہ و مذہب کو بیچ میں لانے سے وہ یک جہتی متاثر ہوگی جو اصل مقصد ہے۔ اسی چیز کو فرقہ پرستی کہا جائے گا اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ یا تو یہ ساجھے کی ہنڈیا کسی چوراہے پر پھوٹ جائے۔ یا اختیار اہون البلیتین جیسی کسی رخصت کی پناہ میں جا کر اسلام کے واضح احکام کی تاویلیں ہونے لگیں۔ تا آنکہ عقیدہ تک پس پشت جا پڑے۔ اس صورت میں ہم خربوزے ہوں گے اور دوسرے چھری۔ اور یہ لازمی نتیجہ ہوگا سیکولر ذہن کو اپنانے کا۔ بخلاف اس کے اگر ہم نے ان لوگوں کو نسبتاً یگانہ اور قریب سمجھا جو کسی نہ کسی نام سے خدا کو مانتے ہیں کسی نہ کسی رنگ میں ضرورتِ ہدایت کے قائل ہیں اور کسی نہ کسی شکل میں مکتی اور نجات کو انسان کا مقصد قرار دیتے ہیں اور خدا پرستی ہی کو اپنے اور ان کے درمیان قدرِ مشترک قرار دے کر انھیں آواز دی تو خدا پرستی سے اتفاق کرنے کے ساتھ ہی وہ خود بخود ہمارے میدان میں آ جائیں گے اور یہ دعویٰ ناقابلِ تردید ہے کہ اس میدان میں دنیا کی کوئی طاقت اسلام کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی۔ کیونکہ کوئی شخص خدا کو اس کی صفات کے ساتھ مان لینے کے بعد ان بدیہی تقاضوں سے انکار نہیں کر سکتا جن کا نام اسلام ہے۔ اور اگر ہٹ دھرمی

کے ساتھ انکار کرے گا تو اس کی پوزیشن کمزور ہی نہیں ہو گی بلکہ ویسی ہی مضحکہ خیز بن جائے گی جیسے ہماری پوزیشن سیکولر میدان میں جا کر مضحکہ خیز بن جاتی ہے۔ یہ طریقہ اختیار کرنے کے بعد ہماری حیثیت اس چھری کی سی ہو جائے گی جس پر چلا ہے وکین بھر کر خربوزے گر پڑیں لیکن کٹیں گے وہ خود ہی ـــــ مگر ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ جس میں توحید کے بغیر دنیوی لاگ کا شائبہ بھی نہ ہو وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے توحید ہی کے لیے جینے کا اور توحید ہی کے مرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔ اور اس بات سے کس مسلمان کو انکار رہے گا کہ اسے ایک علیحدہ امت کی حیثیت سے برپا کرنے کا مقصد ہی یہ ہے۔

یہاں یہ بات تسلیم کرنا چاہیے کہ آج کی دنیا میں غیر مسلم سیکولر ذہن کو غیر مسلم مذہبی ذہن پر ایک گونہ برتری حاصل ہے۔ وہ صفات جو اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہیں غیر مسلم سیکولر حلقوں میں ملتی ہیں لیکن اگر اس نقطۂ نظر سے غیر مسلم مذہبی حلقوں کی جانب توجہ کی جائے تو ایک طرح سے مایوسی ہونے لگتی ہے۔ خصوصًا وہ مذہبی ذہن جس نے کوئی تنظیمی شکل اختیار کر لی ہے وہاں تو کبھی کبھی ایسی سطح ذہنی سے واسطہ پڑتا ہے کہ آدمی سر پکڑ کر بیٹھ جائے لیکن نصح و خیر خواہی کی راہ آسان کب رہی ہے؟ یہ راستہ ہمیشہ ایسی مشکلات سے بھرا ہوا رہا ہے اور داعیان حق کو انہی مشکلات میں سے اپنی راہ نکالنا پڑی ہے۔ آج بھی اگر غور کیا جائے تو اس مشکل کا سبب معلوم ہو جائے اور ہمت کی جائے تو اس کا حل بھی نکل سکتا ہے۔

ذرا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سوسائٹی میں مختلف عوامل قدرتی طور پر اپنا کام کرتے رہتے ہیں اور اس میں کچھ ایسی چھلنیاں ہر وقت اپنا کام کرتی رہتی ہیں جو مختلف مزاج رکھنے والوں کے مجموعہ میں سے کسی خاص نوعیت کا مزاج رکھنے والے انسانوں کو چھانٹ چھانٹ کر ایک طرف کرتی رہتی ہیں۔

اس نقطۂ نظر سے تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کی اجتماعی زندگی پر حقیقی مذہب کے بجائے مذہب کے نام پر اپنی خداوندی چلانے والوں کا اقتدار قائم ہوا تو قدرتی طور پر مذہب کے مخلص پیروں سے بھی آگے وہ لوگ بڑھنے لگے جن کے سامنے مذہب کے راستے سے حاصل ہونے والی دنیا تھی۔ ظاہر ہے کہ دنیا کے لیے مذہب کو استعمال کرنے والوں سے ذہن و اخلاق کی اس بلندی کی توقع نہیں کی جا سکتی جو حقیقی مذہب انسان کو عطا کرتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی میں ایک چھلنی نے اپنا کام شروع کر دیا اور اس عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مذہب پر بھی اور اقتدار پر بھی وہ لوگ قابض ہوتے چلے گئے جن کی ذہنی و اخلاقی سطح بلند نہیں تھی۔ یہاں تک کہ ان کی تنگ دلی و تنگ نظری نے انسانوں کو اتنا مجبور کر دیا کہ ان کی اجازت کے بغیر

کوئی شخص حرکت بھی نہ کر سکے۔ بالآخر اس شدت کا ردعمل اس صورت میں ظاہر ہوا کہ مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا۔ لیکن اس بے دخلی کا نتیجہ بھی یہ نہیں نکلا کہ اہل مذہب نے اپنی غلطی محسوس کر کے اس کی اصلاح کی ہوتی۔ بلکہ سابق کمزوریوں میں ان امراض کا اور اضافہ ہو گیا جو پستی و مغلوبی کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں۔ حوصلہ کی بلندی اور ظرف کی وسعت کے بجائے ان کے حصے میں احساس کمتری اور دل و نگاہ کی تنگی آئی اور اب ان کا کام یہ رہ گیا کہ مذہب کے نام پر نئے نئے جھگڑے کھڑے کرتے رہیں۔ اس طرح مذہب اپنے نام لیواؤں کو اونچا اٹھانے کے بجائے خود ان کی پستی میں گرتا چلا گیا اور اپنے نمائندوں کے طفیل میں جھگڑے فساد اور تنگ دلی و تنگ نظری کا نشان بن گیا۔ دوسری طرف عالی ظرفی اور وسعت قلب و نظر سیکولر اصحاب کے حصے میں عملی طور پر جتنی بھی آئی ہو لیکن نظری طور پر سیکولرطرز فکر ان صفات کا نمائندہ ضرور بن گیا۔ یہ کہنا تو صحیح نہیں ہے کہ مذہبی حلقوں میں اعلیٰ صفات بالکل نہیں رہیں لیکن اس تلخ حقیقت کو ماننے بغیر چارہ نہیں کہ اب بھی سوسائٹی کی مشین کچھ اس طرح چل رہی ہے کہ سوسائٹی کا کمتر مذہب کی جانب کم ہی توجہ کرتا ہے۔

چھٹنی کا یہ عمل اگرچہ مسلم سوسائٹی میں بھی ہوا لیکن ہر منصف مزاج آدمی ملنے گا کہ مسلمانوں میں اس کی رفتار دھیمی اور اس کی نوعیت مختلف رہی۔ اس کے اسباب پر گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں ورنہ بات مذاہب کے تقابل تک پہنچ جائے گی۔ لیکن واقعہ یہی ہے کہ انحطاط کے اس عمل کا اثر مسلمان پر جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن اسلام محفوظ رہا۔ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ تمام مذاہب میں صرف اسلام کے دائرے میں اس صورت حال کا ردعمل ظاہر ہوا ہے اور اسلام اب اقدامی پوزیشن میں آ رہا ہے۔

بہرحال یہ ہے اس مشکل کا مختصر حال جس سے دعوت توحید کو سابقہ ہے۔ لیکن اس مشکل کا حل یہ نہیں ہے کہ سوسائٹی میں بن جانے والے ان دو گروہوں کو مستقل طبقات مان کر ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے دوسرے کو نظر انداز کر دیا جائے۔ بلکہ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ دعوت توحید کی پکار انسان کے جذبات عالیہ تک پہنچائی جائے۔ اور اس آواز پر لبیک کہنے والوں کی چال اور آگے بڑھنے کا رخ وہ ہو کہ انسانیت کا اعلیٰ جوہر ہی اس کی جانب توجہ کرے۔ بات بالکل سادہ اور صاف ہے۔ آواز جیسی ہوگی ویسی ہی مزاجی ساخت رکھنے والے عناصر اس کی جانب متوجہ ہوں گے۔ بلندی پر چڑھنے کے لیے آواز دیجیے ہر طرف سے وہی لوگ آگے بڑھیں گے جن کو بلندی سے دلچسپی ہوگی اور جو بلندی پر چڑھنے کا حوصلہ بھی

رکھتے ہوں گے۔ اس کے برخلاف اپنی آواز میں لطف و لذت کی چاٹ لگا دیجیے کام و دہن کے متوالوں کی بھیڑ جمع ہو جائے گی۔ جن کے اندر بلندی پر چڑھنے کا ارادہ ہوگا نہ حوصلہ۔ اسی طرح فخر و مباہات کی یا غصہ و انتقام کی جذباتی باتیں کیجیے لوگوں میں ایک ابال آ جائے گا۔ سربزیری کا وعظ فرمایئے جھک جانے والی نرم فطرت کے لوگ ایک طمانچہ کھا کر دوسرا گال بھی پیش کر دیں گے اور زیر جھکا کر تن بہ تقدیر بیٹھ جائیں گے۔

۳۔ اسی طرح یہ بھی ایک خیال ہے کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی دنیوی برکات پیش کی جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ اسلام کے پاس ان تمام مسائل کا بہترین حل ہے جن میں آج دنیا کے بہترین دماغ الجھے ہوئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام دنیوی مسائل کا بھی بہترین حل ہے لیکن اصلاً وہ آدمی کی ابدی نجات کے مسئلے کا حل ہے۔ وہ بہترین نظام زندگی سے پہلے بہترین نظام بندگی ہے۔ مسائل زندگی کے حل کی بات اس غلط خیال کی اصلاح کے لیے بالکل صحیح ہے کہ "دین آدمی کی آخرت بناتا ہو تو بناتا ہو لیکن اس کی دنیا بگاڑ دیتا ہے" اس سیاق میں اور اس حد تک یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے سنوارنے کا حکم دیتا ہے اور محض دینداری سے نہیں بلکہ دینی نظام سے دنیا بگڑتی نہیں بلکہ سنور جاتی ہے لیکن مسائل کے حل کی بات کا اتنا بڑھ جانا کہ اسلام محض مسائل کا نسخہ معلوم ہونے لگے گھوڑے سے آگے گاڑی کو جوت دینا ہوگا اور جو لوگ اس راستے سے اسلام کے محل میں داخل ہوں گے وہ دوسرے راستے سے نکل بھی جائیں گے۔ پھر قطع نظر اس سے کہ اس بات کو اسلام کی پہلی آواز اور اس کے لیے پہلا محرک نہیں بننا چاہیے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جب تک نفع اور نقصان کی قدریں نہ بدل جائیں مسائل کے کسی ایک حل پر لوگوں کا متفق ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ نفع اور نقصان اضافی چیزیں ہیں۔ ایک چیز ایک شخص کے لیے اس کے نقطۂ نظر سے عین فائدہ ہے وہی چیز دوسرے کے لیے اس کے نقطۂ نظر سے سراسر نقصان ہوگی جب تک اس دنیا میں انسان کی حیثیت کا اور اس کے انجام کی بات کا تعین نہ ہو جائے نفع اور نقصان کا تعین نہیں ہو سکتا۔ یہی چیزیں اس بات کی صداقت کا ثبوت ہیں کہ

"برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی"

لہٰذا اگر ان باتوں کو اہتمام کے ساتھ ملحوظ نہ رکھا جائے تو داعی مسائل کے جنگل میں کھو جائے گا اور اس کی دعوت الی اللہ غیر شعوری طور پر دعوت الی الدنیا مع اللہ بن جائے گی۔

ہم مسلمانوں کو اس ملک میں جن حالات سے گذرنا پڑ رہا ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثریت کی نظر

میں مسلمان ایک ناقابل حل مسئلہ بنے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کا جو حال ہے وہ تو خیر ظاہر ہے لیکن اکثریت کے دل سے پوچھیے کہ ان پر کیا گزر رہی ہے ان کو مسلمانوں کے مسئلے نے قابل رحم حالت تک پہنچا دیا ہے ۔

موجودہ دور سے پہلے بھی ہندو اکابر کو اندیشہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کی توحید ان کے مذہب کو متاثر کرے گی اور اسلام کی معاشرتی مساوات ان کے ورن آشرم کے سسٹم کو ہلا دے گی ۔ اس لیے انھوں نے بھی اپنے رنگ میں توحید اور مساوات کا پرچار شروع کیا لیکن یہ کوششیں چونکہ مدافعانہ انداز میں تحفظ کی تدبیریں تھیں ۔ اس لیے ان کا وہ نتیجہ نہیں نکلا جو صحیح محرک کے ساتھ صحیح کوششوں کا نکلنا چاہیے ۔ تاہم چونکہ یہ کوششیں تعمیری تھیں اور ان میں کسی کے خلاف جارحانہ انداز نہیں تھا ۔ اس لیے وہ بالکل بے نتیجہ بھی نہیں رہیں خصوصاً جبکہ مغربی تہذیب نے آکر ان کو ایک نیا رنگ دے دیا ۔

لیکن اب مسلمانوں کا جو خطرہ اکثریت کے دل پر چھایا ہے اس کا رنگ دوسرا ہے ۔ اس خطرے نے ان کے دل و دماغ ہی کو متاثر نہیں کیا ہے بلکہ عملی طور پر اس خطرے کو ٹالنے کے لیے وہ اپنے اپنے طور پر کوشاں ہیں ۔ کچھ لوگ جو زیادہ دانشمند ہیں وہ وحدت ادیان کی "مشترکہ سچائیوں" کے نام پر مسلمانوں کو تحلیل کر کے متحدہ قومیت کی معجون بنانا چاہتے ہیں ۔ یہ حضرات خوب سمجھتے ہیں کہ توحید ہی مسلمان کی طاقت ہے اس لیے انھوں نے اپنے سیاسی فرزندوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کے عرسوں اور قوالیوں میں اور ایسے ہی دوسرے شرک آمیز پروگراموں میں مصروف کر کے "اہل حرم سے ان کی روایات چھین لو" کچھ لوگوں کی تشخیص و تدبیر یہ ہے کہ توحید و آخرت پر جان دینے والا یہ خطرہ چونکہ بھوکا ہے اور بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے نازک حصہ پیٹ ہوتا ہے اس لیے پیٹ کے راستے سے اس کے دل تک پہنچو اور اس میں خدا کے بجائے روٹی کی محبت ڈال کر "روح محمد اس کے بدن سے نکال دو" کچھ اور لوگ نازی ازم کا شکار ہو کر ہٹلر کی نقل کرتے ہوئے اس خطرے کو طاقت سے کچل دینا چاہتے ہیں ۔ ان کے نزدیک مسلمانوں کے مسئلے کا بس یہی ایک حل ہے کہ خود مسلمان کو حل کر دیا جائے اور یہ سوچتے وقت بے چارے اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ نہ یہاں کے مسلمان یہودی ہیں نہ وہ خود جرمن ہیں

غرض یہ کہ

یک چراغیست دریں بزم کہ از پرتو آں — ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

(ایک ہی چراغ ہے اس بزم میں جس کے عکس سے — جہاں دیکھیے لوگوں نے ایک انجمن بنا رکھی ہے)

ان حالات میں مسلمانوں کے سوچنے کا ایک انداز تو یہ ہے کہ وہ تنہا اتنے حملوں سے کیسے بچے اور آیات الٰہی

کا علمبردار کدھر جائے؟ دوسرا طریقہ سوچنے کا یہ ہوسکتا ہے کہ جب ہماری امتیازی خصوصیت یعنی توحید کے پوری طرح برسرِکار نہ آنے کی وجہ سے خود ہم اور دوسرے لوگ اتنی پریشانیوں میں مبتلا ہیں تو کیوں نہ ہم واقعی توحید کے علمبردار بن جائیں اور اپنی توحید پر فخر کرنے کے بجائے اسے لوگوں کی ناگزیر ضرورت بنادیں۔

پہلے نقطہ نظر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اِن مشکلات سے نجات پانے کی بات سوچے اور نجات دہندہ بننے کا خیال اس کے ذہن میں بھی نہ آئے۔ کبھی فریاد و فغاں کرے، کبھی جھنجلا کر خود اپنی شان میں فخریہ پڑھنے لگے۔ کبھی مغلوبانہ ذہن سے مقابلہ کی سوچنے لگے اور کبھی مایوس ہوکر وقت کے دھارے میں بہنے کے لیے تیار ہوجائے جو "آسان میری" کا اچھا نسخہ ہے۔ لیکن دوسرا نقطہ نظر اختیار کرنے کے ساتھ ہی ایک مردِ مومن کی وقعت خود اپنی نظر میں بڑھ جائے گی۔ اس کی نگاہ اتنی بلند ہوجائے گی کہ ان دنیوی مشکلات کو وہ تارِ عنکبوت سے زیادہ اہمیت نہیں دے گا۔ وہ دنیا کو ایک معالج کی نظر سے دیکھے گا اور علاج کی تدبیروں پر غور کرے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے حقوق کی بات سے زیادہ اپنی ذمہ داریوں کی بات سوچے گا۔ غرض یہ کہ نقطہ نظر کے بدلتے ہی اس کی کایا پلٹ جائے گی اور وہ اس طرح سوچنے لگے گا کہ دنیوی ترقی اور خوش حالی کی جدوجہد میں تو سب ہی لوگ لگے ہوئے ہیں۔ اخلاقی سدھار کا کام بھی دوسرے لوگ کرسکتے ہیں لیکن اپنے محروم بھائیوں تک ایمان کی دولت پہنچانا تو میرا اور صرف میرا کام ہے ـــــ اس لیے

مصلحت دید من آن ست کہ یاراں ہمہ کار   بگزارند و خمِ طرۂ یارے گیرند

کلمۂ سواء

کہو، اے اہلِ کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے ـــــ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ـــ ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی و اطاعت کرنے والے) ہیں۔

(آلِ عمران - ۶۴)

امیر جماعت اسلامی ہند مولانا ابو اللیث ندوی کا خطاب عام

ملکی اور ملّی مسائل

اور اُن کا حل

مُرتبہ :—— عبد المعز منظر

پٹنہ - ۸ر نومبر —— ۹ بجے شام کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ارکان جماعت اسلامی حلقہ بہار کے تربیتی اجتماع کے موقع پر ایک عظیم مجمع کو مولانا ابو اللیث صاحب ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے خطاب فرمایا جس میں عمائدین شہر ارباب فکر و نظر کے علاوہ تعلیم یافتہ نوجوانوں اور غیر مسلموں کی بھی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی - انجمن اسلامیہ ہال پورے طور پر بھرا ہوا تھا - اس کے علاوہ میدانوں اور دکانوں میں کافی حضرات موجود تھے - تقریباً دو گھنٹے تک مولانا نے خطاب فرمایا - مجمع ہمہ تن گوش رہا - لوگ امیر جماعت کی پر مغز باتوں کو توجہ اور خاموشی سے سنتے رہے -

امیر جماعت اسلامی ہند نے فرمایا کہ جماعت اسلامی کی دعوت اور اس کے پروگرام اور پالیسی سے تو آپ حضرات واقف ہی ہوں گے کیونکہ ملک کا باخبر طبقہ بالعموم جماعت کی بنیادی دعوت سے بہت کچھ واقف ہو چکا ہے - اس لیے میں اس موقع پر اس پر گفتگو کرنے کے بجائے ملک و ملت کے ان چند ضروری مسائل پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت مختلف ذہنوں میں پائے جاتے ہیں -

محترم حاضرین ! —— آزادی سے پہلے ملک کی تعمیر و ترقی کا جو حسین خواب دیکھا گیا تھا افسوس ہے کہ ۲۲ سال کے بعد بھی وہ شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا - آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی کے بہت سے کام ہوئے مگر غربت و امارت کی خلیج پاٹی نہ جا سکی اور غریب اور زیادہ غریب بنتے چلے گئے - سوشلزم کے نعرے کے باوجود یہ فرق دور نہ کیا جا سکا - دوسری طرف یہ ملک جو اخلاق و روحانیت اور مذہب کا گہوارہ کہا جاتا تھا خود یہاں یہ اخلاقی قدریں اجنبی بن چکی ہیں اور ان کے ماننے والے اور ان پر عمل پیرا

لوگ کم سے کم تر ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف اخلاقی بحران اخلاقی قدروں کی نا قدری کا دور دورہ ہے
نسل، ذات، زبان اور علاقائی تعصبات اور تنگ نظریوں نے طبقات اور علاقوں کا تعلق دوسرے طبقات
اور علاقوں اور مرکز سے برائے نام باقی رہنے دیا ہے۔ ہر طرف توڑ پھوڑ اور افراتفری کا عالم ہے حکمراں
جماعت تباہ ہو رہی ہے اور اس کی جگہ کوئی دوسری جماعت لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔

ان حالات میں جو خرابیاں موجود ہیں بظاہر ان کے بڑھنے ہی کا اندیشہ ہے اور حالات کے جلد بدل جانے
کی توقع نہیں کی جا سکتی — اس وقت مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان کئی طرح کے ملی مسائل درپیش ہیں۔ سب سے
بڑا مسئلہ تو جان و مال کے تحفظ ہی کا ہے۔ امیر جماعت نے فرمایا کہ میں احمد آباد اور بڑودہ سے خود ہو کر آیا
ہوں۔ یہاں کا فساد جبل پور، جمشید پور، رورکیلا کے فسادات سے بہت بڑھ کر ہے۔ جانی اور مالی دونوں
طرح کے نقصانات، وہاں بہت زیادہ بڑے پیمانے پر ہوئے ہیں۔ ان حالات میں مسلمانوں میں خوف و
ہراس اور مایوسی کی کیفیات ایک قدرتی بات ہے۔ احمد آباد کے دورے کے بعد میں کیرالا بھی گیا تھا۔ وہاں
میں نے ایک نئی بات محسوس کی کہ اب جنوب کے مسلمان جو اب تک فسادات سے بڑی حد تک مامون و محفوظ رہے
ہیں وہ بھی بہت زیادہ خوف و ہراس محسوس کرنے لگے ہیں اب ملک کی ہر خبر نہ صرف یہ کہ ملک کے گوشے گوشے
میں پھیل جاتی ہے بلکہ ساری دنیا میں اس کا فوراً چرچا ہو جاتا ہے اور دور دور کے لوگ اس سے متاثر ہوتے
ہیں۔ جنوب کے مسلمانوں کے لیے یہ صورت حال نئی ہے۔ اس لیے وہ ان حالات سے زیادہ متاثر ہو رہے
ہیں اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ بہت سے لوگ اس موقع پر مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک پاشی سے بھی نہیں
چوکتے۔ بعض لیڈروں نے اس نازک اور نفسیاتی موقع کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اس
بات کا طعنہ دیں کہ وہ بدلے ہوئے حالات کو نہیں سمجھ رہے ہیں اور اب بھی باہر کی طرف دیکھ رہے ہیں اس
سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ مسلمانوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ قومی یک جہتی کا باعث مسلمانوں کا
علیحدہ پرسنل لا ہے جس کی بنیاد شریعت پر ہے۔ یہ بات اس توقع پر کہی جا رہی ہے کہ شاید مصیبت کے درمیان
مسلمانوں کا ذہن مشترک پرسنل لا کی تجویز کو قبول کر سکے۔ یہ باتیں انتہائی تکلیف دہ ہیں

پھر جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں۔ وہ بھی عدد درجہ سطحی اور ناکافی ہیں اور بعض اوقات عملاً ان کو الٹا
استعمال کیا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر قومی یک جہتی کونسل کی یہ تجویز کہ فرقہ پرستی کے رجحانات کو دبایا جائے
بظاہر ایک اچھی تجویز تھی مگر اس پر عمل اس طرح ہوا کہ مسلم اور اردو پریس کو بالخصوص اس کا نشانہ بنایا گیا

اور جرم کی تشخیص و تعیین کے بغیر مسلم اخبارات کی بہت بڑی تعداد کو مقدمات کے چکر میں ڈال دیا گیا۔ اس کے مقابلے میں اکثریت کے مشہور فرقہ پرست اخبار جو دن رات مسلمانوں کی دل آزاری کرتے رہتے ہیں اور ان کو کیچڑ کے لگاتے ہیں وہ حکومت کی گرفت سے اب تک آزاد ہیں

مسلمانوں کے لیے دوسرا اہم مسئلہ یہ ہے کہ دین و مذہب سے ان کے تعلق کو توڑنے کے لیے آزادی کے بعد ہی سے ایک ایسا نصاب تعلیم رائج کیا جارہا ہے جس کو پڑھ کر بچے مشکل ہی سے اپنے دین سے وابستہ رہ سکتے ہیں۔ اگر ان کی دینی تعلیم کا علیحدہ سے کوئی بندوبست نہ کیا جا سکا

اسی مسئلے کا ایک گوشہ یہ بھی ہے کہ مسلم یونیورسٹی جو اگرچہ اسلام کی نمائندہ نہیں مگر اس سے مسلمانوں کو بہت سے دنیاوی اور دینی فوائد حاصل ہو رہے تھے اس کا حلیہ بھی بہ تدریج بگاڑا جا رہا ہے۔

یہی حال اوقاف کے مسئلے کا ہے۔ اگر اوقاف کا مناسب انتظام ہو سکے تو ان سے بہت سے ملی کام چل سکتے ہیں مگر ان پر بھی نگاہ کرم ہے۔ اگر اوقاف پر بھی حکومت کا مکمل کنٹرول ہو گیا تو واقفین کے مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے، نہ ان سے ملت ہی کے کاموں میں کوئی آسانی پیدا ہوگی۔

مولانا نے فرمایا یہ تھے اہم ترملی مسائل ——— یہ مسائل مسلمانوں کے لیے بے حد اہمیت رکھتے ہیں مگر ان کی وجہ سے مسلمانوں کو ملکی مسائل سے صرف نظر نہیں کرنا چاہیے، کیونکہ یہ ملک دوسروں کی طرح ان کا بھی ہے۔ اس ملک کے حالات اگر بگڑتے ہیں تو ان کا اثر خود مسلمانوں پر بھی پڑے گا اور ان کے لیے زندگی دشوار تر ہوتی چلی جائے گی۔ مسلمان ملکی مسائل سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح میں غیر مسلموں سے کہوں گا کہ مسلمانوں کی جان و مال کا زیاں ملک کا زیاں ہے۔ ان کی بربادی ملک کی بربادی ہے۔ پھر مسلمانوں کی بربادی سے بیرونی دنیا میں ملک کی ساکھ مجروح ہوتی ہے اور دنیا کی رائے عامہ پر برا اثر پڑتا ہے۔ خالص مادی نقطہ نظر ہی سے دیکھیے تو اس کا اثر ملک کی تجارت، صنعت اور سیاست سب پر برا پڑتا ہے اور اس کا خمیازہ بھگتنا ہی پڑتا ہے۔ پھر اگر اضطراب اور حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے مسلمانوں کی صلاحیتیں ٹھٹھر کر رہ گئی ہیں تو یہ بھی ملک ہی کی بدقسمتی ہے۔ اگر اکثریت کے بعد سب سے بڑی اکثریت کرب، اذیت، پریشانی اور بدحالی کا شکار رہے تو اس سے ملکی مسائل کی پیچیدگی میں مزید اضافہ ہوگا۔ پھر غیر مسلموں کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ اس کی کیا ضمانت ہے کہ مسلمان ہمیشہ ان حالات کو ٹھنڈے دل سے برداشت ہی کرتے رہیں گے۔

بہرحال ملکی اور ملی مسائل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں ایک دوسرے پر اثرانداز ہوتے ہیں اور

ہم ملک کے شہری ہونے کے ناطے ملک کے خیر و شر اور عافیت و پریشانی میں برابر کے شریک ہیں۔ ہماری پوری کوشش ہونی چاہیے کہ ہم دونوں طرح کے مسائل کے حل کے لیے پوری طرح فکر مند رہیں۔ اگر ہم اب تک ملی مسائل کو حل کرنے میں ناکام رہے ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ملی مسائل کو ملکی مسائل سے پوری طرح مربوط نہیں کر سکے ہیں۔

دینی حیثیت سے بھی مسلمان ملکی مسائل سے بے تعلق نہیں رہ سکتے کیونکہ ان کی اصلی حیثیت یہ ہے کہ وہ خیر امت ہیں، شہداء علی الناس ہیں، عدل و انصاف کے علمبردار اور اخلاق کے معلم ہیں۔ ان کا جینا اور مرنا مفادات کے تحفظ کے لیے نہیں، بلکہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے ہے۔ یہی منصب ان کا اللہ اور اس کے رسول نے متعین فرمایا ہے اور قرآن مجید اور احادیث نبوی اس پر شاہد ہیں۔ اسلام محض چند عبادات اور رسوم کا نام نہیں ہے، نہ اسلام شخص خدا اور بندوں کے درمیان پرائیوٹ تعلق کا نام ہے۔ اسلام ایک پورا نظام زندگی ہے دنیا مزرعِ آخرت ہے۔ آخرت کی کامیابی کی راہ دنیا کے منجدھار سے گزرتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے بھی ملکی مسائل سے علیحدگی خود مسلمانوں کے دینی منصب کے منافی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ مسلمان ملکی مسائل سے عہدہ برآ کس طرح ہوں؟ تو یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ ہم اس کے لیے لامحالہ دوسروں کے طور طریق اپنائیں بلکہ ہم اس کے لیے اپنا کوئی راستہ اختیار کر سکتے ہیں ـــ حالات سے مایوسی اسلام میں کفر ہے اور مسلمانوں کے شایان شان ہرگز نہیں ہے۔ قرآن مجید کی یہ آیت کہ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا تقریباً ایسے ہی حالات میں نازل ہوئی تھی جیسے حالات سے ہم اس وقت دوچار ہیں میں خوف زدہ کرنے کا قائل نہیں، ہمت پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ مگر یہ بھی کوئی قابلِ تعریف ہمت نہیں ہے کہ جن مفاسد سے ہم بچ سکتے ہوں محض اپنی عزت نفس کی خاطر یا وقتی جذبات کے ہیجان کی وجہ سے ہم ان سے نہ بچ سکیں۔ گالی کا جواب گالی، اشتعال کا جواب اشتعال سے نہ دینا عالی ہمتی ہے

پھر ہمیں یہ بھی سوچنا چاہیے کہ موجودہ حالات کو پیدا کرنے میں جہاں دوسروں کا دخل ہے، خود ہماری غلطیوں کا بھی اس میں دخل ہے۔ مسلمان اس ملک میں بالعموم فاتح کی طرح آئے اور دیگر فاتحوں کی طرح انھوں نے بھی بحیثیت مجموعی دین اور ملک کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا۔ شکر گزاری کا رویہ اختیار نہیں کیا۔ اور اپنے کو ملک کے لیے رحمت بنا کر پیش نہیں کیا

تقسیم کے بعد گائے اور مسجدوں کے سامنے باجا بجانے پر بہت سے ہنگامے ہوئے ہیں۔ گائے کے مسئلے کو

بالعموم بہانہ بنایا جاتا ہے، مگر باجا بجانے کا مسئلہ ایسا ہے جس پر مسلمانوں کو حالات کے پیش نظر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیے۔ بلاشبہ عبادتوں کے لیے پرسکون ماحول مناسب ہے۔ مگر غیر مسلم اگر نہ مانیں اور اس کو بہانہ بنا کر خون خرابہ کرنے پر تلے ہوئے ہوں تو اس مسئلے کو فساد کے لیے بہانہ بننے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ خود مسلمان باجا بجاتے ہیں تو ہمارے جذبات اس طرح پر مشتعل نہیں ہوتے۔ پھر سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ بھی ہے اور اس کے بعد ہی اڑیسہ کے فسادات کے موقع پر اسی مسئلے کو بہانہ بنایا گیا تو ان حالات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

فسادات کے سلسلے میں بعض غیر مسلم جماعتوں کا نام لیا جاتا ہے۔ ہم بھی ان سے واقف ہیں۔ ان کی سرگرمیوں کو کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ مگر ان کے وجود کے باعث مستقل طور پر خوف و ہراس میں مبتلا رہنا مسلمان کے شایان شان نہیں ہے۔ ہندوستان میں یہی ایک دو جماعتیں نہیں ہیں دوسری جماعتیں بھی ہیں جن کے اغراض و مقاصد دوسرے ہیں۔ مسلم دشمنی ان کے پروگرام کی اہم ترابات نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم جارح تنظیموں کے عزائم سے تو ضرور واقف ہوں اور ان کے پیدا کردہ حالات کے تدارک کی فکر بھی کرتے رہیں مگر ان سے خائف نہ ہوں۔ دوسری جماعتیں اس وقت کمزور ہیں تو اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کے تصورات واضح نہیں ہیں۔ ان کا خلوص بھی اس درجے کا نہیں ہے جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر ان جماعتوں سے کام لے کر فرقہ پرستی کا کچھ نہ کچھ توڑ ضرور کیا جا سکتا ہے۔ فرقہ پرست جماعتیں کوئی اتنا بڑا خطرہ بھی نہیں ہیں کہ ان کی کوششوں سے مسلمان اس ملک سے فنا ہو سکیں، بلکہ میں تو یہ دیکھ رہا ہوں کہ بتدریج مسلمانوں کی ہمت بڑھ رہی ہے اور جہاں کہیں ان پر حملہ کیا جا رہا ہے وہ اب اپنے حق مدافعت کو کچھ نہ کچھ استعمال کرنے لگے ہیں اور یہ بات قانوناً یا اخلاقاً کسی طرح ناپسندیدہ نہیں کہی جا سکتی۔

ہندوستانی جماعتوں کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ وہ نام تو بڑے بڑے نظریات اور اصولوں کا لیتی ہیں مگر بڑے بڑے لیڈر مفاد پرستی میں مبتلا اور وزارتوں اور مناصب کے شوق میں سرگرداں رہتے ہیں۔ ذات پات اور فرقہ پرستی کو اقتدار حاصل کرنے کا وسیلہ بناتے ہیں اور اب تو فرقہ پرست جماعتیں بھی اسی ڈگر پر چل پڑی ہیں اور وہ بھی مال و دولت اور اقتدار کی حرص میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ مگر انہیں اب سوچنا پڑے گا کہ وہ اگر مقبولیت چاہتی ہیں تو مسلم دشمنی کی پالیسی کو ترک کریں۔ یہ جماعتیں بھی اب مسلم ووٹ کی قیمت کو زیادہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گی۔ پھر مسلمانوں کے رویے میں جو تبدیلی آ رہی ہے وہ بھی ان پر اثرانداز

ہولی اور اس مسئلے پر غور کرتے وقت یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مسلم دشمنی کے اسباب بہت گہرے ہیں اس کی نوعیت کچھ تاریخی عوامل سے وابستہ ہے۔ غلطیاں بھی ہوئی ہیں اور غلط فہمیاں بھی پھیلتی رہی ہیں اور ان کو بروقت دور کرنے کی تدبیریں نہیں کی گئیں تو اب اگر مسلمان منظم ہو کر ان تاریخی عوامل و اسباب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے چلے جائیں تو حالات میں سدھار ضرور پیدا ہوگا پھر فساد کے بعد جو خبریں اخبارات میں آتی ہیں ان سے بالعموم یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہر غیر مسلم جارح اور ظالم تھا اس نقطہ نظر میں بھی حقیقت پسندی اور اعتدال سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

فسادات میں صرف غنڈے ہی شریک نہیں ہوتے۔ بہت سے بظاہر معزز لوگ بھی اپنی لیڈری کے لیے فسادات کی آگ کو بھڑکاتے ہیں۔ غیر مسلموں کا فرض تھا کہ وہ اپنے ظالموں کا ہاتھ پکڑتے۔ بعض غیر مسلم احمدآباد میں بھی ایسے تھے جنھوں نے مسلمانوں کی جانیں بچائیں۔ اگر ایسے خیر پسند لوگوں سے روابط بڑھائے جائیں اور ان کی سوئی ہوئی انسانیت کو جگایا جائے تو یہ ایک موثر تدبیر ثابت ہو سکتی ہے۔

قومی یک جہتی کے لیے جو کوششیں حکومت اور پارٹیوں کی طرف سے کی جاتی رہی ہیں ان کے بارے میں امیر جماعت نے فرمایا کہ میں ان سے بہت زیادہ پر امید نہیں ہوں۔ ملک میں لا اینڈ آرڈر قائم رکھنے کا مسئلہ بلا شبہ حکومت کی ذمہ داری ہے اور کوئی حکومت اس بنیادی وظیفہ کو دوسروں پر نہیں چھوڑ سکتی ہمیں خوشامدانہ طور پر اور لجاجت کے ساتھ نہیں بلکہ پوری خودداری کے ساتھ حکومت کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلاتے رہنا چاہیے۔ ایک وقت آئے گا جب وہ اپنی ذمہ داری زیادہ محسوس کرنے پر مجبور ہوں گے۔

اب احمدآباد کے فساد کے نتیجے میں حکومت کے سوچنے کے انداز میں بھی کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ قومی یک جہتی کونسل نے بھی کچھ تجاویز منظور کی ہیں جس میں بہ صراحت یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ مسلمان عمومیت کے ساتھ بیرونی ملکوں سے وابستگی رکھتے ہیں۔ یہ صورت حال نئی ہے اور پرانے نقطہ نظر پر اسے ایک ارتقا کہا جا سکتا ہے۔ اس بات کی بھی تردید کی گئی ہے کہ مسلمانوں کی وفاداری مشتبہ ہے۔ چھاگلہ صاحب جس قومی دھارے کی بات کیا کرتے تھے خود مسز اندرا گاندھی نے یہ سوال کیا ہے کہ یہ قومی دھارا آخر ہے کیا؟ اب زمانہ بین الاقوامیت کا ہے اور رفتہ رفتہ بین الاقوامی نقطہ نظر پیدا ہو رہا ہے۔ یہ سوچنا کہ کسی ملک کے تمام لوگ اپنی فکر کو ملک کے مسائل تک محدود رکھیں یہ ایک مہمل بات ہے۔ ظاہر بات یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی عملی تعلق کسی بیرونی گروہ سے نہیں ہے۔ رہا فکری، جذباتی اور دینی تعلق کا معاملہ تو اس کو بھی ملک کے حدود تک محدود کر دینا

ایک بالکل غیر معقول بات ہے۔

آخری بات جس کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں یہ ہے کہ فساد کی روک تھام کے سلسلے میں جن تجاویز کا ذکر ہوا ہے ہم ان پر بالکلیہ تکیہ نہیں کر سکتے۔

ہمارا مسئلہ خود ہمارے اپنے حل کرنے ہی سے حل ہوگا۔ ان غیر مسلموں سے ربط بڑھانے کی ضرورت ہے جو فرقہ پسندوں کو شر پسند سمجھتے ہیں اور ان کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہیں۔ مگر ان کی آمادگی کو بڑھانا اور اسے منظم کرنا خود ہمارا کام ہے اسے حکومت یا اکثریت یا کسی پارٹی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ہمیں آگے بڑھ کر اہل ملک کی ہر قسم کی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہوگا۔

اور سب سے آگے بڑھ کر جو نصیحت میں آپ کو کرنا چاہتا ہوں وہ ہے توکل علی اللہ، اعتماد اور صبر و استقامت کی نصیحت یہ اہل وسیلہ ہے مگر اس کے ساتھ ہی آپ اس کے لیے بھی آمادہ ہوں کہ وقت پڑ جائے تو کم ہمتی اور بزدلی نہ دکھائیں اور نہ مایوسی اور گھبراہٹ کا شکار ہوں بلکہ پوری جرأت و پامردی کے ساتھ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں اور اپنی محافظت و مدافعت کے لیے وہ تمام تدبیریں بروئے کار لائیں جو نہ شرعاً و اخلاقاً غلط ہوں اور نہ مروجہ قانون کے خلاف۔ مسلمانوں کو نہ ظالم بننا چاہیے اور نہ بزدل۔

بعض مسلم نوجوانوں کے ذہنوں میں حالات کے دباؤ سے بعض اوقات غلط تدابیر پیدا ہونے لگتی ہیں اور وہ اپنی ناپختہ تدابیر پر اصرار کرنے لگتے ہیں۔ اس طرز فکر کو سہارا اس بات سے بھی ملتا ہے کہ خود اکثریت کے کچھ لوگ اسی طرح کی تدابیر اپناتے ہیں۔ مسلمان نوجوان بھی بعض اوقات تشدد کا جواب تشدد سے بم کا جواب بم سے دینے کی سوچتے ہیں۔ مگر آپ سے کہوں گا کہ اگر دوسرے اس طرح سوچتے ہیں تو انہیں سوچنے دیجیے۔ آپ انتقامی جذبے سے مغلوب نہ ہوں۔ اس طرح کی تجاویز نہ خود مسلم نوجوانوں کے لیے ذاتی طور پر مفید ہو سکتی ہیں نہ ملت کے لیے۔ میں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ ایسی تدابیر جن کا اثر ظالم و مظلوم مجرم و بے قصور سب پر یکساں پڑے ہر طرح نامناسب اور غلط ہیں

پھر میں اس بات کو بھی غلط سمجھتا ہوں کہ مسلم نوجوان بھی آر ایس ایس قسم کی عسکری تنظیمیں کھڑی کریں۔ ایسا کرنا ناقابل عمل بھی ہے اور انتہائی نقصان دہ بھی۔ ضرورت ہے کہ ہم ٹھنڈے دل سے حالات پر غور کریں، حکمت، محبت شفقت، احسان، مواسات کے ذریعے حالات کو بدلنے کی جدوجہد میں لگ جائیں۔ حالات بالآخر بدل کر رہیں گے

یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنے کی ہے کہ فسادات کے سلسلے میں جو تدبیریں بتائی گئی ہیں وہ مفید ہیں۔ مگر بنیادی

مسئلہ یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی اصل حیثیت کیا ہے۔ کیا وہ دیگر فرقوں گروہوں اور قوموں کی طرح ایک قوم ہیں اور ان کا کام صرف اپنی حفاظت اور اپنے لیے مفادات کا حصول ہے۔ ایسا نہیں ہے آپ اخلاق کے نگہبان حقوق کے پاسبان اور عدل وانصاف کے قائم کرنے والے ہیں جس ملک میں عدل وانصاف کا جنازہ نکل رہا ہے وہاں آپ ان اصولوں کے پاسبان ہیں۔ آپ کا اصل کام شہادت حق ہے، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے آپ نے اپنی اس اصلی حیثیت کو پہچانا تو آپ دیکھیں گے خوف وہراس آپ کے دلوں سے کافور ہو جائے گا۔ مایوسی امیدوں سے بدل جائے گی۔ خدا کی ذات تمام قوتوں کا سرچشمہ ہے۔ کائنات کی اصل باگ ڈور اس کے مضبوط ہاتھوں میں ہے۔ آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ وہ مالک الملک ہے جسے چاہتا ہے اقتدار کی مسند پر بٹھاتا ہے اور جسے چاہتا ہے چشم زدن میں اس سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے قوت و عزت بخشتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل ورسوا و بے سہارا بنا دیتا ہے۔ اگر آپ اپنے اندر ضروری تبدیلیاں پیدا کرلیں اور اپنے اصل مقاصد کے لیے جدوجہد شروع کر دیں تو اس کا اچھا اثر پورے ملک پر پڑے گا۔ اکثریت کا نقطہ نظر بھی بدلے گا۔ خیر پسندوں کی تعداد بڑھنے لگے گی اور آپ کے اچھے اثرات متعدی ہونے لگیں گے بس ستی ہو کر اعلیٰ کام میں لگ جانے کی ضرورت ہے۔

اگر آپ اپنا منصب پہچان لیں اور اس کے لیے کوشاں ہو جائیں تو خود وہی اکثریت جو بظاہر آپ کی دشمن نظر آتی ہے۔ بالآخر آپ کو سر آنکھوں پر بٹھائے گی۔ ملک میں اس وقت زبردست نظریاتی کشمکش جاری ہے آپ کو یقین ہے کہ اسلام ایک برتر نظریہ اور نظام زندگی ہے۔ انسانی فطرت اور عقل کے مطابق ہے دنیا اور دنیا کے تمام مسائل ومشکلات کا بھی حل ہے اور اس کی پیروی میں نجات اور ثواب ہے تو یاد رکھیے کہ محض یقین کافی نہیں عمل کی ضرورت ہے۔ جدوجہد اور سرگرمی دکھلانے کی ضرورت ہے۔ اللہ کا وعدہ مشروط ہے۔

اگر ہم اپنا نظریہ یہی متعین کریں کہ ہم دین ہی کی خاطر جیتے اور مرتے ہیں تو اللہ کی نصرت اور تائیدیں ضرور حاصل ہوں گی کیونکہ باری تعالیٰ کی غیرت جوش میں آئے گی اور آپ وما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید میں نصرت کا جو وعدہ پوشیدہ ہے آپ اس کے مستحق بن جائیں گے اور ظالموں کا وہی انجام ہوگا جس کا ذکر ماسبق اور مابعد کی آیات میں کیا گیا ہے۔

ہم اس ملک کو یہ یاد دلانا چاہتے ہیں کہ اب تک ساری توجہات کا مرکز مادی ترقی رہی ہے۔ حالانکہ

انسان صرف جسم نہیں جسم و روح کا مرکب ہے اس کی روحانی اور اخلاقی ضروریات بھی اتنی ہی اہم ہیں اس وقت ملک میں ایک نظریاتی خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ پرانی قدریں رخصت ہو رہی ہیں اور نئی قدروں نے اعتماد حاصل نہیں کیا ہے ملک کو ایک متوازن نظام زندگی کی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے کہ اس خلا کو اسلام کے ذریعے پُر کیا جائے جس سے زندگی کے ہر گوشے پر واضح روشنی پڑتی ہے تو کوئی ہے جو اس نظام زندگی کا تعارف کرائے۔ لوگ تلاش کر رہے ہیں ضرورت ہے کہ وہ آنکھیں کھول کر تلاش کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ملک کا نظریاتی خلا اسلام کے ذریعے بخوبی پُر کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں میں اپنے لیے اور آپ سب کے لیے دعائے خیر کرتا ہوں۔   والسلام

(بقیہ صفحہ ۴۵) میں عہد رفتہ کو واپس لانا چاہتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ کسی وقت اس علاقے پر حملہ کر بیٹھے۔ ہاں ایک شعاع امید ہے کہ نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد اشتراکی فتنے اور یہودی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس سرزمین کو تمام فتنوں سے محفوظ رکھے آمین!
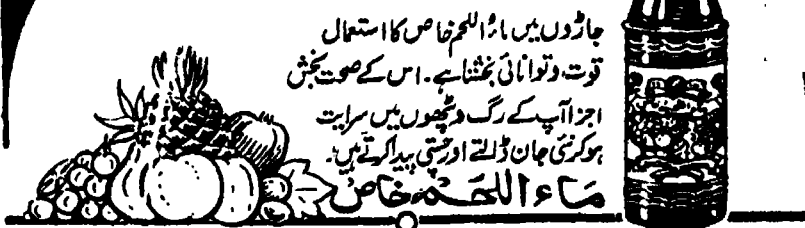
ارتقاءِ آدم

ڈاکٹر احسان اللہ خاں، شعبۂ ارضیات، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

گزشتہ مارچ ۶۹ء میں اسٹوڈنٹس یونین کی جانب سے اسلامی ہفتہ منایا گیا جن میں چند ایسے مقالے بھی پڑھے گئے جن میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی تھی کہ "اسلام میں انسانی رفعت کا تصور کیا ہے"۔ تبصرے کے دوران اسلامی نقطۂ نظر کی ترجمانی پر کافی اختلاف کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد صحیح موقف معلوم کرنے کی غرض سے مئی میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب کے مکان پر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کی صدارت میں یونیورسٹی کے ایک درجن سے زائد اسلام پسند اساتذہ نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور حسب ذیل نقطہ ہائے نظر ابھر کر سامنے آئے۔

۱۔ قرآن کریم کے وہ تمام جملے یا فقرے جن میں تخلیق آدم کا تذکرہ آتا ہے ان سے عربی لغت و قواعد کو ملحوظ رکھتے ہوئے محض تخلیق مخصوص (SPECIEL CREATION) ہی کا مفہوم نہیں نکلتا ہے بلکہ ان بیانات میں اس بات کی بھی پوری گنجائش پائی جاتی ہے کہ اللہ نے انسان کو بنانے کا کام اس تدریج کے ساتھ کیا ہو جس کی تفصیل نظریہ ارتقاء نے پیش کی ہے

۲۔ چونکہ ارتقاء ایک مشاہداتی حقیقت ہے جس کو نظریہ سے موسوم کرنا غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ لہذا قرآن کریم کے ان تمام جملوں یا فقروں کا جو خلق آدم سے متعلق ہیں ارتقائی مفہوم لینا چاہیے اور تخلیق مخصوص کے نظریے پر جو مشاہداتی حقیقت کے خلاف ہے کھل کر تنقید کرنی چاہیے۔

آخر میں مولانا نے اپنے صدارتی فرض کو انجام دیتے ہوئے دوسرے نقطہ نظر کی حمایت کی۔

ارتقاء حقیقت یا نظریہ

زمین میں تین قسم کی چٹانیں پائی جاتی ہیں۔ غیر تہ والی چٹان۔ تہ والی چٹان۔ اور ان دونوں سے

تبدیل شدہ چٹان۔ تہ والی چٹانوں میں جانداروں کے ڈھانچے، سانچے اور دوسرے نشانات ہوتے ہیں جن کو فاسل (FOSSIL) کہا جاتا ہے۔ کسی ایک تہ میں پائے جانے والے فاسل اس کے قبل کی تہ میں واقع فاسل سے ترقی یافتہ اور اس کے بعد والی تہ کے فاسل کے مقابلے میں غیر ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ اس ارتقاء کا سلسلہ تقریباً .. ملین سال قبل شروع ہوا اور سالہا سال کے مسلسل مشاہدے کے بعد یہ ایک مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ حضرت آدم (HOMOSAPIENS) زمانہ قدیم کے غیر ترقی یافتہ جانوروں سے ارتقاء کرکے تقریباً پچاس ہزار سال قبل اس سرزمین پر موجودہ شکل وصورت میں وارد ہوئے۔

اختلافی مسئلہ محض یہ ہے کہ حضرت آدم کس طریقہ ارتقاء (MECHANIS MOFEVOLUTION) سے قدیم جانوروں سے ترقی کرکے وجود میں آئے۔ اس کو دریافت کرنے کے لیے سائنس دانوں نے کافی تجربے اور مشاہدے کیے مگر اب تک کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں ہوسکا جو یہ ثابت کرسکے کہ اس یا ان طریقوں سے ایک (SPECIS) اس کے قبل کے قریب ترین (SPECIS) سے عالم وجود میں آئی۔

سائنسی تجربے اور مشاہدے کے علاوہ بہت سی قیاس آرائیاں بھی کی گئی ہیں جن کو نظریہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ ایسا میدان ہے جو اب تک سائنسی تجربے کے حدود سے باہر ہے اور یہیں پر مختلف زمانوں میں لفظی اور استدلالی جنگ لڑی گئی ہے۔ یہ میدان اب بھی اہل فلسفہ کے لیے ویسا ہی کھلا ہوا ہے بہرحال چند نظریے مختصراً ذیل میں لکھے جارہے ہیں

بفن (BUFFON, 1707-88) یہ وہ دور تھا جب کہ تخلیق کا نظریہ بالکل چھایا ہوا تھا اور اس کے خلاف کوئی دوسرا نظریہ کھلے طور پر پیش کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ لہذا بفن نے دبی زبان میں اس کے خلاف لکھنے کی جرأت کی۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ نظریہ تھا کہ ماحول جانوروں اور پودوں کی ظاہری صورت کو بدل دیتا ہے اور یہ بدلی ہوئی صورت وراثۃً منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اس تبدیلی میں انفرادی کوشش کا بھی دخل ہے۔

اراس ماس ڈارون (E. DARWIN, 1731-1802) جو چارلس ڈارون کے دادا تھے ان کا یہ نظریہ تھا کہ حالات سے مجبور ہوکر انفرادی کوشش ہی ترقی یافتہ تبدیلی کی ذمہ دار ہے۔

لیمارک (LAMARCK 1744-1829ء) یہ اپنے زمانے کے مانے ہوئے فطرت داں تھے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ پودوں میں کوئی ارادہ نہیں ہوتا ہے لہذا ماحول کے مطابق تبدیلی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مگر جانوروں میں ماحول کے دباؤ سے خود بخود تبدیلی نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں انفرادی کوشش کا بھی دخل ہے۔

سینٹ ہلیر (ST. HILAIR 1772-1844ء) ان کا نظریہ یہ تھا کہ ترقی یافتہ جاندار دوسرے غیر ترقی یافتہ دھیرے دھیرے نسلاً بعد نسل وجود میں نہیں آئے ہے بلکہ یہ تبدیلی بیک جست ہوتی ہے۔

چارلس ڈاروِن (C. DARWIN 1859-82ء) ان کی شہرت ارتقاء کو ایک حقیقت کی شکل دینے سے ہوئی۔ مگر ان کا فطری انتخاب کا نظریہ ارتقاء کی گتھی (مکنزم آف ایوولوشن) کھولنے سے قاصر رہا۔

بعد میں نیولیمارکزم (NEO-LAMAR KISM) اور نیو ڈاروینزم کے نام سے دو اور نظریے پیش کیے گئے مگر یہ بھی زیادہ مؤثر ثابت نہ ہو سکے۔

ارتقاء کی مخالفت کیوں؟

ارتقاء کی اصل شکل انیسویں صدی کے وسط میں کافی اجاگر ہو رہی تھی اور جو تھوڑی بہت کمی تھی، اس کو ڈاروِن کی کتاب (ORIGIN OF SPECIES) نے دور کر دیا تھا۔ مگر یہ حقیقت عیسائی علماء کی ترجمانی کے مطابق تورات کے خلاف تھی۔ لہذا عیسائی علماء نے اس کی کھل کر مخالفت کی جو اکثر مناظروں کی صورت اختیار کر گئی۔ ان مناظروں میں (T. H. HUXLEY اور SAMUEL) کا مناظرہ جو 1860ء میں منعقد ہوا کافی مشہور ہے۔ 1909ء

اس مناظرے میں عیسائی عالم نے کافی جذباتی اور غیر شائستہ الفاظ استعمال کیے اس کے برخلاف ایک ابھرتی ہوئی طاقت کا اصول اپناتے ہوئے (ہکسلے) نے بہت ہی مدلل طریقے سے ارتقاء کی حقیقت کو پیش کر کے ذہین طبقے کے ذہن کو مسخر کر لیا اس کا بہت ہی دور رس نتیجہ برآمد ہوا اور ذہین طبقہ روز بروز مذہب سے بدظن ہونے لگا۔ اور ارتقاء کی حقانیت مسلسل مقبول ہونے لگی۔

یہ صورت حال دیکھ کر اکثر عیسائی علمار نے اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی بلکہ CARDI-MAL MANHEW نے خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کی۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد عیسائی علمار نے ارتقائی حقیقت کو مان لیا مگر حضرت آدم اور ان کی روح کے متعلق تخلیق مخصوص پر بضد رہے

جو ارتقار کی حقیقت ماننے کے بعد بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے۔

شاید اس کے بعد کوئی ایسا عیسائی عالم نہیں ہوا جو اس مسئلے کو اور آگے بڑھا سکتا اور عیسائیت کو ارتقار کی حقیقت ماننے کے بعد مذہبی نقطۂ نظر سے صحیح شکل دے سکتا۔

مشرقی ملکوں میں مغربی علوم کے ساتھ ساتھ مذہب اور سائنس کا ٹکراؤ بھی آیا۔ مشرقی علمار جو دینیات اور فلسفے کے بڑے ماہر ہوتے ہیں مگر عموماً سائنس سے نابلد بھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے ذہنوں کو عیسائی علمار کی لفظی اور استدلالی بہت بھائی اور ارتقار کی حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔ لہٰذا ان علمار نے ارتقا کی حقیقت کو اس کے طریقے (میکنزم آف ایوولوشن) کے نظریے سے خلط ملط کر دیا اور مجموعی طور سے ارتقار کے طریقے کا انکار کرنے کے ساتھ ساتھ ارتقار کی حقیقت کا بھی انکار ہی نہیں بلکہ کھل کر مخالفت شروع کر دی۔ اس کا جو نتیجہ ہونا چاہیے وہ سامنے ہے۔

صحیح موقف

ارتقار ایک مسلمہ حقیقت ہے اس کی مخالفت خواہ کسی مقصد سے کی جائے خود اس مقصد کی جڑ کھودنے کے مترادف ہے۔

انیسویں صدی میں مندرجہ بالا حقیقت تسلیم کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ تمام عالم خود بخود وجود میں آگیا اور اس کا کوئی خالق نہیں۔ مختلف دلائل (جو سائنسی تجربے اور مشاہدے کے حدود سے باہر ہیں) کے زور سے اس کی خوب اشاعت کی گئی۔ اس کے برخلاف عیسائی علمار نے حقیقت ارتقار ہی کی مخالفت میں تمام زور صرف کر کے ذہین طبقے کو اپنے خلاف کر لیا اور بعد میں دوسرے مذاہب کے علمار بھی حقیقت سے صرف نظر کر کے عیسائی علمار کی تقلید کرتے رہے۔ مگر اس دور میں ارتقار کی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا رہا ہے کہ تمام عالم میں جو بہترین نظم و ضبط پایا جاتا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا کوئی خالق ہے

اگر یہ موقف عیسائی علمار نے ابتدا ہی میں اختیار کیا ہوتا تو شاید موجودہ دنیا کی بے خدا سوسائٹی اس حد تک بے لگام ہو کر دنیا میں اتنی تیزی سے ابتری پھیلا کر اس قدر جلد اس نوع انسانی اپنے سیز کو نماتے (اکس ٹنکشن) کے کنارے تک نہیں پہنچا سکتی تھی۔ بہرحال موجودہ رجحان سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انسانیت کی خدمت کی جا سکتی ہے۔

زندگی

ہمارے دوست جناب احسان اللہ خاں صاحب نظریہ ارتقا کے اسپلسٹ ہیں لیکن انھوں نے یہ مختصر مضمون محض سرسری طور پر شاید قلم برداشتہ لکھ دیا ہے۔ اس مضمون میں یہ بھی واضح نہیں ہے کہ وہ مشاہداتی حقیقت کس چیز کو کہہ رہے ہیں۔ ایک چیز تو یہ ہے کہ جاندار مخلوقات میں ارتقار کا مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ یعنی جاندار مخلوقات میں ادنیٰ ترین مخلوق بھی پائی جا رہی ہے، مثلاً امیبا اور اعلیٰ ترین مخلوق بھی پائی جا رہی ہے مثلاً آدمی — دوسری چیز یہ ہے کہ آدمی امیبا سے درجہ بدرجہ ترقی پا کر انسانیت کی منزل تک پہنچا ہے اور اس کے قریب ترین آبا و اجداد بندر یا لنگور ہیں۔ اگر وہ پہلی چیز کو مشاہداتی حقیقت کہتے ہیں تو اس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ سبھی لوگ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور اگر وہ دوسری چیز کو جو زیر بحث اور متنازع فیہ ہے مشاہداتی حقیقت کہہ رہے ہیں تو اس کی تردید خود ان کے اس مختصر مضمون میں بھی موجود ہے اور آج تک کسی نے یہ نہیں کہا کہ اس نے بندر یا لنگور یا کسی اور جانور سے انسان بنتے دیکھا ہے اور جب کسی نے یہ مشاہدہ نہیں کیا کہ سب سے پہلا انسان کسی مادہ بندر کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا یا کوئی لنگور کسی دن اچانک انسان کی شکل میں متشکل ہو گیا تھا تو پھر اسے مشاہداتی حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ زمین میں ادھر ادھر دبی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ انسان کسی جانور کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ ایک نظریہ تو ہو سکتا ہے لیکن اس کو مشاہداتی حقیقت نہیں کہہ سکتے۔ پتہ نہیں کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی جیسے عالم دین اور معلم نے جس موقف کی تائید کی ہے اس کا مطلب کیا ہے۔

جن اسلام پسند اساتذہ کی طرف اس مضمون میں پہلا موقف منسوب کیا گیا ہے اور ان کی طرف سے جو بات کہی گئی ہے وہ کسی حد تک اس وقت صحیح ہوتی جب نظریہ ارتقار صرف طریقہ تخلیق کا نام ہوتا۔ اگر سوال صرف اتنا ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو کس طرح پیدا کیا؟ آیا اس طرح کہ ان کا خاکی پتلا بنا اور پھر اس میں روح پھونک

دی گئی یا اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا جرثومہ حیات پیدا کیا جو ایک خاص مدت میں پرورش پاتا اور ترقی کرتا ہوا انسان بن گیا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ ممکن ہے اللہ نے تخلیق آدم میں دوسرا طریقہ اختیار کیا ہو لیکن سب جانتے ہیں کہ چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں سب سے پہلے جرثومہ حیات سے لے کر منزل انسانیت تک کے کسی مرحلے میں اللہ کی تخلیق اور اس کے ارادے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس نظریے کے اساتذہ نے صاف صاف کہا ہے کہ سب سے پہلا جرثومہ حیات بغیر کسی خالق کی تخلیق کے آپ سے آپ وجود میں آیا تھا اور پھر کسی خالق کی تخلیق اور اس کے ارادے کے بغیر، خالص مادی عوامل کے تحت وہ مختلف جانوروں کی شکل اختیار کرتا ہوا انسانیت کی منزل تک پہنچا ہے۔ کیا کوئی ذی علم اور مخلص مسلمان تصور بھی کر سکتا ہے کہ تخلیق آدم سے متعلق آیات قرآنی میں اس نظریے کی گنجائش موجود ہے؟ اور یہ کہ انسان کے بارے میں ڈارونی نظریہ ارتقاء بھی صحیح ہو سکتا ہے؟

جو اسلام پسند اساتذہ نظریہ ارتقاء کو مذہب کے خلاف نہیں سمجھتے، شاید ان کے نزدیک بحث صرف اتنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو ان کے خاکی پتلے میں روح پھونک کر پیدا کیا تھا یا اس نے بتدریج انسان کی شکل تک پہنچایا اگر وہ بتدریج انسانی شکل تک پہنچے تھے تو بس یہی نظریہ ارتقاء ہے اور اس کی گنجائش قرآن کی آیتوں میں موجود ہے۔ معلوم نہیں نظریہ ارتقاء کے بارے میں وہ خود غلط فہمی میں مبتلا ہیں یا دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں۔ اسے ہم لطیفہ کہیں یا ستم ظریفی کہ جس نظریے میں کسی علیم و حکیم خدا کی کہیں ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہمارے اسلام پسند اساتذہ اس کی تعریف و تشریح اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع کرتے ہیں۔ آخر میں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ راقم الحروف چارلس ڈارون اور اس جیسے دوسرے سائنس دانوں کے ایجاد کردہ نظریہ ارتقاء کو مذہب کے خلاف سمجھتا ہے۔ اس نظریہ ارتقاء کو مذہب کے خلاف نہیں سمجھتا جسے کچھ اسلام پسندوں نے بطور خود ایجاد کر لیا ہے۔

فاضل مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں بار بار لکھا ہے کہ ارتقاء ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ اگر اس سے مراد زیر بحث نظریہ ارتقاء ہے تو میں اس "حقیقت" کو نہ ماننے والوں کی لمبی فہرست پیش کرنے کے بجائے یہاں صرف اتنا لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ حیاتیات میں یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسا سیاسیات میں یہ دعویٰ کہ سیاست سے مذہب کی علیحدگی ایک مسلمہ حقیقت ہے اور عقائد کی بحث میں منکرین خدا کا یہ دعویٰ کہ خدا کی عدم موجودگی ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

وادیٔ حرم میں

جدہ ایئرپورٹ زیادہ خوبصورت اور وسیع نہ سہی، ہے بین الاقوامی اہمیت کا حامل ۔ ایشیا، افریقہ اور یورپ کے ممالک سے آنے والے ہوائی جہاز سعودی مملکت کی حدود میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے اس ہوائی اڈے پر اترتے ہیں اور کچھ دیر توقف کرکے اپنی منزل کی راہ لیتے ہیں۔ حج کے زمانے میں تو جیسے ہوائی جہازوں کی قطار لگ جاتی ہے اور بعض اوقات اس ٹریفک کو کنٹرول کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ مملکت سعودیہ اس دشواری کے مکمل سدباب کے لیے ایک نیا ایئرپورٹ تعمیر کر رہی ہے جو اپنی گنجائش اور دلکشی میں بے مثال ہوگا۔ خود جدہ کے شہر نے بھی اپنی پرانی کینچلی مدت ہوئی اتار پھینکی ہے۔ اب کشادہ سڑکوں اور خوشنما عمارتوں کا سلسلہ چاروں طرف پھیلا ہوا نظر آتا ہے۔

مکہ معظمہ میں

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ۱۵ اکتوبر کو ظہر کے وقت جدہ کے ہوائی اڈے پر اترے تو رابطہ کے وفد اور پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ مولانا محترم دو سال کے وقفے کے بعد تشریف لائے تھے۔ اس لیے لوگوں کے جوش و خروش اور محبت کا عجب عالم تھا۔ مکہ معظمہ میں رابطہ کا اجلاس ۱۴ اکتوبر سے شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے جدہ میں دو تین گھنٹے قیام کے بعد آپ بذریعہ کار اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ احرام کی درویشانہ ہیئت اور حدود حرم میں داخل ہونے کا احساس عجیب رنگ دکھا رہا تھا۔ مولانا کی زبان سے ادا ہونے والی تلبیہ کا آہنگ بلند ہوتا تو سکون آمیز ماحول میں عشق حقیقی کی سحر آفریں خوشبو مچل جاتی تھی۔ مولانا محترم نماز مغرب سے کچھ پہلے مکہ میں داخل ہوئے اور شوبرا ہوٹل میں چند گھنٹے آرام فرمانے کے بعد حرم میں تشریف لے گئے۔ حرم پاک میں یوں تو کوئی وقت ایسا نہیں ہوتا جب یہ اللہ کے بندوں سے خالی ہو لیکن عصر، مغرب اور عشاء کی نماز وں میں خاص گہماگہمی ہوتی ہے۔ اہل مکہ زمانہ قدیم سے اس دستور کے پابند چلے آ رہے ہیں کہ وہ عصر کے بعد بیت اللہ کا رخ

کرتے ہیں۔ وعظ ونصائح کی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں اور مغرب وعشاء کی نمازیں پڑھ کر اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں۔ کہ معظمہ کا ہر نمایاں آدمی ان اوقات میں آپ کو حرم کی چہار دیواری میں ملے گا۔ یہیں ملاقاتیں ہوتی ہیں اور بچھڑے ہوئے دوست ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ مولانا محترم بیت اللہ میں داخل ہوئے تو فوراً ہی آپ کی آمد کا چرچا ہو گیا اور ملنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

مغرب وعشاء کے درمیان مولانا نے عمرہ ادا کیا۔ کمزوریٔ صحت کی بنا پر سات مرتبہ طواف ممکن نہ ہوا اور ان طوافوں کے درمیان دو مرتبہ ٹھیرنا پڑا۔ کیفیت یہ تھی جیسے اس مشقت نے آپ کو بے حال کر دیا ہو۔ مولانا اب تک نہ جانے کئی مرتبہ عمرہ وحج کا یہ فریضہ ادا کر چکے ہیں۔ لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ ضعف کے ہاتھوں مجبور ہو گئے تھے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی تو اور بھی مشکل مرحلہ ہے۔ مولانا نے یہ فریضہ ایک چھوٹی سی گاڑی میں بیٹھ کر ادا کیا۔

رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس

مولانا محترم رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے بطور خاص تشریف لائے تھے۔ اس لیے اگلے دن (یعنی ۱۶ اکتوبر) سے آپ اجلاس کی کارروائی میں حصہ لینے لگے۔ اس دفعہ رابطہ کے اجلاس زیادہ جوش وخروش پایا جاتا تھا۔ ہاں کئی نمائندوں کی غیر موجودگی بھی کھٹک رہی تھی۔ شام کی حکومت نے رابطہ کے نمائندے کو جانے کی اجازت نہیں دی تھی اور عراق کی نمائندگی بھی ایک ایسے صاحب کر رہے تھے جو سعودی عرب میں غریب الوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ایک آدھ افریقی ممالک کے نمائندے بھی غیر حاضر تھے۔

رابطہ کی مجلس کل ۴۰ ارکان پر مشتمل ہے اور انہی ارکان پر مشتمل ثقافت اسلامیہ کمیٹی، اقلیات اسلامیہ کمیٹی اور مالیات کمیٹی ہیں، جو متعلقہ مسائل پر اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ کرتی ہیں اور جنرل کونسل کی میٹنگ میں ان کے فیصلوں کی توثیق کی جاتی ہے۔ اس دفعہ ثقافت اسلامیہ کمیٹی اور اقلیات اسلامیہ کمیٹی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا محترم نے جنرل کونسل کے اجلاس میں سات فل اسکیپ صفحات پر مشتمل ایک مفصل اور پُراز معلومات رپورٹ پیش کی تو شرکائے اجلاس کے جذبات کا عجب عالم تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے تھے اور ہر شخص اظہار جذبات کے لیے بے چین نظر آتا تھا۔ مصر کے سابق مفتی شیخ حسنین مخلوف نے پرجوش انداز میں کہا:-

"میرے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہاں کے مسلمان ان حالات سے گزر رہے ہیں۔ یہ

حالات تو قرونِ وسطیٰ کے مظلوم مسلمانوں کے حالات سے بھی چند قدم آگے معلوم ہوتے ہیں۔ مصر کے اخبارات میں ہانگ کانگ فسادات کی ایک آدھ خبر چھپتی ہے تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ دو گروہوں میں معمولی سا تصادم ہوگیا ہے لیکن اس رپورٹ نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں اور اعداد و شمار خود اپنی زبان سے یہ بتا رہے ہیں کہ وہاں باقاعدہ مسلمانوں کی نسل کشی کے پروگرام پر عمل ہو رہا ہے۔ یہ رپورٹ ایسی ہے کہ اسے تمام اسلامی ممالک میں بھیجنا چاہیے۔"

روسی مہاجرین کے نمائندے شیخ سعید شامل مقیم کا کیشیا نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے توجہ دلائی کہ عرب ممالک شاید اس ملک کی دوستی کی خاطر مسلمانوں کے اس قتلِ عام پر لب کھولنے سے گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ اس ملک کی دوستی نہ دنیوی لحاظ سے کوئی اہمیت رکھتی ہے اور نہ دینی لحاظ سے اس کی کوئی حقیقت ہے۔ یہ ایک بے اصل دوستی ہے۔ عرب ملکوں کو بلا تاخیر اس پر نظرِ ثانی کرنی چاہیے۔

مفتیِ اعظم فلسطین حضرت شیخ امین الحسینی نے کہا:۔

"دنیا میں ایک یہودی قتل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے شور سے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں لیکن ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ بس ملک میں پوری مسلمان قوم قتل کی جا رہی ہے اور ہماری آنکھیں بند ہیں۔"

ترکی کے نمائندے نے یہ تجویز پیش کی کہ سعودی حکومت اس مسئلے کو حقوقِ انسانی کی بین الاقوامی کمیٹی میں اٹھائے

مولانا محترم نے اس رپورٹ میں حکومتی اور اخباری سطح پر بدترین مظالم کی مذمت اور وہاں ایک وفد بھیجنے کی جو تجاویز پیش کی تھیں انھیں اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا گیا اور طے پایا کہ اقلیات اسلامیہ کمیٹی ان تجاویز پر عمل درآمد کا پروگرام بنائے گی۔ مولانا کی یہ رپورٹ اشاعتِ عام کے لیے پریس کو بھیجی جا چکی ہے اور بیروت کے کثیر الاشاعت پرچے "المجات" میں اس کا ملخص آ گیا ہے۔ اشتراکی پریس تو ضرور اس کی اشاعت سے گریز کرے گا لیکن مسلمان اخبارات میں وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کی توقع ہے۔

رابطہ کے اجلاس کا دوسرا اہم موضوع مسئلہ فلسطین تھا۔ شرکائے اجلاس نے رباط کانفرنس پر اظہارِ اطمینان کرتے ہوئے "اسلامی اتحاد" کے عملاً قائم ہونے پر زور دیا اور یہ طے پایا کہ رابطہ کا وفد تمام اسلامی ملکوں کا دورہ کرے گا۔ جن ممالک نے رباط کانفرنس میں شرکت نہیں کی تھی انہیں آئندہ کانفرنس میں شریک ہونے پر آمادہ کیا جائے گا اور جو پہلی کانفرنس میں شریک ہو چکے ہیں ان پر زور دیا جائے گا کہ وہ جلد از جلد کوئی اور مثبت قدم اٹھائیں۔ مولانا محترم اس سے قبل اتحادِ اسلامی کے سلسلے میں تیرہ چودہ تجاویز پر مشتمل ایک خاکہ پیش کر چکے ہیں۔

وفد اس حیثیت کو بھی پیش نظر رکھے گا۔ گزشتہ سال کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ رابطہ فدائین فلسطین کی اخلاقی تربیت سے بھی غافل نہیں ہے۔ ان میں قرآن مجید کے نسخے اور مسئلہ فلسطین کی تاریخ کثیر تعداد میں پھیلائے گئے ہیں۔

اجلاس میں انڈونیشیا اور پاکستان میں عربی زبان کی تدریس کے مراکز کھولنے کی تجویز بھی زیر بحث آئی۔ حرم شریف کی توسیع کے سلسلے میں سعودی حکومت کی کوششوں کو سراہا گیا۔ یہ توسیعات رابطہ کے مشورے کے مطابق عمل میں آ رہی ہیں۔ ریڈیو صوت الاسلام کے پروگراموں میں اسلامی نظریات کی مزید گنجائش اور ایک اسلامی نیوز ایجنسی کے قیام کے بارے میں بھی گزشتہ سال کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ ابھی یہ کوشش کسی نتیجہ خیز مرحلے تک نہیں پہنچ سکی ہے اور حکومت سعودیہ سے اس مسئلے پر گفتگو ہو رہی ہے۔ خلیج عقبہ کی ۹ ریاستوں کے الحاق اور ان میں اسلامی دستور کے نفاذ کے سلسلے میں بھی رابطہ کی ایک رپورٹ پیش ہوئی۔

رابطہ کے یہ اجلاس ۲۳ اکتوبر تک جاری رہے اور اس دوران میں عام لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ چودھری محمد علی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ مولانا کے پہنچنے کے چار پانچ دن بعد تک مکہ میں مقیم رہے۔ پاکستانی سفیر بھی مولانا سے ملنے کے لیے جدہ سے تشریف لائے۔ علامہ سعید علال الفاسی مراکش کے ممتاز دینی رہنما اور اپوزیشن لیڈر ہیں۔ مراکشی سفارت خانے نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا مولانا محترم بھی اس میں ایک معزز مہمان کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ واضح رہے کہ تمام غیر ملکی سفارت خانے جدہ میں ہیں۔ اس لیے اس دعوت کے سلسلے چند گھنٹوں کے لیے مکہ سے خلاف پروگرام جدہ جانا پڑا۔

مدینہ طیبہ میں

۲۳ اکتوبر کی شام کو مولانا محترم مکہ سے بذریعہ کار مدینہ طیبہ روانہ ہوئے اور وادی فاطمہ کے نئے راستے سے اپنے مقام پر پہنچے۔ جنرل عبدالحمید خاں کی قیادت میں سعودی عرب کا دورہ کرنے والا پاکستانی فوجی وفد بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ جہاں مولانا قیام پذیر ہوئے، اور اس طرح یہ ہوٹل دو دن تک مرجع خاص و عام بنا رہا۔ مدینہ طیبہ میں مقیم پاکستانی باشندوں کا جوش قابل دید تھا۔ وہ بار بار مولانا سے پاکستان کے حالات دریافت کر رہے تھے اور اس بات کا اظہار کر رہے تھے کہ وہ پاکستان میں برپا ہونے والی حق اور باطل کی کشمکش میں غیر جانبدار نہیں رہ سکتے۔ ان کے دل اسلامی تحریک کے ساتھ ہیں اور اگر ضرورت پڑی تو وہ وطن واپس جا کر اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے اپنی جانیں بھی قربان کر دیں گے

عرب ممالک میں فوجی انقلابات اور آئے دن خفیہ سازشوں کا جو چکر چل رہا ہے اس سے اسلام پسند عرب

نوجوان سخت مضطرب نظر آتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ وہ بھی ان بادشاہوں کے جواب میں ایسا ہی طریقہ اختیار کریں۔ مدینہ طیبہ میں نوجوانوں کے ایک گروہ نے مولانا محترم سے اسی مسئلے پر گفتگو کی اور اجازت چاہی کہ وہ انہیں خفیہ تنظیمیں قائم کرنے کی اجازت دیں تاکہ ملحد و بے دین عناصر کا سدباب کیا جا سکے۔ مولانا محترم نے انہیں نہایت محبت سے سمجھایا کہ اس طریقے سے آیا ہوا انقلاب کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور انقلاب در انقلاب کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کا مزاج عوامی اور جمہوری ہوا کرتا ہے۔ وہ پہلے عوام کی اصلاح و تربیت کرتی ہیں۔ پھر ان کی تائید سے حکومت کے نظام میں تبدیلی لاتی ہیں۔ آپ لوگوں کو بھی اس طریق کار سے ہٹ کر کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

مولانا محترم کے دلائل سے وہ لوگ مطمئن ہو کر واپس گئے۔ ۲۴ر اکتوبر کو جمعہ کا دن تھا۔ مولانا محترم نے نماز جمعہ مسجد نبویؐ میں ادا کی۔ اور وہاں بھی ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہا۔

۲۵ر اکتوبر کی صبح کو آپ مدینہ سے جدہ روانہ ہوئے اور وہاں ۲۸ر اکتوبر کی شام تک مقیم رہے

جدّہ میں اس طرح اہل جدہ کے تمام گلے شکوے دور ہو گئے۔ پاکستانی باشندوں اور عرب دوستوں کی ملاقات کا سلسلہ آخر وقت تک ختم ہونے میں نہ آیا۔ یہاں بھی پاکستانی فوجی وفد کا اسی ہوٹل (جدہ پیلس) میں قیام رہا جہاں مولانا محترم ٹھہرے ہوئے تھے۔

۲۵ر اکتوبر کو ہی پاکستانی سفارت خانے نے فوجی وفد کے اعزاز میں ایک عشائیہ دیا۔ مولانا محترم اور چودھری محمد علی بھی اس میں مہمانان خاص کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ مولانا محترم پاکستانی سفارت خانے کی دعوتوں میں پہلے بھی شریک ہوتے رہے لیکن اس دفعہ اس کا تاثر زیادہ خوش گوار تھا اور اہل عرب بھی محسوس کر رہے تھے کہ موجودہ حکومت کا رویہ اپنے معزز رہنماؤں کے ساتھ احترام آمیز ہے۔

ریاض میں ریاض سعودی حکومت کا دارالخلافہ اور بڑا ہی دل آویز شہر ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی سڑکوں اور نئے طرز کی عمارتوں کو دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ کبھی صحرا نشینوں کی بھی بستی تھی اور عطر بیز ہواؤں کی جگہ یہاں ریت کے جھکڑ چلا کرتے تھے۔ زمین کی چھاتی سے ابلنے والے سیال سونے نے ریاض تو کیا پورے ملک کی ہیئت بدل کر رکھ دی ہے۔ لیکن ریاض چونکہ مرکز حکومت بھی ہے اس لیے اس نے تیل کی دولت سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

مولانا محترم جب مکہ میں مقیم تھے تو اس وقت سعودی حکومت کے وزیر تعلیم شیخ حسن نے اپنا ایک نمائندہ آپ کو

لینے کے لیے بھیجدیا تھا۔ شیخ حسن اسلامی جذبۂ حمیت سے سرشار ایک پرجوش اور باعمل نوجوان ہیں۔ وہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے حکومت کی تعلیمی پالیسی میں نہایت انقلابی تبدیلیاں کر رہے ہیں۔ ان کی سرکردگی میں اس وقت دو تعلیمی کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔ ایک کمیٹی وہ ہے جو مڈل اور ثانوی تعلیم کا اسلامی نصاب تیار کرنے میں مصروف ہے اور دوسری عربی تدریس کی کمیٹی ہے جس کے ذمے عربی ادب کے ذریعے نوجوانوں کے افکار کی اصلاح کرنا ہے۔

مولانا محترم ۲۰ اکتوبر کو جدہ سے بذریعہ ہوائی جہاز ریاض پہنچے تو وزیر تعلیم اپنے پورے اسٹاف کے ساتھ ان کا استقبال کرنے کے لیے موجود تھے اور ٹیلی ویژن کیمرہ استقبال کے مناظر کو محفوظ کرنے میں مصروف تھا۔ مولانا محترم کو وزارت تعلیم کے سرکاری مہمان کی حیثیت سے ٹھیرایا گیا اور وزیر تعلیم نے اسی روز پھر ہوٹل میں آکر مولانا محترم سے ملاقات کی۔

۲۹ اکتوبر کو دونوں تعلیمی کمیٹیوں کے اجلاس میں شرکت کے لیے مولانا محترم کو دعوت دی گئی اور نماز مغرب کے بعد آپ ان کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ نصاب کمیٹی کے اجلاس میں وزیر تعلیم نے اس کی کارگزاری بیان کرتے ہوئے بتایا کہ یہ کمیٹی مڈل تک نصاب تیار کر چکی ہے اور اب تعلیمی نصاب تیار کرنے میں مصروف ہے۔ یہ نصاب اس نقطۂ نظر سے تیار کیا جا رہا ہے کہ نوجوان نسل جدید علوم میں بھی مہارت حاصل کرے اور اسلام سے بھی اس کا رشتہ کمزور نہ پڑنے پائے۔ اس کے اندر مسلمان ہونے اور اسلامی تہذیب کا نمائندہ ہونے کا احساس ہر وقت غالب رہے۔

مولانا محترم نے اس کارگذاری کو سراہتے ہوئے فرمایا کہ یہی وہ اسکیم ہے جس کا میں ایک مدت سے مطالبہ کر رہا ہوں کہ اسلامی حکومتیں انہیں اختیار کریں اور اپنے ملکوں کو غیر اسلامی تہذیبوں کی یلغار سے بچائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تعلیمی منصوبہ کسی جنگی منصوبے سے کم اہم نہیں ہے۔

وزیر تعلیم کے اصرار پر مولانا محترم نے وعدہ کیا کہ وہ اس کمیٹی کی رپورٹ کو پڑھ کر اسے کچھ اور مفید مشورے دیں گے اور پاکستان میں حکومتی سطح پر جو تعلیمی پالیسی بنائی گئی ہے اور اس پالیسی پر جماعت اسلامی نے جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ یہ ساری چیزیں کمیٹی کو ارسال کریں گے۔

نصاب کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر مولانا محترم نے عربی تدریس کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کی اور عربی ادب پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ قرآن زبان و ادب کا بے مثال شہ پارہ ہے۔ یہ کتاب ہدایت بھی ہے اور کتاب ادب بھی۔ کمیٹی کو چاہیے کہ وہ قرآن کے ذریعے سے نوجوانوں میں عربی ادب کا ذوق پیدا کرے۔ اس

طرح ادب کا معیار بھی نہ بدلے گا اور ان کے افکار کی بھی اصلاح ہو گی۔ کمیٹی نے مولانا کی اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔
ریاض میں مولانا محترم کی ان مصروفیتوں کے مناظر ٹیلی ویژن پر بڑے اہتمام سے دکھائے گئے۔ اگرچہ رابطہ کے اجلاس کے جزوی مناظر بھی ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے تھے لیکن ریاض میں رنگ کچھ اور تھا۔

۳۰ اکتوبر کا دن بڑا بھرپور گزرا۔ وزیر تعلیم نے شہر کی گھما گھمی سے دور ایک وسیع باغ میں مولانا محترم کے اعزاز میں ایک ظہرانے کا اہتمام کیا تھا۔ عمائدین حکومت اور معززین شہر کی ایک بڑی تعداد اس میں شریک ہوئی اور عام اجتماع کا سا منظر رہا۔ اسی روز شاہ فیصل کے چچا پرنس امیر عبداللہ نے مولانا کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔

ریڈیو ریاض کے نمائندے نے بھی مولانا محترم سے ایک انٹرویو لیا جس میں یہ سوالات زیر بحث آئے کہ موجودہ حالات میں باطل تحریکوں کا کیسے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا کا یہ انٹرویو غالباً ۵ / ۶ نومبر کو ریاض ریڈیو سے نشر ہوا ہے۔

۳۱ اکتوبر کو عام نشستیں رہیں اور لوگ جوق در جوق مولانا محترم سے ملنے کے لیے آتے رہے۔ پاکستانی دوستوں نے تو سوال و جواب کی ایک مجلس جما ڈالی اور دیر تک مولانا سے مستفید ہوتے رہے اور اسی روز مولانا محترم ریاض سے پرواز کر کے کراچی تشریف لے آئے۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا محترم کے اس دورے نے سعودی حکومت اور عوام کو پاکستان کے اور قریب کر دیا ہے۔ مولانا محترم نے ہر محفل میں اس بات کا اظہار کیا کہ پاکستان کے عوام اور پاکستان کی حکومت مسجد اقصےٰ کے تحفظ کے مسئلے سے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ وہ ہر قیمت پر اپنے قبلہ اول کو یہودیوں کے پنجے سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ کسر صرف اتنی ہے کہ اسرائیلی جارحیت سے براہ راست متاثر ہونے والے عرب ممالک بھی پورے اخلاص کے ساتھ ساری دنیا کے مسلمانوں کا ساتھ دیں۔

سعودی حکومت ان دنوں جس آزمائش سے گزر رہی ہے اس کا اظہار بھی اس موقع پر نامناسب نہیں۔ اس کے سر پر ہر وقت ایک اشتراکی انقلاب کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔ مختلف ترقیاتی پروگراموں کی تکمیل کے لیے جو ماہرین فن سعودی عرب میں آئے ہیں وہ اپنے ساتھ اشتراکیت کے زہریلے جراثیم بھی لائے ہیں اور بیرونی طاقتوں سے باقاعدہ ساز باز رکھتے ہیں۔ اب تک کئی سازشیں پکڑی جا چکی ہیں اور سعودی حکومت اپنی طرف سے سخت حفاظتی اقدام کر رہی ہے۔ دوسری طرف اسرائیل کی نگاہیں بھی شمالی حجاز پر لگی ہوئی ہیں۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اسرائیل کے دعوے کے مطابق کبھی اس کے آباء و اجداد رہتے تھے۔ اب وہ پھر عالمی طاقتوں کی پشت پناہی (باقی ص۱۲ پر)

ترکی

(امین اللہ وثیر)

ترکی کے انتخابات میں بالآخر جسٹس پارٹی کو فتح ہوئی۔ عصمت انونو کی ری پبلکن پارٹی کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک کروڑ چالیس لاکھ ووٹروں میں سے ایک کروڑ سے زائد نے حصہ لیا اور اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ ترکی پارلیمان کی کل نشستیں ۴۵۰ ہیں جن میں سے ۲۶۰ جسٹس پارٹی نے حاصل کیں اور ۱۴۵ ری پبلکن پارٹی کو ملیں

انتخابی سرگرمیاں کئی ہفتے سے جاری تھیں لیکن انتخابات سے چند روز پہلے تو عروج پر پہنچ گئیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر تمام سیاسی جماعتوں کو اپنا پروگرام پیش کرنے کی آزادی ہے۔ ۲۹ ستمبر کو ریڈیو سے مختلف جماعتوں کے رہنماؤں نے انتخابی تقاریر نشر کیں۔

برسر اقتدار جماعت جسٹس پارٹی کے رہنما اور وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل نے اپنی تقریر میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ گزشتہ چار سالوں میں ترکی نے بہت ترقی کی ہے اور ملک پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو گیا ہے

ٹرکش لیبر پارٹی کے سکریٹری جنرل طارق ضیا نے کہا:۔

موجودہ نظام حکومت میں کارکنوں کو سب سے زیادہ تکالیف کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ انھوں نے کسانوں، کارکنوں، مزدوروں، چھوٹے تاجروں اور محدود آمدنی والے عام لوگوں پر زور دیا کہ وہ اس گلے سڑے نظام کو بدلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ انھوں نے کہا۔ ترکی کے ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ علاقوں کے مابین حالات سخت غیر متوازن ہیں۔

ری پبلکن پارٹی کے رہنما عصمت انونو نے ملک میں تعلیم کی کمی پر اظہار افسوس کیا اور کہا کہ ملک میں تعلیمی اداروں کی کمی اور حکومت کی بے توجہی اس مسئلے کے حل میں سخت رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔

ترکی کی سب سے چھوٹی جماعت یونین پارٹی کے سکریٹری جنرل شمسی بے نے کہا۔ میں آپ کے سامنے جھوٹ بولنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میرے پاس بڑی خوبصورت اور مؤثر کہانیاں ہیں جو میں آپ کو سناؤں گا تاکہ آپ مجھے پارلیمنٹ کا رکن منتخب کرلیں۔ انتخابات کے بعد آپ اپنی ہی دنیا میں رہیں گے اور میں آپ کے ووٹوں کی بدولت ایک نئی دنیا میں داخل ہو جاؤں گا۔ آپ ٹیکس وصول کرنے والوں کا استقبال کریں گے اور مجھے پارلیمنٹ کے دروازے پر پولس سلام کرے گی۔ کیونکہ میں آپ کا نمائندہ ہوں گا۔ ووٹ بہرحال آپ کا ہے۔ شمسی بے نے ریڈیو پر ایک نظم بھی سنائی

الائنس پارٹی کے ڈپٹی چیرمین امین پاکسُت نے ایک بیان میں ترک قوم کو اشتراکیت کے خطرے سے خبردار رہنے کی تلقین کی۔ انھوں نے کہا ان کی جماعت کمیونزم کے خلاف مصروف جہد ہے۔ جو لوگ ان کی جماعت کو ووٹ دیں گے وہ گویا اشتراکیت اور غربت کے خلاف جنگ کرنے میں جماعت کی مدد کریں گے۔ انھوں نے مزید کہا: فساد پسند اور فتنہ پرداز "بائیں بازو" کو ووٹ دینا ایسا ہے جیسے اس شاخ کو کاٹ دیا جائے جس پر آپ بیٹھے ہیں۔

ری پبلکن پارٹی کے سکریٹری جنرل بلند اجودت نے اپنی ریڈیائی تقریر میں قوم سے اپیل کی ہے کہ وہ "انسانی زندگی کے قابل نظام حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں ان کی جماعت کو پورے پورے اختیارات سونپ دے۔ انھوں نے کہا اس وقت حکومت کی تبدیلی سے زیادہ موجودہ نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

ترکی کی سیاسی جماعتوں کی طرف سے کی گئی تقریروں میں سب سے زیادہ توجہ کا مرکز (مارکسسٹ) ٹرکش لیبر پارٹی کے چیرمین محمد علی آیبر کی تقریر تھی۔ اخبارات کے مطابق انھوں نے توقع کے عین مطابق ترکی کی ایک گھناؤنی تصویر کھینچی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہاں تک کہہ دیا کہ ترکی گزشتہ دو سال سے "غیرملکی تسلط" کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا ہے اور یہ ایک آزاد ملک نہیں ہے۔ انقرہ کے اخبار "ڈیلی نیوز" کا کہنا ہے کہ محمد علی آیبر اور ان کی جماعت ترکی میں جس قسم کا نظام قائم کرنے کے خواہاں ہیں اس سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن یہ بیان دے کر انھوں نے پوری قوم کی ناراضگی کو یقیناً دعوت دی ہے۔ گزشتہ چار سالوں میں اس جماعت کا کردار اور قوم کے ساتھ ان کا خلوص پوری قوم پر عیاں ہو چکا ہے اور اس کا اندازہ ان الزامات سے لگایا جاسکتا ہے جو اس جماعت کے کارکن اور عہدیدار ایک دوسرے پر لگاتے رہتے ہیں۔ اخبار لکھتا ہے: "مسٹر آیبر! آپ غالباً اس لیے خوش نہیں ہیں کہ ترکی سینٹو کا رکن ہے اور اس نے اپنے اتحادیوں کے ساتھ معاہدے کر رکھے ہیں۔ آپ ترکی کو ایک ایسے کیمپ میں لے جانے کے متمنی ہیں جس میں انسانی آزادیوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے لیکن آپ کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آپ اپنے ان خوابوں کو کبھی پورا

ہوتا نہیں دیکھ سکیں گے۔
اشتراکی رہنمانے برسر اقتدار جسٹس پارٹی پر انتخابات جیتنے کے لیے غیر قانونی طریقے اختیار کرنے اور لیبر پارٹی پر جھوٹے الزامات عائد کرنے کا الزام بھی لگایا۔ انھوں نے کہا جسٹس پارٹی مذہب کو سیاسی آلہ کار کے طور پر استعمال کر رہی ہے اور ہمارے عوام کے مذہبی عقائد کو سیاست دانوں کے ناپاک عزائم کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ان حالات کے تحت انتخابات سے قوم کی آزادانہ رائے کا اظہار نہ ہو سکے گا۔

انگریزی روزنامہ "ڈیلی نیوز" سے ایک انٹرویو میں وزیر اعظم سلیمان ویمرل نے کہا: گزشتہ چار سالوں کے دوران ہم نے کئی سالہ جمہوریت کو ایک نیا ترکی عطا کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہم نے ملک میں امن وسلامتی بحال کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی آزادانہ خارجہ پالیسی بھی اختیار کی کہ ترکی اب ایک ایسا ملک بن چکا ہے جس سے دوستی کی دنیا میں تمنا کی جاتی ہے اور جس کے وعدوں پر اعتبار کیا جاتا ہے۔ اس عرصے میں ترکی کی سالانہ آمدنی میں بھی اضافہ ہوا ہے اور ترک عوام کے دلوں میں "امید کی ایک نئی شمع روشن ہو چکی ہے"
دائیں بازو کے آزاد گروپ کے رہنما پروفیسر نجم الدین اربکن نے اعلان کیا ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی "ایک نئی پارٹی" HOLY LOVERS قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا وہ "خلافت" کے قیام کی بھی از سر نو کوشش کریں گے۔

۲

رباط میں منعقدہ اسلامی کانفرنس کے خلاف ترکی کے اشتراکی اور یہودی پریس کے دل کی بھڑاس ابھی تک نہیں نکلی۔ وہ تاحال اس کانفرنس کے انعقاد کو غلط اقدام قرار دینے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے روزنامہ "آشام" لکھتا ہے "جیسا کہ ہمارا اندازہ تھا "اسلامک سمٹ" غیر یقینی صورت حال میں ہی ختم ہو گئی" اخبار کا کہنا ہے۔ اس بیسویں صدی میں توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ اسلام مختلف قوموں کے اختلافات کو ختم کرا سکتا ہے۔ یقیناً ویمرل کی حکومت نے ترکی کی عزت پر ایک اور وار کیا ہے۔
اخبار "ملیت" کے عبدی ایکچی نے لکھا ہے: اسلامی ملکوں میں اتحاد پیدا کرنے کی نسبت اسلامی کانفرنس نے محض پرانی قراردادوں ہی کو دہرا دیا۔ اخبار کا کہنا ہے کہ کانفرنس میں ہندوستان کی شمولیت کے سلسلے میں ہمارے طرز عمل سے اس ملک کے ساتھ ہمارے تعلقات کو سخت دھچکا لگا ہے۔ ہماری رائے میں حکومت نے اس کانفرنس

میں شرکت کرکے اپنی داخلی پالیسی کو تو بہتر بنا لیا لیکن خارجہ پالیسی کے سلسلے میں اس کے نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا نظر نہیں آتے۔

"جمہوریت" کے رفیق تلا کا لکھتے ہیں، حکومت کے فیصلے نے ترکی کو ایک بین الاقوامی جھگڑے میں ملوث کر دیا۔ حکومت نے صرف چند ووٹوں کی خاطر قومی مفاد کو نقصان پہنچایا۔ اس ملک میں اسلام سالہا سال تک آزمایا جا چکا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ پالیسی ہمیشہ ناکام ہوئی ہے۔ ہمارا نصب العین فقط قومیت اور لادینیت ہونا چاہیے "ینی گزٹ" نے اسلامی کانفرنس کو رجعت پسندی اور ترقی پسندی کی آویزش اور کمیونزم کے خلاف مغربی استعمار کا ایک مظاہرہ قرار دیا۔ اخبار لکھتا ہے کہ یہ ترکی کے لیے مفید ہے کہ وہ تمام ترقی پسند اور رجعت پسند عرب ملکوں کے ساتھ ایک جیسے تعلقات قائم رکھے اس لیے ہمیں مشرق وسطیٰ میں ان تمام امور سے کنارہ کش رہنا چاہیے جن کا تعلق استعماریت سے ہے۔

۳

۲۵ ستمبر کو سابق صدر اور سابق وزیر اعظم عصمت انونو نے اپنی ۸۵ ویں سالگرہ منائی۔ اس موقع پر ان کے پوتے اور پوتیوں نے انہیں ایک کیک پیش کیا۔ جو ایک گلاب کے پھول اور پانچ موم بتیوں سے مزین تھا۔ انھوں نے خود کیک کاٹا اور مہمانوں میں تقسیم کیا۔ اپوزیشن رہنما بہت خوش و خرم دکھائی دیتے تھے اور دیر تک ہنسی مزاح کی باتیں کرتے رہے۔ ان کے مداحین نے انہیں بہت سے تحفے بھیجے جن میں انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا بھی شامل ہے اخباری نمائندوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ان کی واحد تمنا یہ ہے کہ ان کے پوتے پوتیاں بھی انہیں کی طرح لمبی زندگی گزاریں

۴

روزنامہ "ینی گزٹ" نے بتایا ہے کہ آئندہ پارلیمنٹ کے ارکان کی تنخواہوں میں اضافہ کیا جائے گا۔ اس وقت پارلیمنٹ کا ہر رکن ۲۷۰۰ ترکی لیرا خزانے سے وصول کرتا ہے جب کہ آئندہ وہ ۵۰۰۰ لیرا وصول کرے گا۔

۵

ایک ترکی النسل جرنلسٹ گنیش ترابوداور اس کی سویڈش بیوی باربراکو ادرنہ کی سرحدی چوکی پر ترکی سرحد پار کرنے سے روک دیا گیا اور ان کے پاسپورٹ پولیس نے اپنے قبضے میں لیے۔ ان سے کہا گیا کہ وہ واپس انقرہ پہنچ جائیں۔ ۱۹۶۰ء میں بھی انہیں ترکی چھوڑنے سے منع کر دیا گیا تھا اور ان کے پاسپورٹ چھین لیے گئے تھے بتایا جاتا ہے کہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ سویڈش پریس میں ترکی کے خلاف مسلسل پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں

بار ہر اب تک ترکی کے متعلق چار کتابیں لکھ چکی ہیں اور اس پر الزام لگایا گیا ہے کہ اس کی ایک کتاب گمراہ پروپگینڈہ سے بھری ہوئی ہے۔ بعد کی ایک خبر کے مطابق وزیر داخلہ پروفیسر راغب انر کی ذاتی مداخلت پر ان دونوں صحافیوں کے پاسپورٹ واپس کر دیے گئے۔

گزشتہ روز ارغیپ کے قریب ایک گاؤں میں ایک اٹھارہ سالہ ڈچ سیاح نے قبول اسلام کا اعلان کیا اور ایک ترک کسان لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سیاح اڈ گر موپ کا اسلامی نام خلیل حسین رکھا گیا ہے۔

۶

یکم اکتوبر کو ارض روم میں وزیر اعظم سلیمان ڈیمرل نے کہا کہ جمہوریت کی دشمن بعض سیاسی جماعتیں ایک مرتبہ پھر اس کوشش میں مصروف ہیں کہ ملک میں ایک اور فوجی انقلاب برپا کر دیا جائے۔ انھوں نے الزام لگایا کہ بعض لوگوں کا مقصد یہ ہے کہ آزاد اور جمہوری نظام کو کسی ژولیدہ ذہنیت کے حامل نظام زندگی سے تبدیل کر دیا جائے لیکن ریاست، نظم و ضبط قائم رکھنے والی طاقتیں اور قوم کسی بھی ایسے شخص کا سر توڑنے کے لیے پوری طرح مضبوط ہے جو جمہوریت کو تباہ کر کے کسی اور طرز کی حکومت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

یاد رہے اس سے پہلے اشتراکی اخبار "آشام" لکھ چکا ہے کہ ترکی بڑی تیزی کے ساتھ خونی انقلاب کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وہ ڈیموکریسی کو "انقلاب دشمنی" کا نام دیتا ہے۔ اسی اخبار کے الہامی سوئیل نے انکشاف کیا ہے کہ اس وقت ترکی میں امرا اور اہل اقتدار مکمل طور پر متضاد گروپوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ فری میسن برادرز اور مسلم برادرز۔

ملک میں ساری کش مکش دراصل انہیں دو گروپوں سے وابستہ ہے۔ باقی صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ اخبار لکھتا ہے کہ فری میسن میں حکومت کے بڑے بڑے ارکان شامل ہیں جب کہ دوسری طرف مسلم برادرز میں بھی بہت سے فوجی جرنیل، پروفیسر، سیاسی رہنما، اعلیٰ سرکاری عہدہ دار اور تاجر شامل ہیں۔ اخبار نے اس سلسلے میں بعض نام بھی گنوائے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ صورت حال ری پبلکن پارٹی کے زمانے میں بھی اسی طرح تھی اور ڈیموکریٹ پارٹی کے عہد اقتدار بلکہ فوجی انقلاب کے دوران بھی۔

۷

گزشتہ چند دنوں میں استنبول اور انقرہ یونیورسٹیوں اور بعض دوسرے اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں حالات

افسوسناک رخ اختیار کر لیا بعض مقامات پر طلبہ نے پولس کا باقاعدہ مقابلہ کیا۔ روزنامہ ترجمان کا کہنا ہے "سرمایہ دارانہ ذہنیت، ظالم کمیونزم، صیہونیت، فری میسنری اور ترقی پسندانہ آئیڈیالوجی کی باہوں میں باہیں ڈالے نوجوانوں کو زیادہ سے زیادہ خراب کرنے پر تلی ہوئی ہے حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی عقائد سے محبت رکھنے والے بعض نوجوانوں نے ترکی کے تعلیمی اداروں کو خون خرابہ کا مرکز بنا رکھا ہے۔ یہ لوگ مختلف ناموں کے تحت غیر قانونی مشاغل اپنائے ہوئے ہیں۔ یاد رہے انقرہ کی مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی لمبے عرصے سے بند چلی آ رہی ہے۔ ڈیلی نیوز کا کہنا ہے کہ "پروگریسو سٹوڈنٹس" کا رہنما وہ طالب علم ہے جسے کچھ عرصہ پیشتر "کلیہ قانون" سے نکال دیا گیا تھا۔ وہ دو سال تک پولس کی "مطلوبہ فہرست" میں شامل رہا۔ یہ شخص اب ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں لوہا کاٹنے والی چھڑی پکڑے "پروگریسو سٹوڈنٹس" کا ہیرو بنا ہوا ہے۔ وہ دائیں اور بائیں بازووں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کو باہم لڑا کر یونیورسٹیوں کو "میدان جنگ" بنانے کا عزم رکھتا ہے۔ (ماخوذ)

(بقیہ اشارات)

زندگی کے جن دو مقالوں پر مقدمہ چلایا گیا ہے ان میں کا ایک مولانا جلال الدین انصر عمری کا "کیا رام چندر جی اور کرشن جی خدا کے رسول تھے ؟" ہے۔ جو جنوری ۶۹ء میں شائع ہوا تھا اور دوسرا مقالہ پروفیسر عبد المغنی صاحب کا "مسلمانوں کے لیے آزاد ہندوستان کا چیلنج" ہے، جو اکتوبر ۶۹ء کے شمارے میں چھپا تھا۔ پہلے مقالے پر دو دفعات کے تحت مقدمہ قائم کیا گیا ہے۔ دفعہ ۱۵۳ (الف) اور دفعہ ۲۹۵ اور دوسرے مقالے پر صرف دفعہ ۱۵۳ (الف) کے تحت۔

یہ مقدمات مقالہ نگاروں پر چلائے گئے ہیں۔ ۴ ر دسمبر کو ہماری گرفتاری چونکہ پروفیسر عبد المغنی صاحب کے مضمون کی وجہ سے ہوئی تھی اس لیے مولانا جلال الدین گرفتاری سے بچ گئے۔ حالاں کہ وہ بھی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے لیکن ان کی گرفتاری کا اندیشہ موجود تھا۔ اس لیے انھوں نے عدالت میں حاضر ہو کر ۷ ر دسمبر کو اپنی ضمانت منظور کرالی ہے۔ ان سب مقدمات کے لیے پہلی تاریخ ۲۸ ر دسمبر مقرر کی گئی ہے۔

تنقید و تبصرہ

تاریخ دعوت و عزیمت حصہ اوّل مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صفحات ۴۹۶ سائز ۲۲×۲۶ کاغذ طباعت، کتابت بہتر مجلد قیمت دس روپیے۔ ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۴ سال پہلے دارالمصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوا تھا اور اب یہ دوسرا ایڈیشن اضافہ و ترمیم کے ساتھ مجلس تحقیقات و نشریات اسلام نے چھاپا ہے۔ اس ایڈیشن میں جیسا کہ فاضل مرتب نے دیباچہ طبع دوم میں لکھا ہے دو اضافے کیے گئے ہیں۔ ایک اضافہ مقدمۂ کتاب میں "دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی" کے زیر عنوان کیا گیا ہے اور دوسرا اضافہ اصل کتاب میں فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" کے زیر عنوان کیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے اس حصے میں درج ذیل اکابر امت اسلامیہ نے جگہ پائی ہے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز حسن بصری۔ امام احمد بن حنبل۔ ابوالحسن اشعری۔ امام غزالی۔ شیخ عبدالقادر جیلانی۔ علامہ جوزی۔ نورالدین زنگی ــ صلاح الدین ایوبی۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام۔ مولانا جلال الدین رومی۔ امام ابومنصور ماتریدی کا بھی ایک ذیلی عنوان کے تحت محض ضمنی تذکرہ کیا گیا ہے۔ فہرست مضامین میں "خاتمہ" اور انڈکس اسماء و کتب کے دو عنوان بھی موجود ہیں لیکن کتاب میں نہ "خاتمہ" شائع ہوسکا ہو اور نہ انڈکس۔ شاید سہواً ان دونوں عنوانوں کا مواد چھپنے سے رہ گیا ہے۔

امت کے ان مشاہیر کا تذکرہ اور مولانا علی میاں مدظلہ کا تروتازہ اور مؤثر قلم اس کتاب کے قیمتی قابل قدر اور پرتاثیر ہونے میں کیا شبہ ہے۔ اچھی ترتیب، سلجھا ہوا پیرایہ بیان اور عالم اسلام کی اصلاحی کوششوں کا جائزہ کتاب شروع سے آخر تک معلومات افزا، دلچسپ اور لائق مطالعہ ہے۔

مولانا کو تصوف سے جو لگاؤ اور بزرگوں سے جو عقیدت ہے وہ اس درجے پر پہنچی ہے کہ وہ ان کے معاملے میں

اپنے لیے ایک مورخ محقق اور ناقد کے بجائے ایک سراپا عقیدت مند مرید کی حیثیت پسند فرماتے ہیں۔ تبصرہ نگار نے مولانا کی دوسری کتابوں میں بھی اس عقیدت کی جھلک دیکھی ہے اور اس کتاب میں بھی۔ میں اپنا یہ تاثر ظاہر کرنے والا ہی تھا کہ صدق جدید میں مولانا کی اس کتاب پر تبصرہ پڑھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ صرف میرا ہی تاثر نہیں ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے بڑی خوبی سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ میں ان کے تبصرے کا حصہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

مصنف کو بعض شخصیتوں سے جو غیر معمولی عقیدت ہے۔ (مثلاً شیخ جیلانی اور مولانا روم) وہ کتاب کے صفحات سے چھن چھن کر نکل رہی ہے اور کم سے کم مولانا کے حالات میں تو مصنف، محدثانہ تنقید بھول ہی گئے ہیں بلکہ ایک خوش عقیدہ صوفی نظر آنے لگتے ہیں۔ چنانچہ یہ روایت بلا تکلف نقل کر دی ہے کہ "سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشاء کے وقت سے نیت باندھی اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی۔" صلاکا —— گویا عشاء کے فرض بھی پورے ادا نہ کر سکے۔

مصنف ماشاءاللہ حدیث و تاریخ دونوں پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن بزرگوں کے فضائل و مناقب خوارق کے ذکر کے وقت ان کے اندر جو صوفی صافی کا قلب ہے وہ معلوم ہوتا ہے کہ محدثانہ دماغ اور مورخانہ نگاہ دونوں پر غالب آجاتا ہے۔ (صدق جدید، ۲۹ اگست ۶۹ء)

راقم الحروف اس کی ایک مثال اور پیش کرتا ہے۔ شیخ عزالدین بن عبدالسلام رحمۃ اللہ کی وفات کا حال مصنف لکھتے ہیں۔

۹ رجمادی الاولی ۶۶۰ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی۔ یہ الملک الظاہر بیبرس کا عہد حکومت تھا۔ اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا۔ کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے، شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی، جنازہ میں امراء دربار، ارکان سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں سلطان نے خود کندھا دیا اور دفن میں شریک ہوا

شیخ کا جنازہ جب قلعے کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا ازدحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے۔ اس لیے کہ یہ شخص جو مرجع خلائق ہے اگر اشارہ کر دیتا تو میری سلطنت چلی جاتی اس کے انتقال کے بعد مجھے اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔"

(ص۳۷۶)

اس عبارت کا دوسرا پیراگراف نہ صرف یہ کہ پہلے پیراگراف کی ضد ہے بلکہ اس نے شیخ عزالدین کی پوزیشن بھی خراب کر دی ہے۔ پہلا پیرا تو یہ کہتا ہے کہ سلطان کو شیخ کی وفات کا بہت صدمہ ہوا وہ اپنے ارکان سلطنت اور افواج شاہی کے ساتھ خود جنازہ میں شریک ہوا۔ جنازے کو کاندھا دیا اور دفن تک موجود رہا۔ دوسرا پیرا کہتا ہے کہ وہ جنازے تک میں شریک نہیں ہوا اور قلعہ سے جنازے کا منظر دیکھ کر شیخ کی وفات پر خوش ہوا اور اپنی سلطنت کے لیے ایک بڑا خطرہ ٹل جانے کی وجہ سے اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ پیرا یہ بھی کہتا ہے کہ حکومت مصر کی طرف سے شیخ کی ساری عزت افزائی محض اس لیے ہوتی رہی کہ ملوکیت برقرار رہے ورنہ سلاطین مصر کے دل میں شیخ کی کوئی حقیقی عزت و وقعت نہ تھی۔ فاضل مصنف نے یہ روایت طبقات الشافعیۃ الکبریٰ سے لی ہے لیکن انھوں نے تنقید کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔

پیش لفظ میں فاضل مصنف نے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں کی طرف یہ خیال منسوب کیا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

تبصرہ نگار یہ پڑھ کر سوچنے لگا کہ ہندوستان میں یہ اچھے اچھے سنجیدہ حلقے کہاں اور کس مقام پر پائے جاتے ہیں؟ پھر اصل کتاب پڑھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ فاضل مصنف نے جن مشاہیر کی اصلاحی کوششوں پر گفتگو کی ہے ان میں سے کون ایسا ہے جسے سنجیدہ حلقے اس کتاب سے پہلے نہ جانتے ہوں یا ان کی اصلاحی کوشش سے ناواقف ہوں؟ دو باتوں میں ایک ہی صحیح ہو سکتی ہے، یا تو کوئی ایسا سنجیدہ حلقہ موجود نہیں جو اس قسم کا خلا محسوس کرتا ہو جسے فاضل مصنف نے بھرنے کی کوشش کی ہے یا جس قسم کا خلا وہ سنجیدہ حلقہ محسوس کرتا ہے اسے فاضل مصنف بھر نہیں سکے ہیں۔

بہرکیف فاضل مصنف نے اصلاحی کوششوں کا جو جائزہ لیا ہے اور جس قسم کا تسلسل دکھانے کی سعی کی ہے وہ بجائے خود، قدر، مطالعہ اور استفادہ کے لائق ہے۔

کعب بن زہیرؓ اور قصیدہ بانت سعاد تالیف علی محسن صدیقی استاد تاریخ اسلام کراچی یونیورسٹی صفحات ۱۰۶ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر قیمت ۲/۲۵ - ناشر مکتبہ اسحاقیہ پھول چوک۔ جونا مارکیٹ کراچی ۲

اس کتاب کے مرتب ٹرپل ایم۔ اے ہیں اور انھوں نے بڑی محنت سے قصیدہ بانت سعاد کی خدمت کی

ہے۔ عہدِ رسالت کے قصائد میں اس قصیدے نے بڑی مقبولیت، شہرت اور اہمیت حاصل کی ہے۔ پہلے ہندوستان کے مدارس میں بھی یہ قصیدہ نصابِ تعلیم میں داخل رہا ہے۔ تبصرہ نگار نے بھی اسے مدرسہ الاسلامیہ شمس الہدیٰ پٹنہ میں پڑھا تھا۔ جہاں تک مجھے علم ہے اب یہ قصیدہ ہندوستان کے مدارس سے خارج ہو چکا ہے ویسے اب بھی ممکن ہے کہ کہیں نصاب میں داخل ہو۔ — یہ کہیں نصاب میں داخل ہو یا نہ ہو

جہاں تک عہدِ جاہلی اور عہدِ اسلام کی عربی شاعری کو سمجھنے اور اس سے مستفید ہونے کا تعلق ہے اس کی اہمیت اپنی جگہ باقی ہے اور باقی رہے گی۔ فاضل مرتب نے بڑی محنت سے اس کتاب کے مقدمہ میں قصیدہ اور قصیدہ نگار حضرت کعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں۔ خود قصیدے کی انھوں نے اس کے مختلف نسخوں کو سامنے رکھ کر تصحیح کی ہے اور صحت کا اہتمام کر کے اچھی طباعت کے ساتھ شائع کرایا ہے۔ عربی لغات کی تشریح کی ہے۔ ہر شعر کا سلیس ترجمہ کیا ہے اور اسے واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح اس کتاب نے قصیدہ بانت سعاد کو سمجھنے میں ایک اچھے مددگار کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

امن کی عالمگیر بنیادیں از منظور حسین ریڈر سول انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ۔ انجینیرنگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ۔ صفحات ۸۰ ۔ قیمت درج نہیں ہے۔ ناشر مسلم ایجوکیشنل پریس علیگڈھ

مصنف نے قرآن سے ۲۲ نکات اخذ کر کے امن کی عالمگیر بنیادیں متعین کی ہیں۔ پوری کتاب اچھے اخلاق کو اختیار کرنے کی ترغیب اور برے اخلاق سے بچنے کی تبلیغ پر مشتمل ہے لیکن جس زبان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے وہ اردو اور انگریزی کا ایک ایسا مخلوط نمونہ ہے جو اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ فاضل مصنف نے شاید اردو زبان میں بھی انجینیرنگ کا فن استعمال کیا ہے۔ پوری کتاب میں مصنف اردو جملوں کے ساتھ انگریزی ٹائپ میں انگریزی اصطلاحات اور جملے لکھتے چلے گئے ہیں۔ اس کا ایک مختصر نمونہ میں انگریزی الفاظ کو اردو رسم الخط میں لکھ کر پیش کرتا ہوں۔

غصہ کے نارمل لیول کو بڑھنے یا رائز یا ایب نارمل نہ ہونے دینا کیونکہ یہ بھی عجیب عجیب رنگ دکھاتا ہے جو بھی ہوتا ہے اس کی ڈگری یا مگنی چیوڈ پر ہے صد ۱۱
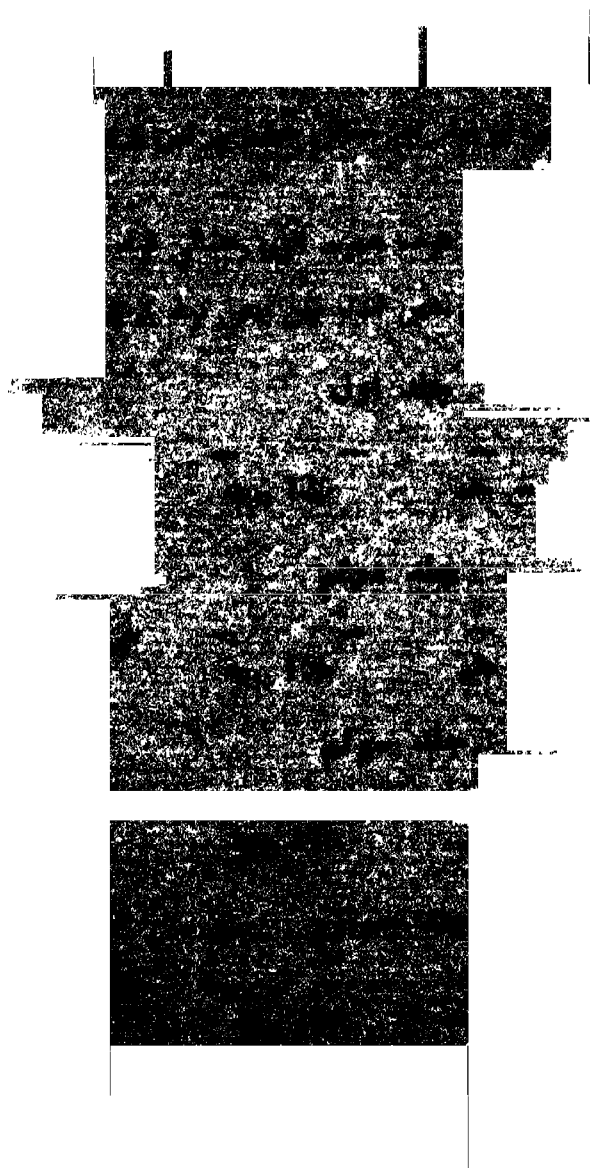
اسلام کی دعوت کی کیا اھمیت ھے؟
اس دور میں اسے کس طرح انجام دینا چاھئے؟
اس کی فطری ترتیب کیا ھے؟
اس کے اصول و آداب کیا ھیں؟
دعوت کی کامیابی اور داعی کی کامیابی میں کیا فرق ھے؟
کن لوگوں کو اسلام کی دولت ملتی ھے؟
وہ کیا اسباب ھیں جو انسان کو اس دولت سے محروم کر دیتے ھیں؟
دعوت کے لئے ضروری اوصاف کیا ھیں؟
اس کے لئے تنظیم کی کیا اھمیت ھے؟

ان تمام سوالات کا تفصیلی جواب معلوم کرنے کے لئے
سید جلال الدین عمری کی بالکل نئی تصنیف

* اسلام کی دعوت *

کا مطالعہ کیجئے۔ اپنے موضوع پر بہت ھی جامع اور نئے انداز کی کتاب

صفحات ۳۱۶ قیمت تین روپئے

مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ھند دھلی

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

زندگی

رامپور

فی پرچہ ۸۰ پیسے

لانہ آٹھ روپے

امت مسلمہ کا نصب العین

(کتاب وسنت کی روشنی میں)

از

سید احمد عروج قادری - مدیر زندگی

جس میں

امت مسلمہ کے نصب العین - اقامت دین - پر کتاب و[illegible]
کے دلائل یکجا کرنے کی سعی کی گئی ھے اور لوگوں [illegible]
شکوک و شبہات دور کئے گئے ھیں - جو لوگ جماعت
اسلامی سے وابستہ ھیں اُنھیں ایک ھی جگہ تشفی بخش
اور مفصل دلائل ملیں گے اور جو لوگ اس نصب العین
کے صحیح ھونے پر اطمینان حاصل کرنا چاھیں وہ اس
کی دلیلوں پر غور کر سکیں گے ــــ

سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۱۹۲ عمدہ طباعت اور

قیمت 1.75

منیجر زندگی - رامپور

ماہنامہ

زندگی

رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۸/-
پاکستان سے ۸/-
ششماہی
ہندوستان سے ۴/-
پاکستان سے ۴/-
فی پرچہ ۸۰ پیسے

شمارہ: ۲	ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ مطابق فروری ۱۹۷۰ء	جلد ۴۴

اس دائرہ میں ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گئی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا آئندہ کے لیے خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر۔ ماہنامہ زندگی رام پور۔ یوپی

مالک جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع۔ روہیلا پرنٹنگ پریس۔ رامپور۔ یوپی
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی رام پور یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

جیسا کہ جنوری کے اشارات میں لکھا گیا تھا، احمد آباد اور بمبئی کی کانفرنسوں نے کانگریس کی پھوٹ پر آخری مہر لگا دی اور ہندوستان کی یہ سب سے بڑی سیاسی پارٹی دو مستقل گروپوں میں تقسیم ہو گئی۔ گزشتہ اشارات میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ ان دونوں گروپوں میں کوئی بھی نام، جھنڈے اور الکشنی نشان کو آسانی کے ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوگا اور اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ جھگڑا طویل ہوگا اور غالباً عدالت ہی اس جھگڑے کا آخری فیصلہ کرے گی۔ گاندھی صدی کا آخری مہینہ دسمبر ۱۹۶۹ء کئی پہلوؤں سے ہندوستان کے مستقبل کے لیے بہت اہم تھا۔ کانگریس کے دونوں حالیہ اجتماعات اور پٹنہ میں جن سنگھ کے اجتماع نے ہمارے وطن ہندوستان کو دوراہے پر لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ جن سنگھ کا چہرہ پہلے بھی نمایاں تھا لیکن نقاب کی جو دو چار دھجیاں لٹک رہی تھیں اس نے انہیں بھی نوچ کر پھینک دیا ہے۔ اسی طرح کانگریس کے دونوں گروپ نہ صرف الگ ہوئے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے سامنے آکھڑے ہوئے ہیں۔

اس نازک موڑ پر بھی اگر ہندوستان کی ملت اسلامیہ انتشار فکر و عمل کا شکار رہی اور اس نے اجتماعی جدوجہد کے ساتھ ملک کو وہ پیغام نہ پہنچایا جس کی وہ امانت دار ہے اور اس نے ملک کو وہ راہ نہیں دکھائی جو فلاح و نجات کی ایک ہی راہ راست ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کا ملی و اسلامی وجود خطرے میں پڑ جائے گا بلکہ پورا ملک ایک ایسے راستے پر پڑ جائے گا جو امن، چین اور اعتدال کا راستہ نہیں ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں کے ذہن سے یہ بنیادی بات نکل گئی ہے کہ ان کی اصل حیثیت کیا ہے؟ وہ دوسروں کی امامت و قیادت کرنے والے ہیں یا اقتدار اور پیروی کرنے والے، وہ دوسروں تک اپنا پیغام پہنچانے والے ہیں یا دوسروں کا پیغام خود وصول کرنے والے، وہ

دوسروں کو دعوت دینے والے ہیں یا دوسروں کی دعوت کو قبول کرنے والے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ یہ بھی بھول گئے ہیں کہ ان کا اصل مسئلہ کیا ہے اور ان کی حقیقی ذمہ داری کیا ہے؟

کانگریس اپنے بڑے ڈھانچے میں جس کش مکش کو چھپائے ہوئے تھی وہ اس کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد باہر نکل آئی ہے، اس کے ایک حصہ نے دائیں بازو کی طاقت کو کمک پہنچائی ہے اور دوسرے حصے نے بائیں بازو کی قوت کو مزید تقویت دی ہے اور پورا ملک کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ دونوں طاقتیں ایک سرگرم معرکے کے لیے کمر کس رہی ہیں ــــ ملک کی آزادی اور اس کی تقسیم کے بعد ان دونوں طاقتوں کی نظروں میں مسلمانوں کی حیثیت یا تو قربانی کے بکرے کی رہی ہے یا ایک ایسے ریوڑ کی جسے ہانک کر اس کیمپ میں داخل کیا جا سکتا ہے یا اس کیمپ میں اس ہانک پکار کی داستان بڑی لرزہ خیز اور عبرت ناک ہے جسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ افسوس اس کا ہے کہ مسلمانوں کو یہ حیثیت دینے میں زیادہ قصور ان طاقتوں کا نہیں خود ہمارا ہے۔ ہم نے اپنے قول و عمل سے ان طاقتوں کے سامنے کبھی یہ ثبوت پیش کیا ہی نہیں کہ مسلمان جانوروں کا ریوڑ نہیں ہیں بلکہ اس ملت کی حیثیت ایک ایسے رہنما کی ہے جو دائیں بازو کو بھی سیدھی راہ دکھا سکتی ہے اور بائیں بازو کو بھی

دائیں بازو کی طاقت مسلمانوں کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہے اور کیا بنانا چاہتی ہے یہ کوئی مخفی راز نہیں اور اب تو جن سنگھ کے حالیہ پٹنہ سیشن نے اسے باضابطہ قرارداد کی شکل دے دی ہے۔ وہ انہیں "قومیانا" یا "بھارتیانا" یا "ہندیانا" یا "ہندوستانیانا" چاہتی ہے۔ ایک حقیقت کے لیے یہ چاروں لفظ اخبارات میں استعمال ہو رہے ہیں۔ شری بلراج مدھوک جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے رہتے تھے وہ اب ان کی پارٹی کا متفقہ مقصد بن چکا ہے۔ ہم اس قرارداد کے متعلقہ حصے یہاں نقل کرتے ہیں تاکہ اسے تلاش کرنے میں دشواری نہ پیش آئے۔ ۳۰ر دسمبر ۶۹ء کو چانکیہ نگر میں چار گھنٹوں کے مباحثے کے بعد ترمیم کے ساتھ جو قرارداد منظور ہوئی ہے۔ وہ یہ ہے:۔

"تمام انتشار پرور عناصر کو خصوصاً ان عناصر کو جن کی کھلی یا ڈھکی وفاداریاں ملک کے باہر ہیں یا دو قومی یا کئی قومی نظریے پر یقین رکھتے ہیں، ہندیانا ضروری ہے اور ہندیانے کے معنے ہیں تمام محدود وفاداریوں مثلاً مذہبی، علاقائی، لسانی یا عقیدے کی وفاداری کو وسیع تر قومی وفاداری کا تابع کرنا۔"

قومی آواز، لکھنؤ ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۹ء

جن سنگھ کی ورکنگ کمیٹی نے جو قرارداد پاس کی تھی اس کے درج ذیل جملے کو اجلاس عام میں نکال دیا گیا۔

"اس کا اطلاق خصوصیت سے ہندوستانی مسلمانوں پر ہوتا ہے کیونکہ ۹۳ فی صدی سے زیادہ مسلمانوں نے ۱۹۴۶ء کے عام الکشن میں جو تقسیم سے عین قبل ہوا تھا مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا"

(قومی آواز)

اگرچہ اب اس قرارداد کی لپیٹ میں وہ تمام فرقے اور افراد آگئے ہیں جنھیں جن سنگھ کی طرف سے وفاداری کی سند نہ دی گئی ہو لیکن سرفہرست ہندوستانی مسلمان ہی ہیں اور یہ بات جن سنگھی مقررین نے اپنی تقریروں میں واضح بھی کردی ہے۔ قرارداد میں ہندیانے کی تشریح بھی کی گئی ہے لیکن ابہام باقی ہے مسلمانوں کے بارے میں اس ابہام کو دور کرنے کے لیے جن سنگھ کے آرگنائزنگ سکریٹری شری یگیہ دت شرما نے مثال اور نمونہ پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے محب وطن مسلمانوں کی مثال میں مسٹر محمد علی کریم بھائی چھاگلہ کا نام لیا جن کی وفاداری ان کے خیال میں شک سے بالاتر ہے۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ جن سنگھ ہندوستانی مسلمانوں کو افکار و اعمال کے لحاظ سے کم از کم "چھاگلہ" ضرور بنانا چاہتا ہے اس سے کم درجہ پر وہ مسلمانوں کو "وفاداری" کی سند نہیں دے سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اس جن سنگھی قرارداد کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان بائیس سال سے اپنے جن حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں ان میں کا کوئی حق بھی جن سنگھ دینے کو تیار نہیں ہے مسلمانوں کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ ان کی مذہبی و تہذیبی انفرادیت تسلیم کی جائے۔ جان و مال کے تحفظ کا مطالبہ، اردو زبان کے تحفظ کا مطالبہ، نصاب تعلیم میں ترمیم و اصلاح کا مطالبہ، اوقاف کے تحفظ کا مطالبہ، یہ تمام مطالبات اسی ایک بنیادی مطالبے کی شاخیں ہیں۔ اس بنیادی مطالبے کو ماننا تو درکنار جن سنگھ اسے غیر وفاداری کی علامت قرار دیتا ہے۔

اس قرارداد کے بعد ۴ جنوری ۷۰ء کو تنظیمی کانگرس کی ورکنگ کمیٹی نے جو قراردادیں پاس کی ہیں ان میں جن سنگھ کے "ہندیانے" والے رزولیوشن کے بارے میں کلی سکوت اختیار کیا گیا ہے۔ ہم اس معنے خیز سکوت کو اس کی تائید نہ سمجھتے اگر ان قراردادوں میں جن سنگھ جیسی پارٹیوں کی مدح نہ کی گئی ہو۔ ایک قرارداد میں برسراقتدار کانگریس پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ وہ اقلیتوں اور خاص طور پر مسلمانوں کے ذہنوں میں جان بوجھ کر ایسی پارٹیوں کے بارے میں شبہات اور بے اعتمادی پیدا کر رہی ہے جن کی قومی یکجہتی اور سیکولر اقتدار کے لیے وفاداری کسی بھی سوال سے بالاتر ہونی چاہیے

معلوم ہی ہے کہ بمبئی کے اجلاس میں مسز اندرا گاندھی نے کھل کر جن سنگھ کی مذمت کی تھی اور اس کے ہندیانے والے نظریے کو فتنہ انگیز اور نقصان دہ قرار دیا تھا اور مسلمانوں کو ہندوستان کا ویسا ہی شہری اور وفادار

کہا تھا جیسے دوسرے ہندوستانی ہیں۔ اس پس منظر میں ہندیا نے والی جن سنگھی قرارداد کے بارے میں مکمل سکوت کو
اس کی تائید کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے۔ تنظیمی کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنی قراردادوں میں یہ بھی کہا ہے
کہ اگر اقلیتوں نے اجتماعی طور پر کسی ایک سیاسی پارٹی کا ساتھ دیا تو یہ تنگ نظری خود ان کے لیے بھی نقصان دہ
ہوگی اور ملک کے لیے بھی۔ اقلیتوں کے ساتھ اس مہربانی کو اگر ڈھکی چھپی دھمکی سمجھا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا۔
ان قراردادوں کا حاصل بھی یہی نکلتا ہے کہ تنظیمی کانگریس کے دربار سے بھی مسلمانوں کے حقوق ملنے کی
توقع نہیں کی جا سکتی جبکہ یہ بات کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ وہ جن سنگھ جیسی پارٹیوں کو اپنی ہم خیال پارٹیوں میں شمار
کرتی ہے۔

اب ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ کیا شریمتی مسز اندرا گاندھی کی قیادت سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں
کو ان کے حقوق صرف زبانی طور پر نہیں بلکہ عملاً مل جائیں گے؟ میں یہ بحث یہاں نہیں کرتا کہ جب آں جہانی پنڈت
جواہر لال نہرو مسلمانوں کو ان کے حقوق عملاً نہیں دلا سکے تو آج مسز اندرا گاندھی کس قوت پر انہیں یہ حقوق دلا دیں گی
اور میں یہ بحث بھی نہیں کرتا کہ وہ مسلمانوں کو ایک منفرد تہذیبی و مذہبی یونٹ تسلیم کرتی ہیں یا نہیں اور اس حیثیت سے
انہیں ان کے حقوق دلانا چاہتی بھی ہیں یا نہیں؟ میں یہاں مسلمانوں کے ایک ایسے مطالبے کے سلسلے میں جس کی حمایت بہت
سے برادران وطن بھی کر رہے ہیں، ان کی بے بسی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں ابھی ان کے گروپ کا جو انقلابی سیشن بمبئی میں
ہوا ہے اسی موقع پر اردو زبان کو اس کا جائز حق دینے کے مطالبے کے لیے ایک کنونشن منعقد ہوا اور یہ مطالبہ ملک
کی پندرہ زبانوں کے ممتاز ادیب و شاعر و دانشور گروہ کی طرف سے پیش ہوا اور اس مطالبے کی پذیرائی کے بارے
میں بہت سی توقعات قائم کر لی گئیں لیکن اس کنونشن میں مسز اندرا گاندھی نے اس مطالبے پر جو تقریر کی وہ یہ تھی:

> اردو کے مسئلے کی جو اہمیت ہے وہ میں جانتی ہوں مجھے یہ بتانے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ ہم نے اپنے طور
> پر پوری کوشش کی کہ اس زبان کو اس کا جائز حق دیا جائے لیکن ہم کامیاب نہیں ہوئے۔ اردو کا مسئلہ بڑا
> پیچیدہ مسئلہ ہے، اس کی راہ میں جو مشکلات ہیں وہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی جانتی ہوں۔ میں کوئی وعدہ
> نہیں کر سکتی اس لیے کہ مجھے یقین نہیں ہے کہ میں اسے پورا کر سکوں گی۔ اس سلسلے میں ہمارے ہاتھ بندھے ہوئے
> ہیں۔ اگر اردو کے لیے کچھ کیا جائے تو ڈر ہے کہ اس کا نتیجہ کہیں ایسا خوفناک نہ نکل آئے کہ آپ کو اسکولوں میں
> اردو پڑھنا بھی مشکل ہو جائے۔۔۔۔۔ پھر اس کے بعد انھوں نے اردو زبان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ یہ

ایک خوبصورت زبان ہے اور ہمارا مشترکہ ورثہ ہے ایسی خوبصورت چیز کو ہم کھوئیں کیوں ؟ یہ سوال ہے لیکن جو ذہنیت پیدا ہوگئی ہے اس کا بدلنا مشکل ہے۔ (دعوت دہلی، ۲ جنوری ۱۹۷۰ء)

شومئی قسمتی کی یہ تقریر سن کر لوگوں کی توقعات کا محل دھڑام سے زمین بوس ہوگیا۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے اردو کو اس کا جائز حقوق دلانے کی کیا کوشش کی ؟ ہندوستان کی جرات مند وزیراعظم کے ہاتھ کس نے باندھ رکھے ہیں ؟ اردو کے لیے حکومتی سطح پر کوئی فیصلہ کیوں ٹھیک نہیں ہوگا اور اس سے کیا غلط فہمیاں اور کیا مشکلات پیدا ہوں گی ؟ نڈر وزیراعظم اگر یہ باتیں واضح کر دیتیں تو اردو کا جائز حق مانگنے والوں کی شاید کچھ تشفی ہو جاتی ـــــ وزیراعظم نے جب سوشلزم کے کاز کے لیے دائیں بازو کی تمام پارٹیوں یہاں تک کہ سنڈیکیٹ اور اس کے طاقتور حامیوں کی مخالفت کی پروا نہیں کی اور اپنی تقریروں میں بڑے جوش کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ہم اس وقت میدان جنگ میں ہیں تو غریب اردو کو اس کا حق جس کو وہ خود بھی جائز حق کہتی ہیں، عطا کرنے کا وعدہ کرلیتیں تو کون سی نئی قیامت ٹوٹ پڑتی۔ پارلیمنٹ میں ابھی ان کی حکومت مضبوط ہے۔ اے آئی سی سی کے ارکان کی اکثریت ان کے ساتھ ہے اور کانگریس کے مندوبین کی اکثریت بھی ان کی حامی ہے تو پھر خوف کس کا ہے ؟ ہمیں تو اب تک یہ معلوم تھا کہ اردو کی مخالفت صرف جن سنگھ کرتا ہے لیکن اب وزیراعظم کی تقریر سے یہ اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید ان لوگوں کی اکثریت بھی اردو کو اس کا جائز حق دینے پر آمادہ نہیں ہے۔ جو سوشلزم کا نعرہ لگا کر ان کے ساتھ میدان عمل میں اتری ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی حیرت کے ساتھ نوٹ کی گئی ہے کہ اس نازک موڑ پر انفرادی تقریروں میں مسلمانوں کی پرجوش ہمدردیوں کے باوجود وزیراعظم کے گروپ کے ہریجن صدر نے اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے مسائل کا ذکر نہیں کیا یہاں تک کہ غریب اردو کے لیے بھی ان کے قلم سے کوئی کلمۂ خیر نہیں نکل سکا۔ ان کا خطبۂ صدارت پڑھ کر کوئی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ مسلمانوں کے بھی کچھ مسائل ہیں جنہیں حل کرنا ہے اور ان کی بھی کچھ مشکلات ہیں جنہیں دور ہونا چاہیے۔ سوشلسٹ صدر نے ہریجنوں کے مسائل کا ذکر کیا ٹھیک کیا لیکن مسلمان کیوں نظر انداز کیے گئے ؟ اس سے ہوا کا رخ معلوم ہو جاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب اردو زبان کا جائز حق دینے کا وعدہ وزیراعظم نہیں کرسکتیں کیونکہ انہیں اسے پورا کرنے کا یقین نہیں ہے تو پھر اس سے اہم تر حقوق ملنے کی ان سے یا ان کی کانگریس سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

صحیح اور سچی بات یہ ہے کہ مسلمانوں کو مسلمانوں کی حیثیت سے ان کے حقوق دینے کے لیے ہندوستان

کی کوئی ایک سیاسی پارٹی بھی آمادہ نہیں ہے خواہ وہ دائیں بازو کی ہو یا بائیں بازو کی —— دائیں بازو کی پارٹیاں ایک ایسا سرمایہ دارانہ نظام نافذ کرنا چاہتی ہیں جس پر قدیم ہندو تہذیب و تمدن کی پوری چھاپ ہو اور جس میں مسلمانوں کی حیثیت صرف ان کے خیمہ برداروں کی ہو اور بائیں بازو کی پارٹیاں یہاں ایک ایسا سوشلسٹ نظام قائم کرنا چاہتی ہیں جس پر ماڈرن تہذیب کی چھاپ لگی ہوئی ہو اور جس میں مسلمانوں کی حیثیت اس نظام کے حلقہ بگوشوں کی ہو۔ اسلام اسلامی تہذیب، اسلامی روایات اور اسلامی انفرادیت نہ دائیں بازو کے لیے قابل برداشت ہے اور نہ بائیں بازو کے لیے اور ان دونوں بازوؤں میں خود مسلمانوں کی بھی ایک قلیل تعداد شامل ہے۔ اگر آج مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ اس لیے توڑے جا رہے ہیں کہ وہ باجپئی یا مدھوک کیوں نہیں بن جاتے تو کل اس لیے توڑے جاسکتے ہیں کہ وہ ڈانگے یا نمبودری پد کیوں نہیں بنتے۔

اس صورت حال میں بھی اگر مسلمان اپنی حیثیت کو پہچاننے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کیے ہوئے فریضہ حیات کو ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو کم سے کم اجتماعی طور پر ان کو یہ فیصلہ ضرور کرلینا چاہیے کہ وہ کیا بننا چاہتے ہیں۔ وقت اور زمانہ ان کے انتظار میں رکا نہیں رہے گا وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کریں گے تو کوئی نہ کوئی فیصلہ ان پر تھوپ دیا جائے گا اور اس کے آگے انہیں سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے سوا شاید ہی کوئی گروہ ایسا ہو جس نے اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہ کرلیا ہو صرف مسلمانوں نے اپنے بارے میں اب تک اجتماعی طور پر کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔

میں یہ جانتا ہوں اور اس پر اللہ کا شکر بھی ادا کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی اکثریت خود مسلمان رہنا چاہتی اور اپنی آئندہ نسل کو بھی مسلمان رکھنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو ختم کرنا نہیں چاہتی لیکن صرف خواہش سے کچھ نہیں ہوتا۔ میں یہاں خواہش کی نہیں بلکہ فیصلہ کی بات کر رہا ہوں۔ کسی چیز کی خواہش اور اس کی طرف میلان و رغبت میں بھی ملا کرتا ہے جو شعوری بھی ہوسکتا ہے اور غیر شعوری بھی لیکن فیصلہ ہمیشہ شعوری ہوتا ہے اسی لیے اس کے بعد اقدام و عمل ضروری ہو جاتا ہے۔ دو چیزوں کے درمیان مقابلہ اور ان دونوں کے میزانیۂ نفع و نقصان پر غور کرکے ان میں سے کسی ایک چیز کو ترجیح دینے اور پختہ ارادے کے ساتھ اسے حاصل کرنے کے لیے اقدام کرنے کا نام "فیصلہ" ہے۔ اس نازک موقع پر بھی اگر مسلمانوں نے اپنی خواہش کو فیصلے میں تبدیل نہیں کیا تو وہ سخت گھاٹے میں رہیں گے۔

ہمارے کتنے ہی دانشور ایسے ہیں جو کہتے رہتے ہیں کہ مسلمانوں میں کوئی "قیادت" موجود نہیں ہے —— یہ صورت حال

عجیب ہے کہ مسلمانوں کی قیادتیں رو رہی ہیں کہ انہیں مردان کار نہیں ملتے اور مردان کار کہہ رہے ہیں کہ انہیں قیادت نہیں ملتی۔ ہر معقول آدمی یہ سمجھنے پر مجبور ہوگا کہ قیادت نہ ملنے کی شکایت اپنی بے عملی کو چھپانے کا ایک بہانہ ہے۔ قیادت کہیں آسمان سے نہیں ٹپکتی بلکہ مردان کار اپنے میں سے کسی کو قائد منتخب کرتے اور اس کی قیادت میں آگے بڑھتے ہیں۔ یہ کہنا غلط ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی قیادت موجود نہیں ہے۔ یہاں مسلمانوں کی متعدد ایسی جماعتیں کام کر رہی ہیں جو کم سے کم اس بات پر متفق ہیں کہ یہاں مسلمانوں کو مسلمان ہی بن کر رہنا ہے اور ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کی جانی چاہیے جو ان کی اسلامی انفرادیت کو ختم کرنے کے لیے کی جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا مسلمان اجتماعی طور پر عملاً ان میں سے کسی ایک کا بھی ساتھ دے رہے ہیں؟ قیادت کوئی بھی ہو مردان کار کی قوت اور اپنے ماننے والوں کے جوش عمل سے چمکتی اور آگے بڑھتی ہے۔ دور سے کھڑے ہو کر ہر قیادت کا انکار کرنے اور "قیادت، قیادت" پکارنے سے نہ قیادت ملتی ہے اور نہ کوئی کام بنتا ہے۔

اوپر کی تفصیل اس لحاظ سے تھی کہ مسلمانوں کے جو اہم حقوق ہیں وہ بھی انہیں خود ہی حاصل کرنے ہوں گے جس کے لیے عزم، فیصلے، ایثار و قربانی اور صبر و تحمل کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر کوئی شے بھی حاصل نہیں ہوتی لیکن ہمارے نزدیک صرف چند حقوق کا حصول مسلمانوں کا اصل مقصد حیات نہیں ہے اور نہ یہ ان کا اصل منصب ہے جیسا کہ اوپر اشارہ گزرا ان کا اصل کام اس دعوت حق کی اشاعت ہے جسے اللہ نے تمام انسانیت کے لیے نازل کیا ہے اور جو تمام بنی نوع انسان کی مشترکہ متاع ہے۔ اگر ہندوستان کے باشندے اپنی اس مشترکہ اور گم شدہ متاع کی طرف مائل ہو جائیں تو ان کے دل و دماغ کی دنیا بدل جائے گی اور پھر نہ صرف مسلمانوں کو ان کے حقوق مل جائیں گے بلکہ ان تمام لوگوں کے حقوق مل جائیں گے جو اس وقت زبردست اور ظلم و زیادتی کے شاکی ہیں۔ جماعت اسلامی ہند مسلمانوں کے سامنے بھی اور دوسرے برادران وطن کے سامنے بھی ایک طویل عرصے سے دعوت حق کی اشاعت کا کام انجام دے رہی ہے اور مسلمانوں کو وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوْا کا سبق یاد دلا رہی ہے وہ یقین رکھتی ہے کہ جب تک مسلمان عملاً یہ سبق یاد نہ کر لیں ان کے مسائل حل نہیں ہو سکتے اور نہ یہ ملک امن و آشتی کا گھر بن سکتا ہے۔

اسلام کا تصور اخلاق

(۳)

(مولانا سید جلال الدین عمری)

غرض و غایت

اخلاق کی غرض و غایت کیا ہے؟ کیوں انسان اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرے اور ان کے لیے تکلیف اٹھائے؟ وہ کیا مقصد ہے جو اخلاق کے ذریعے انسان حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اس سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک معلوم کرنے کے لیے ہمیں ایک دوسرے سوال پر غور کرنا ہوگا جو اس سے زیادہ وسیع ہے۔ وہ یہ کہ اخلاق ہی کی نہیں بلکہ انسان کے تمام اعمال کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کے ہر کام کا کیا ہدف ہونا چاہیے اور اس کو کس مقصد کے لیے تگ و دو کرنی چاہیے؟ اس وسیع سوال کو اگر حل کرلیا جائے تو خود بخود اخلاق کی غرض و غایت متعین ہو جائے گی۔ کیونکہ اخلاق کا تعلق انسانی عمل کے ایک محدود گوشے سے ہے۔ اس محدود گوشے کا لازماً وہی مقصد ہو سکتا ہے جو انسان کی پوری زندگی اور اس کے تمام اعمال کا مقصد ہے۔ اس سے ہٹ کر اس کا کوئی دوسرا مقصد ہو نہیں سکتا۔

زندگی کی غرض و غایت متعین کرنا شاید دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ اس موضوع پر سوچنے والے ہمیشہ سوچتے رہے ہیں۔ ایک رجحان جو پہلے بھی رہا ہے اور آج بھی جس کو بہت سے مفکرین کی حمایت حاصل ہے۔ یہ ہے کہ زندگی کو حصول مسرت کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ مسرت وہ آخری غرض و غایت ہے جو انسان اس دنیا میں پانا چاہتا ہے۔ اس کی ساری دوڑ دھوپ اسی کے لیے ہوتی ہے اور اس کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اسی کی تلاش میں صرف ہوتی ہیں۔ اگر اس کو مسرت مل جائے تو اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو گیا۔

لیکن اس دنیا میں مسرتیں بے شمار بھی ہیں اور مختلف و متضاد بھی۔ ان میں سے ہر مسرت کے پیچھے انسان دوڑ

نہیں سکتا۔ اس لیے مجبوراً اس کو ان کے درمیان انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ وہ بعض مسرتوں سے اپنی نظر پھیر لیتا ہے اور بعض کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہ ترک و اختیار الل ٹپ اور من مانے طریقے سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے کچھ متعین اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ ان ہی کے تحت انسان مسرتوں کی طویل فہرست میں سے کسی ایک یا چند مسرتوں کا انتخاب کرتا ہے۔ جب تک کوئی اصول نہ ہو یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس خوشی کو کس خوشی پر ترجیح دی جائے اور کس خوشی کو اہم اور کس خوشی کو غیر اہم کہا جائے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی مسرتیں کسی قانون کے تابع ہونی چاہییں۔ یہ مسرت پر قانون کی بالاتری کا کھلا اعتراف ہے۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کے نزدیک زندگی حصول مسرت کے لیے نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ کسی اعلیٰ ترین اور صحیح ترین قانون کی پیروی کی جائے قانون کی بالاتری کو ماننے کے بعد انسان کوئی بھی رویہ اختیار کرتے وقت یہ نہیں دیکھے گا کہ اس سے مجھے خوشی حاصل ہوتی ہے یا نہیں بلکہ یہ دیکھے گا کہ اس کے تسلیم کردہ قانون کی رو سے وہ صحیح ہے یا نہیں! وہ اصول اور قانون کی خاطر اپنی مسرتیں چھوڑ دے گا لیکن اصول اور قانون کو کبھی نہیں چھوڑے گا۔

بعض لوگوں کے نزدیک انسان اپنے خیالات، عادات و اطوار، رہن سہن، تمدن و معاشرت، اخلاق اور قانون ہر پہلو سے بتدریج ترقی کر رہا ہے اور پستی سے بلندی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ اپنے آغاز حیات میں جانوروں کی سی زندگی گزارتا تھا۔ ایک مدت کے بعد اس کی زندگی جانوروں کی زندگی سے ممتاز ہوئی، اس کے شعور اور تمیز میں ارتقا ہوا جس کے نتیجے میں وہ بدویت سے نکل کر تہذیب و تمدن کے دائرے میں داخل ہوا اور جہالت سے علم کی روشنی میں آیا۔ بہت سی وہ چیزیں جن کو وہ اپنے غیر متمدن دور میں مستحسن سمجھتا تھا، ان کو ناپسندیدہ قرار دینے لگا اور بہت سے ان توہمات پر سے اس کا اعتقاد ختم ہوا جن کو اس نے حقائق کا درجہ دے کر رکھا تھا۔ بہت سے وہ اصول و قواعد اس نے چھوڑ دیے جن پر وہ سختی سے عمل کر رہا تھا۔ اس طرح انسان ذہنی اور عملی طور پر بتدریج اور مسلسل آگے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ انسان کا مقصد حیات اس ارتقا کو جاری رکھنا ہے تاکہ اس کا نقص دور ہو اور اس کی شخصیت کی تکمیل ہو سکے۔ جب پوری زندگی کا مقصد ہی تکمیل شخصیت ہو تو اخلاق کو بھی ہماری تکمیل کا باعث ہونا چاہیے۔

زندگی کا مقصد چاہے حصول مسرت قرار دیا جائے یا قانون کا اتباع یا تکمیل ذات، ان میں سے ہر مقصد غیر متعین ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے ان کا مفہوم متعین کرنے میں سخت اختلافات رہے ہیں۔ مسرت ایک اضافی چیز ہے۔ اس کا مفہوم محدود بھی ہو سکتا ہے اور وسیع بھی، خالص مادی بھی ہو سکتا ہے، ذہنی اور روحانی بھی، ہیں

جس چیز کو وہ مسرت سمجھوں بہت ممکن ہے وہ دوسرے کے لیے کلفت کا سبب ہو۔ کسی کی خوشی کھانے پینے اور عیش و عشرت میں ہوگی اور کوئی اعلیٰ خیالات اور شائستہ عادات و اطوار میں مسرت محسوس کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اخلاق کے ذریعے انسان مسرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کس قسم کی مسرت ہے؟

اسی قسم کے سوالات قانون کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب ہم قانون کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے کون سا قانون مراد ہے؟ کیا وہ قانون جس کو انسان کی عقل اور فطرت صحیح قرار دے یا وہ قانون جسے اس کے مذہب کی سند حاصل ہو یا وہ قانون جسے اس کا معاشرہ صحیح سمجھتا ہو یا وہ قانون جسے وقت کی حکومت نے قانون کی حیثیت دے رکھی ہو؟ ان میں سے جس قانون کو بھی آپ دوسرے پر ترجیح دیں گے اس کے لیے ترجیح کی کوئی وجہ ہونی چاہیے۔ سوال یہ ہے کہ وہ وجہ ترجیح کیا ہے؟ اور کیا وہ سب کے لیے قابلِ قبول بھی ہے؟

تکمیلِ ذات کے نظریے سے متعلق بھی اسی قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ آیا اس سے انسان کی مادی تکمیل مراد ہے یا روحانی اور اخلاقی تکمیل؟ پھر یہ کہ تکمیلِ ذات کا مذکورہ بالا تصور کمال کا کوئی ایک معیار متعین نہیں کرتا بلکہ اس کو زمانے کے حوالے کر دیتا ہے کہ وہ جس معیار کو چاہے اختیار کرے اور جس معیار کو چاہے رد کر دے۔ چنانچہ معیار کے بدل جانے کی وجہ سے آج کا کامل ترین انسان کل ناقص قرار پا سکتا ہے اور کل جس کو ناقص سمجھا جاتا تھا آج اس کو کمال کی سند حاصل ہو سکتی ہے۔ علاوہ ازیں ایک ہی دور میں مختلف و متضاد نظریات اور زندگی کے بے شمار طریقے اپنے اپنے نہج پر تکمیلِ ذات کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ یہ فیصلہ کون کرے کہ ان میں سے کس نظریے سے فی الواقع انسان کی تکمیل ہوتی ہے اور کون سا نظریہ پستی کی طرف لے جاتا ہے؟

اس طرح ان نظریات کو ماننے کے بعد ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں جہاں ہم مسرت کا نام تو لیتے ہیں لیکن اس کا تعین نہیں کر پاتے۔ قانون کا ذکر تو کرتے ہیں لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کس قانون کی برتری تسلیم کی جائے، اپنی شخصیت کی تکمیل تو چاہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ تکمیل کس طرح ہوتی ہے؟

موجودہ دور کا ایک عام رجحان یہ ہے کہ زندگی کی غرض و غایت متعین کرتے وقت خدا اور آخرت کو زیرِ بحث نہیں لانا چاہیے۔ چنانچہ آج کوئی بھی مقصدِ حیات اس حقیقت کو مان کر متعین نہیں کیا جاتا کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے اور آخرت آنے والی ہے بلکہ اس موضوع پر خدا و آخرت کے تصور سے بے نیاز ہو کر غور کیا جاتا ہے حالانکہ خدا اور آخرت کو مانے بغیر انسان کا جو بھی مقصدِ حیات متعین کیا جائے اس کے لیے کوئی مضبوط دلیل فراہم نہیں کی جا سکتی۔ البتہ اس کو ماننے کے بعد ہم خالص علم و عقل کی روشنی میں زندگی کا

ایک مقصد متعین کر سکتے ہیں۔ اسلام نے یہی کام انجام دیا ہے۔ اس کے نزدیک خدا نے انسان کو یہ زندگی اس لیے عطا کی ہے تاکہ وہ اس کی عبادت کرے اور اس کے احکام بجالائے۔ جو شخص زندگی کے اس مقصد کو پورا کرے گا خدا کی رضا اور خوشنودی اس کو حاصل ہوگی اور وہ آخرت میں کامیاب ہوگا۔ زندگی کے اس مقصد کو جو شخص ماننے سے انکار کردے وہ خدا کے غضب کا مستحق اور آخرت میں ناکام ہوگا۔

زندگی کا یہ مقصد اس سوال کا جواب بھی آسانی سے فراہم کر دیتا ہے کہ ہماری مسرت کس چیز میں پوشیدہ ہے۔ ہمیں کس قانون کی پیروی کرنی چاہیے اور ہماری تکمیل کس طرح ہوتی ہے۔ سب سے پہلے آپ مسرت کو لیجیے یہ انسان کی فطرت ہے کہ اس کے سامنے جو مقصد ہوتا ہے اس سے اس کو محبت ہوتی ہے اور وہ اس کو پورا کر کے خوشی محسوس کرتا ہے۔ جو شخص خدا کی عبادت کے ذریعے اس کی رضا حاصل کرنا چاہے اور اسی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دے لے اس کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ اپنے آپ کو خدا کی عبادت میں لگا دے اور اس کے لیے سب سے بڑی مسرت یہ ہوگی کہ اس کا خدا اس سے خوش ہو جائے۔ وہ ہر آن خدا کی عبادت کی طرف لپکے گا اور اس کی خوشی حاصل کرنا چاہے گا اور ہر اس کام سے دور رہنا چاہے گا جو خدا کی ناخوشی کا باعث ہو۔ اگر اس پر صحیح معنے میں یہ مقصدِ حیات غلبہ پالے تو وہ اپنی ہستی کو خدا کی خوشی کے لیے فنا کردے گا اسی کیفیت کو قرآن مجید نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (البقرہ: ۲۰۷)	لوگوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو خدا کی رضا کی تلاش میں اپنے آپ کو بیچ ڈالتے ہیں

ایک حدیث شریف میں ہے:۔

ذَاقَ طَعْمَ الْاِيْمَانِ مَنْ رَضِيَ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا (مسلم)	ایمان کا مزا چکھ لیا اس شخص نے جو خوش ہوگیا اللہ سے اس کو اپنا رب مان کر، اسلام سے اس کو اپنا دین مان کر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو اپنا رسول مان کر۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جس طرح مادی چیزوں میں لذت ہوتی ہے اسی طرح ایمان کی بھی ایک لذت ہے۔ یہ لذت اس شخص کو نصیب ہوتی ہے جو خدائے تعالیٰ کو اپنا پروردگار، اسلام کو اپنا دین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی و راہنما محض ایک حقیقت واقعہ کے طور پر ہی نہ مانے بلکہ ان حقیقتوں کو پاکر مسرت اور خوشی

محسوس کرے ۔ وہ یہ سوچ کر کیف و سرور میں ڈوب جائے کہ خدا اس کا رب ہے۔ اسلام کی سی دولت اس کو ملی ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اس کو حاصل ہے ۔

اسلام نے ایمان کی ایک علامت یہ بتائی ہے کہ انسان خدا کے احکام کی تعمیل کسی خارجی دباؤ، مروت، اور مجبوری کے تحت نہ کرے بلکہ دل کی آمادگی اور خوشی کے ساتھ ان کو انجام دے ۔ جب خدا کو خوش کرنے والا کوئی کام اس سے انجام پائے تو مسرت اور خوشی کی کیفیت اپنے اندر پائے اور اگر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے تو اس پر فخر نہ کرے، بلکہ اس کو دل سے ناپسند کرے ۔ چناں چہ ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں

اذا سرتك حسنتك وساءتك	جب تمہاری نیکی تم کو خوش کردے اور
سیئتك فانت مومن	تمہاری برائی تم کو بری لگے تو تم مومن ہو ۔

اس سے آگے کی بات اسلام نے یہ بتائی ہے کہ جہاں کہیں بھی خدا کی مرضی پوری ہو رہی ہو ایک بندۂ مومن کو اس سے مسرت محسوس کرنی چاہیے، خواہ وہ اس میں شریک نہ ہو سکا ہو۔ اسی طرح برائی کے خلاف اس کے دل میں نفرت کا پایا جانا ضروری ہے ۔ جس دل میں برائی کے خلاف نفرت نہیں ہے اور وہ اس کو پسند کر رہا ہے اگر وہ عملاً اس سے دور بھی ہے تو کم از کم ذہناً اس میں حصہ دار ہی سمجھا جائے گا۔ چناں چہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔

اذا عملت الخطیئۃ فی الارض	جب کسی جگہ گناہ کیا جائے اور اس میں کوئی
من شهدها فكرهها كان كمن	شخص موجود ہو لیکن اس کو ناپسند کرے تو گویا
غاب عنها ومن غاب عنها فرضيها	وہ اس سے غائب رہا لیکن جو شخص اس سے غائب
كان كمن شهدها	تو رہا لیکن اس کے ارتکاب پر خوش رہا وہ
(ابوداؤد)	گویا اس میں حاضر رہا ۔

مومن کی خوشی اور ناخوشی خدا کی خوشی اور ناخوشی کے تابع ہوتی ہے ۔ اس کو ہر اس کام سے خوشی حاصل ہوتی ہے جس سے خدا خوش ہو اور ان تمام کاموں سے تکلیف پہنچتی ہے جو خدا کی ناخوشی کا سبب ہوں ۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان ان ہی چیزوں سے خوشی محسوس کرتا ہے جن سے فی الواقع اسے محبت ہو جن چیزوں سے اس کو محبت نہیں ہوتی ان کے حاصل ہونے سے اس کو کوئی خوشی بھی نہیں ہوتی ۔ بلکہ بعض اوقات اذیت پہنچتی ہے ۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ بتایا ہے کہ اہل ایمان کو خدا کی ذات سے، اس کے احکام سے، اس کے

چاہنے والوں سے بلکہ ان تمام چیزوں سے جو خدا کو پسند ہیں، بے پناہ محبت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف خدا کے انکار، شرک ونفاق، اس کی نافرمانی اور معصیت سے ان کو سخت نفرت ہوتی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ	اللہ تعالیٰ نے پسندیدہ کر دیا تمہارے
الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ	لیے ایمان کو اور تمہارے دلوں میں اس کو زینت
وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ	دے دی اور ناپسندیدہ کر دیا تمہارے لیے
وَالْعِصْيَانَ (الحجرات)	کفر وفسق اور نافرمانی کو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے نزدیک خدا کی عبادت زندگی کا مقصد ہے۔ ایک مومن کو مسرت اسی مقصد کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اخلاق کی پابندی کو بھی وہ خدا کی عبادت سمجھتا ہے۔ اس لیے جب وہ کوئی اخلاقی کام انجام دیتا ہے تو مسرت محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ اس طرح اس کے مقصدِ حیات کی تکمیل ہوتی ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ اسلام نے خدا اور آخرت کا جو عقیدہ پیش کیا ہے، اس سے قانون کے اتباع کا تصور کیسے پیدا ہوتا ہے اور اخلاقی زندگی پر اس کے کیا اثرات پڑتے ہیں۔ اسلام میں خدا کے احکام ہی قانون ہیں۔ ان احکام کا اتباع اس کے نزدیک ایک برتر قانون کا اتباع ہے۔ جو شخص خدا کو ماننے اور اس کے احکام کو نہ ماننے یا کسی کے حکم کو خدا کے حکم سے برتر سمجھے تو اس کا ایمان ہی صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے ایک مومن خدا کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرے گا۔ یہ اطاعت جس طرح زندگی کے تمام معاملات میں ہوگی اسی طرح اخلاق کے معاملے میں بھی ہوگی۔ اخلاقی احکام کی نوعیت وہ نہیں ہوتی جو قانونی احکام کی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایک مومن دونوں ہی قسم کے احکام کو اس حیثیت سے قبول کرے گا کہ وہ خدا کے احکام ہیں اور ان کی اتباع ہونی چاہیے۔

قرآن وحدیث میں اخلاقی ذمہ داریوں کے لیے بکثرت 'حق' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ 'حق' ثابت اور طے شدہ چیز کو کہتے ہیں۔ گویا اخلاقی احکام بھی ثابت اور طے شدہ احکام ہیں جن کو ایک مومن کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر ایک جگہ کہا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ	ان کے مالوں میں حق ہے مانگنے والے کا
مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (المعارج [۲۴])	بھی اور نہیں مانگنے والے کا بھی۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:۔

فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ذٰلِكَ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ الروم : ۳۸

پس ادا کرو قرابت دار کو اس کا حق اور مسافر کو یہ بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو خدا کی رضا چاہتے ہیں

ظاہر ہے ان آیتوں میں جس 'حق' کا ذکر کیا گیا ہے وہ قانونی حق نہیں بلکہ اخلاقی حق ہے۔ احادیث میں تو اخلاقی ذمہ داریوں کے لیے 'حق' کا لفظ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ذیل میں ہم صرف دو حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

حق المسلم على المسلم خمس رد السلام وعيادة المريض واتباع الجنائز واجابة الدعوة وتشميت العاطس (بخاری، مسلم)

مسلمان کے مسلمان پر پانچ حق ہیں۔ اس کے سلام کا جواب دینا، وہ اگر بیمار ہو جائے تو عیادت کرنا، اس کا انتقال ہو جائے تو جنازے کے پیچھے چلنا، وہ دعوت دے تو قبول کرنا اور وہ چھینک کر الحمد للہ کہے تو اس کا جواب دینا۔

دوسری حدیث جو ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے۔ آپ نے ایک مرتبہ صحابہ سے فرمایا:۔

اعطوا الطريق حقه قالوا وما حق الطريق يا رسول الله قال غض البصر وكف الاذى ورد السلام والامر بالمعروف والنهى عن المنكر (بخاری، مسلم)

راستے کو اس کا حق ادا کرو۔ لوگوں نے پوچھا یا رسول اللہ! اس کا حق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا۔ نگاہ نیچی رکھنا، کسی کو تکلیف پہنچانے سے باز رہنا، سلام کا جواب دینا، معروف کا حکم دینا اور منکر سے منع کرنا۔

اسلام نے خدا کے احکام کی اطاعت کا، جس میں اخلاقی احکام بھی شامل ہیں بہت ہی اونچا تصور پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ انسان ان احکام کی اطاعت محض اس جذبے سے کرے کہ وہ خدا کے احکام ہیں اور ان سے اس کی رضا حاصل ہوتی ہے، اس کے سوا کوئی دوسری غرض اس کے پیچھے نہ ہو۔ اگر وہ کسی کے ساتھ حسن سلوک کرے تو یہ نہ سمجھے کہ اس پر کوئی احسان کر رہا ہے جس کے لیے اس کو شکر گزار رہنا چاہیے بلکہ یہ تصور رکھے کہ حسن سلوک خدا کا حکم ہے اور وہ اس کی تعمیل کر رہا ہے۔ اس کا بدلہ خدا ہی کی طرف سے عطا ہوگا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ

جو لوگ اپنے مالوں کو خدا کی راہ میں خرچ

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًی لَّھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ خَیْرٌ مِّنْ صَدَقَۃٍ یَّتْبَعُھَآ اَذًی وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَلِیْمٌ ۝

(البقرہ: ۲۶۲-۲۶۳)

کرتے ہیں پھر اپنے انفاق کے بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ ایذا پہنچاتے ہیں ان کے لیے اجر ہے اُن کے رب کے پاس۔ وہاں نہ ان کو خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اچھی بات کہنا اور دوسروں کی غلطی سے درگذر کرنا اس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد تکلیف پہنچائی جائے اور اللہ بے نیاز اور حلم والا ہے۔

اس معاملے میں ایک مومن کے جو جذبات ہوتے ہیں اس کی تصویر کشی قرآن مجید میں ایک جگہ اس طرح کی گئی ہے :-

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا یَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۝

(الدھر)

اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ حالانکہ خود ان کو اس کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر بھی وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں صرف خدا کی رضا کے لیے کھلاتے ہیں اور تم سے کوئی بدلہ اور احسان گزاری نہیں چاہتے۔ ہم اپنے رب سے ڈرتے ہیں (اس کی طرف سے آنے والے) اس دن سے جو بہت ترش رو اور سخت ہے۔

اگر یہ پاکیزہ جذبہ کسی کے اندر نہیں ہے تو اسلام کے نزدیک اس کے کسی بھی اخلاقی رویے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ قانون کی مخلصانہ پابندی کا یہ اتنا اونچا تصور ہے کہ اس سے اونچا تصور شاید نہیں کیا جا سکتا۔

اب تکمیل کے تصور کو لیجیے۔ اسلام میں شخصیت کی تکمیل خدا کی اطاعت سے ہوتی ہے۔ یہ اطاعت قدم قدم پر ہونی چاہیے اور زندگی کے ہر معاملے میں ہونی چاہیے۔ خدا کی اطاعت میں انسان جتنا آگے ہوگا اتنا ہی کامل بھی ہوگا۔ اس معاملے میں اس سے جتنی کوتاہی ہوگی اتنا ہی نقص اس کے اندر پایا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص کمال تک پہنچنا چاہے اس کو اخلاق کے معاملے میں بھی خدا کی اطاعت کرنا چاہیے۔ خدائے تعالیٰ نے جن اعلیٰ اخلاقیات کی تعلیم دی ہے ان سے اس کی زندگی آراستہ ہو اور جن پست اخلاقیات سے منع کیا ہے

ان سے اس کا دامن پاک رہے۔ قرآن مجید نے خدا کے اطاعت گذار اور فرماں بردار بندوں کی جگہ جگہ جو تصویر کشی کی ہے اس میں اخلاقی خوبیاں بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔ یہ خوبیاں جب تک کسی شخص میں نہ پیدا ہوں اس کی اطاعت ناقص ہی رہے گی۔ اخلاقی بلندی کے بغیر شخصیت کی تکمیل کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں ہے ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ ایک اونچے درجے کا مومن اونچے درجے کے اخلاق کا بھی مالک ہوتا ہے۔

اکمل المومنین ایمانا — مومنوں میں اس شخص کا ایمان سب سے زیادہ

احسنہم خلقا (ابوداؤد، دارمی) — کامل ہے جس کے اخلاق سب سے زیادہ اچھے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خدا کی عبادت میں، ذکر و تسبیح میں، قانون شریعت کی پابندی میں، حلال حرام کے پاس و لحاظ میں کمال پیدا بھی کرلے لیکن اس کے اخلاق میں بلندی نہ پائی جائے تو اس کی اطاعت میں نقص ہی رہے گا اور اطاعت کے نقص کے ساتھ اسلام میں شخصیت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک حدیث سے تو معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت کی تکمیل میں حسن اخلاق کی نفل عبادات اور ذکر و تسبیح سے زیادہ اہمیت ہے چنانچہ روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک عورت کے بارے میں کہا گیا کہ وہ کثرت سے نماز پڑھتی ہے، روزے رکھتی ہے، صدقہ و خیرات بھی بہت کرتی ہے البتہ زبان دراز ہے اور اپنی زبان سے پڑوسیوں کو تکلیف پہنچاتی رہتی ہے۔ آپ نے فرمایا وہ جہنم میں جائیگی۔ ایک دوسری عورت کا ذکر کیا گیا کہ گو وہ نماز کم پڑھتی ہے اور روزے بھی کم رکھتی ہے اور چند پنیر کے ٹکڑے خیرات کرتی ہے لیکن وہ اپنی زبان سے کسی پڑوسی کو ایذا نہیں پہنچاتی۔ آپ نے فرمایا کہ وہ جنت میں جائیگی۔

اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی اطاعت اخلاق کے معاملے میں بھی ہونی چاہیے ورنہ اس پہلو سے انسان کی اطاعت میں نقص رہے گا اور اس کی شخصیت کی تکمیل نہ ہوسکے گی۔ شخصیت کی تکمیل کے لیے اخلاق کی اہمیت کا یہ ایک رخ ہے۔ اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ کی کامل اور ہمہ جہتی اطاعت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی میں بعض خاص اخلاقی خوبیاں پائی جائیں۔ جب تک انسان کے اندر ضبط نفس، قوت برداشت، زہد و قناعت، صبر و ثبات، بندگی کی راہ میں آگے بڑھنے کا جذبہ، ایثار و قربانی، عزم و ہمت، شجاعت اور استقامت جیسی اخلاقی صفات موجود نہ ہوں، اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں اور زندگی کے ہر قدم پر خدا کے احکام کی تعمیل کرتا رہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ اخلاقی اوصاف خدا کی اطاعت میں کمال حاصل کرنے ہی کے لیے نہیں بلکہ ہر اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کا کوئی بھی اونچا مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ قرآن و حدیث میں ان اخلاقی اوصاف پر بار بار ابھارا گیا ہے اور ان کو پیدا کرنے کی ہر طرح

کوشش کی گئی ہے، تاکہ انسان اس قابل ہو سکے کہ وہ خدا کی پوری پوری اطاعت کرے۔

قرآن میں ہے :۔

"جس نے خدا کی اطاعت سے سرکشی کی اور دنیا کی زندگی کو (آخرت کے مقابلے میں) ترجیح دی جہنم اس کا ٹھکانا ہے لیکن جو شخص خدا کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرے اور اپنے نفس کو خواہشات کی اتباع سے روکے تو جنت اس کے رہنے کی جگہ ہوگی" (نازعات)

ایک جگہ انفاق کا حکم دیتے ہوئے فرمایا :۔

"صدقات (خاص طور پر) ان محتاجوں کے لیے ہیں جو خدا کے راستے میں اس طرح گھر گئے ہیں کہ معاش کی تلاش میں زمین میں دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ وہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ اس لیے جاہل ان کو غنی سمجھتے ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو۔ وہ چمٹ کر لوگوں سے نہیں مانگتے۔ ایسے لوگوں پر تم جو کچھ بھی خرچ کروگے اللہ اس کو جاننے والا ہے"

(بقرہ : ۱۷۷)

"بے شک وہ لوگ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں، جو اپنے رب کی آیات پر ایمان لاتے ہیں، جو اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے، جو دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل اس خیال سے کانپتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنے رب کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ ایسے لوگ نیکیوں میں جلدی کرتے ہیں اور (وہی) ان کی طرف بڑھنے والے ہیں" (المومنون)

"نیک لوگ نعمت میں ہوں گے، تختوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے۔ ان کے چہروں پر تم نعمت کی تازگی پاؤگے، خالص مہر بند شراب ان کو پلائی جائے گی، جس کی مہر مشک کی ہوگی۔ یہ ہے وہ چیز جس میں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنی چاہیے" (التطفیف)

"نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق یا مغرب کی طرف پھیر لو۔ بلکہ نیکی یہ ہے کہ آدمی اللہ، یوم آخرت، ملائکہ، خدا کی نازل کردہ کتاب اور نبیوں پر ایمان لائے اور مال سے محبت کے باوجود اس کو رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کرنے پر خرچ کرے، نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ نیک لوگ حقیقت میں وہ ہیں جو عہد کرتے ہیں تو اس کو پورا کرتے ہیں اور تنگی و محتاجی اور تکلیف اور مصیبت میں اور جنگ کے وقت صبر کرتے ہیں۔ یہی لوگ سچے ہیں

اور یہی خدا سے ڈرنے والے ہیں۔"   (البقرۃ : ۱۷۷)

"اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد چاہو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو، وہ حقیقت میں زندہ ہیں لیکن تم نہیں جانتے۔ اور ہم ضرور تمہیں خوف، بھوک، مالوں، جانوں اور آمدنیوں کے نقصان میں ڈال کر آزمائیں گے۔ جو لوگ صبر کرنے والے ہیں ان کو خوش خبری دے دو۔ وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔" (بقرۃ: ۱۵۲-۵۶)

"کمزوری مت دکھاؤ اور غم مت کرو۔ تم ہی بلند رہوگے اگر تم مومن ہو۔ اگر آج (جنگ احد میں) تم کو زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے (بدر میں) تمہاری مخالف قوم کو ایسا ہی زخم لگ چکا ہے۔ یہ زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے ہیں تاکہ اللہ دیکھے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور تمہارے درمیان سے اپنے دین کی گواہی دینے والے چن لے اور اللہ ظلم کرنے والوں کو نہیں چاہتا۔ اور یہ اس لیے ہے تاکہ اللہ خالص کرلے ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تک اللہ نے نہیں دیکھا ہے ان لوگوں کو جو اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور ابھی اس نے نہیں دیکھا ہے ان لوگوں کو جو صبر کرتے ہیں تم تو اس سے پہلے موت کی تمنا کیا کرتے تھے جب کہ وہ تمہارے سامنے نہیں تھی، اب وہ تمہارے سامنے آگئی اور تم نے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ محمد تو بس اللہ کے رسول ہیں ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ جو شخص الٹے پاؤں پھر جائے وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اللہ شکر کرنے والوں کو بدلہ دے گا۔ کوئی نفس اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔ موت کا متعین وقت لکھا ہوا ہے۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہے ہم اس کو اسی میں سے دیتے ہیں اور جو آخرت کا ثواب چاہے ہم اس کو اسی میں سے دیتے ہیں اور شکر کرنے والوں کو جلد ان کا بدلہ دیں گے۔ اس سے پہلے بہت سے نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں ان کو جو تکلیفیں پہنچیں اس سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ باطل کے سامنے عاجزی ظاہر کی اور اللہ صبر کرنے والوں کو چاہتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو معاف کردے۔ ہمارے کام

میں جو کچھ ہم سے زیادتی ہوئی ہے اس سے درگذر فرما۔ ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ پس اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور آخرت کا اس سے اچھا ثواب بھی عطا کیا اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (آل عمران: ۱۴۷، ۱۴۸)

قرآن کی مختلف آیتوں کا جو ترجمہ اوپر دیا گیا ہے اس سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شخصیت کی تکمیل کا اسلام کے نزدیک کیا تصور ہے اور اس کے لیے وہ کس قسم کی اخلاقی خوبیوں کو انسان کے اندر نشوو نما دینا چاہتا ہے؟ وہ چاہتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو رکھے، اپنی خواہشات کے پیچھے نہ دوڑے بلکہ ان کو خدا کے احکام کے تابع رکھے اور اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ اس کو کل قیامت کے دن خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے۔ اس کے اندر خودداری اور استغنا ہو، وہ دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے بلکہ خدا کی بندگی کی راہ میں جو معاشی پریشانی لاحق ہو اس کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرے۔ وہ ایک تھکے ہوئے آدمی کی طرح اور بوجھل قدموں کے ساتھ اس راہ میں نہ چلے، بلکہ پورے جوش اور ولولے کے ساتھ آگے بڑھے اور اپنی ساری دوڑ دھوپ کے باوجود یہ سمجھے کہ اطاعت اور بندگی کا حق بھی ادا نہیں ہوا ہے اور خدا کے سامنے اسے جواب دینا ہے۔ اس کے اندر نیکیوں میں سبقت اور آگے بڑھنے کا جذبہ ہو اور وہ خدا کی سب سے بڑی نعمت جنت کو حاصل کرنے کے لیے بے چین اور بے تاب رہے۔ خدا کا خوف اور تقویٰ یہ نہیں ہے کہ آدمی کچھ ظاہری رسوم و آداب کا پابند ہو جائے، بلکہ تقویٰ خدا سے صحیح تعلق، غیب کی حقیقتوں پر کامل ایمان اور انسانوں کی خدمت اور راہِ خدا میں استقامت کا نام ہے۔ کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے اندر صبر و ثبات کا وصف پایا جائے، وہ بھوک پیاس تنگی، ترشی اور جان و مال کا نقصان برداشت کرے، میدانِ جنگ سے پیٹھ نہ پھیرے، ثابت قدمی کے ساتھ اپنے محاذ پر جما رہے۔ خدا کی راہ میں جو موت آتی ہے اسے موت نہ سمجھے — کیونکہ یہ وہ موت ہے جس سے حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے۔ خدا کے نیک بندوں نے اس کی رضا کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دی ہیں۔ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہے، کبھی کمزوری اور بزدلی نہیں دکھائی اور مخالفین کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ ہر مومن کو اسی اسوہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ جب تک ان اعلیٰ اخلاق سے انسان آراستہ نہ ہو، نہ تو وہ خدا کی اطاعت میں کمال پیدا کر سکتا ہے اور نہ اس کی شخصیت کی تکمیل ہو سکتی ہے۔

خدا کی اطاعت میں کمال کے لیے جن اخلاقی اوصاف کی ضرورت ہے احادیث میں نسبتاً زیادہ وضاحت اور تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر ملتا ہے۔ ہم یہاں اس طرح کی چند حدیثیں پیش کرتے ہیں۔

زہد و قناعت

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ وہ شخص کامیاب ہے جو اسلام لایا۔ ضرورت کے مطابق روزی پائی اور جو کچھ اللہ نے دیا اس پر قانع رہا۔ (مسلم)

"دولت مندی ساز و سامان کی زیادتی کا نام نہیں ہے بلکہ حقیقی دولت مندی یہ ہے کہ دل غنی ہو۔"
(بخاری، مسلم)

صبر اور استغناء

ایک شخص نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا کام بتائیے کہ اسے انجام دوں تو مجھ سے خدا بھی محبت کرے اور لوگ بھی محبت کریں۔ آپ نے فرمایا "دنیا سے بے رغبت ہو جاؤ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس کی خواہش مت کرو، لوگ تم سے محبت کریں گے۔" (ترمذی، ابن ماجہ)

"جو شخص سوال سے بچنا چاہے اللہ تعالیٰ اس کو سوال سے بچا لیتا ہے۔ جو لوگوں سے بے نیاز ہونا چاہے اللہ اس کو بے نیاز کر دیتا ہے اور جو صبر کا طالب ہو اس کو صبر عطا کرتا ہے۔ صبر سے زیادہ اچھی اور وسیع دولت خدا کی طرف سے کسی کو نہیں دی گئی۔" (بخاری، مسلم)

"اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔ اوپر کا ہاتھ خرچ کرنے والا اور نیچے کا ہاتھ مانگنے والا ہوتا ہے۔"
(بخاری، مسلم)

ضبطِ نفس

"سب سے زیادہ فضیلت والی ہجرت یہ ہے کہ تم وہ چیزیں چھوڑ دو جو تمہارے رب کو ناپسند ہیں۔" (احمد)

"تم خدا کی حرام کردہ چیزوں سے بچو اس کے سب سے زیادہ عبادت گذار بن جاؤ گے۔" (احمد، ترمذی)

قربانی اور استقامت

"میدان جہاد میں جس کا گھوڑا بھی مارا جائے اور جس کا خون بھی بہا دیا جائے اس کا جہاد سب سے افضل ہے" (احمد)

"میدان جہاد سے مت بھاگو اگر سب لوگ مارے بھی جائیں" (احمد)

ایک مرتبہ آپ نے انسان کو ہلاک کر دینے والے سات گناہوں کا ذکر کیا۔ ان میں ایک میدان جہاد سے فرار بھی تھا۔ (بخاری، مسلم)

آپ نے فرمایا: اگر تم میدان جہاد جمے رہے، خدا سے اجر کے طالب ہوئے، آگے بڑھتے رہے اور

پیچھے نہیں ہٹے تو تمہارے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے الا یہ کہ کسی کا قرض تمہارے ذمے ہو"۔ (مسلم)

"جب تک مجاہد میدان جنگ میں ہے اور ابھی واپس نہیں ہوا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دن میں روزہ رکھے، رات میں قیام کرے اور خدا کی آیتوں کی تلاوت کرتا رہے"۔ (بخاری، مسلم)

آپ نے فرمایا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ خدا کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں۔ (بخاری، مسلم)

توازن اور اعتدال

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے آپ نے پوچھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مستقل دن میں روزہ رکھتے اور رات بھر قیام کرتے ہو، کیا یہ صحیح ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے فرمایا۔ ایسا نہ کرو۔ روزہ رکھو بھی اور چھوڑ بھی دو، رات میں قیام بھی کرو اور سوؤ بھی۔ اس لیے کہ تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھوں کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، تمہارے ملنے والوں کا بھی حق ہے۔ ہر حق دار کو اس کا حق ادا کرو۔ (بخاری، مسلم)

آپ کی ازواج مطہرات میں سے ایک کے پاس کچھ لوگ آئے اور آپ کی عبادت کا حال دریافت کیا۔ جب ان کو اس کا علم ہوا تو خدا کا کامل بندہ بننے کے لیے انھوں نے اس کو ناکافی سمجھا اور کہا کہ آپ کا معاملہ ہم لوگوں سے مختلف ہے۔ آپ کے اگلے پچھلے تمام گناہ معاف ہو چکے ہیں اس لیے مختصر سی عبادت آپ کے لیے تو کافی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس احساس کے ساتھ ایک نے کہا کہ میں رات بھر نماز پڑھا کروں گا اور آرام نہیں کروں گا۔ دوسرے نے کہا۔ میں دن میں مستقل روزے رکھوں گا، کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورتوں سے الگ رہوں گا اور ان سے تعلق نہیں رکھوں گا۔ جب آپ کو ان کی ان باتوں کا علم ہوا تو فرمایا۔ خدا کی قسم میں تم سے زیادہ خدا کے بارے میں جانتا ہوں اور تم سے زیادہ اس سے ڈرتا ہوں لیکن اس کے باوجود روزہ رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ رات میں نماز پڑھتا بھی ہوں اور سوتا بھی ہوں۔ شادی بھی کرتا ہوں۔ یہ ہے میرا طریقہ۔ جو شخص میرے اس طریقے سے اعراض کرے وہ میری پیروی کرنے والوں میں نہیں ہے۔ (بخاری، مسلم)

دوام اور استقلال

خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے خواہ وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ (بخاری، مسلم)

"تم اتنا ہی کام شروع کرو جس کی تم طاقت رکھتے ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ تو ثواب دینے سے اکتائے گا نہیں بلکہ تم خود طاقت سے زیادہ کام کو نباہ نہ سکو گے اور اکتا جاؤ گے"۔ (بخاری مسلم)

حزم واحتیاط

"معاملات میں سوچ سمجھ کر آہستہ قدم اٹھانا خدا کی جانب سے ہے اور جلدبازی شیطان کی جانب سے" (ترمذی)

"ایک شخص نے آپ سے نصیحت کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ کسی بھی معاملہ کو اس کے انجام پر غور کر کے اختیار کرو۔ اگر اس میں بھٹکنے کا اندیشہ ہو تو اسے چھوڑ دو"۔ (شرح السنہ)

"مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا" (بخاری، مسلم)

اوپر کی آیات اور حدیثوں میں جن اوصاف کا ذکر ہے وہ فی نفسہٖ اعلیٰ اخلاقی اوصاف بھی ہیں اور ان سے خدا کی اطاعت اور بندگی میں مدد بھی ملتی ہے۔ ان سے یہ صلاحیت پیدا ہوتی ہے کہ انسان بندگی کی راہ میں ترقی کرے اور کمال تک پہنچے جس طرح بعض اخلاقی خوبیاں خدا کی اطاعت میں مدد دیتی ہیں۔ اسی طرح بعض اخلاقی کمزوریاں ایسی ہیں جو انسان کو خدا کی اطاعت سے غافل کر دیتی ہیں۔ جب تک اس کی زندگی ان کمزوریوں سے پاک نہ ہو خدا کی اطاعت میں ترقی کرنا تو درکنار اس کے لیے اس راہ میں ثابت قدم رہنا بھی مشکل ہے۔ اسلام نے اس طرح کی تمام اخلاقی کمزوریوں سے انسان کو دور رہنے کی تلقین کی ہے تاکہ خدا کی اطاعت سے اس کے اندر کوتاہی اور غفلت نہ پیدا ہو اور وہ ترقی اور کمال تک پہنچے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے:۔

"بعض لوگ (خدا سے) غافل کرنے والی بات خریدتے ہیں تاکہ بے جانے بوجھے اس کی راہ سے دوسروں کو بھٹکائیں اور اس (کے دین) کو مذاق بنا لیں"۔ (لقمٰن: ۵)

اس میں وہ تمام دلچسپیاں شامل ہیں جو انسان کو خدا کے دین کو سننے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے سے روکتی ہیں۔ خدا کے نیک بندوں کی ایک صفت قرآن نے یہ بیان کی ہے کہ وہ لغویات اور کاموں سے اعراض کرتے ہیں۔ لغویات پر سے ان کا گذر ہوتا ہے تو اس میں دلچسپی نہیں لیتے بلکہ شریفانہ طریقے سے گزر جاتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی اور بے مقصد چیزوں کو چھوڑ دے" کیونکہ ان چیزوں کے اختیار کرنے کے بعد وہ خدا کی بندگی کی طرف توجہ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح آپ نے ہر وقت کے مذاق اور ٹھٹول سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ چیز اس سنجیدگی اور وقار کے منافی ہے جو خدا کی اطاعت

کے لیے مطلوب ہے۔ چنانچہ آپ کا ارشاد ہے۔ "زیادہ مت ہنسو کیونکہ اس سے دل مردہ ہو جاتا ہے۔ (احمد، ترمذی)
دور خاپن، تملق اور چاپلوسی، کم ظرفی، چھچھورا پن، کنجوسی اور بخیلی، گالم گلوچ اور بد زبانی، احسان جتانا، اس طرح کی اخلاقی کمزوریاں، طبیعت کی پستی اور دنارت کو ظاہر کرتی ہیں۔ خدا کی اطاعت میں کمال کے لیے ضروری ہے کہ آدمی فراخ حوصلہ، بلند ہمت، اور وسیع الظرف ہو۔ کوئی دنی الطبع انسان صحیح معنے میں خدا کا اطاعت گذار نہیں بن سکتا۔ اسلام نے اس طرح کی ایک ایک کمزوری کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "خدائے تعالےٰ اونچے کاموں کو پسند کرتا ہے اور پست چیزوں کو پسند نہیں کرتا"

اس کو بھی انسان کی اخلاقی کمزوری ہی کہنا چاہیے کہ وہ اپنی قوت اور صلاحیت کو ضائع کر دیتا ہے اور خدا سے اپنی کامیابی کی جھوٹی آرزوئیں کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ خدا کا قانون یہ ہے کہ انسان آرزوؤں اور تمناؤں کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی سعی و محنت سے کمال تک پہنچتا ہے۔ اسی لیے آپ نے فرمایا۔ "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھو۔ اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے، صحت کو بیماری سے پہلے، تونگری کو محتاجی سے پہلے، فرصت اور فراغت کو مشغولیت سے پہلے، زندگی کو موت سے پہلے" (ترمذی)

قرآن مجید میں ہے :-

"(آخرت کی کامیابی) نہ تو تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی برائی کرے گا اس کو اس کا بدلہ دیا جائے گا اور وہ اللہ کے مقابلے میں اپنے لیے کوئی حامی اور مددگار نہ پائے گا اور جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت بشرطیکہ وہ مومن ہو تو اس قسم کے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جائے گا"

(النساء ۴ ۱۲۳، ۱۲۴)

مطلب یہ ہے کہ خدا کے ہاں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ انسان خدا کے احکام کے سامنے اپنا سر جھکا دے برائی سے بچے اور نیکی پر عمل کرے۔ اگر یہ خوبی اس کے اندر نہیں ہے تو محض جھوٹی آرزوؤں سے وہ کامیابی نہیں حاصل کر سکتا۔

کلکی اوتار اور محمدؐ صاحب

تحریر :- پنڈت وید پرکاش اپادھیائے ایم اے

ترجمانی :- جناب وصی اقبال صاحب

ہندی پمفلٹ کلکی اوتار اور محمد صاحب کی یہ ترجمانی اس لیے شائع نہیں کی جارہی ہے کہ اس میں جتنی باتیں لکھی گئی ہیں ان سب سے ہمیں اتفاق ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ برادران وطن کا ایک طبقہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے بارے میں جو نقطہ نظر رکھتا ہے وہ ہمارے سامنے رہے ۔

(ادارہ زندگی)

تمہید

اس تحقیقی مقالے میں قدیم ہندوستانی روایات اور اسلامی روایات کو امتزاجی انداز میں پیش کیا گیا ہے اسلامی روایات میں جو مقام رسولوں، نبیوں اور پیغمبروں کا ہے، وہی مقام ہندوستانی روایات میں اوتاروں کو حاصل ہے۔ مسلمان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہیں۔ اور ہندوستانی روایات میں کلکی (اوتار) کو آخری اوتار مانا گیا ہے

بیرون ہند پیغمبر آتے ہیں اور ہندوستان میں صرف اوتار، یہ ناممکن ہے۔ کیونکہ یہ ساری زمین اللہ کی ہے اور اللہ تعالیٰ بے انصاف نہیں ہے ۔

تمام ممالک کے ادب میں ان ہی ممالک کی افضلیت کے گیت گائے گئے ہیں۔ اس لیے کوئی بھی اپنے ملک کو کمتر نہیں کہے گا۔ پیغمبر صرف عرب میں آئے ہندوستان میں نہیں، یہ ایک محدود نظریہ ہے اور اوتار صرف ہندوستان ہیں آئے دوسرے ممالک میں نہیں۔ یہ خیال بھی یک طرفہ ہے ۔

محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے آخری پیغمبر ہیں۔ یہ معلوم ہونے پر مجھے پرانوں میں اس موضوع پر تلاش و جستجو کی خواہش ہوئی۔ ہندوستانی روایات کے مطابق پہلے کچھ کلجگ (تاریک دور) گزر چکے ہیں۔ ان میں کلکی کے ظہور میں آنے سے متعلق جو واقعات رونما ہوئے اور اس کلجگ میں جو واقعات گزرے۔ ان کا مقابلہ جب میں نے محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات طیبہ سے کیا تو پوری یکسانیت پائی۔ البتہ کہیں کہیں جو بہت معمولی سا فرق ہے۔ وہ کچھ زیادہ اہم نہیں ہے۔

جدید الحادی نظریات کی دھماکہ خیزیوں سے جو تباہی ممکن ہے اس کا ازالہ دینی اتحاد[1] ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ باہمی افتراق کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ ان ہی احساسات و جذبات کے باعث میں نے یہ تحقیق کی ہے جو مذہبی اتحاد کی بنیاد ہے۔ قومی یک جہتی کے حامی اس پر معترض نہیں ہوں گے۔ اعتراض اگر ہوگا تو صرف "کوئیں کے مینڈکوں" کو لیکن اگر وہ بھی اپنے اس تنگ دائرے سے باہر نکل کر دنیا پر نظر ڈالیں تو ان کی یہ کوتاہ بینی یقیناً ختم ہو جائے گی۔

میں نے یہ تحقیقی کام کا بیڑا اس لیے بھی اٹھایا ہے کہ اللہ کے پیغام کی تبلیغ ہو۔ اب سے پہلے اس موضوع پر کچھ لکھا گیا ہے یا نہیں، اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن "سرورِ عالم"[2] نامی کتاب میں یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) اور کلکی اوتار ایک ہیں۔

میرا خیال ہے میرے اس تحقیقی کام کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ کیونکہ میں نے یہ کام صرف خدا کے بھروسے پر انجام دیا ہے۔

اس مقالہ میں جو دلائل اور قیاس آمیز باتیں آئی ہیں۔ وہ میری اپنی نہیں ہیں۔ میں نے انہیں ویدوں اور پرانوں سے دریافت کیا ہے، یا پھر اللہ کی جانب سے مجھ پر منکشف ہوئی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ یہ مختصر سا تحقیقی مقالہ اتحاد و یک جہتی کے لیے بہت زیادہ مفید اور مددگار ثابت ہوگا۔ صرف نام رکھ لینے سے کوئی ہندو، مسلمان یا عیسائی نہیں بن جاتا۔ اگر میں سراج الحق کو ستیہ دیپ، عبداللہ کو پنڈت رام داس یا رام مِتر اور عبدالرحمٰن کو بھگوان داس کہوں تو وہ برا نہیں مانیں گے۔ یہ صرف زبانوں کا

---

[1] دینی اتحاد سے وحدت ادیان کے معنے پیدا کرنا ایک بہت بڑی غلط فہمی کے مترادف ہوگا۔ ان الفاظ کا منشا صرف یہ ہو سکتا ہے کہ تمام لوگ جو کسی نہ کسی مذہب کے پیرو ہیں انھیں آپس میں متحد ہو کر کفر و الحاد کے مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیے۔

[2] سرورِ عالم مؤلفہ محمد مسلم

(ادارہ)

فرق ہے ۔اب اگر آپ چاہتے ہیں تو مجھے عربی زبان میں نورالہدیٰ کہہ سکتے ہیں ۔

خدا سے میری یہ دعا ہے کہ سبھی لوگوں میں خاص طور پر ہندو مسلمان میں پوری طرح اتحاد قائم ہو۔ اور میری یہ حقیر کوشش اس کا سبب بنے

کلکی اوتار اور محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تقابل مطالعہ کرنے کے بعد کہیں بعض لوگ اس شک میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ میں نے محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات طیبہ سے فائدہ اٹھا کر کلکی اوتار کی فرضی کہانی گڑھ لی ہے ۔اس لیے میں نے جن سناتن دھرمی کتابوں سے استفادہ کیا ہے ۔ان میں سے پرانوں کے تخلیقی زمانے کو عقلی اور نقلی دلائل سے ثابت کر رہا ہوں ۔

پرانوں کی تخلیق کب ہوئی ؟ یہ سوال آج بھی حل طلب ہے ۔مغربی تاریخ نویسوں نے شروت سوتروں، اُپ نشدوں اور پرانوں وغیرہ کا زمانہ تخلیق متعین کرنے کے مقام پر جگہ جگہ لفظ "شاید" کا استعمال کثرت سے کیا ہے ۔جو ان کے فیصلے کی کمزوری کا بین ثبوت ہے ۔

ان مغربی عالموں کی رائے پرانوں کے زمانہ تخلیق کے متعلق کیا ہے ؟ سب سے پہلے میں اسے پیش کر کے زمانہ تخلیق کی بابت طے کروں گا اور اس کے بعد اصل موضوع پر آؤں گا ۔

پرانوں کا زمانہ ڈبلیو۔ ایل۔ لانگ کے مطابق (حضرت) عیسےٰ (علیہ السلام) سے چار سو سال بعد کا ہے[1] ۔ ان کے مطابق رامائن اور مہا بھارت کی تخلیق دو سو قبل مسیح ہے[2] ۔ جناب لانگ کے ان مندرجہ بالا بیانات میں تضاد ہے ۔

۱۔ رامائن کے مولف بالمکی اور مہا بھارت کے مولف دیاس جی کے ہم عصر ہونے کی تردید خود ان دونوں کتابوں سے ہوتی ہے ۔

دراصل بالمیک اور وید دیاس جی کسی طرح ہمعصر ہو ہی نہیں سکتے ۔اس لیے کہ رام کے زمانے میں ہی بالمیک تھے جیسا کہ رام چندر جی کے یہاں سے نکالی ہوئی سیتا کی نگرانی بالمیک کو اپنے آشرم میں رکھ کر کرنا پڑتی ہے[3] سے ثابت ہوتا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ اپنے اس عظیم کام کی تکمیل بھی اسی آشرم میں کرتے ہیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے۔

---

[1] انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری مولفہ ڈبلیو ایل لانگ صفحہ ۱۲۳

[2] 〃 〃 〃 〃 صفحہ ۱۲۲

[3] رامائن کی تالیف (د-۱)

۲۔ رام چندر جی کے حالات زندگی تریتا یگ ([illegible]) کے ہیں اور اسی زمانے میں رامائن کا تحریر میں آنا بھی ممکن ہے۔ اس کے برعکس وید ویاس جی نے مہابھارت دواپر یگ ([illegible]) میں لکھی ہے۔

۳۔ شک راج کا (حضرت) عیسیٰ (علیہ السلام) سے ملنا پران سے ثابت ہے[1] اور شک راج، وکرمادتیہ کا قائم مقام تھا۔ اس لیے وکرمادتیہ کا زمانہ (حضرت) عیسےٰ (علیہ السلام) سے قبل کا ثابت ہوتا ہے۔ وکرمادتیہ کے زمانے میں رامائن مہابھارت اور پران کو احترام کی نظر سے دیکھا اور سمجھا جاتا تھا۔

ان اسباب کے باعث ظاہر ہے کہ لانگر کی تحقیق قابل اعتماد نہیں ہے۔

زبان کے اعتبار سے پران، پانینی[2] کی بہ نسبت زیادہ قدیم ہیں۔ کیونکہ پرانوں کی زبان پانینی کی قواعدی پابندیوں سے آزاد ہے۔ ان میں سنسکرت الفاظ کا استعمال عالمانہ انداز کا ہے۔ جو ویدک اور عوامی سنسکرت کی درمیانی مدت کا ہے۔

پانینی کا زمانہ لانگر کے نزدیک ۵۲۰ ق م سے لے کر ۳۰۰ ق م کے درمیان کا ہے[3]۔ اس کے علاوہ گوتم بدھ کا زمانہ ۵۶۳ ق م سے لے کر ۴۸۳ ق م کے درمیان کا ہے۔

گوتم بدھ نے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت پالی زبان میں کی ہے۔ جو اس وقت کی بول چال کی زبان تھی (اور یہ بات بدھ کی مذہبی کتابوں سے ثابت ہوتی ہے) زبان میں وسعت اور پھیلاؤ کے باعث سنسکرت کی صورت بگڑ کر پالی، پالی سے پراکرت، پراکرت سے اپ بھرنش اور اپ بھرنش سے آج ہندی (اور اردو) ہو گئی ہے۔

سنسکرت زبان کی اہمیت گوتم بدھ سے پہلے ہی تھی۔ کوئی بھی زبان بہت تیزی سے نہیں بدل جاتی۔ زبان کی تبدیلی میں ہزاروں سال لگ جاتے ہیں۔ گوتم بدھ سے پہلے سنسکرت زبان کے قواعدی اصول گفتگو میں استعمال ہوتے تھے۔ اس متعین قواعد کے بانی پانینی کا زمانہ، گوتم بدھ کے زمانے میں ایک ہزار سال جوڑ کر ۱۵۶۳ ق م کے لگ بھگ ثابت ہوتا ہے۔ پانینی کے سوتروں کی تخلیق سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت

---

[1] بھوشیہ پران۔ پرتی سرگ پرو، تیسرا حصہ، دوسرا باب، اشلوک ۲۱، ۲۲، ۲۳ اور ۳۱

[2] قواعد کی ایک کتاب کا نام اور سنسکرت کے قواعد نگار کا نام (د-ا)

[3] ان سائیکلوپیڈیا آف ورلڈ ہسٹری مولفہ ڈبلیو ایل، لانگر صفحہ ۲۴

[4] 〃 〃 〃 صفحہ ۴۱

لکھنے کی آسانی نہ ہونے کے باعث زبانی یادداشت کا طریقہ رائج تھا۔ جو سوتروں کی وجہ سے سہل تھا۔ پرانوں کی زبان پانینی کے زمانے سے پہلے کی ہے۔ علمی سنسکرت[1] میں پرانوں کی تخلیق ۲۰۵۰ ق م سے ۱۵۶۲ ق م کے درمیان ثابت ہوتی ہے۔

یہ تو رہے عقلی دلائل اور ان پر بعض حضرات پوری طرح اعتماد نہیں کرسکتے۔ اس لیے کہ سب ہی عالموں کی رائے ایک دوسرے سے مختلف اور مشتبہ ہے اور اس وجہ سے کہ یہ حضرات اپنی رائے کا اظہار کرنے میں "شاید ممکن ہے" یا سوالیہ علامت کا استعمال کرتے ہیں۔

اب ہم پرانوں سے ہی ان کا زمانہ تخلیق ثابت کریں گے۔

اٹھارہ پرانوں میں ایک بھوشیے پران بھی ہے جس میں مستقبل کی پیشین گوئیاں ہیں جن مقامات پر لرٹ ([illegible]) کی جگہ لٹ ([illegible]) لکار ([illegible]) کا یا لرٹا ([illegible]) لکار کا استعمال ہوا ہے۔ وہاں پر وتیوں بھوتم ([illegible]) طریقے سے ویدک سنسکرت کی طرح ترٹ ([illegible]) کا وتیے ([illegible]) ہوگیا ہے۔ اس لیے پرانوں کی علمی زبان بلاشبہ عوامی سنسکرت سے افضل ہے۔ بھاگوت پران بارھویں حصہ دوسرا باب میں کلکی کے ظہور پذیر ہونے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔ اور ان کی خصوصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ پہلے حصہ میں جو چوبیس اوتاروں کا ذکر آیا ہے ان میں کلکی کو آخری اوتار مانا گیا ہے۔ بھوشیے پران کے پرتی سرگ بھاگ میں ویدیا[2] جی مستقبل میں پیش آنے والے واقعات آدم (علیہ السلام) سے شروع کرتے ہیں۔ اے منی مستقبل میں پیش آنے والے سوت[2] جی کے ذریعے بیان کیے ہوئے کلجگ کے سارے واقعات سن کر اطمینان و سکون حاصل کرو۔[3]

اس بات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پران آدم سے پہلے تخلیق ہوئے۔ دواپر یگ کے خاتمے میں دو ہزار دو سو آٹھ سال باقی رہ گئے تھے۔ اس وقت آدم علیہ السلام کی پیدائش ہوئی تھی۔[4]

---

[1] رشیوں کی سنسکرت

[2] پران پڑھنے یا ان کا ذکر کرنے والا (م-ا)

[3] بھوشیے پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ، چوتھا باب اشلوک ۲۵

[4] نوٹ:۔ اس تحقیق میں کئی باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) معزز مقالہ نگار کی نگاہ سے شاید یہ بات پوشیدہ رہ گئی کہ آدم (علیہ السلام) دنیا کے سب سے پہلے انسان اور تمام انسانوں کے باپ ہیں

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کلجگ کو شروع ہوئے ۵۰۷۰ سال ہو رہے ہیں۔ اس لیے آدم (علیہ السلام) اب سے ۵۰۷۰ + ۲۲۰۸ = ۷۲۷۸ سال پہلے ہوئے ہیں۔ اس وقت لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ اس لیے اشلوکوں کو زبانی یاد رکھنا پڑتا تھا۔

(بقیہ صفحہ ۲۹) (۲) معزز مقالہ نگار کی خود اپنی تحقیق کے مطابق آدم (علیہ السلام) کی پیدائش اب سے ۷۲۷۸ سال پہلے یعنی ۵۳۰۹ ق م میں ہوئی ہے۔ اور پرانوں کی تخلیق ۲۵۰۲ سے ۱۵۶۳ ق م کے درمیان ہونا ثابت کی ہے جس کا سیدھا سادا مطلب یہ ہوا کہ پرانوں کا آدم علیہ السلام سے تقریباً ڈھائی تین ہزار سال بعد تخلیق ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

(۳) بہت سے ہندو عالموں کی طرح ہمارے معزز مقالہ نگار بھی شاید اسی نظریہ کے قائل ہیں کہ وید ازلی ہیں اور اسی باعث انھوں نے پرانوں کو آدم علیہ السلام سے پہلے تخلیق ہونا ثابت کرنا چاہا ہے ــــــــ لیکن ایسا نہیں ہے۔

آیئے اس معاملے میں خود ویدوں سے رجوع کریں کہ وہ اپنی قدامت کی نسبت کیا کہتے ہیں۔

(۱) رگ وید اشٹک ۸، ادھیائے ۸، ورگ ۹ کا دوسرا منتر جو دیانند صاحب کی مشہور بھومکا میں منقول ہے۔ اس میں لوگوں کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔

"جس طرح زمانہ قدیم میں تم سے پہلے نیک اور ایشور کے حکم کو عزیز جاننے والے تمہارے بزرگ گزر چکے ہیں اور قادر مطلق وغیرہ صفات سے موصوف ایشور کے حکم کی تعمیل کرتے رہے ہیں۔ اسی طرح تم بھی سچے دھرم پر چلو۔"

(۲) یجروید ادھیائے ۱۳، منتر ۲۷، دیانندی بھاشیہ کے مطابق ترجمہ کا اس طرح ہے:۔

"اے عالم باعمل مہاتمن! آپ گزشتہ عالموں سے تعلیم پائے ہوئے ہیں اور آپ دانشمند ہیں۔ آپ کے جن گھوڑوں کو چابک سواروں نے سدھایا ہے آپ ان کو دشمنوں کی فوج کے مقابلے میں رتھ میں جوڑیئے اور عدل وانصاف کی کرسی پر جلوہ افروز ہوجیے۔"

(۳) یجروید ادھیائے ۱۲، منتر ۱۱۱ دیانندی بھاشیہ کے موافق ترجمہ کا اس طرح ہے۔

"اے انسان! جو لوگ عالم ہیں جہاں دیدہ نشیب وفراز سے واقف، وسیع علم والے، نیک اعمال والے ہیں۔ تو اس قسم کے بڑے وودانوں کی جو پہلے جگ میں ہو چکے ہیں تقلید کر۔ میں تجھے یہی حکم دیتا ہوں۔"

(۴) یجروید ادھیائے ۱۹، منتر ۳۸

"اے ہمارے باپ دادا اور پردادا! آپ ہماری زندگی کو پوتر کریں۔ آپ ہماری آرزوؤں اور ہماری محنت کو ہر طرح سے کامیابی دیں۔ جو انسان کتوں کی مانند عادت والے ہمارے دور و نزدیک بسے ہیں

(باقی اگلے صفحے پر)

نیوح (حضرت نوح علیہ السلام) کے زمانے سے سنسکرت زبان کا بگاڑ شروع ہوا۔ کیونکہ وشنو نے خوش ہو کر سنسکرت زبان بگاڑ کر نیوح (حضرت نوح علیہ السلام) کو عطا کر دی تھی اور اس بگڑی ہوئی زبان کا نام ملیچھ زبان رکھا گیا تھا [1]

نیوح (حضرت نوح علیہ السلام) کے تین لڑکے ہوئے۔ سم، ہام، اور یاقوت [2]۔ اور پھر یہیں سے زبان کی تقسیم شروع ہوئی۔ سم سے سیمیٹک، ہام سے ہیمو ٹاٹ وغیرہ

اب اس طرح آدمؑ [3] (علیہ السلام) سے قدیم ہونے کے باعث پرانوں کا زمانہ تخلیق ۸۲۷ سال قبل ثابت ہوتا ہے۔ جو ہر طرح ممکن ہے بھلے ہی کچھ لوگ اس پر معترض ہیں۔

آدم علیہ السلام سے قبل پرانوں کے زمانے میں چار ورن (طبقے) تھے لیکن یہ ورن (طبقات) صرف کاموں کی مناسبت کے لحاظ سے تھے۔ ذات کے اعتبار سے نہیں، شودر برہمن بن جاتا تھا اور برہمن شودر بن جاتا تھا [4]۔

(بقیہ حاشیہ ۳۱) ہم کو ان کی صحبت سے الگ رکھیے۔

(۵) یجروید، ادھیائے ۳۴، منتر ۲۷

"اے سورج کی مانند سکھ دینے والے ودوان پرش! جس طرح آکاش میں سورج کا راستہ پاک و صاف ہے اسی طرح جن نقائص سے خالی دھرم کے راستے پر آپ کے بزرگ چلے تھے۔ آج انھیں آنند دینے والے دھرم مارگوں پر چلنے کی آپ ہم کو ہدایت کریں۔ آپ انھیں مارگوں پر چلنے کا ہم کو اپدیش کریں، اور ہماری رکھشا کریں۔"

مندرجہ بالا ان چند منتروں سے ہی یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ویدیت زیادہ قدیم نہیں ہیں۔ دوسرے ویدوں سے پہلے دوسری مذہبی کتابیں اور مذہبی عالم موجود تھے اور ویدوں نے کسی گزشتہ قائم و مروج شدہ مذہب کی جو بگڑ چکا تھا صرف تجدید کی تھی اور نیک لوگوں کی نسلیں ویدوں سے پہلے بھی گذر چکی تھیں۔

بحوالہ "وید اور اس کی قدامت" مؤلفہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

[1] بھوشیے پران، پرتی سرگ پرو، پہلا کھنڈ، پانچواں باب اشلوک ۳، ۴ (و۔ا)

[2] " " " " ۵ (و۔ا)

[3] غالباً معزز مقالہ نگار کی مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے لیکن وہ کسی غلط فہمی کے باعث بار بار آدم علیہ السلام کا نام لے رہے ہیں۔ تاریخی اعتبار سے یہ زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہے۔ (و۔ا)

[4] بھوشیے پران، برہم پرو، باب ۴۰، اشلوک ۷، ۴

جب ساری مخلوقات کا مالک صرف ایک خدا ہے تو کوئی بھید بھاؤ ہو ہی نہیں سکتا[1] چلنے پھرنے کا عمل، جسم، ذات، بال، سکھ دکھ، خوف اور گوشت کے حساب سے سب انسان برابر ہیں۔ پھر انسانوں کے درمیان یہ اونچ نیچ کیسے ممکن ہو سکتی ہے[2] رگ وید میں جو برہمن، چھتری، ویش اور شودر کے چار نام آئے ہیں ان کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ یہ چار ذاتیں ہیں۔ ان کا مطلب صرف اتنا ہے کہ عمل اور خوبیوں کے لحاظ سے چار طبقوں کا قیام[3] اور ان چاروں طبقوں میں آزادانہ آیا جایا جا سکتا تھا۔

اس طرح پرانوں کا زمانہ تخلیق اور چار طبقاتی نظام پر تفصیل سے بات چیت کرنے کے بعد اب میں یہ بتانا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ پرانوں میں بعد میں اضافہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ بھاگوان پران کے ایک باب میں اٹھارہ پرانوں کے اشلوکوں کی تعداد دی ہوئی ہے جس کے باعث ایک اشلوک بڑھانے کی بھی ہمت نہیں کی جا سکتی۔

اب میں خدا کا نام لے کر آخری اوتار سے متعلق گفتگو کروں گا جس کے لیے مجھے پروفیسر سوتی پرشاد چترویدی سابق ہیڈ آف دی سنسکرت ڈیپارٹمنٹ پریاگ یونیورسٹی اور ۱۰۰۸ سوامی راما نندجی سرسوتی کی جانب سے حکم ملا ہے اور میں ان دونوں بزرگوں کا اس کیلئے ممنون احسان ہوں

پنڈت وید پرکاش اپادھیائے، ایم اے
ریسرچ اسکالر سنسکرت ڈیپارٹمنٹ پریاگ یونیورسٹی

اوتار کے معنے

اوتار لفظ اَو (अव) اُپ سرگ پورک تر (तृ) دھاتو میں گھن (घञ्) پرتیے (प्रत्यय) لگا کر بنا ہے۔ اس طرح اوتار لفظ کے معنے یہ ہوئے کہ زمین پر آنا۔ ایشور کا اوتار کے معنے ہیں۔ تمام انسانوں کو پیغام پہنچانے والے ایک نیک انسان کا زمین پر جنم لینا[4]۔

---

[1] بھوشیے پران برہم پرو، باب ۴۰، اشلوک ۴۴

[2] 〃 〃 〃 ۴۲

[3] رگ وید ۱۰-۹۰-۱۲، اتھروید ۱۹-۶-۶

[4] نوٹ: عام طور پر اب تک اوتار لفظ کے معنے یہ سمجھے جاتے تھے کہ خدا انسان کی شکل میں زمین پر اترتا ہے لیکن معزز مقالہ نگار نے اس لفظ کے معنے یہ بتلائے ہیں کہ ایک نیک انسان کا دوسرے انسانوں کی اصلاح کے لیے زمین پر آنا۔ ایشور کا اوتار کے یہ معنے بڑی حد تک حقیقت پر مبنی ہیں اور اس طرح یہ لفظ اب 'خدا کا رسول' کے ہم معنے ہو گیا ہے۔ (ع-ا)

خدا ہر جگہ ہے۔ کسی مقررہ مقام پر اس کا رہنا اور وہاں سے اس کا کسی دوسری جگہ آنا جانا۔ خدا کے بارے میں ایسا کہنا۔ اس غیر محدود ہستی کو محدود بنانے کے مترادف ہے کہیں اس کا جلوہ بہت نمایاں نظر آتا ہے اور کہیں اس قدر نمایاں نہیں ہوتا۔ جیسے بادل میں چھپے سورج کی روشنی مدھم نظر آنے لگتی ہے لیکن اس سے سورج کی روشنی میں فرق نہیں پڑتا۔ سات آسمانوں میں آخری آسمان پر اس کی جلوہ نمائیاں بہت زیادہ ہیں۔ جہاں نہ سورج چمکتا ہے اور جہاں چاند یا تارے بھی نظر نہیں آتے ہیں[1] وہاں خود خداوند تعالےٰ کا نور اس قدر ہے کہ چاند سورج بے بساط معلوم ہوتے ہیں۔

جس طرح سورج کی روشنی سے تمام سیارے روشن نظر آتے ہیں اسی طرح رب العالمین سے کائنات کا ذرہ ذرہ پرنور رہتا ہے۔ اسی سے متعلق یعنی اس کا کوئی مقرب بندہ عام لوگوں کی اصلاح کے لیے اس دنیا میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ یا دنیا میں آئے ہوئے انسانوں میں سے نرم دل اور بہتر چال چلن والے انسان کے سپرد یہ عظیم کام کر دیا جاتا ہے۔ اور خداوند تعالےٰ اسے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دکھا دیتا ہے۔ اسی باعث بنا کچھ پڑھے لکھے اسے سب سے افضل علم حاصل ہو جاتا ہے[2]

'ایشور کا اوتار' میں لفظ 'کا' متعلقہ فاعل کی علامت ہے۔ اس لیے مطلب صاف ہی ہے کہ خدا کے مقرب بندہ کا ظہور ہونا۔ خدا کا مقرب کون ہے؟ اس کا مقرب وہی ہے جو حقیقت میں اس کا بندہ بن کر رہتا ہے۔ رگ وید میں ایسے شخص کو 'کیری'[3] ([illegible]) کہا گیا ہے جس کے معنے ہیں خدا کی تعریف بیان کرنے والا۔ اور عربی میں اس کے لیے 'احمد' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اب شبہہ یہ رہتا ہے کہ اس طرح خدا کے جس قدر بھی چاہنے والے (یعنی حمد پکارنے والے) ہیں۔ وہ سبھی 'احمد' کہے جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ خدا کی سب سے زیادہ حمد کرنے والے پر 'کیری' یا 'احمد' لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ گو (حضرت) آدم (علیہ السلام) بھی خدا تعالےٰ کے بہت بڑے ثنا خواں تھے۔ لیکن ان کا نام احمد نہیں ہوا۔ حاصل یہ نکلا کہ خدا سے قرب رکھنے والا ہر شخص احمد نہیں ہو سکتا۔

---

[1] شویتا شوتر اُپ نشد باب ۶، منتر ۱۴

[2] نوٹ:۔ خداوند پاک جب کسی نیک انسان کو اس عظیم خدمت کے لیے مبعوث فرماتا ہے تو اسے ان تمام حقائق کا خود اس کی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیتا ہے تاکہ وہ اپنا کام پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ انجام دے سکے اور اس کے اندر کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہے۔ (وید)

[3] رگ وید ۲-۱۲-۶

ہمیں یہاں صرف آخری نبی سے متعلق گفتگو کرنا ہے۔ لہٰذا یہ کہہ دینا میں مزید ضروری سمجھتا ہوں کہ لفظ اوتار[1] سنسکرت زبان میں پرافیٹ انگریزی زبان میں اور نبی عربی زبان میں دنیا کی اصلاح کرنے والوں کے لیے منتخب لفظ[2] ہے۔

ہر ملک اور قوم کے لیے الگ الگ اوتار (رسول) ہوئے ہیں۔ کیونکہ ایک اوتار سے ساری دنیا کی اصلاح ناممکن ہے۔ لیکن آخری اوتار (رسول) کی بات دوسری ہے۔ اس کی بعثت کا مقصد ساری دنیا کی اصلاح کرنا تھا۔

اب ہم اوتار (رسول) کے اسباب پر غور و فکر کریں گے۔

اوتار کے آنے کے اسباب

۱۔ لوگوں کی بے دینی میں دلچسپی اور حقیقی دین سے دوری[3]

۲۔ اصل دین میں اضافہ کرلینا یعنی اپنی مطلب برآری کے واسطے اصل دین میں کچھ نئی باتیں شامل کر دینا[4]

۳۔ دین کے نام پر بے دینی اختیار کرنا۔

۴۔ دین کے نام پر بے علم لوگوں کو بد دینی کی تلقین کرنا۔

۵۔ خدا کے محبوب و مقرب بندوں کو تکلیفیں دینا۔

۶۔ گناہوں اور ظلم و تشدد میں ترقی ہو جانا۔

۷۔ بہت زیادہ تشدد اور انارکی کا پھیلنا۔

۸۔ اپنے پیٹ اور خاندان کی کفالت تک ہی دین کو محدود رکھنا[5]۔

۹۔ خدا کی نعمتوں کا عدم مساوات کے طور پر استعمال کرنا[6]

---

[1] ہندو مسلم ایکتا، مصنفہ پنڈت سندر لال صفحہ ۲۹-۳۰

[2] نوٹ:۔ اس میں اتنا اضافہ اور کر لیجیے۔ خدا کی جانب سے اس کے لیے مبعوث کیا ہوا (و۔ا)

[3] گیتا

[4] نوٹ:۔ دوسرے معنے میں اسے بدعت کہا جاتا ہے۔ (و۔ا)

[5] نوٹ:۔ منشا یہ ہے کہ دین کو اعلیٰ مقاصد کے بجائے صرف اپنے پیٹ اور خاندان کی کفالت کے لیے استعمال کرنا ویدایک نہایت شرمناک بات ہے۔ (و۔ا)

[6] یجروید باب ۴۰ منترا

۱۰۔ دین دار لوگوں کی حفاظت اور بد دین اور ظالم لوگوں کی اصلاح کے لیے اوتار (رسول) کا ظہور ہوتا ہے[1]

۱۱۔ دین میں بگاڑ پیدا ہونے پر اوتار (رسول) کا ظہور ہوتا ہے۔

۱۲۔ جھگڑے، فساد اور لوٹ کھسوٹ میں اضافہ ہونے پر اوتار (رسول) آتا ہے۔

۱۳۔ زمانے کے مطابق لوگوں کے رجحان دیکھ کر اور بگڑے ہوئے دین سے دل چسپی لیتے دیکھ کر دین کے بنیادی اصولوں کی تجدید اور ان کی پیروی کرانے کے لیے اوتار (رسول) آتا ہے۔

یہ سارے اسباب اوتار (رسول) کے ظہور پذیر ہونے کا باعث ہوتے ہیں۔

آخری اوتار کے آنے کے اسباب

اوتار کے آنے کے اسباب کا مختصر سا ذکر کرنے کے بعد اب ہم آپ کو آخری اوتار کے آنے کے اسباب سے متعارف کرائیں گے۔

۱۔ بربریت کی حکمرانی :۔ لوگوں میں بے رحمی کا جذبہ، خود غرضی اور دوسروں کے حقوق سے لاپرواہی برتنا حکمرانوں میں برائیوں کا چلن، ٹیکسوں میں اضافہ ہو جانا، سچے دین کی تبلیغ و اشاعت کرنے والے پرائیٹ تھمزنا

۲۔ درختوں کا پھل پھول سے محروم رہنا :۔ درختوں پر پھل پھول کا نہ آنا اور اگر پھل پھول آئیں تو بہت کمی کے ساتھ نہ آنے کے برابر۔

۳۔ ندیوں میں پانی کی قلت :۔ ندیوں میں پانی کی کمی ہو جانا۔

۴۔ بد دینی کی ترقی :۔ دوسروں کو ستا کر ان کا مال و اسباب لوٹ لینا۔ لڑکیوں کو مار کر زمین میں دفن کر دینا

۵۔ عدم مساوات کا فروغ :۔ پاکیزہ جذبات و احساسات کا خاتمہ ہو جانا۔ اونچ نیچ اور چھوت چھات کا وبائی شکل اختیار کر لینا۔

۶۔ شرک میں مبتلا ہو جانا :۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی پرستش کرنا، گو کہ کائنات کا حاکم اعلیٰ صرف ایک خدا ہے لیکن اسے چھوڑ کر دوسرے دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرنا۔ شجر و حجر کو خدا متصور کرنا۔

۷۔ بھلائی کی آڑ میں برائی :۔ بھلائی کا یقین دلا کر کسی کو پھانس لینا اور اسے نقصان پہنچانا (یہی فریب کہلاتا ہے۔

[1] گیتا

۸۔ رشک وحسد اور ظاہرداری کا چلن :۔ لوگوں میں ایک دوسرے کے لیے ہمدردی کا مفقود ہو جانا۔ آپس میں ایک دوسرے کو دشمن خیال کرنا۔ خدا کے لیے بندگی کے احساسات میں کمی آ جانا اور لباس صرف اس لیے ہو کہ لوگ سمجھیں کہ یہ خدا کے بہت زیادہ نیک بندے ہیں۔

۹۔ دین کے نام پر بددینی اختیار کرنا۔ اصل دین سے کھنچاؤ اور بددینی سے رغبت رکھنا۔

۱۰۔ اللہ کے نیک بندوں کی حفاظت کرنا۔ نیک اور خداترس لوگوں کی سماج میں ابتر حالت دیکھ کر ان کی حفاظت کے لیے آخری اوتار آتا ہے۔

۱۱۔ خدا کے احکام سے لاپرواہی برتنا۔ لوگوں میں ویدوں کے لیے عقیدت مندی میں کمی اور ان میں مندرج احکامات پر عمل نہ کرنا۔

آخری اوتار کی خصوصیات

۱۔ گھوڑا سوار ([illegible]) پرانوں میں آخری اوتار سے متعلق جہاں کہیں بھی ذکر ہوا ہے ان کی سواری گھوڑا ([illegible]) ہی بتائی گئی ہے۔ وہ گھوڑا تیز رفتار ہوگا اور گھوڑے کی صفت میں 'دیو ورت' نام آیا ہے۔ یعنی دیوتا کا عطیہ۔

۲۔ سیف بکف ([illegible]) گھوڑا سوار ہونے کے علاوہ آخری اوتار کو سیف بکف بھی جتایا گیا ہے[1] برائیوں کا خاتمہ آخری اوتار تلوار سے کریں گے۔ جو بری بم سے نہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ یہ دور ایٹمی دور ہے۔ تلوار کا دور نہیں ہے اور اوتار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا لباس اور ہتھیار ملک، زمانہ اور ضرورت کے مطابق رکھتا ہے۔ وہ جس قوم یا طبقے میں پیدا ہوتا ہے اسی قوم یا طبقے کے مطابق اس کا پہناوا ہوتا ہے۔

۳۔ ہشت الٰہی صفات سے آراستہ ([illegible]) آخری اوتار آٹھ الٰہی صفات سے آراستہ ہوگا۔ ان آٹھوں صفات اور خصوصیات کا ذکر پرانوں نے کیا ہے۔

۴۔ دنیا کا محافظ ([illegible]) پتی ([illegible]) کا لفظ 'پا' ([illegible]) (حفاظت کرنا) دھاتو میں ڈتی پرتیے ([illegible]) کے ملانے سے بنا ہے۔ جگت معنی ہیں دنیا' اس لیے جگت پتی کے معنی ہوئے دنیا

---

[1] بھاگوت پران ۔۱۲۔۲۔۱۹

کا محافظ۔

۵۔ بدکاروں کا مٹانا ([illegible]) آخری اوتار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ برے لوگوں کو ہی مٹائیں گے[1] اچھے لوگوں کو نہیں۔

۶۔ چار مددگاروں کا حمایت یافتہ ([illegible]) آخری اوتار کے چار مددگار ہوں گے جو ہر طرح اس کی حمایت و مدد کریں گے[2]

۷۔ فرشتوں کے ذریعے مدد ([illegible]) دین کے پھیلانے اور بددینوں کے مٹانے میں مدد دینے کے لیے فرشتہ (دیوتا) بھی آسمان سے اتر آئیں گے۔

۸۔ شیطان سے نجات دہندہ ([illegible]) جس معنے میں کلی ([illegible]) لفظ استعمال ہوتا ہے اسی معنے میں شیطان لفظ بھی استعمال ہوتا ہے۔ آخری اوتار کے ذریعے شیطان یعنی کلی ([illegible]) کو شکست ہوگی۔

۹۔ تابناکی ([illegible]) آخری اوتار کا جسم اس قدر پرنور ہوگا کہ اس کی مثال نہیں دی جا سکتی[3] اور اس جیسا پرنور نہ کوئی دوسرا اوتار ہوا ہے۔

۱۰۔ بادشاہ نما ڈاکوؤں کا خاتمہ ([illegible]) آخری اوتار کے بارے میں بھاگوت پران میں یہ بھی تحریر ہے کہ وہ بادشاہ نما ڈاکوؤں کا خاتمہ کریں گے۔

۱۱۔ جسم سے خوشبو کا نکلنا ([illegible]) آخری اوتار کے جسم سے خوشبو نکلے گی جو ہوا میں مل کر لوگوں کے دلوں کو نرم کرے گی۔

۱۲۔ عظیم معاشرے کا مبلغ ([illegible]) آخری اوتار ایک عظیم معاشرے کی اصلاح کریں گے اور بے دین لوگوں سے برائیاں دور کرکے انہیں راہِ راست پر لائیں گے۔

۱۳۔ بیساکھ کے بڑھتے چاند کی بارہویں تاریخ کو پیدائش ([illegible]) آخری اوتار کی پیدائش ماہ بیساکھ کے دوسرے پندرھواڑے کی بارہ تاریخ کو ہوگی اور یہ بات کلکی اوتار میں تحریر

---

[1] [2] [3] بھاگوت پران، ۱۲-۲-۱۹، ۱۲-۲-۲۰، ۱۲-۲-۲۱

[4] ہے دیو! چار مددگاروں کے ساتھ میں شیطان کا ناش کروں گا۔ کلکی پران، باب ۲، اشلوک ۵

[5] کلکی پران، باب ۲، اشلوک ۱۵

۴۔ شمبل کے بڑے پروہت کے یہاں پیدائش ([Devanagari])
آخری اوتار کی پیدائش شمبل کے خاص پروہت وشنو یش ([Devanagari]) کے یہاں ہوگی اور والدہ کا نام سومتی ([Devanagari]) ہوگا[4]

آخری اوتار کا زمانہ

ہندوستان کی مذہبی کتابوں نے زمانے کو چار حصوں میں منقسم کیا ہے۔
۱۔ ست یگ ([Devanagari]) اس زمانے کا نام تخلیقی دور ([Devanagari]) بھی ہے۔ اس کی مدت سترہ لاکھ اٹھارہ ہزار سال ہے۔
۲۔ تریتا یگ ([Devanagari]) تریتا یگ کی مدت بارہ لاکھ چھیانوے ہزار سال ہے۔
۳۔ دواپریگ ([Devanagari]) تریتا یگ کے بعد دواپر یگ آتا ہے۔ اس کی مدت آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہے۔
۴۔ کلی یگ ([Devanagari]) کلی یگ کی مدت چار لاکھ بتیس ہزار سال ہے۔
اوتار مستقبل میں آئے گا لیکن اوتار سے پہلے ہی ظلم و زیادتیوں کے باعث زمین زیر آب ہو جائے گی تو پھر اوتار کے آنے کی غرض ہی کیا رہ جاتی ہے۔ البتہ گیتا میں بھی کہا گیا ہے کہ جب جب دین کو نقصان ہوتا ہے اور بد دینی پھیلتی ہے تب تب اوتار ہوتا ہے۔ نیک انسانوں کی محافظت اور بدکاروں کو مٹانے کے لیے ــــ اور دین کو قائم (برپا) کرنے کے لیے ہر زمانے میں اوتار ہوتا ہے[3]
اب دیکھنا یہ ہے کہ جن حالات کی بنا پر اوتار ہوتا ہے کیا وہ حالات گذر چکے ہیں یا گذر رہے ہیں؟ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ آخری اوتار کلی یگ میں ہوگا۔ اور کلی یگ کو شروع ہوئے پانچ ہزار اٹھتر سال ہو گئے ہیں۔ آخری اوتار کا ظہور کلی یگ کے زیادہ حصہ گزر جانے یا کچھ گزر جانے پر ہوتا ہے[4]۔ حالات ایسے ہوں گے کہ لوگوں کو صرف اپنا پیٹ پالنا ہی دشوار ہوگا۔

---

[1] بھاگوت پران، ۱۲-۲-۱۸،
[2] کلکی پران باب ۲، اشلوک ۴، ۱۱
[3] بھاگوت گیتا
[4] بھاگوت پران ۱۲-۲-۱۷

دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ آخری اوتار اس وقت ہوگا جبکہ جنگ میں تلوار کا استعمال کیا جاتا ہو اور گھوڑے سواریوں کے طور پر استعمال ہوتے ہوں۔

بھاگوت پران میں تحریر ہے کہ دیوتاؤں کے عطا کیے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہو کر ہشت الٰہی صفات سے آراستہ، دنیا کا محافظ، تلوار سے ظالموں کا خاتمہ کرے گا[1]

یہ تلوار اور گھوڑوں کا زمانہ نہیں ہے۔ یہ تو ایٹم اور ٹینکوں کا زمانہ ہے۔ تلوار اور گھوڑے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اس لیے آخری اوتار کا ظہور تلواروں اور گھوڑوں کے زمانے میں ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اب سے تقریباً چودہ سو سال پہلے گھوڑوں اور تلواروں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس سے ایک سو سال بعد سوڈے اور کوئلے سے بارود کا بنانا عرب میں شروع ہوا۔

تاریخ پیدائش کا بھی دھیان میں رکھنا ضروری ہے۔ کلکی پران میں آخری اوتار کی پیدائش ماہ بیساکھ کے دوسرے پندرھواڑے کی ۱۲ تاریخ مندرج ہے[2]۔ (باقی آئندہ)

---

[1] بھاگوت پران ۱۲-۲-۱۹

[2] کلکی پران باب ۲، اشلوک ۱۵

(بقیہ صفحہ ۴۷)

ایک عظیم سائنس داں اور ماہر انسانیات کی حیثیت سے وہ قدرتی طور پر جنگ کے خلاف تھا جب ۱۹۴۱ء میں جرمنی کے نازی فسطائیوں نے سوویت یونین پر حملہ کیا تھا اس وقت امریکہ کے صدر روزویلٹ سے نازی دشمن محاذ میں امریکہ کی شمولیت کا سب سے پہلا مطالبہ کرنے والے ممتاز سائنسدانوں میں وہ بھی شامل تھا۔

ڈاکٹر ایس ہرڈلکی زندگی نے وفا نہ کی اور اس نے نازیوں پر اتحادیوں کی فتح نہیں دیکھی وہ ۳ ستمبر ۱۹۴۳ء میں واشنگٹن میں انتقال کر گیا۔ اس سال مارچ میں چیکوسلواکیہ کی سب سے پرانی چارلس یونیورسٹی میں ایس کی یاد منائی گئی۔ ایس کے گاؤں میں یکم ستمبر سے ۵ ستمبر تک عالمی شہرت کے سائنس دانوں کی ایک کانفرنس ہوئی جس میں دنیا کے تقریباً ایک سو ماہرین علم انسانیات نے شرکت کی۔

راہِ خدا میں استقامت

(سید جلال احمد امین آبادی)

اللہ کے دین کو جب کبھی زمین پر قائم کرنے کی سعی کی گئی ہے اس کارِ عظیم کو روکنے کے لیے وقت کی ساری باطل اور طاغوتی قوتیں صف آرا ہوتی رہی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے آتشِ نمرود، حضرت یوسفؑ کے لیے زندانِ مصر، حضرت موسیٰؑ کے لیے لشکرِ فرعون، حضرت زکریاؑ کے لیے سرزمینِ بابل کے آرے اور سلاطین، حضرت یحییٰؑ کے لیے ہیرودیاس رومی کی قتل گاہ، حضرت عیسیٰؑ کے لیے یہودیوں کی طرف سے کانٹوں کا تاج اور پلاطیس کی عدالت سے صلیب کا فیصلہ اور پھر خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خانۂ کعبہ میں سجدہ ریز جبینِ اقدس کے لیے اونٹ کی اوجھڑی اور راہِ خدا میں گامزن پائے مبارک کے لیے کانٹے، طائف کے میدان میں دینِ حق کی دعوتِ سعید کے جواب میں پتھروں کی بارش اور انسانیت کی فلاح و کامیابی کی ساری جد و جہد کے صلے میں دار الندوہ میں قتل کی سازش اور میدانِ احد کی وہ یورش و یلغار کہ چہرۂ انور زخمی ہوا اور دندان مبارک شہید ہو جائیں پھر مسلسل اور پیہم دوسرے تیسرے اور چوتھے خلفائے راشدینؓ کی شہادتِ عظمیٰ کے بعد بھی میدانِ کربلا سے مشہد بالاکوٹ تک کی ساری درمیانی سعید روحوں پر گزری ہوئی لرزہ خیز ظلم و تشدد کی داستانیں صاف اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہیں کہ دعوتِ حق و اقامتِ دین کی گراں بار ذمہ داری کو اٹھانا کوئی آسان کام نہیں۔

قرآن کریم میں معقول دلائل کے ساتھ اس عظیم کام کو انجام دینے کا حکم دیا گیا ہے اور اس راہ کی دشواریوں کا تذکرہ کرکے داعیانِ حق کو اس بات کی تاکید کی گئی ہے کہ وہ اقامتِ دین کی راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر و استقامت کی روش اختیار کریں۔ چنانچہ یہ بات ہر صاحبِ علم و بصیرت پر واضح ہے کہ کفر و ضلالت کے علمبرداروں کے سفاکانہ مظالم کے بالمقابل اہلِ حق نے صبر و استقامت کے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ ان کے ذرا سے تصور ہی سے مردہ رگ و پے میں بھی زندگی موجزن ہو جاتی ہے۔

دعوت دین کے لیے سعی وجہد کی ضرورت اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات پر صبر و استقامت کی اہمیت کو قرآن حکیم میں نہایت مؤثر طریقے سے بیان کیا گیا ہے ـــــ اس سلسلے کی چند آیات ملاحظہ فرمایئے :-

فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَعَلَ
لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ
اَزْوَاجًا يَذْرَؤُكُمْ فِيْهِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ
شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ○ لَهٗ
مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَبْسُطُ
الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ وَيَقْدِرُ اِنَّهٗ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ شَرَعَ لَكُمْ
مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا
وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ
مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ
مُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا
الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ
عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ
اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ
يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ
يُّنِيْبُ ○ وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْ
بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا
بَيْنَهُمْ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ
مِنْ رَّبِّكَ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى
لَّقُضِيَ بَيْنَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ
اُوْرِثُوا الْكِتٰبَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ

وہ زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے،
اس نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے جوڑے بنائے
اور جانوروں کے جوڑے بنائے اور اس طریقے سے
تمہاری نسلیں پھیلاتا ہے کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور
وہی ہر بات کا سننے اور دیکھنے والا ہے۔ آسمان و
زمین کی کنجیاں اسی کے اختیار میں ہیں جس کو چاہتا
ہے زیادہ روزی دیتا ہے اور (جس کو چاہے)
کم دیتا ہے۔ بے شک ہر چیز کا مکمل علم رکھنے والا
ہے۔ اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا
حکم اس نے نوحؑ کو دیا تھا اور جس کی (اے نبیؐ!)
ہم نے تم پر وحی کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیمؑ
کو موسےٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو دیا تھا کہ اس دین کو
قائم کرو اور اس معاملے میں تفرقہ نہ ڈالو۔ مشرکین
کو وہ بات بڑی گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ
ان کو دعوت دے رہے ہیں۔ اللہ جس کو چاہے
اپنے لیے منتخب کر لیتا ہے اور جو شخص رجوع کرے
اس کو اپنی طرف آنے کا راستہ دکھاتا ہے اور وہ
لوگ بعد اس کے کہ ان کے پاس علم پہنچ چکا تھا محض
آپس کی ضد سے باہم متفرق ہو گئے اور اگر آپ کے
پروردگار کی طرف سے ایک وقت معین تک کی ایک
بات پہلے نہ ٹھہر چکی ہوتی تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا

لَفِیْ شَکٍّ مِّنْہُ مُرِیْبٍ ○ فَلِذٰلِکَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَھُمْ ۔ (سورۂ شوریٰ ع ۲)

اور جن لوگوں کو ان کے بعد کتاب دی گئی ہے (یعنی مشرکین مکہ) وہ اس کی طرف سے شک میں مبتلا ہیں جس نے ان کو تردد میں ڈال رکھا ہے۔ سو آپ اسی طرف (پیہم) دعوت دیے چلے جائیے اور جس طرح تمہیں حکم دیا گیا ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو جاؤ اور ان کی خواہشوں پر نہ چلو۔

مندرجہ بالا آیات میں محکم استدلال کے ساتھ دین کی چند اساسی باتیں بیان کی گئی ہیں جو ایک طرف تو دعوت اسلامی کے کام کے لیے منطقی مواد فراہم کرتی ہیں تو دوسری طرف پچھلی انبیائی دعوتوں کے حوالے کے ساتھ اس دعوت و تحریک پر بھی روشنی ڈالتی ہیں جس کا آغاز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے، مندرجہ بالا آیات میں کیسی مربوط و ہم آہنگ باتیں بیان کی گئی ہیں۔

ساری کائنات کا خالق اللہ تعالٰے ہے۔ تمام کائنات کو نسل درنسل وہی قائم کر رہا ہے۔ وہ یکتا و یگانہ ہے اعلیٰ اوصاف کا حامل ہے ساری مخلوق اور ساری کائنات اس کی نگاہ سے دور نہیں۔ آسمان و زمین کی ساری کنجیاں اسی کے اختیار میں ہیں۔ ساری مخلوق کا وہی روزی رساں ہے ایسے عظیم خالق و مالک پروردگار نے تمہاری ہدایت کے لیے دین حق نازل فرمایا ہے وہی ہادی برحق دنیا کی پیدائش سے لے کر اب تک سارے انسانوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کے دروازے کھولتا رہا ہے۔ اب تمہارے لیے اس دین حق کو نازل کرتے ہوئے اس بات کا حکم دیا جا رہا ہے کہ اس کو عملاً دنیا میں قائم کرنے کی سعی و جہد کرتے رہو اور اس معاملے میں اختلاف نہ پیدا کرو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس دین کو قائم کرنے کی سعی کر رہے ہیں وہ مشرکین کے لیے ناگوار ہے (وہ یہ کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ ہی کو کیوں نبوت عطا کی گئی ہے) حالانکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس کار عظیم کے لیے منتخب فرما لیتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوا سے باریابی کا شرف بخشتا ہے جو لوگ حق کے واضح ہو جانے کے بعد اس دعوت کی مخالفت کر رہے ہیں وہ محض باہمی ضد اور ہٹ دھرمی میں مبتلا ہیں۔ اگر اللہ تعالٰے نے ہر قوم کے فیصلے کا ایک وقت مقرر نہ کیا ہوتا تو ان ہٹ دھرموں کو کبھی سزا مل چکی ہوتی۔ مشرکین مکہ دعوت اسلامی کے سلسلے میں لایعنی شک و تردد میں مبتلا ہیں۔ ان حالات میں اے نبیؐ آپ ان سب کو دین حق کی دعوت مسلسل و پیہم دیتے رہیے اور ان کی مخالفتوں کے علی الرغم آپ استقامت کی روش اختیار فرمائیے اور ان مفسدوں کی باتوں کو ذرا بھی خاطر میں

میں نہ لائیے۔

ایک داعیِ حق کو دعوت الی اللہ واقامت دین کا کام پوری یکسوئی سے انجام دیتے رہنا چاہیے۔ ساری دنیا بھی اگر مخالفت پر اتر آئے تو اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ ایک داعی حق اللہ کا سپاہی ہوتا ہے۔ معرکہ حق و باطل میں اگر کوئی اللہ کا سپاہی ہوتے ہوئے باطل قوت سے مرعوب ہو کر کسی درجے میں بھی اہل باطل سے مصالحت کا تصور بھی کرنے لگ جائے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی سخت ناگواری کا باعث بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے ایسے سپاہیوں کو پسند فرماتے ہیں جو بڑی سے بڑی مادی قوت قاہرہ کے بالمقابل راہ حق پر ڈٹے رہیں اور باطل سے کسی بھی درجے میں مصالحت کے لیے مائل نہ ہوں۔ اسی بات کو قرآن کریم میں حضورؐ کو خطاب کرتے ہوئے اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ	جس طرح کہ آپ کو حکم ہوا ہے (کارِ دعوت حق
وَمَن تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا	پر) استقامت رکھیے اور وہ لوگ بھی (استقامت
إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝	رکھیں) جو کفر سے توبہ کرکے آپ کے ساتھ ہو چکے
وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا	ہیں اور دائرہ دین سے ذرا مت نکلیے یقیناً اللہ
فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم	تم سب کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے اور (اے مسلمانو)
مِّن دُونِ اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَاءَ	ان ظالموں کی طرف مت جھکو کہیں تم کو دوزخ کی
ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ۝	آگ نہ چھو لے اور تمہیں کوئی ایسا سرپرست نہ ملے گا
(ہود ع ۱۰)	جو خدا سے تمہیں بچا سکے اور کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی

ان آیات میں بھی دعوت حق کے کار عظیم کے بالمقابل پیش آنے والی رکاوٹوں اور اس راہ کی ساری مشکلات کے باوجود فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ کہہ کر اس بات کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ داعیان حق کو ہر حال میں راہ حق پر جمے رہنا چاہیے اور پھر وَلَا تَرْكَنُوا إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ کے الفاظ سے یہ لرزا دینے والی بات بیان کی گئی ہے کہ اگر تم پر ظلم و تشدد کے پہاڑ بھی ٹوٹ پڑیں تب بھی تمہیں اہل باطل سے ذرہ برابر بھی کسی مصالحت کا تصور بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیے۔ وَلَا تَرْكَنُوا کے الفاظ بتلا رہے ہیں کہ باطل کی طرف ہلکا سا میلان طبع اور قدرے ذہنی رجحان بھی وہ جرم عظیم ہے جس پر فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ کی وعید سنائی گئی ہے۔ راہ حق پر استقامت کا یہ وہ مقام ہے جس کا ادنیٰ تصور بھی کوہ ہمالہ کو اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دے گا لیکن یہ حقیقت ہے کہ نمرود کے مقابل حضرت ابراہیمؑ

نے فرعون کے بالمقابل حضرت موسےؑ نے ہیرو ڈیاس کی رومی قتل گاہ میں حضرت یحییٰؑ نے اور سر زمین مکہ کے سامنے ظالم و جاہل سرداروں کے بالمقابل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے اصحاب نے نہایت ہی عظیم استقامت کا ثبوت دیا ہے۔ استقامت داعیان حق کی شخصیتوں کا بنیادی جوہر بھی ہوتا ہے اور خدا کی توفیق اور اس کے عطا کردہ عزم و استقلال کا نتیجہ بھی۔ مؤخرالذکر حقیقت یعنی راہ خدا میں استقامت کے لیے توفیق خداوندی بھی ضروری ہے اس بات کو سورہ بنی اسرائیل میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ان آیات کو پڑھتے ہوئے دل و جگر کانپ اٹھتے ہیں اور بے اختیار رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا کے الفاظ زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ روح اور وجدان پر کپکپی طاری کر دینے والی وہ آیتیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ	اے نبیؐ! اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ بنایا
تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا قَلِيْلًا ۙ اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ	ہوتا تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچے
ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ	اور اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو حالت حیات میں بھی
ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا	اور بعد موت کے دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر آپ
(بنی اسرائیل ع ۸)	ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار نہ پاتے۔

چونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے ثابت قدمی کی عظیم صلاحیت عطا فرمائی تھی اس لیے آپ کا اہل باطل کی طرف قرب میلان بھی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ اس نازک مقام کو واضح فرما رہے ہیں کہ اگر ہماری توفیق شامل نہ ہوتی تو آپ ان کی طرف کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے۔ واضح رہے کہ یہ نہیں فرمایا جا رہا ہے کہ آپ کچھ کچھ جھک جاتے بلکہ فرمایا جا رہا ہے کہ کچھ کچھ جھکنے کے قریب جا پہنچتے لیکن ہماری توفیق نے کچھ کچھ مائل ہونے کے قریب پہنچنے بھی آپ کو بچا لیا۔ پھر یہ بات بھی لائق غور ہے کہ آگ کے چھو لینے کی وعید اہل باطل کی طرف جھک جانے پر نہیں دی گئی ہے بلکہ کچھ کچھ جھکنے کے قریب پہنچنے پر ہی اس کا اطلاق ہوتا ہے جس سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم توفیق خداوندی بچے رہے۔ راہ حق میں استقامت کے لیے ان تاکیدی احکام کو دیکھیے اور پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نظر ڈالیے کہ کیسے رونگٹے کھڑے کر دینے والے کٹھن و دشوار حالات میں بھی آپ نے ایسی استقامت کا مظاہرہ فرمایا کہ آج اس کا تصور بھی آسان نہیں ہے۔ وہ وقت خاص طور پر پیش نظر رکھنے کے لائق ہے جب کہ تمام سرداران مکہ نے جمع ہو کر آپ کے مہربان و شفیق چچا ابو طالب پر شدید دباؤ ڈالا اور حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر دعوت حق سے باز نہ آئیں تو قتل کر ڈالنے کی دھمکی دی۔ اس پر آپ کے چچا نے جواب تک برابر ان ظالموں

کے بالمقابل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت کرتے آئے تھے اور مادی اعتبار سے آپ کی حمایت آخری دنیوی سہارے کی حیثیت رکھتی تھی نہایت سوز ورقت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے کہا اے بھتیجے! میں اب تک تمہارا ساتھ دیتا رہا ہوں لیکن اب ضعیفی میں مجھ پر اتنا بوجھ نہ ڈالو جسے میں سہار نہ سکوں۔ تم اپنی اس دعوت سے باز آؤ ورنہ میں آئندہ تمہاری حمایت نہ کرسکوں گا۔ اہل ظلم کی تشدد پسندانہ دھمکی اور مشفق و مہربان چچا کی پرسوز اپیل ایک طرف تھی اور وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا کی پر جلال ہدایت دوسری طرف۔ چنانچہ اس نازک موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی بات ارشاد فرمائی جو ایک جلیل القدر پیغمبر کے شایان شان تھی۔ آپ نے فرمایا۔ "اے چچا! یہ لوگ اگر میرے دائیں ہاتھ میں سورج کو لا رکھیں اور بائیں ہاتھ میں چاند، تب بھی میں اپنے کام سے نہ ہٹوں گا۔ اور احکام خداوندی میں ایک حرف بھی کم و بیش نہ کروں گا۔ خواہ اس کام میں میری جان بھی ختم ہو جائے"

انسان بندر کی اولاد نہیں ہے

ایک مغربی سائنس داں کی تحقیق

عالمی امن کونسل نے یونسکو کے تعاون سے ہر ملک کے ان اہم شخصیتوں کے نام شائع کیے ہیں جن کی سالگرہ ۱۹۶۹ء میں ہو رہی ہے۔ ان میں چکوسلواکیہ کے ایک اہم امریکی انسانیات داں ایلیس ہرڈلیکا کا نام بھی بجا طور پر شامل کیا گیا جو ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوا تھا اور ۱۹۴۳ء میں فوت ہوا تھا۔

ایلیس ہرڈلیکا چیکوسلواکیہ کے علاقہ موراویہ کے گاؤں ہمپولیٹس میں ایک کیبنٹ میکر کے گھر میں پیدا ہوا تھا۔ وہ سات بچوں میں سب سے بڑا تھا۔ چونکہ وہ بہت ذہین تھا اس لیے اس کے والدین نے اسے ضلع کے صدر مقام میں واقع مذہبی تعلیم کے اسکول میں دینیات پڑھنے کے لیے داخل کر دیا۔ غربت نے اس کے ماں باپ کو پورے کنبے کے ساتھ ترک وطن پر مجبور کر دیا۔ جہاں اس کو نیویارک کے ایک تمباکو کے کارخانے میں کام مل گیا۔ اس وقت ایلیس کی عمر صرف ۱۳ سال تھی لیکن اس نے بھی اپنے والد کی ابتدائی پریشانیاں دور کرنے میں مدد دینے کے لیے اس کارخانے میں مزدور کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔ اسے علم کی پیاس تھی اور ہمیشہ تعلیم حاصل کرنے کے قابل ہونے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ جلد ہی اس نے ایک سکنڈری اسکول میں رات کو پڑھنا شروع کر دیا اور انگریزی سیکھنے لگا۔ ۱۸ سال کی عمر میں اس نے طب کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس نے نیویارک میں معالج کی حیثیت سے کام شروع کر دیا۔ بعد میں اس نے مڈلٹن شہر میں ماہر نفسیات کی حیثیت سے شہرت حاصل کی۔ اس ماحول میں اسے علم انسانیات سے دلچسپی پیدا ہو گئی اور جلد ہی اس نے اس میدان میں بھی مہارت حاصل کی۔ پیرس میں کافی تجربات کرنے کے بعد وہ سائنسی تحقیقات کی مشکل اور دشوار گذار راہ پر چل پڑا۔ اس نے زندہ اور مردہ تخلیقات پر لشہ پیمائی شروع کر دی۔ رفتہ رفتہ وہ اس فن میں کافی

مہارت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اسے بشر پیمائی کا ماہر سائنس داں تسلیم کیا جانے لگا۔ سب سے پہلے وہ اسٹیٹ پیتھالوجیکل انسٹی ٹیوٹ میں ملازم ہو گیا اور جلد ہی اسے واشنگٹن میں علم بشر پیمائی کے میوزیم کا ڈائرکٹر بنا دیا گیا۔ اس نے اپنی تحقیقی مہم جاری رکھی۔ دور دراز کا سفر کیا اور نئی نئی ایجادات کیں۔ یہاں تک کہ وہ نہ صرف امریکا اور یورپ میں بلکہ پوری دنیا میں علم بشر پیمائی کا مسلمہ سائنسداں تسلیم کیا جانے لگا۔ اپنے سائنسی اور تحقیقی کام کے سلسلے میں اس نے ساری دنیا کا گشت کیا اور اس نے تمام نسلوں اور قبیلوں کے لوگوں کی تحقیق کی۔ الیس نے الکاس میں انسانی ڈھانچوں اور مصری ممیوں کا بھی مطالعہ کیا۔ اس کی ایک تحقیق یہ ہے کہ ریڈ انڈین دراصل ایشیائی تھے اور ۱۴-۱۵ ہزار سال قبل براعظم امریکہ میں اس وقت آئے تھے جب دونوں خطے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔

ڈارون کی تردید

اس نے اس تصور کی دھجیاں اڑا دیں کہ انسان بندر کی نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ ڈارون کی تحقیقات کے بعد یہ تصور عام ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر الیس کا نظریہ یہ ہے کہ انسان کے آباء و اجداد بھی انسان ہی تھے جو آزادانہ پروان پاتے رہے اور تمام انسانی نسلوں کا منبع و ماوی ایک ہی ہے۔ یعنی اس نے "وحدت آدم" کے تصور کی توثیق کی۔ عام خیال ہے کہ انسانی نسل کا آغاز ایشیا سے الیس کئی خطوں میں ایک ساتھ انسانی ارتقاء کے امکان سے اتفاق رکھتا ہے اس کا یہ تصور بھی بالکل نیا ہے کہ سلاؤ باشندوں کی اصل شماری کا ریتھمین ہے۔ اس کی تمام تحقیقات سے پوری دنیا میں دلچسپی کا اظہار کیا گیا اور یکے بعد دیگرے اس کی تحقیقات کی صداقت کا ثبوت ملا۔

اس نے علم انسانیت پر جو کتابیں لکھیں ان میں اس کے نظریات کے سائنسی ثبوت موجود ہیں۔ اس نے ان کتابوں میں وحدت آدم کے تصور کو ثابت کیا ہے۔ الیس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس نے جو بھی تحقیقی کام کیا اس کا مقصد انسانی نظریات میں شرافت کا جوہر پیدا کرنا تھا۔

اسے اپنے آبائی وطن سے بے حد محبت تھی جو اس نے بہت کم سنی میں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے وطن کو کبھی نہیں بھولا پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو وہ اپنے آزاد ملک کے دورے پر گیا۔ ۱۹۲۲ء میں اس نے سائنس دانوں کے ایک جلسہ میں کہا تھا "چیکوسلواک قوم اپنی قومی آزادی اور اپنے وجود کے لیے جدوجہد میں صرف اخلاقی ترقی ہی سے کامیاب ہو سکتی ہے۔ یہ سوچنا بہت غلط ہوگا کہ صرف دولت یا دوسری مادی طاقت اور کوئی کمتر چیز کسی قوم کو بچا سکتی ہے یا اس کے مستقبل کی ضمانت دے سکتی ہے صرف ذہنی فراغ ہی کے ذریعے کسی قوم کو ایسا باثر مقام اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے مستقبل میں اپنے وجود کی حفاظت کر سکے۔

(باقی ص ۳۹ پر)

رسائل و مسائل

علی گڈھ سے ایک خط

محترم نجات اللہ صدیقی صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڈھ سے لکھتے ہیں :-

مکرمی ــــ سلام و تحیات !

زندگی جنوری ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر احسان اللہ خاں صاحب کے مقالہ پر اڈیٹر کا نوٹ پڑھ کر یہ عرض کرنا ضروری محسوس ہوا کہ اس موضوع پر زندگی میں جو مواد شائع ہو اس کی نوعیت یہ نہیں ہونا چاہیے گویا اڈیٹر اور لکھنے والوں کے درمیان مذاکرہ ہو رہا ہے۔ امید ہے ابھی اور لوگ اظہار خیال کریں گے۔ اڈیٹر کو بھی اپنی رائیں ایک ساتھ جامع طور پر ظاہر کرنی چاہییں۔ عجلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہجہ بھی خالص علمی اور غیر جذباتی رکھنا مناسب ہے۔

پہلے موقف (مذکورہ صفحہ ۴۲۔ زندگی، جنوری ۱۹۷۰ء) پر تبصرہ پڑھ کر تعجب ہوا۔ خدا سے بے نیاز سائنس اور سائنس دانوں نے کائنات کے جتنے مظاہر کی تشریح کی ہے خدا کے بغیر کی ہے۔ غالب رجحان کے اتباع میں ان مغربی سائنس دانوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جو خدا کے قائل تھے۔ کسی کتاب میں 'پانی کس طرح برستا ہے' کے عنوان کے تحت یہ بیان کیا گیا ہو کہ سورج کی گرمی سے سمندر سے بھاپ اٹھتی ہے پھر درجۂ حرارت اور ہوا کے دباؤ میں فرق کے سبب مانسونی ہوائیں چلتی ہیں' وغیرہ وغیرہ ۔ ۔ ۔ ۔' تو اس پورے بیان میں خدا کا ذکر نہیں ہوگا۔ فرض کیجیے مجھے ایک شخص ملتا ہے جو اس غلط فہمی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ پانی اس طرح برساتا ہے کہ آسمان میں کسی خزانے سے بادلوں کو پانی سے سیراب کر کے ان کو زمین پر پانی گرانے کو کہتا ہے اور میں اس سے یہ کہوں کہ "پانی اس طرح برستا ہے جس طرح اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے" تو کیا اس سے یہ لازم آئے گا کہ میرے نزدیک بھی پانی برسنے کے پورے عمل میں خدا کی حکمت و ارادہ کا کوئی دخل نہیں اور یہ عمل خود بخود انجام پاتا ہے؟ یا میں اپنے مخاطب سے اس حسن ظن کی امید رکھوں کہ میری پوری بات یہ ہے کہ خدا نے پانی برسانے کا وہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے جسے اس کتاب میں بیان

بیان کیا گیا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ڈاروِن نے ارتقاء کے عمل کی تشریح اس ارادے سے کی ہو کہ انسانوں کو یہ باور کرایا جا سکے کہ انسانی تخلیق خدا کی حکمت و قدرت کی محتاج نہیں بلکہ ایک خود کار عمل کا نتیجہ ہے۔ مگر اس سے ان لوگوں کے موقف پر کیا اثر پڑتا ہے جو یہ رائے ظاہر کرتے ہوں کہ خدا نے انسان کو اس تدریجی عمل کے ساتھ بنایا ہے جس تدریجی عمل کو ڈاروِن نے بیان کیا ہے؟ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہوں یا یہ کہتے ہوں کہ ہو سکتا ہے کہ انسان کو خدا نے تدریجی طور پر بنایا ہو ان کی نسبت سے مسئلہ ڈاروِن یا اس کے نظریے یا اس نظریے کے پیش کرنے کے محرکات یا اس نظریے کے اثرات کا نہیں بلکہ صرف یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بیانات ان کی اس رائے کی تائید کرتے ہیں یا ان میں اس کی گنجائش نکلتی ہے کہ آدم کو اللہ نے مٹی سے بغیر خلق کے درمیانی مراحل سے گذارے ہوئے، بنانے کے بجائے متعدد مراحل سے گزارتے ہوئے بنایا ہے۔ پہلے موقف کا بیان اگر غور سے پڑھا جائے تو اس کا تعلق نظریہ ارتقاء کے صرف اس پہلو سے ہے جس میں تدریجی یا درمیان مراحل کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس نظریے کے محرکات و مقاصد اور اس کے پیش کرنے والوں کے فلسفیانہ مزعومات سے اس موقف کو کوئی ہمدردی نہیں۔

اڈیٹر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نظریے کے اساتذہ نے اور خود ڈاروِن نے اللہ کی تخلیق اور اس کے ارادے کی ضرورت کی نفی کی ہے اور یہ دعویٰ کیا ہے کہ پہلا جرثومہ حیات بغیر کسی خالق کی تخلیق کے آپ سے آپ وجود میں آیا تھا۔۔۔۔ (صفحہ ۴۷۔ زندگی جنوری ۱۹۷۰ء)

چونکہ اس موضوع پر میرا مطالعہ بہت کم ہے اس لیے میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ بیان کس حد تک درست ہے مگر مجھے یہ شبہہ ضرور ہے کہ یہ سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے نہ کہ مطالعہ پر۔ اس شبہہ کی بنا ڈاروِن کی کتاب 'اصل الانواع' کا آخری جملہ ہے جو ذیل میں اس لیے نقل کر رہا ہوں کہ اگر یہ سامنے آچکا ہوتا تو شاید مذکورہ بالا رائے ظاہر کرنے میں زیادہ احتیاط سے کام لیا گیا ہوتا۔ ڈاروِن کی کتاب کے آخری جملہ کا ترجمہ یہ ہے:۔

"زندگی کے اس تصور میں بڑی رفعت ہے کہ اسے اپنی متعدد قوتوں کے ساتھ ابتداءً خالق نے چند ہیئتوں یا ایک ہیئت میں ڈالا۔ پھر یہ سیارہ تو کشش کے مقررہ قانون کے مطابق گردش میں مصروف رہا مگر اتنی سادہ سی ابتدا سے لاتعداد حسین اور حیرت انگیز ہیئتوں نے جنم لیا اور برابر جنم لیتی جا رہی ہیں۔

(ڈاروِن: اوریجن آف اسپیشیز۔ آخری جملہ)

اگرچہ یہ قلم برداشتہ ترجمہ بڑا ناقص ہے مگر میرا منشا صرف یہ اطلاع دینا ہے کہ اس میں زندگی کے آغاز کو خالق کے خلق کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینے کی ہے کہ اگر کچھ سائنس دانوں نے اس طرح کے دعوے کیے ہیں جن کا ذکر اڈیٹر نے مذکورہ بالا عبارت میں کیا ہے تو انھوں نے سائنس کے حدود سے صریح تجاوز کیا ہے۔ جس طرح بیج سے درخت بن جانے یا زلزلہ آنے کے عمل کی تشریح وتفصیل اور اسباب وعلل کے متعلقہ سلسلوں کی دریافت اور وضاحت سے یہ نہیں ثابت ہوتا کہ ان مظاہر کے پیچھے کوئی کرنے والا ہاتھ اور کسی علیم وحکیم ہستی کا ارادہ نہیں ہے اسی طرح سائنس داں اگر ارتقاء کی ہر کڑی دریافت کرلیں، بلکہ فرض کیجیے کہ قید زمان سے باہر نکل جائیں اور وہ ہمیں وہ پورا تاریخی عمل آنکھوں سے دکھلا دیں جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ ارتقاء یوں ہوا ہے اور زندگی کی سادہ ہیئتوں سے انسان تک پہنچنے کے درمیان مراحل یہ تھے ۔۔۔۔ تو بھی یہ نہیں ثابت ہوگا کہ اس عمل کے پیچھے کوئی عامل اور مدبر نہیں ہے۔

مغربی سائنس دانوں کے طرز تحقیق اور طریقہ بیان کے علی الرغم اگر ہم عمل ارتقاء کی تشریح اللہ کے ذکر سے شروع کریں تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم جغرافیہ کی کتابوں میں مذکور زلزلہ آنے یا پانی برسنے کی کیفیت کے بیان کو اللہ کے ذکر سے شروع کریں مجھے یقین ہے کہ موخر الذکر بیانات کو فاضل مدیر زندگی لطیفہ یا ستم ظریفی نہیں قرار دیں گے۔ پھر میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ اول الذکر کو ستم ظریفی کیوں کر قرار دیا جاسکتا ہے۔ اگر خلق آدم میں ارتقاء ہوا تھا تو میں اسے صانع اور قادر مطلق کی محیر العقول صنعت وقدرت کا ایک اور نمونہ قرار دے کر اس سے اس کی صنعت وقدرت پر استدلال کروں گا۔ یقیناً خدا بیج سے یا بغیر بیج کے بھی پورا برگد کا درخت یک لخت کھڑا کر سکتا ہے اور کر سکتا تھا۔ مگر آنکھیں دیکھتی ہیں کہ وہ ایسا نہیں کرتا اور اصحاب بصیرت کو بیج سے برگد کا پورا درخت بننے کے طویل تدریجی عمل میں صنعت خداوندی کے نمونے نظر آتے ہیں۔ اگر آدم کا خلق بھی اس تدریجی ارتقا کے ذریعے ہوا ہو جس کے بعض مراحل کا بیان "نظریہ ارتقاء" میں مذکور ہے تو اس کا معاملہ بھی بعینہٖ یہی ہے۔

گہرے مطالعہ اور سنجیدہ غور وفکر کے بغیر متوارث تعصبات کی بنا پر سائنس کے بیانات پر حکم لگانا نہ صرف علماء کے ذمہ دارانہ مقام کے شایان شان نہیں بلکہ اسلام کے لیے مضر نتائج کا حامل ہوسکتا ہے۔ مطالعہ اور غور وفکر میں ہمیشہ مخالف رائیں رکھنے والوں کی باتوں پر ٹھنڈی فضا میں غور وفکر سے مدد ملتی ہے۔ افسوس کہ مدیر زندگی کا نوٹ بالخصوص اس کے وہ فقرے جو کچھ اسلام پسندوں کے موقف (یعنی پہلے موقف) کے سلسلے

میں لکھے گئے ہیں۔ اس فضا کو بگاڑنے والے ہیں۔

آخر میں صرف عبرت کے لیے ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ امام زمخشری کی معرکۃ الآراتفسیر کشاف کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔ اب ذرا سورہ بقرہ کی آیت ۹۱ کی تفسیر دیکھیے آپ کو یہ جملہ ملے گا

"اس سے معلوم ہوا کہ بادل آسمان سے اترتا ہے اور وہاں سے پانی لے کر آتا ہے نہ کہ ان لوگوں کے زعم کے مطابق جن کا دعویٰ ہے کہ وہ سمندر سے (پانی) لے آتا ہے"

وفیہ ان السحاب من السماء ینحدر و منہا یاخذ ماءہ لا کزعم من یزعم انہ یاخذہ من البحر

کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم ان غلطیوں سے بچ سکیں جو اگلوں سے ہو چکی ہیں۔

زندگی

محترم نجات اللہ صدیقی صاحب نے اپنے مکتوب میں جتنی باتیں لکھی ہیں ان سب پر اظہار خیال ضروری نہیں ہے البتہ اس کے بعض اجزاء کے بارے میں چند باتیں ان کی خدمت میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

(۱) سب سے پہلے میں انہیں یہ یاد دلانا چاہتا ہوں کہ زندگی میں ڈارونی نظریہ ارتقاء کے خلاف جو مضامین یا خطوط ابھی حال میں شائع ہوئے ہیں وہ اس روداد کے بعد چھپے ہیں جو میں نے علی گڈھ کل ہند سمینار کے بارے میں زندگی مئی ۹۰ء کے شمارے میں شائع کی تھی اور پھر میں نے اپنا وہ مقالہ بھی شائع کر دیا تھا جو سمینار میں پڑھا گیا تھا اس میں میں نے ڈارونی نظریہ ارتقاء پر سخت تنقید کی ہے اس لیے میری حیثیت محاکمہ کرنے والے کی نہیں ہے بلکہ اس بحث کے ایک فریق کی ہے۔ محاکمہ قارئین زندگی خود کرلیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جناب احسان اللہ خاں صاحب کے مضمون پر ساتھ ہی ساتھ اپنا نوٹ شائع کرنا ضروری سمجھا اور اسی وجہ سے میں آپ کے خط پر بھی اظہار خیال ضروری سمجھتا ہوں۔

(۲) آپ نے اسلام پسند اساتذہ کی طرف پہلے موقف کی توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"ہو سکتا ہے کہ ڈارون نے ارتقاء کے عمل کی تشریح اس ارادے سے کی ہو کہ انسانوں کو یہ باور کرایا جاسکے کہ انسان کی تخلیق خدا کی حکمت و قدرت کی محتاج نہیں بلکہ ایک خود کار عمل کا نتیجہ ہے مگر اس سے ان لوگوں کے موقف پر کیا اثر پڑتا ہے جو یہ رائے ظاہر کرتے ہوں کہ خدا نے انسان کو اسی

تدریجی عمل کے ساتھ بنایا ہے جس تدریجی عمل کو ڈارون نے بیان کیا ہے؟" اس پیراگراف کو ختم کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے: "پہلے موقف کا بیان اگر غور سے پڑھا جائے تو اس کا تعلق نظریہ ارتقاء کے صرف اس پہلو سے ہے، جس میں تدریج، یا درمیان مراحل کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ اس نظریے کے محرکات و مقاصد اور اس کے پیش کرنے والوں کے فلسفیانہ مزعومات سے اس موقف کو کوئی ہمدردی نہیں"

آپ کی یہ توضیح پڑھ کر صدمہ پہنچا۔ پہلے تو میں حسن ظن کی وجہ سے یہ سمجھا تھا کہ پہلا موقف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے کالبد میں روح پھونک کر بیک دفعہ انہیں انسان نہیں بنایا تھا بلکہ پہلے ان کا جرثومہ حیات پیدا کیا اور پھر اسے بتدریج ترقی دے کر انسانی شکل تک پہنچایا جس طرح آج رحم مادر میں انسانی جرثومے بتدریج ترقی پا کر انسانی شکل اختیار کرتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ یہ عمل بطن مادر میں تکمیل کو پہنچتا ہے اور حضرت آدم کے لیے یہ عمل خارج میں تکمیل کو پہنچایا گیا۔ اسی لیے میں نے اپنے نوٹ میں لکھا تھا کہ اگر پہلے موقف والے حضرات صرف اسی کو نظریہ ارتقاء کہتے ہیں تو میں اس کو مذہب کے خلاف نہیں کہتا لیکن آپ کی توضیح سے معلوم ہوا کہ پہلا موقف یہ ہے کہ قرآن حکیم کے بیانات میں ان تمام درمیانی مراحل کی بھی گنجائش موجود ہے جس کی تفصیل ڈارون اور اس جیسے دوسرے سائنس دانوں نے بیان کی ہے۔ یعنی انسان کسی جانور سے ترقی پا کر انسانیت کی منزل تک پہنچا ہے

—— اب میں پورے یقین کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یہ موقف قطعاً غلط ہے اور قرآن حکیم کے بیانات میں اس کی گنجائش موجود نہیں ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو کسی بندر یا لنگور سے ترقی دے کر انسان بنایا تھا وہ اس کی طرف ایسی بات منسوب کرتے ہیں جس کی کوئی سند اس نے نازل نہیں کی اور جو تخلیق آدم کے سلسلے میں تیرہ صدیوں تک کے تمام علمائے امت کی تفسیروں کے خلاف ہے اور آج تک کتابوں سے الماریاں بھر دینے کے باوجود خود سائنس دان بھی یہ ثابت نہیں کر سکے ہیں کہ انسان کسی جانور سے ترقی پا کر انسان بنا تھا۔ اس کے علاوہ فاضل مکتوب نگار کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ زندگی میں جو کچھ شائع ہوا ہے اس میں ڈارون کے پورے نظریہ ارتقاء پر تنقید کی گئی ہے اس کے کسی ایک پہلو یا جز پر نہیں۔ پھر یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب علی گڑھ کے اسلام پسند اساتذہ کو پورے نظریے اور اس کے اثرات و نتائج سے ہمدردی نہیں ہے —— اور کسی مسلمان کو ہو بھی نہیں سکتی —— تو آخر انہیں کیا تشویش پیدا ہوئی کہ انھوں نے باضابطہ اجتماع کر کے اس کے بارے میں موقف کی تعیین کی اور ان میں سے بعض نے اس غیر ثابت شدہ تدریجی عمل کو جسے ڈارون نے بیان کیا ہے مشاہداتی حقیقت تک کہہ ڈالا اور یہ اعلان کرنا بھی ضروری سمجھا کہ "تخلیق مخصوص کے نظریے پر جو مشاہداتی حقیقت کے خلاف ہے

کھل کر تنقید کرنی چاہیے" اور محترم ڈاکٹر احسان اللہ صاحب نے یہ بھی لکھ دیا کہ "اس کی مخالفت خواہ کسی مقصد سے کی جائے خود اس مقصد کی جڑ کھود دینے کے مترادف ہے" انھوں نے اس نظریہ پر عیسائی علماء کی تنقید اور پھر ان کی خاموشی کا ذکر کرنا بھی ضروری سمجھا، گویا مسلمان علماء کی تنقید بھی عیسائی علماء کی تنقید کی طرح بے معنی ہے۔ مجھے فاضل مکتوب نگار سے یہ شکایت کرنے کا حق ہے کہ انہیں ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں نہ کوئی جذباتیت نظر آئی اور نہ فضا کو بگاڑ دینے والی کوئی بات نظر آئی مگر زندگی کے اڈیٹر نے لطیفہ اور ستم ظریفی کا لفظ لکھ دیا تو اس میں انھیں دونوں چیزیں نظر آگئیں، یہاں تک کہ خود انھوں نے ڈارونی عمل ارتقاء کے لیے قرآن سے ثبوت پیش کیے بغیر، تیرہ صدیوں تک مسلمہ طریقۂ تخلیق آدم کے بیان کو متوارث تعصبات کے لفظ سے نوازا، گویا ڈارون نے انسان کے انسان بننے کا جو عمل بیان کیا ہے وہ ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کے خلاف کچھ کہنا متوارث تعصبات ہی کے ذیل میں آسکتا ہے۔ کیا فاضل مکتوب نگار نے یہ لکھ کر فضا کو درست کرنے کی کوشش کی ہے؟ —— میں ان سے اور محترم احسان اللہ خاں صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا واقعی انسان کو بندر اور لنگور کی اولاد مان لینے سے اسلام کے لیے مفید نتائج اور انسان کو ابتداءً ہی انسان مان لینے سے مضر نتائج مترتب ہوں گے؟ دونوں فاضلوں نے ڈارون کے بیان کردہ تدریجی ارتقاء آدم پر تنقید اور اس کے انکار کو اسلام کے لیے مضر قرار دیا ہے کیا فی الواقع ان کے نزدیک اس نظریے کو یہ حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ ہم ان کے بڑے شکر گزار ہوں گے اگر وہ قرآن سے یہ ثابت کر دیں کہ انسان بندر اور لنگور سے ترقی پاکر انسان بنا تھا۔

(۳) میں نے چارلس ڈارون کے بارے میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ "اس نے دعویٰ کیا ہے کہ پہلا جرثومہ حیات بغیر کسی خالق کی تخلیق کے آپ سے آپ وجود میں آیا تھا" شاید خط لکھتے وقت میری عبارت نظر سے اوجھل ہو گئی۔ مجھے بھی یہ معلوم ہے کہ ڈارون خدا کا منکر نہ تھا لیکن انسانی تخلیق کے بارے میں اس نے جو نظریہ مرتب کیا تھا اس میں کہیں بھی خدا کی تخلیق اور اس کے ارادے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی اس لیے ملحدین نے اس کی کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیا یہاں تک اس کو اپنے ملحدانہ نظریات کے لیے ایک زبردست ہتھکنڈا بنا لیا اور پہلے جرثومۂ حیات کے بارے میں بھی صاف صاف کہا کہ وہ محض مادی عوامل کے تحت وجود میں آیا تھا۔ بے شک میرا مطالعہ بھی اس موضوع پر فاضل مکتوب نگار ہی کی طرح بہت کم ہے لیکن میں نے سنی سنائی باتوں پر یہ نہیں لکھا ہے بلکہ ان لوگوں کے مضامین میں پڑھ کر یہ لکھا ہے جنھوں نے ڈارون کی زبان میں براہ راست اس موضوع کا مطالعہ کیا ہے اور حوالے

میں سب سے پہلے آپ کی توجہ ڈاکٹر احسان صاحب کے اس مضمون ہی کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جس پر میرے نوٹ سے متاثر ہو کر آپ نے یہ خط لکھا ہے۔ ان کے ایک ذیلی عنوان صحیح موقف کو دوبارہ پڑھیے اس عنوان کے تحت جو کچھ انھوں نے لکھا ہے سب پر اظہار خیال مقصود نہیں ہے صرف ایک بات کی نشان دہی کرتا ہوں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ :-

"انیسویں صدی میں مندرجہ بالا حقیقت (ارتقار کی حقیقت۔ ایڈیٹر) تسلیم کرلینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ یہ تمام عالم خود بخود وجود میں آگیا اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے" (زندگی جنوری ۶۸ء صفحہ ۱۴)

میں نے تو صرف یہ لکھا تھا کہ نظریہ ارتقا کے اساتذہ نے پہلے جرثومہ حیات کے بارے میں کہا ہے کہ وہ آپ سے آپ وجود میں آیا تھا اور ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ ارتقار کی حقیقت تسلیم کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ تمام عالم بغیر کسی خالق کے خود بخود وجود میں آگیا ہے۔ میں یہیں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ مسئلہ زیر بحث یہ نہیں ہے کہ ارتقار آدم کو تسلیم کرلینے کے بعد سائنس دانوں نے سائنس کی حدود کے اندر رہ کر خدا کا انکار کیا تھا یا باہر جاکر، میں نے جو نوٹ لکھا ہے اس کو اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ ارتقار آدم کو تسلیم کرلینے کے بعد سائنس دانوں نے خالق کا انکار کیا ہے یا نہیں ؟

جناب وحید الدین خاں صاحب کا ایک مقالہ "نظریہ ارتقا" زندگی مئی ۶۱ء میں شائع ہوا تھا اور غالباً یہ مقالہ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں پڑھا تھا۔ اس مقالے میں انھوں نے سمپسن کے حوالے سے پہلے جرثومۂ حیات کے خالق کے بارے میں اہم سوال کے جواب کا یہ ترجمہ دیا ہے :-

زندگی کی بالکل ابتدائی شکل ابھی تک سائنس کو معلوم نہیں ہوسکی اور نہ موجودہ حالات میں اس کی امید ہے کہ کبھی معلوم ہوسکے البتہ ہمارا مطالعہ نہ صرف اس امکان کی شہادت دیتا ہے بلکہ وہ ہمیں اس گمان غالب تک لے جاتا ہے کہ زندگی غیر نامیاتی عناصر سے خود بخود وجود میں آئی اور یہ واقعہ کسی مافوق طاقت کی مداخلت کے بغیر محض مادی عمل کے ذریعے ہوا ہے، اسی نامعلوم آغاز سے ارتقار کرکے تمام دوسری انواع حیات وجود میں آئی ہیں " (مینگ آف ایولیوشن صفحہ ۱۷۶)

جناب اکرام الدین صاحب الہ آبادی کا ایک طویل مقالہ "مسئلہ ارتقار" زندگی میں بالاقساط شائع ہوا تھا، انھوں نے ایک قسط میں واحد الخلیہ کیڑے سے لے کر بندر اور اس کے بعد انسان کی ارتقائی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھا ہے :-

"یہ نظریہ چند منکرین خدا فلاسفہ کے رجحان طبع کا نتیجہ ہے۔ خدا کی ذات و صفات اور اس کی حکمتوں کا انکار کرنے کے بعد ان کے ذہنوں میں اس نظریے کے سوا کوئی دوسرا نظریہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔" (زندگی جنوری ۱۹۵۶ء صفحہ ۱)

ڈارون خدا کا منکر نہ تھا لیکن اس نے ارتقاء آدم کا سبب خدا کے ارادے اور اس کی حکمت کو قرار نہیں دیا بلکہ اس کے نزدیک اس کا سبب بقائے اصلح، تنازع للبقا اور انتخاب فطری تھا محترم اکرام الدین صاحب ڈارون کے وقت یورپ کے ذہنی رجحانات کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں :-

"مادہ پرستوں نے جب اس مقالہ کو دیکھا تو ان کی مانگی مراد ملتی نظر آئی انھوں نے لاینحل سوالات کے جواب اس مقالے سے اخذ کر لیے ان میں سب سے زیادہ بنیادی اور اہم سوال یہ تھا کہ ہمارے جسم کے مختلف اعضا کی ساخت و ترتیب سے ایک مقصدیت کا اظہار ہوتا ہے جسے بغیر ایک حکیم و علیم ذات کی مداخلت کے پیدا ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا، خالص میکانکی طاقت کے ذریعے جسم کے اعضا کی حرکت تو ثابت کی جا سکتی ہے لیکن ان کی حرکت میں جو مقصدیت پائی جاتی ہے اس کی کسی طرح توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس مسئلے کا حل مادہ پرستوں نے ڈارون کے بقائے اصلح، فطری انتخاب اور تنازع للبقا کے اصول ثلاثہ سے اخذ کر لیا۔ چنانچہ ڈارون کے پیش کردہ مقالہ (اوریجن آف اسپیشیز) کی اشاعت ان مادہ پرستوں کے ذریعے بہت زوروں سے ہوئی اور اس کی ہزاروں اور لاکھوں کاپیاں فروخت ہوئیں۔" (زندگی دسمبر ۵۵ء صفحہ ۸)

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صرف زندگی کی ابتدائی شکل ہی کے بارے میں نہیں بلکہ تمام عالم کے بارے میں یہ طے کر لیا گیا کہ اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ فاضل مکتوب نگار اچھی طرح باخبر ہیں کہ فلاسفہ یونان کی طرح کسی ہستی کو محض علت العلل کی حیثیت سے مان لینا ایک بات ہے اور کائنات کے تمام دروبست میں ایک علیم و حکیم ہستی کی تخلیق و تکوین اس کے علم و حکمت اور اس کے ارادے اور مشیت کو کارفرما تسلیم کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ ڈارون بھی بس فلاسفہ یونان ہی کی طرح خدا کا قائل تھا۔ انھوں نے اس کے جس آخری جملے کا ترجمہ پیش کیا ہے وہ بھی بتا رہا ہے کہ ایک خالق نے زندگی کی ابتدا کر دی اور اس کا کام ختم ہو گیا۔ اس کی فتنہ انگیز کتاب کا سب سے بڑا جرم یہی ہے کہ اس نے ارتقاء آدم کی ایسی تشریح کی کہ اس میں کہیں خدا کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ اسی لیے اس کے بعد اس نظریے کے اساتذہ نے اس "بے ضرورت چیز" کا انکار کر دیا اور یہ احمقانہ رائے اختیار کر لی کہ زندگی کی ابتدا بھی کسی خالق کی مداخلت کے بغیر ہی ہوئی تھی۔ انھوں نے ارتقائے آدم کی اس تفصیل کو بھی جسے اس کتاب نے مرتب کیا تھا بے دلیل عقیدہ کی طرح مان لیا

اور خالق کا انکار کر بیٹھے۔ یورپ کے ملحدانہ فلسفوں اور باطل نظریات سے اچھی طرح واقف لوگوں نے اس کتاب کو الحاد کی جڑ قرار دیا ہے۔

نومبر اور دسمبر کے دو شماروں میں ایک تازہ مضمون "نظریہ ارتقاء" شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک جگہ جناب اقبال اعظمی ایم اے نے لکھا ہے :-

" ارتقاء میں کسی مافوق الفطرت طاقت کے وجود کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ یہ عالم آپ کے کل اور اس کے مکین تخلیق کا نتیجہ نہیں ہیں (زندگی نومبر ۶۹ ص۲)

وہ دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

" نظریہ ارتقاء میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ روئے زمین پر حیات کا پہلا ذرہ اپنے آپ ہی غیر ذی روح مادہ سے وجود میں آیا " (زندگی دسمبر ۶۹ ص۲)

یہاں یہ چند حوالے محض اس شبہے کو دور کرنے کے لیے پیش کیے گئے ہیں کہ زندگی کے اڈیٹر نے اپنے نوٹ میں جو بات لکھی تھی وہ سنی سنائی باتوں پر مبنی نہ تھی۔ یہ نوٹ طویل ہوتا جارہا ہے اس لیے آخر میں ڈارون کی تشریح ارتقاء پر آدم پر ایک تنقید نقل کرکے اس کو ختم کرتا ہوں۔

اٹیمی انرجی کمیشن کے ایک ماہر علم الابدان ڈاکٹر ٹی سان نہیمشن نے بہت صاف گوئی سے کام لیا ہے وہ فرماتے ہیں :-

" وہ سائنس داں جو ادھر ادھر اس بات کا درس دیتے پھر رہے ہیں کہ ارتقاء زندگی کی ایک حقیقت ہے وہ ایک لطیفہ گو سے کم نہیں اور وہ داستان یا لطیفہ جو وہ سنا رہے ہیں وہ دنیا کا سب سے دلچسپ لطیفہ ہے۔ ارتقاء کی تشریح کے وقت ہم ذرہ برابر بھی حقیقت سے کام نہیں لے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ قیاس آرائیوں کا ایک الجھا ہوا گنجلک کھیل یا اعداد و شمار کی شعبدہ بازی ہے "

(زندگی نومبر ۶۹ نظریہ ارتقاء ص۲)

ایک مختصر پمفلٹ

جناب صوفی نذیر احمد صاحب کشمیری نے ۱۶ صفحات کا ایک مختصر کتابچہ چھپوا کر اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ یہ کتابچہ زندگی میں بھی اشاعت کے لیے آیا ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے: "مسلمانوں کا ہندوانا عقل وانسانیت کا تقاضا ہے یا ہندوستان کا اسلامیانا" صوفی صاحب کا یہ مضمون متعدد روزناموں میں شائع ہو چکا ہے۔ اس پمفلٹ کا فوری محرک مسلمانوں کو ہندیانے کا وہ نعرہ ہے جو مسٹر مدھوک لگا رہے تھے اور اب تو وہ جن سنگھ کی باضابطہ قرارداد بن چکا ہے۔ اس کتابچے میں صوفی صاحب نے بہت اختصار کے ساتھ اسلام کی چند بنیادی اور نمایاں تعلیمات پیش کر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں کو ہندیانا عقل وانسانیت کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس ملک کو اسلام کی راہ دکھائی جائے کیونکہ خدانخواستہ اگر مسلمانوں کو بھی ہندیا لیا گیا تو یہ پورا ملک قبل از تاریخ کی اس فضا میں چلا جائے گا جب ہر فرد کی وفاداری صرف اپنی اپنی ذات، اپنے اپنے سوشل کوڈ، اپنی اپنی دیوی و دیوتا تک محدود ہوتی تھی۔ ہندوستان میں جو مختلف قسم کے بحران پیدا ہو گئے ہیں انہیں ختم کرنے کے لیے ایک عالمگیر اخلاقی و روحانی انقلاب کی ضرورت ہے اور یہ انقلاب اسلام ہی پیدا کر سکتا ہے۔

اس پمفلٹ اور صوفی صاحب کے خلاف ایک ایسے اردو روزنامہ میں جس کے ایڈیٹر مسلمان ہیں ایک تیز و تند اداریہ ٹیوریل پڑھ کر تعجب ہوا۔ اس پمفلٹ کے خلاف اگر پہلی آواز کسی جن سنگھی اخبار کی طرف سے اٹھتی تو تعجب نہ ہوتا کیونکہ یہ براہ راست اس نعرے کے خلاف ہے جو جن سنگھ مسلمانوں کو ہندیانے کے بارے میں لگا رہا ہے۔ سوال پیدا ہوا کہ سب سے پہلے ایک مسلمان مدیر شہیر نے اس کے خلاف آواز کیوں اٹھائی اور وہ بھی اس لہجے میں جو متانت اور وقار سے بھی گرا ہوا ہے۔ صوفی صاحب کا یہ پمفلٹ پڑھ کر سوال کا جواب مل گیا۔ انہوں نے اس پمفلٹ میں بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ ہندوستان کا سیکولر محاذ بھی مسلمانوں کو نیشنلائز کرنے (قومیانے) کی کوشش کر رہا ہے اور ترتیب کے لحاظ سے صوفی صاحب نے پہلے سیکولر محاذ ہی پر تنقید کی ہے اور اسے سمجھانے

کی کوشش کی ہے بس یہی ان کا قصور ہے جو مدیر شہیر کے لیے ناقابل برداشت ثابت ہوا کیونکہ وہ سیکولرزم اور سوشلزم کے خلاف کچھ سنکر یا پڑھ کر اپنے قابو میں نہیں رہتے۔ انھوں نے اس پمفلٹ میں کہی ہوئی باتوں پر اظہار خیال کو بے حد طولانی کام کہہ کر ختم کر دیا اور سارا زور قلم صوفی صاحب کی تجہیل پر صرف کر ڈالا۔ انھوں نے پانچ نمبروں میں "صوفی صاحب نہیں جانتے" "صوفی صاحب نہیں جانتے" کی تکرار کی ہے اور اس کے بعد بھی جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ "صوفی صاحب نہیں جانتے"۔

یہ انداز کلام مدیر شہیر کے عام انداز کلام کے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ پمفلٹ پڑھ کر بے حد مشتعل ہو گئے اور اسی اشتعال میں پورا اداریہ لکھ ڈالا۔ صوفی صاحب نے اس پمفلٹ کی تمہید میں لکھا ہے:

آج ہندوستانی مسلمان کو ہندوانے یا نیشنلائزڈ کرنے کا شور پورے شمالی ہند کا سلوگن بنتا جا رہا ہے مگر اس مشن کو ایک تنظیم کے بجائے دو تنظیمیں انجام دے رہی ہیں اور ایک طریقہ کار کے بجائے دو جدا جدا طریق عمل اختیار کر رکھے ہیں۔ ایک گروہ نہایت ہمدردی پیار و محبت سے اور عمدہ عمدہ وعدے دے کر یہ مشن انجام دے رہا ہے۔ یہ گروہ اپنی بصیرت اور اپنی حدود کے دائرے میں نیک نیت محسوس ہو رہا ہے۔ دوسرا گروہ اس کے خلاف ہر قسم کے خوف و ہراس اور دہشت و دھمکی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہے۔ پہلا گروہ سیکولرزم کا حامی ہے اور دوسرا ثقافتی ہم آہنگی کی دعوت دیتا ہے۔"

ہر وہ مسلمان جو نیشنلزم، سیکولرزم اور سوشلزم پر ایمان نہیں لایا ہے، صوفی صاحب کے اس تجزیے سے متفق ہوگا کیونکہ یہ کوئی خیالی بات نہیں بلکہ مشاہداتی حقیقت ہے دوسرے مقام پر صوفی صاحب نے لکھا ہے۔

ہمارے سیکولر بھائی بہنیں بھی اپنے منصوبوں پر غور کر لیں تاکہ انہیں اپنے خود ساختہ خیالات کی قدر و قیمت بھی معلوم ہو جائے۔ راقم الحروف کو تو سیکولر گروہ کے خیالات تلخی کو کم کرنے کے لیے شریف الطبع لوگوں کی خود فریبیاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہ حقائق سے گریز کی ایک مرنجاں مرنج راہ ہے۔ ص۱۲

صوفی صاحب کی یہ تنقید مدیر شہیر کیسے برداشت کر لیتے۔ ان کے نزدیک پورے ملک کے بنیادی مسائل صرف امیری و غریبی کے گرد چکر کاٹتے ہیں اور انہیں کو وہ "حقائق" سمجھتے ہیں۔ باقی رہے دوسرے مسائل تو ان کی حیثیت محض ضمنی ہے۔ صوفی صاحب ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

حقیقت یہ ہے کہ حیوانات کے مقابل انسان کا مخصوص طریق زندگی وہ ہے جو اخلاقی و روحانی شعور و احساس کے ماتحت ہوتا ہے اور انسانی مذہب اسی اخلاقی و روحانی شعور و احساس و یقین کے

(باقی صـ۱۲ پر)

انور اعظمی صفحات ۳۳۴ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر قیمت مجلد سات روپیے —

اذانِ سحر ناشر :- انور اکیڈمی - سرائے میر - اعظم گڈھ۔

انور اعظمی مرحوم کا یہ مجموعہ کلام خاصے اہتمام کے ساتھ شائع کیا گیا ہے اور ان کے احباب لائق مبارکباد ہیں کہ انھوں نے ان کا کلام محفوظ کر دیا ہے۔ اس کتاب میں عرض ناشر کے بعد جناب کوثر اعظمی کے قلم سے ایک مفصل "تعارف" ہے جو ۳۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ اس تعارف میں مرحوم کی ولادت سے لے کر وفات تک کے واقعات، حالات اور سوانح جمع کیے گئے ہیں۔ اس تعارف کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے بر ا میں اپنی زندگی کے جو سات آٹھ سال بسر کیے تھے ان میں انہیں اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا زیادہ موقع ملا تھا۔ چنانچہ اس تعارف کا ایک بڑا حصہ ہفت روزہ انقلاب رنگون انور نمبر اور روزنامہ پرواز رنگون کے اقتباسات سے مرتب کیا گیا ہے۔ انور اعظمی جیسے کار آمد اور باصلاحیت افراد جب جوانی ہی میں وفات پا جاتے ہیں تو یہ مصرع یاد آجاتا ہے۔ ع این ماتم سخت ست کہ گویند جواں مُرد

اس تعارف میں رسالہ زندگی کی ادارت، کے ذیلی عنوان کے تحت لکھا گیا ہے کہ انور مرحوم نے ایک عرصہ تک ماہنامہ زندگی کو ترتیب دینے کا فریضہ بھی انجام دیا تھا۔ یہ بات واقعہ کے خلاف ہے۔ جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے وہ کچھ عرصے تک زندگی کے منیجر کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔" دوستوں کا دوست" کے تحت مرحوم کی زندگی کے بعض واقعات کا ذکر اور وہ بھی مدحیہ انداز میں مناسب نہیں معلوم ہوا۔ پاس دوستی اور خیال خاطر احباب کے بھی یقیناً کچھ حدود ہیں۔

اس مجموعے میں انور مرحوم کی نظمیں اور چند قطعات ہیں۔ غزل ایک بھی نہیں ہے۔ شاید انھوں نے غزلیں نہیں کہی ہوں گی۔ انور کا کلام خود اس پر گواہ ہے کہ وہ ادب برائے ادب اور شاعری برائے تفریح یا برائے حصولِ

شہرت کے قائل نہ تھے بلکہ ان کے سامنے ایک بلند مقصد تھا اور شاعری اس مقصد کو دوسروں تک پہنچانے کا وسیلہ تھی، وہ اسلام کو ایک مکمل اور بہترین نظام حیات سمجھتے تھے۔ وحدتِ الٰہ اور وحدت آدم پر یقین رکھتے تھے اور چاہتے تھے کہ دنیا میں اسی نظام اور اس کی بنیادی اقدار کا بول بالا ہو ___ ان کی نظم "انتظار" کے یہ اشعار کتنے دل آویز ہیں :-

وہ مردانِ غازی، زمانے کے سلطاں	جبینوں سے جن کی جلال آشکارا
حوادث کی تقدیر جن کے ارادے	زمانے کی رفتار جن کا اشارا
اذانوں سے جن کی شب تار لرزاں	دعاؤں سے جن کی سحر آشکارا
وہ دھرتی کے سیوک، امنگوں نے جن کی	بیاباں بسائے گلستاں سنوارا

وہ آفاق کے مدعا کب اٹھیں گے
نہ غازی وہ پرچم کشا کب اٹھیں گے

"آخری مرحلہ" بھی اثر انگیز نظم ہے۔ اس کا ایک بند یہ ہے۔

تیر دل دوز نہ یہ تیغ جفا کار نئی	مکر و افسوں کی نہ یہ گرمی بازار نئی
لب حق گو کی نہ یہ جرأت گفتار نئی	نہ یہ جلاد نئے ہیں نہ یہ تلوار نئی

جب حقیقت کبھی اقدام کیا کرتی ہے
کفر زاروں میں قیامت ہی مچا کرتی ہے

اس کتاب میں جو قطعات ہیں ان میں ایک قطعہ یہ ہے

چھپا چھپا کے نہ رکھ ان جگر کے داغوں کو	انہیں ستاروں سے اک آفتاب پیدا کر
نہ ہو سکے، تو شکایت نہ کر زمانے کی	جو ہو سکے تو کوئی انقلاب پیدا کر

انور مرحوم نے اپنے مقصد کی تبلیغ اور اپنے خیالات کے ابلاغ کے لیے اپنی نظموں میں سادہ زبان استعمال نہیں کی ہے، بلکہ اکثر و بیشتر انھوں نے اپنے خیالات، استعارات و تشبیہات سے مرصع زبان میں پیش کیے ہیں۔ وہ راست انداز بیان پسند کرتے تھے اس لیے ان کے اشعار میں ابہام بہت کم ہے۔ وہ زبان کے قواعد و ضوابط اور اس کے رکھ رکھاؤ کا بھی لحاظ رکھتے تھے۔ اس لیے اس طرح کی غلطیاں بھی ان کے کلام میں بہت کم نظر آئیں میں چند اشعار کی نشان دہی کرتا ہوں۔ درج ذیل شعر میں ایک ترکیب بھی عجیب ہے اور معنے کے اعتبار

بھی مبہم ہے ۔

نہ جانے کیا تھا؟ پیغام جوانانِ چمن لیکن — تڑپتا ہے ہراک قطرہ مذاق بال و پر ہوکر (ص ۲)

"مذاق بال و پر" کی ترکیب بھی عجیب ہے اور قطروں کا مذاق بال و پر ہوکر تڑپنا بھی سمجھ میں نہیں آیا ——

ایک شعر میں تذکیر و تانیث کی غلطی بھی ہے ۔

ابھی اندیشۂ جنبش کیا تھا کلک فطرت نے — مرتب کر دیا بے تابیوں نے داستاں میری (ص ۲)

مُرتب کر دی، صحیح ہے —— ایک شعر یہ ہے :-

سن کے کچھ سوچ کے پھر میر حسا کرنے کہا — مجھ کو تسلیم کہ ہے رائے مری غلطی پر

وزن میں غلطی، کا لام ساکن ہوگیا ہے ۔

بعض اشعار میں فکری غلطی بھی نظر آئی

ممکن نہیں ہے صلح حسین اور یزید میں — اسلام ہے تو کفر سے ٹکرائے گا ضرور

حضرت حسینؓ اور یزید کی جنگ اسلام اور کفر کی جنگ نہ تھی ۔ اس لیے اس شعر کے دونوں مصرعے ہم آہنگ نہیں ہیں —— یہ جزوی غلطیاں ہیں اور کون سا مجموعۂ اشعار ایسا ہے جو غلطیوں سے بالکل پاک ہو، بحیثیت مجموعی انور مرحوم کا کلام فکر انگیز اور لائق مطالعہ ہے ۔

اسلامی نظمیں

محمد شفیع الدین نیر۔ ایم اے ۔ صفحات ۴۰ کتابت، طباعت، کاغذ بہتر۔ قیمت ۵۰ پیسے
ناشر :- نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

جو لوگ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے واقف ہیں وہ نیر صاحب سے ناواقف نہ ہوں گے ۔ انھوں نے ایک معلم کی حیثیت سے اور بچوں کے ذہن کے مطابق نظمیں کہنے اور کہانیاں لکھنے کے لحاظ سے ہند و پاک میں خاصی شہرت حاصل کی ہے ۔ بچوں کا رسالہ 'پیام تعلیم' پڑھنے والا ہر قاری ان کی اس خاص صلاحیت سے اچھی طرح واقف ہوگا ۔ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب جیسے ماہر تعلیم نے ان کو پیدائشی معلم کہا ہے ۔ ان کی چند اسلامی نظموں کا یہ مجموعہ "اسلامی نظمیں" ملک میں کافی مقبول ہوا ہے ۔ اس کی مقبولیت کی دلیل یہ ہے کہ اس کا ساتواں اڈیشن ہمارے پیش نظر ہے جو ۶۸ء میں چھپا ہے ۔ اس کتابچے کی نظمیں پڑھ کر صاف محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے محض بچوں کو خوش کرنے اور ان کی تفریح کے لیے یہ نظمیں نہیں کہی ہیں بلکہ ان کے سامنے یہ بلند مقصد رہا ہے کہ بچوں کے

ذہن کو مسلمان بنایا جائے اور ان کے دلوں میں اسلام کی محبت اور اسے فروغ دینے کا جذبہ بیدار ہو۔ زبان کی صحت اور خیالات کی صحت ان نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کی نظم "یاران نبی" کے دو آخری شعر یہ ہیں:۔

یہ وہ تھے جن سے صدق وصفا کا نام دوبالا آج بھی ہے — یہ وہ تھے جن کی نیکی سے دنیا میں اجالا آج بھی ہے

نیر پھر تازہ ہو جائے ان سب کی یاد زمانے میں — ہم بھی ایسے ہی کام کریں، ہو جائیں شاد زمانے میں

نیر صاحب بچوں کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ ان کی نظم "کلام اللہ" کے یہ تین شعر پڑھیے ۔

یہی قلت میں بھی ڈر دل سے کثرت کا مٹاتا ہے — یہی خطروں میں لَا تَحْزَنْ کا نقارہ بجاتا ہے

اسی نے ظلم اور عدوان سے لڑنا سکھایا ہے — اسی نے صدق کے فرمان پر اڑنا سکھایا ہے

وہی نیر مسلماں ہوں، وہی پھر ان کا قرآں ہو — یہی شمع ہدیٰ پھر بزم عالم میں فروزاں ہو

اس کتاب میں بعض مطبعی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ ص۱۲ سطر ۸ میں کوئی لفظ غالباً "ہم" چھوٹ گیا ہے ۔ ص۴۴ سطر ۶ نیک کام چھپ گیا ہے۔ غالباً نیک نام ہو گا۔ مسلمان بچوں اور بچیوں کے لیے یہ کتابچہ ایک اچھا تحفہ ہے ۔

ہماری نعت صفحات ۳۲ ۔ قیمت ۳۰ پیسے

یہ پمفلٹ نیر صاحب کی نعتیہ نظموں کا مختصر مجموعہ ہے۔ اس پمفلٹ پر مولانا عبدالسلام قدوائی کا پیش لفظ ہے اور انھوں نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ نیر صاحب نے دل کے ساتھ عقل کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی ہے جو بھی اسے پڑھے گا وہ محسوس کرے گا کہ شاعر نے صرف فضائل ومناقب بیان نہیں کیے بلکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات بھی پیش کی ہیں۔ ابتدا میں سورۂ فاتحہ کا منظوم ترجمہ ہے اور اس کے بعد نعتیہ کلام شروع ہوتا ہے۔ اس مجموعے میں بھی نیر صاحب نے زبان کی سلاست وصحت اور خیالات کی صحت کا خیال رکھا ہے ۔ طباعت کی غلطیاں اس میں بھی رہ گئی ہیں۔ منظوم کلام میں مطبعی غلطیاں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ص۱ کے آخری شعر میں دو غلطیاں ہیں۔ پہلے مصرع میں سبق کو سب لکھ دیا ہے اور دوسرے مصرع میں برائی کو بڑائی چھاپ دیا ہے۔ ص۱۳ کے آخری مصرع میں چلا جاؤ کے بجائے چلاؤ چھپا ہے۔ ص۱۴ کا آخری مصرع ناموزوں معلوم ہوتا ہے۔ ص۱۶ پر اس مصرع میں "پھر کا بیا بیوں کا لڈکا ہمیں بتا دو" "لڈکا" کا لفظ سماعت پر گراں گزرتا ہے کوئی اور لفظ ہوتا تو بہتر تھا۔ ص۲۱ پر ایک مصرع "سکھایا بابا ؤں سے جا جا کے اڑنا" بلاؤں سے

اڑنے کا مطلب کیا ہوگا اور پھر جاجا کے اڑنا تو اور بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔

چاند کا سلام (مغربی پاکستان)

اسعد گیلانی۔ صفحات ۲۴۰۔ قیمت چار روپے۔ ناشر:۔ ادارۂ ادب اسلامی سرگودھا

قارئین زندگی جناب اسعد گیلانی ایم۔ اے سے ناواقف نہ ہوں گے۔ ان کی کئی کتابوں پر زندگی میں تبصرے شائع ہوچکے ہیں۔ اسعد صاحب تحریک ادب اسلامی کے ان ادیبوں میں ہیں جو راست انداز بیان کو پسند کرتے ہیں اور بات اب پسندیدگی کی حد سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اس وقت وہ پاکستان میں ادب کی ایک نئی صنف "تحریکی ادب" کے علمبردار ہیں۔ تبصرہ نگار کے نزدیک راست انداز بیان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اس میں سلیقہ نہ ہو، رمز و ایما نہ ہو، اشارہ و کنایہ نہ ہو، استعارہ و تلمیح نہ ہو، تمثیل و تخییل نہ ہو، بلکہ یہ ہے کہ جو کچھ لکھا جائے اس کا مقصد واضح ہو۔ ادبی تحریر چیستاں اور معمہ نہ بن جائے جسے حل کرنے کی ضرورت پیش آئے ایمائی ادب کو پسند کرنے والے اس کے جواب میں ناصحانہ و مبلغانہ ادب کو پروپگنڈہ اور خوانچہ فروش کی صدا قرار دیتے ہیں جس طرح ادبا و شعراء دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں اسی طرح ادب و شعر کو پسند کرنے والے بھی دو جماعتوں میں منقسم ہیں۔ تبصرہ نگار نہ ادیب ہے نہ شاعر۔ البتہ ادب و شعر کو پسند کرنے والوں میں ہے اور راست انداز بیان ہی کو پسند کرتا ہے۔ تحریک ادب اسلامی میں بھی اپنے مزاج اور پسند کے لحاظ سے دونوں قسم کے لوگ موجود ہیں لیکن شکر ہے کہ ان میں کوئی ان بن، کوئی تناتنی، کوئی تو تو میں میں نہیں ہے اس لیے کہ سب کا مقصد ایک ہے اور جب تک یہ اپنے مقصد کے حصول میں مخلص ہیں ان میں ان بن ہو بھی نہیں سکتی۔ اور اس کا ایک ثبوت یہ زیر تبصرہ کتاب "چاند کا سلام" بھی ہے۔ یہ کتاب اسعد گیلانی کے پانچ ادبی مجموعوں (قافلۂ سخت جاں ۔ پکار ۔ انتظار ۔ تصویریں ۔ ساتھی کے نام) سے منتخب کردہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ اسے تحریک ادب اسلامی کے چار مشہور و معروف ادبا و شعراء (فروغ احمد۔ ایم اے ۔ آباد شاہ پوری ایم۔ اے ۔ غلام حسین اظہر ایم۔ اے ۔ رفیع الدین ہاشمی ایم اے) نے مرتب کیا ہے۔ ان چار میں سے دو کے بارے میں تو مجھے علم ہے کہ وہ ادب میں راست انداز بیان کو ترجیح دینے والوں میں نہیں ہیں اور دوسرے دو کے بارے میں بھی اندازہ یہی ہے کہ وہ ادبی ذوق میں اپنے پہلے دو ساتھیوں سے مختلف نہیں ہیں لیکن ان چاروں نے اپنے ایک ایسے ساتھی کا مجموعۂ مضامین منتخب اور مرتب کیا ہے جو راست انداز بیان کی امامت کر رہا ہے۔ یہ اسعد صاحب کے ادب کی کامیابی کا بھی ثبوت ہے اور اس کی دلیل بھی کہ مقصد ایک ہو

فروعی اور جزوی اختلاف کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ فروغ احمد صاحب نے اس کتاب پر ۱۲ صفحات کا ایک عالمانہ اور فاضلانہ دیباچہ لکھا ہے۔ اس مختصر تبصرے میں گنجائش نہیں ہے ورنہ میں اس کے چند اقتباسات یہاں نقل کرتا۔ اس مجموعے میں اسعد صاحب کے ۲۸ مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ تبصرہ نگار تبصرے کے وقت تک تمام مضامین نہیں پڑھ سکا۔ صرف پانچ مضمون پڑھے گئے ہیں اور ہر مضمون نے متاثر کیا ہے

تحریک اسلامی سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔ کتاب کے ناشر نے لکھا ہے کہ یہ کتاب مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۶ سے بھی حاصل کی جا سکتی ہے ۔

قوت کے سرچشمے

مولانا شیخ عبداللہ عمری مرحوم و مغفور۔ صفحات ۴۲
ناشر: سی عبدالجلیل۔ دفتر جماعت اسلامی ہند

۲۰ اپریل ۶۲ء کو کل ہند جماعت اسلامی ہند کے مرکز دہلی میں امرائے حلقہ جات کے ایک اجتماع میں مولانا شیخ عبداللہ مرحوم نے "قوت کے سرچشمے" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا۔ اب اس مقالہ کو عام افادے کے لیے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے ـــــ مولانا موصوف ایک صاحب استعداد عالم دین اور بڑے اچھے مقرر تھے۔ اس مقالے میں انھوں نے ذکر اللہ۔ یقین۔ اللہ کی معیت۔ توکل۔ استغفار۔ اخلاص۔ اخلاق حسنہ۔ اتحاد و اتفاق۔ علم دین۔ تقویٰ۔ اطاعت امیر۔ صبر۔ نماز۔ روزہ۔ نوافل۔ محبت الٰہی کے ذیلی عنوانات کے تحت ان سب کی اہمیت پر اختصار کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں گفتگو کی ہے اور یہی وہ قوت کے سرچشمے ہیں جن کی طرف انھوں نے جماعت اسلامی کے رفقاء کو بالخصوص اور دوسرے مسلمانوں کو بالعموم متوجہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم مقالہ نگار کی بال بال مغفرت فرمائے اور انھیں جزائے خیر عطا کرے۔ آمین

(بقیہ ایک مختصر پمفلٹ)

ماتحت انسانی کردار کو منظم کرنے کا نام ہے وہ لوکل حالات کی پیداوار نہیں ہے وہ مادی ماحول کے جوار جھنکار کی حیثیت نہیں رکھتی۔ انسانی داخلی امن اور خارجی سلامتی کا دار و مدار اسی شعور و احساس و کردار کے پختہ ہونے پر ہے۔ (ص ۵۸)

جو لوگ مادیت اور حیوانیت ہی کو انسان کی اصل قرار دیتے ہیں اگر وہ اس عبارت پر چراغ پا ہو جائیں تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

★ دورِ حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے۔

★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے۔

★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے۔

★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے۔

★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دل نشین انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

جلد اول

الفاتحہ ... ... الانعام

ہدیہ مع جلد 12/- روپیہ

جلد دوئم

الاعراف ... ... بنی اسرائیل

ہدیہ مع جلد 15/- روپیہ

جلد سوئم

کہف ... ... — روم

ہدیہ مع جلد 17/- روپیہ

جلد چہارم

لقمان ... ... الاحقاف

ہدیہ مع جلد 16/- روپیہ

ملنے کا پتہ

منیجر مکتبہ زندگی [illegible]

Monthly 'ZINDGI' Rampur, Feb. 1970, Regd. No. L-688

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

★ دور حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے۔

★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے۔

★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی توضیح واضح کرنے۔

★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے۔

★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دل نشیں انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

جلد اول

الفاتحہ ... ... الانعام

ہدیہ مع جلد -/12 روپیہ

جلد دوئم

اعراف ... ... [illegible]

ہدیہ مع جلد -/15 روپیہ

جلد سوئم

کہف ... [illegible]

ہدیہ مع جلد -/17 روپیہ

جلد چہارم

[illegible]

ماہنامہ

زندگی

رامپور

مدیر:- سید احمد قادری

سالانہ چندہ	
ہندوستان سے	۸/-
پاکستان سے	۸/-
ششماہی	
ہندوستان سے	۴/-
پاکستان سے	۴/-
قیمت فی پرچہ: ۸۰ پیسے	

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۲ شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۴ شلنگ

جلد ۴۴ | ذی الحجہ ۱۳۸۹ھ مطابق مارچ ۱۹۷۰ء | شمارہ: ۳

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

[illegible]

اشارات

(سید احمد قادری)

اس وقت ہمارا پڑوسی ملک پاکستان نظریاتی تصادم کے جس بحران میں مبتلا ہے وہ اس بحران سے کئی گنا بڑھا ہوا ہے جس کے نیچے میں خود ہمارا ملک ہندوستان گرفتار ہے۔ یہاں بھی علاقائیت کا دیو ہر طرف اینڈتا پھر رہا ہے اور وہاں بھی، یہاں بھی زبان کا مسئلہ جھگڑے کا ترجمان بنا ہوا ہے اور وہاں بھی، یہاں بھی سوشلزم کے نام سے اشتراکیت کا نعرہ لگ رہا ہے اور وہاں بھی اس فرق کے ساتھ کہ یہاں مجرد سوشلزم ہے اور وہاں "اسلامی سوشلزم"۔ وہاں کا بحران زیادہ شدید اور خطرناک اس لیے ہو گیا ہے کہ اس ملک کے باشندے آج تک نہ کسی ایسے دستور کا مزہ چکھ سکے جسے واقعی دستور کہا جا سکے اور نہ آج تک وہاں کے عوام کو اس کا موقع نصیب ہو سکا کہ وہ براہ راست حکومت کے در و بست میں حصہ لے سکیں، وہ یا تو کسی دستور کے بغیر زندگی بسر کرتے رہے یا دس سال تک بنیادی جمہوریت کے نام نہاد دستور کے تحت صرف ڈکٹیٹر شپ کا مزہ چکھتے رہے ہیں۔ یہ آمریت عوام کے حقوق غصب کر کے اور ان کی تمام آزادیوں پر پہرے بٹھا کر خوش ہوتی رہی کہ اس کا اقتدار محفوظ ہے۔ یہاں تک کہ اس نے طلبہ کے حقوق پر بھی دست درازی کی اور اس کا لمبا ہاتھ یونیورسٹیوں اور کالجوں تک جا پہنچا، اس کے کانوں میں ہر طرف سے یہ آواز رس گھولتی رہی کہ شاہ جمجاہ کا ستارۂ اقبال بلند اور پاکستانی عوام کی اکثریت اس کی عقیدت مند ہے۔ کچھ تھوڑے سے لوگ جو بکواس کرتے رہتے ہیں ان کی بکواس کا ملک پر کوئی اثر نہیں ہے۔ لوگ جمہوریت بحال کرنے کا مطالبہ کرتے رہے۔ بالغ رائے دہی کے حق کا مطالبہ کرتے رہے، ملک گیر عام انتخابات کا مطالبہ کرتے رہے، پریس کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی، رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی آزادی مانگتے رہے، طلبہ اپنے حقوق کے لیے چیختے رہے لیکن شاہ جمجاہ اپنے اقتدار میں مست سنی ان سنی کرتا رہا، عوام کے جذبات اور طلبہ کے

احساسات کا آتش فشاں اندر ہی اندر کھولتا رہا لیکن اس کا بہی خواہ کون تھا جو اسے باخبر رکھتا۔ دس سال گزرنے کے بعد ایوب خانی حکومت کا دس سالہ جشن منایا جا رہا تھا کہ یہ آتش فشاں پھٹا اور آخر کار شاہ کا تخت اقتدار جل کر بھسم ہو گیا اور خود شاہ نے اقتدار دوسروں کے حوالے کر کے اپنی جان بچالی ۔ آج حال یہ ہے کہ عوام کو چھوڑیئے خود وہ لوگ جو کل اس کے دسترخوان کی بلی بنے ہوئے تھے اب شیر کی طرح اسے آنکھیں دکھا رہے ہیں اور جو لوگ کل اس کی قصیدہ خوانی میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے آج ہجو گوئی میں سب سے آگے ہیں ۔ جبر و استبداد کا یہ انجام کوئی انوکھا انجام نہیں ہے۔

اس اقتدار کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے پاکستان کے مقصد وجود کو کمزور کیا ۔ اس سے پہلے کی حکومتوں نے اپنی تمام نالائقیوں کے باوجود دین و اخلاق اور اسلامی عقائد و افکار کے ساتھ وہ دشمنی نہیں کی تھی جو اسلام کے اس نادان دوست نے برتی ۔ اس کا بہت بڑا بین الاقوامی کارنامہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے امریکہ کی دوستی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ چین کو اپنا یار و مددگار بنایا اور روس سے دوستی کی پینگ بڑھائی اور اس طرح اس نے تینوں سے امداد حاصل کی لیکن اس کے بدلے میں اس نے الحاد بے دینی اور اشتراکیت کو پوری چھوٹ دی، اس کے دور حکومت میں پاکستان کے اندر اشتراکیت کا مرجھایا ہوا درخت سرسبز و شاداب ہو گیا اور اس کی خاردار شاخیں دور دور تک پھیل گئیں ۔ ادب، صحافت، پریس، ریڈیو، نیوز ایجنسی اور دوسرے اداروں پر سرخ سویرا چھا گیا۔

مسلمانوں کو وہاں یہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اسی ملک میں اسلام مردہ باد کا نعرہ لگا اور جس قرآن کو مسلمانوں کا دستور حیات کہا جاتا رہا تھا اسے آگ کی نذر کیا گیا ۔۔۔۔ چین کی دوستی انڈونیشیا میں آگ اور خون کا کھیل کھیل چکی اور اب پاکستان میں کھیل رہی ہے ۔

---

۲۸ نومبر ۱۹۶۹ کو صدر مملکت پاکستان جنرل محمد یحییٰ خاں نے پاکستانی عوام کو خطاب کرتے ہوئے یہ اعلان کیا

(۱) عام انتخابات ۵ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو ہوں گے

(۲) ایک آدمی ایک ووٹ کی بنیاد پر یعنی آبادی کے تناسب سے انتخابات ہوں گے ۔

(۳) قومی اسمبلی ایک سو بیس دن کے اندر آئین مرتب کرے گی ورنہ اسے توڑ دیا جائے گا ۔

(۴) ون یونٹ ختم کر دیا جائے گا۔

(۵) یکم جنوری ۷۰ء سے مکمل سیاسی سرگرمیوں کی اجازت ہوگی

یہ اعلان سنکر تمام سیاسی پارٹیاں کروٹیں بدلنے لگیں اور یکم جنوری کو اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آج ۲ر فروری ہے۔ اس قلیل مدت میں وہاں تشدد کے جو واقعات ہو چکے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے وہاں کے بعض مبصرین یہ سوال کر رہے ہیں کہ پاکستان میں عام انتخابات منعقد ہو بھی سکیں گے یا نہیں؟ اور یہ بات تو وہاں کی متعدد سنجیدہ اور باوقار پارٹیاں کہہ رہی ہیں کہ ۱۲۰ دن میں کوئی نیا آئین مرتب کر لینا اگر ناممکن نہیں تو سخت دشوار ضرور ہے — پاکستان سے اخبارات و رسائل کی آمد بند ہے اس لیے ہم نہیں جانتے کہ جنرل یحییٰ خان خود کس خیال کے آدمی ہیں، اور انھوں نے جو اعلان کیا ہے اس کے اصل محرکات کیا ہیں ویسے بظاہر محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ وہ انتخابات کرانا اور اقتدار عوام کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ آکاش وانی، بی بی سی اور خود ریڈیو پاکستان یا کبھی کبھی کوئی بھولا بھٹکا اخبار آگیا تو اس سے جستہ جستہ کچھ حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔

ابھی ایک اخبار میں سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی صاحب کا ایک طویل بیان نظر سے گزرا اس میں انھوں نے جامعیت کے ساتھ وہاں کے حالات کا جائزہ لیا ہے۔ ہم یہاں اس کے متعدد اقتباسات پیش کریں گے۔

انھوں نے کہا ہے کہ صدر یحییٰ خاں صاحب نے عوام کو جمہوری حق دینے کے لیے انہیں بے انتہا سخت آزمائش سے دوچار کرنے کا راستہ اختیار کیا ہے، جبر و تشدد کے دس سال ختم ہونے کے بعد قوم سے کہا جا رہا ہے کہ وہ آئین ساز اسمبلی منتخب کرے جو صرف چار ماہ کے اندر آئین تیار کر ڈالے۔ انھوں نے کہا کہ جب صدر نے مساوی نیابت اور ون یونٹ کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو پھر ان دو ترمیموں کے ساتھ ۱۹۵۶ء کا آئین نافذ کر دینا چاہیے تھا لیکن انھوں نے ایک ایسا لائحہ عمل اختیار کیا جو انہیں کتنا ہی اطمینان بخش نظر آئے پاکستان کے مستقبل کے لیے پر خطر ہے، آئین کو نہ تیغ کر دینا تو آسان ہے لیکن آئین بنانا آسان نہیں ہے۔ ۵۶ کا آئین ایک خود مختار دستور ساز اسمبلی نے مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان ہر دو کے منتخب نمائندوں کی اکثریت کی تائید و حمایت سے منظور کیا تھا اور ایوب خاں صاحب کو اسے کالعدم کرنے کا کوئی قانونی حق حاصل نہیں تھا — چودھری صاحب کی پارٹی کے علاوہ دوسری اسلام پسند پارٹیاں بھی مطالبہ کر رہی ہیں کہ کچھ ترمیم کے ساتھ ۵۶ء کا دستور نافذ کر دیا جائے اور اسی کے تحت انتخابات کرائے جائیں لیکن امید نہیں کہ جنرل یحییٰ خان یہ مطالبہ منظور کریں گے۔ انھوں نے اسے نافذ نہ کر کے آزمائشی اور لمبا راستہ کیوں اختیار کیا ہے اس کا جواب مستقبل دے گا، بہرحال یہ ایک اندیشہ کی بات ضرور ہے۔

چودھری محمد علی صاحب نے عوامی لیگ کے چھ نکاتی منصوبے کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے۔ ہم یہاں ان نکات کو نقل کر کے ان کے جائزے کا حاصل درج کریں گے۔ وہ چھ نکات یہ ہیں:۔

(۱) پاکستان کا وفاق صحیح معنوں میں قرار داد لاہور کی بنیاد پر ہو۔

(۲) وفاقی حکومت صرف دو معاملات یعنی دفاع اور امور خارجہ سے سروکار رکھے گی باقی تمام ماندہ معاملات وفاق میں شامل ریاستوں کی تحویل میں ہوں گے۔

(۳) دو کرنسیاں جن کا آزادانہ مبادلہ ہو سکے یا ایک ہی کرنسی بعض حدود و تحفظات کے ساتھ۔

(۴) وفاق میں شامل ریاستوں کو تمام ٹیکس اور محاصل لگانے کا کلی بلا شرکت غیرے اختیار حاصل ہوگا مجموعی مرکزی فنڈ میں ایک خاص مساوی تناسب سے سب ریاستوں سے ٹیکس حاصل کیا جائے گا۔

(۵) بیرونی تجارت سے حاصل ہونے والا زرمبادلہ ریاستوں کی تحویل میں ہوگا۔ زرمبادلہ کی وفاقی ضروریات ریاستوں کی طرف سے مساوی تناسب یا شرح جس پر سمجھوتہ ہو جائے کے مطابق پوری کی جائیں گی۔

(۶) آئین کے تحت ریاستوں کو اپنے کنٹرول میں نیم فوجی یا علاقائی فوجی دستے قائم کرنے اور برقرار رکھنے کا اختیار ہوگا تاکہ وہ اپنی علاقائی سالمیت اور آئین کی حفاظت کر سکیں۔

چودھری محمد علی صاحب نے ان نکات کا جائزہ لے کر کہا ہے کہ تمام کے تمام چھ نکات ہمیں دو ایسی آزاد و خود مختار ریاستوں کے تصور تک پہنچاتے ہیں جن کے مابین تعلقات ایک نام نہاد وفاقی مرکز کی وساطت سے ہوں گے اس وفاقی مرکز کے پاس ملک کی وحدت و سالمیت کے تحفظ کے لیے نہ اپنے وسائل ہوں گے اور نہ وفاق میں شامل ریاستوں کی پالیسیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے اختیارات —— چھ نکاتی منصوبے کے مصنف کی نیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اس امر میں ذرہ برابر شک و شبہہ نہ ہونا چاہیے کہ اگر اس پر عمل درآمد ہوا تو اس سے پاکستان کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا

انھوں نے مزید توضیح کرتے ہوئے اپنے بیان میں کہا ہے کہ یہ ملحوظ خاطر رہے کہ چھ نکاتی منصوبہ علیحدگی یا متحدہ پاکستان کے فوری خاتمے کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک طرح کا ٹائم بم ہے جسے آئین کے عین قلب میں رکھ دیا جائے گا اور مناسب موقع پر اس کے پھٹ جانے کا انتظام کیا جائے گا۔ اس منصوبے میں اور اس کے مصنف کی زبردست مرکز میں اقتدار حاصل کرنے کی خواہش میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ چھ نکات کے علم برداروں نے اسے یہ رنگ دینے میں پوری احتیاط سے کام لیا ہے کہ یہ پروگرام مشرقی پاکستان کے کمل علاقائی خود مختاری کے مطالبے کی تکمیل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ چنانچہ ان نکات کے مضمرات کو بڑی ہوشیاری سے عام لوگوں سے پوشیدہ رکھا گیا ہے تاکہ عوام کو دھوکا دے کر

اُن سے ووٹ حاصل کر لیے جائیں۔

اپنے اقتدار کے لیے پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی پالیسی پر صرف عوامی لیگ کے لیڈر ہی نہیں چل رہے ہیں بلکہ اشتراکی عناصر کی خواہش بھی یہی ہے ان کے متعلق چودھری صاحب لکھتے ہیں' اس صوبہ پرستی کی تائید اور اعانت میں بزعم خویش "ترقی پسند" بھی شامل ہیں جو ہر لسانی گروہ کو امتیازی ثقافت اور جداگانہ قومیت کا مظہر اور علم بردار قرار دیتے ہیں' ان کے نزدیک پاکستان کے سیاسی نظریہ و اساس کے لیے ایک مسلم ملت واحدہ کا تصور رجعت پسندانہ خیال ہے جس کے تدارک کے لیے ادبی صورت میں مسلسل پروپیگنڈہ کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے اکثر کے لیے اسلام بذات خود ایک فرسودہ اور از کار رفتہ عقیدہ ہے جس کی جگہ مارکس کے سائنس' سوشلزم کو ملنی چاہیے' ان کے اندازِ فکر و عمل میں کسی بھی جمہوری حکومت کے مقابلے میں فوجی آمریت کو ترجیح اور فوقیت دی جاتی ہے کیونکہ مؤخر الذکر' پرولتاریہ کی آمریت کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ ان ترقی پسند عناصر نے ایوب خاں کی خوشامد پسندی کی کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور کمیونسٹ لٹریچر کو ملک میں سیلاب کی مانند ہر طرف پھیلا دیا جس میں تاریخ کی مادی تعبیر کی گئی ہے جس میں جارحیت پسندانہ الحاد کا پرچار کیا گیا ہے' جس میں طبقاتی کش مکش پر اکسایا گیا ہے اور جس میں کمیونزم کی حتمی اور قطعی فتح کو نوشتہ تقدیر بتایا گیا ہے۔ یہ ترقی پسند عناصر اسلام کی بنیاد پر عادلانہ معاشرتی و معاشی نظام کی بالواسطہ تکذیب کے ذریعے پاکستان کی بنیادوں کو اندر سے کھوکھلا کرنے میں سرگرم ہیں۔

جو شخص بھی ترقی پسند تحریک سے واقف ہے وہ چودھری صاحب کے اس حقیقت پسندانہ تجزیے کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ترقی پسندوں نے کچھ تھوڑے سے مولویوں کو بھی اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ پاکستان میں ہزاروی گروپ اس کی عبرت ناک مثال ہے۔

چودھری محمد علی صاحب نے پاکستان کے موجودہ حالات کے طویل تجزیے کے بعد آخر میں پورے جوش اور حوصلے کے ساتھ لکھا ہے۔ حکیم الامت علامہ اقبال کا ارشاد ہے:۔

"مسلمانوں کی تاریخ کے نازک لمحات میں اسلام نے ہمیشہ مسلمانوں کو بچایا ہے نہ یہ کہ مسلمانوں نے اسلام کو بچایا ہو۔"

موجودہ بحران میں بھی جس سے ہم دوچار ہیں ان شاء اللہ یہی کچھ ہوگا مسلمانوں کے دلوں کی گہرائیوں

ایک ناقابلِ تسخیر عزم کا شعلہ روشن ہے جو ہر چیلنج کا شاندار جواب دینے کی اہلیت رکھتا ہے۔ میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے عوام کی ان کے صحیح اور مبنی برحق مقصد کی طرف رہنمائی کرے جو یہ ہے کہ اہلِ پاکستان کو دنیا بھر کے لیے انسانی اخوت اور معاشرتی و معاشی انصاف کا علمبردار بننا ہے۔

اگرچہ مغربی پاکستان میں بھی جناب ذوالفقار علی خاں بھٹو اور مولوی غلام غوث ہزاروی کا گروپ اسلامی سوشلزم کے نعرے لگا رہا ہے لیکن نہ بھٹو کی پیپلز پارٹی کو عوام میں مقبولیت حاصل ہے اور نہ ہزاروی گروپ کو اصل خطرہ مشرقی پاکستان کے سروں پر منڈلا رہا ہے اور اس خطرے سے ہندوستان کو بھی اپنی آنکھیں بند نہیں رکھنی چاہییں بھاشانی کے پردے میں چینی کمیونسٹ جو رول وہاں ادا کر رہے ہیں اسے ہمارے لیے بھی فکر انگیز ہونا چاہیے۔ مغربی بنگال میں مارکس وادی کمیونسٹ اپنا زور دکھا رہے ہیں اور مشرقی بنگال میں بھاشانی ماؤزے تنگ کے نقشے پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہ صورت حال ہندوستان کے لیے قابلِ غور نہیں ہے؟ —— مشرقی پاکستان میں اس وقت تین بڑی سیاسی قوتیں میدان میں ہیں

(۱) مجیب الرحمٰن صاحب کی علیحدگی پسند قوت

(۲) بھاشانی کی چین پسند قوت

(۳) معتدل جمہوری اسلام پسند قوت

مجیب الرحمٰن صاحب کی انتہا پسندی کو کچھ بیرونی عناصر قوت پہنچا رہے ہیں اور کچھ اندرونی عناصر مجیب صاحب سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں اگر ان کا "جے بنگلہ" کا نعرہ کامیاب ہو گیا تو اس کا اصل فائدہ بھاشانی گروپ ہی کو حاصل ہوگا، وہ اپنے کمزور صوبے کو ماؤازم کے حملے سے بچا نہیں سکیں گے۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بھاشانی صاحب ووٹ سے پہلے روٹی مانگ رہے ہیں اور مجیب صاحب روٹی اور ووٹ دونوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ ان دونوں قوتوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے معتدل اسلام پسند جمہوری قوت کے مقابلے میں یہ دونوں ہی صف آرا اور ایک دوسرے کی معاون ہیں۔ یہ دونوں پارٹیاں اپنے صوبے میں ایک ایسی فضا بنانے کی کوشش کر رہی ہیں جس میں کسی بھی ایسی پارٹی کے لیے جو ان سے اختلاف کرتی ہو کام کرنا تو الگ رہا، بات کرنا بھی مشکل ہو جائے۔ پلٹن میدان ڈھاکہ میں ان دونوں قوتوں نے مل کر جماعت اسلامی پاکستان کے اجتماع پر منظم حملہ کیا جس میں جماعت کے دو کارکن شہید ہو گئے اور پانچ سو سے زیادہ افراد زخمی ہوئے۔ اس کی جو سرگزشت جلسے میں شریک

افراد نے وہاں کے اخبارات میں شائع کی ہے وہ خطرے کی ایک واضح علامت ہے۔ مجرم اور تخریب پسند پارٹیوں کو چھوڑ کر وہاں کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں نے اس کی مذمت کی ہے، اس کے خلاف احتجاج کیا ہے اور بہت سی پارٹیوں نے اس کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا ہے۔ جنرل یحییٰ خاں نے بھی اس کا نوٹس لیا ہے اور انھوں نے تشدد کی مذمت کرتے ہوئے پاکستانی عوام کو متنبہ کیا ہے۔ اس واقعہ کے بعد ڈھاکا ایڈمنسٹریشن کے بعض اعلیٰ افسروں کا تبادلہ بھی کیا گیا ہے اور سمجھا جاتا ہے کہ اس کی وجہ یہی واقعہ ہے۔ اس تبادلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے روزنامہ ندائے ملت لاہور نے اپنے ایک اداریے میں لکھا ہے:۔

"بعض حلقوں کی جانب سے اس نوعیت کے الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں کہ انتظامیہ میں کئی لوگ شیخ مجیب الرحمٰن کے حامی ہیں اور انھوں نے پلٹن میدان میں فساد و ہنگامہ سے اغماض برت کر مجیب نوازی کا ثبوت دیا ہے۔ اگر یہ الزامات واقعی درست ہیں (اور ان کی اب تک کوئی تردید یا وضاحت مناسب نہیں سمجھی گئی) اور متذکرہ تبادلے واقعی ان الزامات کی بنا پر کیے گئے ہیں تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ مشرقی پاکستان میں انتظامیہ کے بعض ارکان کا یہ جانب دارانہ کردار بڑا ہی قابلِ اعتراض ہے۔ اگر اس کی اصلاح نہ کی گئی تو آئندہ عام انتخابات ہرگز آزادانہ و غیر جانب دارانہ نہیں ہوں گے اور ان کی حیثیت ماضی کے انتخابی سوانگ سے مختلف نہیں ہوگی۔"

ڈھاکہ کے تازہ المیہ کے بارے میں پاکستان ریڈیو اور اے پی پی دونوں نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ہنگامہ اس وقت شروع ہوا جب جماعت اسلامی کے مقررین نے عوامی لیگ اور نیشنل عوامی پارٹی پر اشتعال انگیز تنقید شروع کی۔ گویا یہ ہنگامہ وقتی اشتعال کا نتیجہ تھا جس کی ذمہ داری جماعت اسلامی پاکستان کی تھی۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ اس ہنگامے کا منصوبہ بہت پہلے بنایا گیا تھا۔ ابتدا میں کوشش کی گئی کہ جلسہ منعقد ہی نہ ہو سکے لیکن جب اس میں کامیابی نہ ہوئی تو باضابطہ حملے کا منصوبہ بنایا گیا۔ روزنامہ ندائے ملت لاہور نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ جماعت کے رہنماؤں کا بیان ہے کہ متعلقہ اربابِ اختیار کو پہلے ہی مطلع کر دیا گیا تھا کہ بعض عناصر اس جلسے کو ناکام بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ جماعت کی طرف سے جلسے کا اعلان کرنے والی گاڑیوں پر حملے بھی کیے گئے اور مخالف عناصر لاؤڈ اسپیکروں کے ذریعے یہ اعلان بھی کرتے رہے کہ لوگ جلسہ گاہ نہ جائیں لیکن پولیس کی طرف سے جلسے میں ہنگامے اور فساد کو روکنے کے لیے کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ پولیس ہنگامہ آرائی شروع ہونے کے کافی دیر کے بعد موقع پر پہنچی تو وہاں غنڈوں کے لیے باعثِ تحفظ بنی اور [illegible]

کلکی اوتار اور محمدؐ صاحب

(پنڈت وید پرکاش اپادھیائے۔ ایم۔اے)

ترجمانی جناب وصی اقبال صاحب

(۲)

جگہ کا فیصلہ یہ بات تو بلا اختلاف طے ہے کہ آخری اوتار کا مقام پیدائش شمبھل گاؤں ہوگا [1] لیکن محض گاؤں کے نام سے ہی اطمینان نہیں ہوتا۔ جب تک کہ اس کی تفصیلات نہ ہوں پہلے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ شمبھل گاؤں کا نام ہے یا کسی گاؤں کی صفت ہے؟

شمبھل کسی گاؤں کا نام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اگر کسی مخصوص گاؤں کو شمبھل نام دیا گیا ہوتا تو اس کی تفصیلات بھی بتائی گئی ہوتیں لیکن پرانوں میں کہیں بھی شمبھل گاؤں کی تفصیلات سے متعارف نہیں کرایا گیا ہے۔ عبارت میں تلاش و جستجو کے بعد اگر کوئی شمبھل گاؤں ملتا ہے تو وہاں اب سے چودہ سو سال پہلے کوئی ایسا نیک انسان نہیں گزرا جو ایک بہت بڑے مصلح کی حیثیت سے مشہور و معروف ہو۔ اور آخری اوتار کوئی ہلکی کھیل تو نہیں ہے کہ اوتار ہو جائے لیکن سماج میں ایک ذرا سی بھی تبدیلی نہ آپائے۔ اس لیے لفظ شمبھل کو صفت مان کر اس کے مصدر پر غور کرنا ضروری ہے

۱۔ شمبھل لفظ شم ([illegible]) دھاتو سے بنا ہے۔ یعنی جس مقام پر امن و سکون ملے۔

۲۔ سم اُپ سرگ پورو کُ در ([illegible]) دھاتو میں اپ پرتیے ([illegible]) کے لانے سے مکمل لفظ 'سمبر' ([illegible]) ہوا۔ اور 'ر' کو 'ل' سے بدل لینے کے قاعدے کے مطابق شمبھل لفظ بنا جس کے معنی ہوئے جو اپنی جانب لوگوں کو متوجہ کرتا ہے یا جس کے ذریعے کسی کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

۳۔ شمبھل لفظ کا ملمنتو ([illegible]) ۱-۱۲-۸-۸ کے اوکتا ماول ([illegible]) میں

[1] کلکی پران باب ۲، اشلوک ۴ [2] شم معنی پرسکون کرنا [3] ویدک الفاظ کے مجموعہ کا نام (وید)

سبق ہے۔ 'ر' اور 'ل' میں فرق نہ ہونے کے باعث شمبھل کے معنے ہوں گے : پانی سے قریبی مقام۔
بعض حضرات کو یہ شک ہوگا کہ جب شمبھل کے معنے پانی نکل رہے ہیں تو پانی سے مقام یا گاؤں مطلب کیوں لیا گیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ یہاں تعلق گاؤں کا ہے پانی کا نہیں —
جب گنگا میں گھوش لفظ سے آپ یہ مطلب مراد لیتے ہیں کہ گنگا کے قریب گاؤں میں گھوش (گاؤں) نہ کہ گنگا کے پانی کے اوپر گھوش تو پھر شمبھل لفظ سے اس طرح مطلب اخذ کرنے میں کیا قباحت ہے؟ اگر گنگا میں گھوش جملہ میں صفت ([illegible]) مانتے ہیں تو پھر یہاں بھی صفت ([illegible]) ہی مانیے۔
آخری اوتار کے مقام پیدائش کے سلسلے میں صرف اتنا ہی سوچنا ہے کہ وہ مقام جس کے ارد گرد پانی ہو۔ پرکشش اور پرامن ہو۔ اوتار کی جائے پیدائش مقدس ہوتی ہے۔ اس لیے وہ مقام بھی مقدس ہونا چاہیے اور وہاں امن بھی ہونا چاہیے۔ یعنی وہ جگہ لوگوں کے مذہبی مقدسات کی جگہ ہو۔
شمبھل کے لفظی معنے ہیں : پرامن جگہ آخری اوتار کا جائے پیدائش پرامن اور ظلم و تشدد سے پاک ہونا چاہیے
آخری اوتار کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کا ظہور ہندوستان میں ہی ہو اور سنسکرت یا ہندی زبان ہی بولے زبان، لباس وغیرہ تو صرف مقام اور زمانہ کے مطابق ہی ہوتے ہیں۔ اگر اوتار کے لیے ایک ہی زبان اور لباس کا تعین ہوتا تو پھر سب ہی خطوں میں آنے والے اوتاروں کی زبان اور لباس ایک ہی ہوتا اور تجربہ اس کے خلاف جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بات عقل سے بعید ہے کہ یہ سوچا جائے کہ اوتار صرف ہندوستان میں ہی آسکتا ہے۔ کیا ہندوستان ہی خدا کی محبوب سرزمین ہے؟ یا پھر دنیا کا اطلاق صرف ہندوستان پر ہی ہوتا ہے۔ دیگر ممالک اس سے الگ ہیں؟
لہٰذا یہ قطعی ممکن ہے کہ اوتار ہندوستان سے باہر بھی ہو سکتا ہے اور وہاں وہ اسی ملک یا خطے کی زبان، رسم و رواج اور لباس استعمال کرے گا۔ لیکن بے دینی اور ظلم و تشدد کے خلاف ہوگا۔
زمانے کو نظر میں رکھتے ہوئے یہ بات تو پوری طرح واضح ہے کہ بھارت میں چودہ سو سال پہلے کوئی ایسا انسان نہیں پیدا ہوا جو آخری اوتار کے معیار پر پورا اتر سکے۔
جس قدر پران ہیں کلکی اوتار کے سلسلے میں سب اس پر متفق ہیں کہ ان کا مقام پیدائش شمبھل ہے۔ سمبل یا شمبھل لفظاً ایک ہی ہیں۔ آخری اوتار کی کامیابی کے ذکر میں جگہ وغیرہ کا تعین کیا جائے گا۔

نوٹ :۔ واچسپتیم ([illegible]) کے مطابق شمبھل میں ساٹھ مقدس مقامات ہیں اور کچھ عالموں نے وہاں بہلات ومنات نامی مقدس مقام کا بھی ذکر کیا ہے۔ لات و منات اور مناۃ وغیرہ ساٹھ مشہور مذہبی کا بت شمبھل ہے مسلمان اس مقام کو دارالامان کہتے ہیں۔

دنیا میں معاشرتی اور مذہبی بگاڑ کا زمانہ

ہر بڑے آدمی کی پیدائش سے پہلے مصائب آلام کا دور دورہ ہوتا ہے یا یوں کہیے برائیاں چاروں طرف پھیلنے کے بعد ہی خدائے تعالیٰ اپنے کسی محبوب بندہ کو اس دنیا میں بھیجتا ہے

اب سے تقریباً دو ہزار سال پہلے ہندوستان کی حالت بہت ابتر تھی۔ قدیم ہندوستان کی تاریخ میں سب سے زیادہ تاریکی اور ظلم و تشدد کا دور آخری زمانہ ہے جو تقریباً پانچویں عیسوی سے شروع ہوتا ہے۔ ویدوں کے زمانے میں مورتی پوجا کا رواج نہیں تھا لیکن اس زمانے میں مندروں میں مورتی پوجا کا عام چلن اور رواج ہوگیا تھا[1]۔ مندروں کے پجاری طرح طرح کی برائیوں میں ملوث اور دین کے نام پر بھولے بھالے لوگوں کو لوٹتے تھے[2]

ویدوں کے زمانے میں ساری ہندو قوم میں اتحاد اور مساوات کا طریقہ اپنایا جاتا تھا لیکن اب ذات پات کے باعث تفرقہ بازی کا بازار گرم تھا۔ ویدوں کے زمانے میں طبقاتی تقسیم جو انتظامی سہولت کی خاطر کی گئی تھی۔ اب اس نے قومی تقسیم کی شکل اختیار کرلی تھی۔ اس نے معاشرتی اتحاد پر بہت برا اثر پڑا[3]۔ عورتوں کو غلامی کا درجہ دیا گیا[4]۔ قانون اس طرح کا بنا جو واضح طور پر ذات پات کے فرق کا حامی تھا۔ برہمن چاہے کتنا ہی ظلم و زیادتی کیوں نہ کرلیتا۔ سزائے موت کا مستحق نہیں ہوتا تھا۔ نیچ ذات والے کو اونچی ذات کی عورت سے تعلق پیدا کرانا سزائے موت کا مستحق بناتا تھا لیکن اگر اونچی ذات کا ہندو کسی نیچی ذات کی عورت سے ناجائز تعلق قائم کرے تو اسے صرف معمولی سزا دینے پر ہی اکتفا کیا جاتا تھا۔ اگر نیچ ذات کا آدمی اونچی ذات کے آدمی کو نصیحت کردے تو اس کے منہ میں گرم تیل ڈالنے کا قانون تھا اور گالی دینے پر زبان کاٹنے کا قانون تھا[5]۔ شراب پینا راجاؤں کی افضیلت کی بات تھی۔ رانیاں بھی شراب کے نشے میں بدمست رہا کرتی تھیں[6]

---

1. A History of Civilisation in ancient India by R.C. Dutt Vol. 3 P. 281
2. do do P. 283
3. do do P. 308
4. do do P. 321
5. do do P. 342
6. do do P. [illegible]

راستوں پر بدکرداروں کا جمگھٹ لگا رہتا تھا[1]۔ خدا کی تلاش پہاڑوں اور جنگلوں میں کی جاتی تھی اور من گھڑت باتوں اور بھوت پریت کی پرستش کا نام مذہب تھا۔

غرض یہ کہ اتنی ہی ابتر حالت اس دور میں روم اور فارس کی تھی۔ بائی جنٹائن کی حکومت کے خاتمے سے تمام انتظامی معاملات میں برائیاں پیدا ہوگئی تھیں اور پادریوں کی بدکاریوں اور بے انصافیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ عیسائی مذہب بہت بدنام ہوگیا اور اس کی حالت ایسی ابتر ہوگئی کہ آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ان ساری برائیوں کو اگر واضح کیا جائے تو آج شاید ان پر کسی کو یقین بھی نہیں آئے گا گو کہ ان برائیوں کے ایسے نمایاں نتائج موجود ہیں کہ ان کا انکار ممکن نہ ہوگا۔ آپس کے جھگڑوں اور دشمنی کے باعث معاشرہ اپنی ڈگر سے دور جا پڑا تھا۔ شہر و دیہات میں خون کی ندیاں بہتی تھیں۔ (حضرت) عیسٰے (علیہ السلام) نے سچ ہی کہا تھا کہ میں امن نہیں لایا ہوں، بلکہ تلوار لایا ہوں[2]۔ اس وقت عرب کے ایک حصہ میں محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مذہب رونما ہوا۔ جو رومن حکومتوں کے جھگڑے فساد سے الگ تھا۔ اس دین کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ طوفان کی طرح ساری دنیا میں پھیل جائے گا اور اس کی آمد بہت سی حکومتوں، حکمرانوں، اور رسم و رواج کا اس طرح خاتمہ کردے گی جس طرح بارش گندگی کو صاف کردیتی ہے[3]۔

مختلف تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش سے پہلے عیسائیوں میں کس قدر برائیاں پھیل چکی تھیں[4]۔ اسی سلسلے میں جارج سیل نے قرآن کے ترجمے کے دیباچے میں لکھا ہے کہ گرجاگھر کے پادریوں نے مذہب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کردیا تھا۔ وہ اصل دین کو بھول چکے تھے۔ دین کے نام پر مختلف تصورات لیے ہوئے آپس میں بغض و حسد رکھتے تھے۔ اسی زمین پر گرجاگھروں میں بہت سی غلط باتیں دین کے طور پر مانی اور سمجھی جاتی تھیں اور مورتی پوجا بہت بے شرمی کے ساتھ کی جاتی تھی[5]۔

---

1. A History of Civilization in ancient India by R. C. Dutt. V. 3. P. 467
2. "He said, he brought not peace, but a sword"
3. 'Apology for Mohammad' by G. F. Higgins, P. 1
4. " " " " " " " " P. 2
5. Translation of Holy Quran. by George Sale P. 25-26

(حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے عیسائی مذہب اور مورتی پوجا نے مل کر ایک نئی شکل اختیار کر لی تھی جس کے باعث عیسائیوں میں مورتی پوجا عام ہو گئی اور ایک خدا کی جگہ تین خدا بنا لیے گئے اور (حضرت) مریم کو خدا کی ماں سمجھا جانے لگا[1]

آخری اوتار کا ظہور مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ کلکی اوتار گھوڑا سوار اور سیف بکف ہوں گے۔ تلوار اور گھوڑے کا زمانہ گزر چکا ہے۔ اب تو جیٹ طیاروں اور جوہری بموں کا زمانہ آگیا ہے۔ آخری اوتار کا ظہور اب سے پہلے ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ آخری اوتار کا ظہور اب سے پہلے ہی ہونا ثابت ہوتا ہے۔ آخری اوتار سے پہلے کے حالات سے بھی واقفیت ہو چکی کہ مذہب میں بگاڑ اور بے دینی اور ظلم و ناانصافی میں اضافہ ہونے پر آخری اوتار کا ظہور ہوگا۔ اب ہم کلکی اوتار اور (حضرت) محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا موازنہ پیش کریں گے۔

۱۔ گھوڑا سوار اور سیف بکف:۔ بھاگوت پران میں کلکی اوتار کا دیوتاؤں کے ذریعے دیے گئے گھوڑے پر چڑھنا اور تلوار سے برے لوگوں کا صفایا کرنا تحریر ہے[2]

کلکی اوتار کا گھوڑا جو دیوتاؤں کے ذریعے ملے گا۔ وہ افضل ہوگا۔ اسی پر چڑھ کر وہ دین کے دشمنوں کا صفایا کریں گے۔

(حضرت) محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو بھی فرشتوں کے ذریعے گھوڑا ملا تھا جس کا نام 'براق' تھا۔ اسی گھوڑے پر سوار ہو کر آپ شب معراج میں اللہ کے حضور گئے تھے۔ آپ کو گھوڑے بہت پسند تھے اور آپ کے پاس سات گھوڑے تھے[3] (حضرت) انس فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم گھوڑے پر سوار تھے اور گلے میں تلوار لٹکی ہوئی تھی[4] آپ کے پاس نو تلواریں تھیں[5]

۲۔ معلم عالم:۔ بھاگوت پران میں آخری اوتار کو دنیا کا محافظ کہا گیا ہے[6] جس کا مطلب یہ ہے کہ بگڑے ہوئے

1- The History of Struggle between Science and Religion by Draper

[2] بھاگوت پران حصہ ۱۲، باب ۲، اشلوک ۱۹ [3] جمع الفوائد ۲ ص۱۵ [4] بخاری شریف

[5] [illegible] ص۵۹۶ [6] بھاگوت پران ۱۲ - ۲ - ۱۹

معاشرے کو اپنی تعلیم سے سنبھالنا۔ برائیوں سے محفوظ کرنا۔ اور یہ معاشرہ کوئی محدود معاشرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے دائرے میں ساری دنیا آجاتی ہے۔ اسی خطاب سے قرآن پاک نے (حضرت محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) کو یاد کیا ہے۔

"اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہو کہ اے انسانو! میں تم سب کی طرف اس خدا کا پیغمبر ہوں جو زمین و آسمان کی بادشاہی کا مالک ہے۔" (الاعراف، آیت ۱۵۸)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے:-

"نہایت متبرک ہے وہ ذات جس نے فرقان اپنے بندے پر نازل کیا تاکہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر (خبردار کرنے والا) ہو[1]۔" (الفرقان، آیت ۱)

اس طرح معلم عالم کا اطلاق صحیح معنے میں آپ پر ہی ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ بدکاروں کا صفایا:- کلکی اوتار کے بارے میں لکھا ہے کہ بدکاروں کا صفایا کریں گے یہی بات محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی صادق آتی ہے۔ انھوں نے بھی صفایا کیا تو صرف برے لوگوں کا ہی، نیک اور شریف لوگوں کا نہیں[2]۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے:-

"اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے، کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور یقیناً اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے۔ صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے۔ ہمارا رب اللہ ہے" (الحج آیت ۳۹، ۴۰)

---

[1] معزز مقالہ نگار نے جہاں جہاں قرآن پاک کی عبارتیں حوالے کے طور پر تحریر کی ہیں۔ انھوں نے صرف ان جملوں کا مفہوم اپنی زبان میں ادا کیا ہے لیکن میں نے احتیاط کے باعث تفہیم القرآن سے حوالوں کے ساتھ اصل ترجمہ نقل کر دیا ہے۔

[2] بدکاروں کا صفایا کرنے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار لے کر تمام بدکاروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ جیسا کہ آگے چل کر خود معزز مقالہ نگار نے بھی لکھا ہے۔ یہ ہے کہ آپ نے برائیوں کا صفایا کیا ہے۔ یعنی لٹیروں اور ڈاکوؤں کی اصلاح کر کے انہیں توحید کی تعلیم دی، شرک کو مٹایا اور بتوں کا صفایا کیا۔ البتہ اس مہم کے انجام دینے میں جب رکاوٹیں پیدا کی جانے لگیں اور مسلمانوں پر بے انتہا ظلم و تشدد روا رکھ کر انہیں اپنے گھروں اپنی جائیداد اور اپنے وطن سے بے دخل کیا گیا اور آخر کار وہ ہجرت پر مجبور ہوئے تب یہ امر ناگزیر تھا کہ اب ظلم و تشدد [illegible]

(حضرت) محمد صاحب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لیڈروں اور رؤاکووں کی اصلاح کرکے انہیں توحید کی تعلیم دی، شرک کو مٹایا اور بتوں کا صفایا کیا۔ آپ نے جس دین کو قائم کیا، اس کے بارے میں فرمایا۔ میں اسی دین کو لے کر آیا ہوں جو آپ سے پہلے تمام انبیاء اور رسول لائے تھے —— یعنی اسلام! اور یہ کوئی نیا دین نہیں ہے۔ دین اسلام کے معنے ہیں۔ خدا کے احکامات پر چلانے والا طریقہ۔

اسی طرح 'وید' لفظ بھی خدا کی آواز یا معنے حکم ہے اور خدا کے احکامات کی تعمیل کرنے والے مذہب کا نام 'ویدک' ہے۔ اس باعث ویدک دھرم اور دین اسلام میں بڑی حد تک یکسانیت ہے اور جو ویدک یا دین اسلام کے راستے میں حائل ہوتا ہے۔ اسے ناستک یا کافر کہا جاتا ہے۔ لہٰذا ان کی مخالفت اور ان کا صفایا فطری تقاضا تھا۔

جن حالات میں (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی پیدائش ہوئی۔ وہ بہت برے حالات تھے یہاں تک کہ اپنی لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کرکے زمین میں دفن کر دیا جاتا تھا۔

آپ کی پیدائش سے پہلے کیقباد پہلا بادشاہ ہوا تھا جس نے مزوک کی تعلیم سے متاثر ہو کر اعلان کیا تھا[1] 'دولت اور عورت سب کی ہیں' یہ کسی خاص شخص کی ملکیت نہیں ہیں۔ اس وجہ سے بدکرداری انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ لہٰذا آپ کے پیرو وں نے ان ساری برائیوں کا صفایا کرکے دین حنیف کو قائم کیا ہے۔

۴۔ جائے پیدائش کی یکسانیت:۔ کلکی اوتار کی جائے پیدائش شمبھل ہوگی اور وہ وہاں کے پروہت کے یہاں پیدا ہوں گے[2]۔ پروہت کا نام وشنو یش ہوگا اور یہ نام سنسکرت زبان کا ہے۔ سنسکرت زبان میں وہ نام زیادہ تر اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جو با معنٰی ہوں۔ اس لیے ایسے ناموں کے معنے سے ہی فائدہ اٹھانا مناسب ہے۔

سنسکرت کی قواعد کے مطابق شمبھل لفظ کے معنے ہوئے "امن کا گھر" اور عربی زبان میں مکہ کو 'دارالامن' کہا جاتا ہے جس کے معنے بھی یہی ہوئے 'امن کا گھر' اس طرح آپ کی پیدائش شمبھل یعنی دارالامن (مکہ معظمہ) میں ہوئی ہے۔

۵۔ بڑے پروہت کے یہاں پیدائش:۔ کلکی اوتار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بڑے پروہت کے یہاں

(بقیہ حاشیہ) کا مقابلہ قوت و طاقت سے کیا جائے۔ لیکن اس کے بھی کچھ اصول تھے جنہیں ہر موقع پر [illegible] کیا۔

[1] [illegible] جلد ۴ صفحہ ۲۱۵

[2] [illegible] ۱۸-۲-۵

پیدا ہوں گے۔ (حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی مکہ معظمہ میں کعبہ کے بڑے محافظ (پروہت) کے یہاں پیدا ہوئے۔

۶۔ والدین کے ناموں کی یکسانیت:۔ کلکی اوتار کی والدہ کا نام کلکی پران میں سومتی (سوموتی) آیا ہے جس کے معنی ہیں۔ امن اور اچھے برتاؤ والی۔ لہٰذا آپ کی والدہ ماجدہ کا نام آمنہ تھا۔ آمنہ کے معنی بھی امن والی ہوتے ہیں۔ اسی طرح باپ کا نام وشنویش بتایا گیا ہے جس کے معنی ہیں 'اللہ کا بندہ'[1] اور آپ کے والد کا نام تھا عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ!

۷۔ آخری اوتار ہونے کی یکسانیت:۔ کلکی اوتار کو آخری دور کا آخری اوتار بتایا گیا ہے[2]
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کے بموجب اللہ کے آخری نبی ہیں اور اب آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

کلکی لفظ کے معنی واچسپتیم ([illegible]) اور شبد کلپدرم ([illegible]) انار کا پھل کھانے والے اور داغ کو دھونے والے بتایا گیا ہے۔

آپ بھی انار اور کھجور کا پھل کھاتے تھے اور آپ ہی نے کفر و شرک کے خلاف ساری زندگی جنگ کی ہے۔

۸۔ شمال کی سمت جانے اور نصیحت کرنے میں یکسانیت۔ کلکی پران میں مندرج ہے کہ کلکی پیدا ہونے کے بعد پہاڑی کی طرف جائیں گے۔ اور وہاں پرشورام جی سے علم حاصل کرنے کے بعد شمال کی سمت جا کر واپس آئیں گے۔ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی اپنی پیدائش کے کچھ عرصے بعد پہاڑیوں کی جانب چلے گئے تھے، اور وہاں منصب نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد آپؐ پر حضرت جبرئیل کے ذریعے رفتہ رفتہ قرآن پاک نازل ہونا شروع ہوا اور اس کے بعد آپ نے مدینہ منورہ (شمال کی طرف) کے لیے ہجرت کی۔ پھر مکہ معظمہ واپس آئے اور اسے فتح کیا[3]

۹۔ شیو کے ذریعے کلکی اوتار کو ایک گھوڑے کا ملنا۔ شیو کلکی اوتار کو ایک گھوڑا دیں گے جو ایک عجوبہ ہوگا۔

---

[1] وشنویش یہ مرکب نام ہے۔ وشنو کے معنی ہیں 'اللہ' اور یش کے معنی ہیں 'بندہ'۔ وشنویش یعنی اللہ کا بندہ' اس طرح سومتی یعنی سوم وتی بامعنے امن و سلامتی والی یعنی آمنہ۔

[2] بھاگوت پران۔ ۱-۳-۲۵

[3] پرشورام بامعنے جبریل یا روح القدس

آپ نے بھی معراج کی رات کو ایک ایسے ہی عجیب وغریب گھوڑے (براق) پر سفر کیا تھا اور یہ گھوڑا عطیہ خداوندی تھا۔

۱۰۔ چار بھائیوں کی معاونت سے شیطان کا انسداد۔ کلکی پران میں تحریر ہے کہ کلکی چار بھائیوں کی معاونت سے شیطان ( ) کا انسداد کریں گے لے

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی چار ساتھیوں (بھائیوں) کی معاونت سے شیطان کا انسداد کیا تھا اور یہ چار ساتھی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ تھے۔

۱۱۔ دیوتاؤں کے ذریعے مدد۔ کلکی پران میں لکھا ہے کہ کلکی کو دیوتاؤں کے ذریعے میدان جنگ میں مدد ملے گی لے

بالکل یہی معاملہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پیش آیا۔ خاص طور پر بدر کی جنگ میں فرشتے آپ کی مدد کے لیے آئے اور شریک جنگ ہوئے۔

قرآن پاک کا ارشاد ہے :۔

آخر اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا۔ حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے۔ لہذا تم کو چاہیے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔

یاد کرو جب تم مومنوں سے کہہ رہے تھے۔ کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے۔ بے شک اگر تم صبر کرو اور خدا سے ڈرتے ہوئے کام کرو۔ تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ کر آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔" (آل عمران۔ آیت ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵)

اور وہ موقع جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے۔ جواب میں اس نے فرمایا کہ میں تمہاری مدد کے لیے پے درپے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔" (سورہ الانفال آیت ۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اس نے تم پر کیا ہے جب تم پر لشکر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہ آتی

لے کلکی پران باب ۲، اشلوک ۷
لے کلکی پران ۳-۲-۲۰

تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم لوگ اس وقت کر رہے تھے۔

(سورۂ الاحزاب، آیت ۹)

۱۲۔ نور سے مزین۔ کلکی کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ایک بہترین روشنی سے منور ہوں گے۔ یعنی وہ بہت زیادہ خوب صورت ہوں گے اور ان کی ہمسری نہیں کی جاسکتی[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بھی یہی کہا جاتا ہے کہ آپ بہت خوبصورت اعلیٰ نصب العین کے حامی اور بہادر تھے[2]

۱۳۔ تاریخ پیدائش کی یکسانیت:۔ کلکی پران میں کلکی کی پیدائش کے سلسلے میں لکھا ہے کہ بیساکھ کے دوسرے پندرھواڑے کی ۱۲ تاریخ کو پیدا ہوں گے۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش بھی ۱۲ ربیع الاول ہے یعنی چڑھتے چاند کی ۱۲ تاریخ بامعنی شکل پکش دوادشی (शुक्ल पक्ष द्वादशी)

۱۴۔ جسم سے خوشبو کا نکلنا:۔ بھاگوت پران کے مطابق کلکی کے جسم سے نکلی ہوئی خوشبو سے لوگوں کے دل نرم ہو جائیں گے اور ان کے جسم کی خوشبو ہوا میں مل کر لوگوں کے دل کو نرم کر دے گی[3]

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم کی خوشبو تو مشہور ہی ہے۔ آپ جس سے بھی ہاتھ ملاتے دن بھر اس کے ہاتھ سے خوشبو آتی رہتی تھی[4] اور جب آپ گھر سے باہر تشریف لاتے تو سارا ماحول معطر ہو جاتا تھا۔

ایک بار ام سلمیٰؓ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا پسینہ اکٹھا کیا اور پھر آپ کے معلوم کرنے پر بتایا کہ ہم اسے خوشبوؤں میں ملاتے ہیں اور اس کی خوشبو سب سے زیادہ بہتر ہوتی ہے۔

۱۵۔ ہشت الٰہی صفات سے آراستہ:۔ بھاگوت پران کے ۱۲ ویں حصہ دوسرے باب میں کلکی کو ہشت الٰہی صفات کا حامل بتایا گیا ہے اور وہ آٹھ الٰہی صفات یہ ہیں:۔

۱۔ علم و دانائی۔ ۲۔ عالی نسبی ۳۔ نفس پر قابو پانے والا ۴۔ حامل وحی۔ ۵۔ طاقتور بہادر

---

[1] بھاگوت پران۔ ۱۲۔ ۲۔ ۲۰

[2] جمع الفوائد ص۱۶۹

[3] بھاگوت پران ۱۲۔ ۲۔ ۲۱

[4] شمائل ترمذی

۶۔ کم سخن۔ ۷۔ صدقہ وخیرات کرنے والا۔ ۸۔ شکر گزار واحسان مند۔
ا۔ علم و دانائی۔ علم و دانائی آپؐ ہی کی خصوصیت تھی۔ آپؐ نے بہت سی پیش گوئیاں بھی کی ہیں۔
تفصیلات کے لیے کتاب "الکلام المبین" مصنفہ محمد عنایت احمد ملاحظہ فرمائیں۔
اسی کتاب میں ایک تاریخی واقعہ اس طرح تحریر ہے کہ رومنوں اور فارس والوں کی جنگ میں جب رومنوں نے شکست کھائی تو آپ نے اس واقعہ کا ذکر صحابہ کرامؓ کے سامنے کیا لیکن جب یہ بات آپ کے مخالفین کے کانوں تک پہنچی تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اور پھر جب آپ نے یہ فرمایا کہ نو سال کے اندر اندر رومنوں کی شکست فتح میں بدل جائے گی تو آپ کے مخالفین نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ایک ہزار اونٹ ہارنے کی شرط رکھی لیکن آخر کار ہوا ایسا ہی کہ نو سال کے اندر نینوا کی جنگ میں رومنوں کو فتح حاصل ہو گئی۔ اسی واقعہ سے متعلق سورہ روم قرآن پاک کی ۳۰ ویں سورہ نازل ہوئی ہے۔
اس طرح کے اور بہت سے واقعات جو آپ کی دوراندیشی اور علم و دانائی سے متعلق ہیں، تاریخی کتب میں مندرج ہے۔
(ب) عالی نسبی۔ کلکی مخصوص برہمن خاندان سے متعلق ہوں گے۔
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی خانہ کعبہ کے محافظ قریش کے خاندان بنی ہاشم میں پیدا ہوئے اور یہ حقیقت پوری طرح معلوم و معروف ہے کہ بنی ہاشم نہ صرف بیت اللہ کے نگہبان تھے بلکہ عرب قبائل میں انھیں عزت و شرف کی نظر سے بھی دیکھا جاتا تھا اور اسی باعث بیت اللہ شریف کی نگرانی بنی ہاشم کے سپرد تھی۔
(ج) ضبط نفس۔ آٹھ الٰہی صفات میں یہ تیسری صفت ہے۔ بھارتیہ مذہبی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ کلکی اپنے نفس پر قابو رکھنے والے ہوں گے۔
حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ آپ بے جا تعریف و توصیف کو ناپسند کرنے والے مہربان، امن پسند، نفس پر قابو رکھنے والے اور رحمت عالم تھے۔
بعض لوگ اگر یہ اعتراض کریں کہ جس شخص نے نو عورتوں سے شادی کی ہو تو وہ اپنے نفس پر قابو رکھنے والا کیسے کہا جائے گا؟ ایسے حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ یوگی راج شری کرشن کی رانیوں کی تعداد کچھ سے زیادہ تھی۔ یوگی کاروبار دنیا میں رہ کر بھی اس میں ملوث نہیں ہوتا ہے جس طرح موتی سمندر میں ڈوبے رہنے کے باوجود کبھی تر نہیں ہوتا۔ اسی طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نو بیویاں رکھنا اس بات کی دلیل تو ہے کہ آپؐ مردانہ

خصوصیت میں بھی افضل تھے لیکن اس اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ آپ ضبط نفس کے معاملے میں کسی بھی حیثیت سے کمزور واقع ہوئے تھے۔

(ح) حامل وحی۔ اس موقع پر سنسکرت زبان کا لفظ شرت (श्रुत) استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنی ہیں جو خدا کے ذریعے سنایا گیا ہو یا جو پیغمبروں کے ذریعے بتایا گیا ہو اس لیے جو کتاب خدا کے علم سے عبارت ہو اسے شرتی (श्रुति) کہتے ہیں۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی اللہ تعالیٰ نے جبریل امین کے ذریعے اپنا علم یعنی وحی نازل فرمائی تھی اور اب یہ وحی قرآن پاک کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس بات کی تصدیق لین پول ان الفاظ میں کرتا ہے "فرشتہ کے ذریعے (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر وحی کا نازل ہونا شک وشبہ سے بالاتر ہے"[1]

بی اسمتھ اس حقیقت کی یوں نشاندہی کرتا ہے۔ "وحی کے ذریعے ہی آپ کو منصب نبوت پر سرفراز کیا گیا تھا"[2]

اور سر ولیم میور یوں رقم طراز ہے کہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) رحمت اور اللہ کے نبی تھے[3]

اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور کلکی اوتار میں یکسانیت واضح ہو جاتی ہے۔

(د) طاقتور بہادر۔ آں حضرت صلعم جسمانی طور پر بھی بہت طاقتور تھے۔

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ رکانہ نامی ایک پہلوان جو قبیلہ قریش سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ کے پاس ایک موقع پر موجود تھا۔ آپ نے اس سے خداوند تعالیٰ سے نہ ڈرنے اور یقین نہ کرنے کا سبب پوچھا۔ اس نے جواب میں اس حقیقت کا ثبوت مانگا۔ آپ نے فوراً کہا۔ تو بہت بہادر ہے یعنی اگر کشتی میں میں تجھ پر غالب آجاؤں تو یقین کرے گا۔ پہلوان نے آپ کا چیلنج قبول کر لیا کشتی ہوئی اور آپ اس پر غالب آگئے لیکن وہ اس قدر بدنصیب تھا کہ اس کے بعد بھی وہ آپ پر ایمان نہیں لایا[4]

(س) کم سخن۔ کم بولنا بڑے لوگوں کی ایک بہت بڑی صفت تصور کی جاتی ہے نہ اکرم صلی ...

---

[1] Introduction, Speeches of Mohammad, by Lane Poole p. xxxi

[2] Mohammad and Mohammedanism, by Rev. B. Smith p. 98

[3] Life of Mohammad, by Sir William Muir p. 48

[4] آثار السیر ص۹۱ اور دی لائف آف محمد صفحہ ۵۲۳

کم بولا کرتے تھے لیکن جب آپ کچھ ارشاد فرماتے تو وہ اس قدر متاثر کرنے والا ہوتا کہ لوگ آپ کا کلام بھول نہیں پاتے تھے[1] روایتی بحث و مباحثے میں آپ اکثر خاموشی اختیار فرماتے جبکہ لوگ آپ کی باتیں سننے کے ہمیشہ خواہشمند رہتے تھے[2]

(ص) صدقہ و خیرات :- صدقہ و خیرات دین کا ایک اہم جز ہے۔ غریبوں کو صدقہ و خیرات کرنا آٹھ الٰہی صفات میں سے ساتویں صفات ہے۔

تقریباً سب ہی نیک اور بزرگ لوگوں نے اس صفت کی اہمیت کو قبول کیا ہے۔ کلکی اوتار کو آٹھ الٰہی صفات کا حامل کہہ کر پرانوں نے اس بات کی تصدیق ہی کر دی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی صدقہ و خیرات کرنے میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ آپ کے یہاں ہمہ وقت غریب لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی[3] آپ کبھی کسی کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ سر ولیم نے اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں آپ کو خوبصورت، طاقتور اور صدقہ و خیرات کرنے والا بتایا ہے۔

(ط) شکر گزار احسان مند۔ یہ آٹھویں اور آخری صفت ہے۔ اس کے بغیر کوئی بھی انسان بلند مرتبہ حاصل نہیں کر سکتا۔ کلکی اوتار میں بھی اس صفت کا ہونا بتایا گیا ہے جس کو بالتفصیل اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ صفت نہیں تھی۔ تاریخ کا ایک معمولی سا طالب علم بھی اس فریب کو قبول نہیں کرے گا۔ انصار کے سلسلے میں آپ کے ارشادات اس بات کا بیّن ثبوت ہیں[4]

۱۶۔ کلام الٰہی کا مبلغ :- کلکی اوتار کے سلسلے میں یہ بات تو جانی بوجھی ہے کہ وہ جو دین قائم کریں گے وہ ویدک دھرم ہو گا اور ان کے ذریعے خدائی تعلیمات کا شیطانی تعلیم پر غلبہ ہو گا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ملا ہوا قرآن پاک بھی کلام الٰہی ہے اور یہ بات پوری طرح حقیقت پر مبنی ہے اب چاہے ضدی لوگ اس حقیقت سے کتنا ہی منہ موڑیں لیکن قرآن پاک میں جو اصول، نیک چلنی، محبت، احسان مندی، خیر و کے لیے ترغیب کے سلسلے میں جو تعلیم دی گئی ہے وہی ویدوں میں بھی ہے۔ قرآن پاک کسوٹی پر

[1] Introduction, Speeches of Muhd. by Lane poole p. xxvii
[2] Muhammad and Muhammadanism, by B. Smith p. 40
[3] Introduction, Speeches of Muhd. by Lane poole p. [illegible]
[4] آثار السیر صفحہ ۲۴۳

کی تردید، توحید پرستی کی تعلیم اور آپس میں بھائی چارہ کا طریقہ اپنانے کی تلقین کی ہے۔ ویدوں میں ایک سچائی اور عالمگیر بندگی کا سبق دیا ہے۔[1]

ویدوں میں خدا کی عبادت کا حکم ہے اور مسلمان قرآن کی تعلیم کے بموجب روزانہ دن رات میں پانچ مرتبہ نماز پڑھتے ہیں۔ جبکہ برہمنوں میں شاذ ونادر ہی تین وقت کی پوجا کرنے والے ہوں گے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ کلکی اوتار اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں پوری طرح مناسبت اور یکسانیت ہے۔

اب آخر میں وید مقدس اور قرآن پاک کی تعلیم پر ایک نظر اور ڈالتے چلیں

ویدوں اور قرآن کی تعلیمات

۱۔ اللہ، وہ زندہ جاوید ہستی، جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کرسکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے، اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی۔ الا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔ (البقرہ، آیت ۲۵۵)

اُپنشدوں میں ہے:-[2]

وہ ایک ہے۔ اس کے سوا دوسرا نہیں ہے۔ یہاں تو اس کے سوا کچھ ہی نہیں ہے یعنی کائنات کا وجود اسی وقت تک ہے۔ جب تک خدا اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر خدا کی طاقت کا انکار کیا جائے تو پھر کائنات کا وجود ہی باقی نہ رہے گا۔

۲۔ جس کو کوئی آنکھ نہیں دیکھ سکتی جس سے خود آنکھیں اپنے کو دیکھتی ہیں۔ اس کو ہی تو برہما جان۔[3]

قرآن پاک کا ارشاد ہے:-

---

[1] "एकं सत् तथा विश्व बान्धुत्व"

[2] एकं ब्रह्म द्वितीयं नास्ति, [illegible]

[3] [illegible]

"نگاہیں اس کو نہیں پاسکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے" وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے"
(الانعام آیت ۱۰۲)

۳ "ہمیں سیدھا راستہ دکھا" (الفاتحہ، آیت ۵)

رگ وید میں کہا گیا ہے:- "اے روشنی دینے والے خدا ہمیں خوبصورت راستے سے لے چلو"[1]

۴ - کہو وہ اللہ ایک ہے - اللہ بے نیاز ہے - وہ باپ ہے نہ بیٹا - نہ کوئی اس کی برابری کا ہے -
(الاخلاص آیت ۱ تا ۴)

اپنشد میں کہا گیا ہے ـــــ "خدا ایک ہے - تمام جانداروں میں اس کا ظہور ہے - تمام اعمال پر قادر ہے
سب سے اعلیٰ ہے - شاہد ہے - سب کچھ جانتا ہے اور ہر وصف سے بالاتر ہے"[2]

۵ - "اللہ ہی حق ہے" (الحج آیت ۶۲)

ویدوں میں کہا گیا ہے:- برہما سچا ہے[3] (خدا حق ہے -)

۶ - "جس طرف بھی تم رخ کروگے - اسی طرف اللہ کا رخ ہے" (البقرہ آیت ۱۱۵)

گیتا میں کہا گیا ہے:- "اس کے منہ ہر طرف ہیں"[4]

۷ - ویدوں، گیتا اور سمرتیوں میں ایک خدا کی عبادت کا حکم ہے اور اسی ایک خدا سے اپنی خطاؤں کی
معافی چاہنے کا بھی حکم ہے -

قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے:-

اے نبی! ان سے کہو میں تو ایک بشر ہوں تم جیسا، مجھے وحی کے ذریعے بتایا جاتا ہے کہ تمہارا
خدا تو بس ایک ہی خدا ہے - لہٰذا تم سیدھے اسی کا رخ اختیار کرو اور اسی سے معافی چاہو"
(حٰم السجدہ آیت ۶)

۸ - ویدوں (ندائے الٰہی یا احکام خداوندی) سے عقیدت مندی کا اظہار نہ کرنا اور اس کے احکامات
کا انکار کرنا ناستکتا (کفر) ہے اور ناستکتا کا مطلب ہے قبول نہ کرنا "

---

[1] "अग्ने नय सुपथा राये" (ऋग्वेद)
[2] श्वेताश्वतर उपनिषद् अध्याय ६ मंत्र ११
[3] "सत्यं ब्रह्म"
[4] "विश्वतो मुखम्" (गीता)

قرآن پاک میں بھی لفظ کافر اسی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ کفر کے معنے ہیں "قبول نہ کرنا" یا "بھلا دینا"۔ خدا اور رسول کا انکار کرنے والوں کی زبان سے کہلایا گیا ہے۔ "جو پیغام تم لے کر آئے ہو اس کو ہم نہیں مانتے"[1] یعنی ہم اس سب کا انکار کرتے ہیں اور انکار کرنے والے کے لیے لفظ کافر استعمال کیا جاتا ہے۔

۹۔ مسلمان کے معنے ہیں خدا کے احکامات کی تعمیل کرنے والا۔ مطلب یہ کہ جو خدا پر اس کے احکامات پر اور جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے وہی مسلمان ہے۔

اس لفظ کا بالکل ہم معنے لفظ سنسکرت زبان میں آستک (   ) آیا ہے۔ آستک کے معنے ہیں خدا، خدا کے احکامات اور اوتاروں سے عقیدت مندی رکھنے والا۔ جس طرح اوتاروں کے حکم کو سنسکرت زبان و ادب میں "دوراندیشی کا ثبوت" مانا گیا ہے۔ اسی طرح رسولوں کے احکامات کو "دوراندیشی کا ثبوت" متصور کیا جاتا ہے۔

کافر کا ٹھیک الٹا مسلمان ہے اور ناستک کا ٹھیک الٹا آستک ہے۔

بھارت میں پچہتر فی صدی آستک یا مسلمان اور پچیس فی صدی ناستک یا کافر ہیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ میں ناستکوں (کافروں) کی تعداد زیادہ ہے۔ غرض یہ کہ آستک یا مسلمان، ناستک یا کافر صرف زبان کے فرق کی بات ہے وہ دونوں ایک ہی شے کے نام ہیں۔

۱۰۔ سناتن دھرمی، آریہ سماجی، جین اور بودھ اپنے لیے ہندو لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ لفظ بالکل نیا ہے۔ قدیم ہندوستانی مذہب کو آریہ دھرم کہا جاتا تھا اور آریہ دھرم کے معنے ہیں "اعلیٰ ترین یا محترم مذہب"[2] اور سناتن دھرم کے معنے ہیں "ازلی دین"۔

سنسکرت زبان کا حرف س (   ) فارسی اور ایرانی میں ہ (   ) سے بدل جاتا ہے۔ ایرانی لوگ سندھ کے ساحلی علاقے میں آتے رہتے تھے۔ لہٰذا انھوں نے لفظ سندھ کی 'س' 'ہ' سے بدل کر لفظ سندھ کو 'ہند' استعمال کا تلفظ 'ستان' کر کے 'ہندستان' بنا دیا اور یہاں کے باشندوں کو 'ہندو' کہا جانے لگا۔ ان ہی لوگوں سے تعلق سے سنسکرت زبان و ادب سے عدم واقفیت رکھنے والے لوگ بھی ہندو اور ہندوستان کہے گئے اور پھر مسلمانوں کی حکومت کے زمانے سے ان دونوں ناموں نے اپنی ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی[3]۔ اس کے بعد جب انگریز اس

---

[1] قرآن سورہ سبا آیت ۳۴

[2] بھوشیہ پران، پرتی سرگ پرو، تیسرا حصہ، تیسرا باب، ۳۴ واں اشلوک

[3] اب لفظ 'ہند' ایک مخصوص مذہبی گروہ کے نام کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

ملک میں آئے تو انھوں نے اپنی زبان کے مطابق اسے انڈیا کا نام دیا اور اس کے باشندے انڈین کہلانے جانے لگے لہٰذا بھارتیہ، ہندوستانی اور انڈین الفاظ کے ایک ہی معنے ہوئے۔ بھارت، ہندوستان یا انڈیا کے رہنے والے۔ اب اگر ان زبانی اختلاف کو کوئی حقیقی اختلاف کی شکل دینے لگے تو یہ اس کی کم علمی کے مترادف ہوگا بھارت میں رہنے والے عیسائی، مسلمان، ڈراوڑ، کول، کرات، بھیل، پارسی اور سنتھال وغیرہ سبھی ہندوستانی، سبھی انڈین اور سبھی بھارتی ہیں۔

(بقیہ حاشیہ) دائرے میں صرف وہی لوگ سمجھے اور مانے جاتے ہیں جن کے کچھ مخصوص اعتقادات ونظریات اور رسم ورواج ہیں اور جو گروہ یا شخص ان مخصوص اعتقادات نظریات اور رسم ورواج کو اپنائے ہوئے نہیں ہے یا انہیں اپنانے سے انکار کرتا ہے۔ وہ ہندو نہیں ہے

میرے اس خیال کی تائید سوامی ویکانند جی اپنے مقالے "ہندومت۔ ایک عالمگیر مذہب" کے ذریعے ان الفاظ میں کی ہے۔

"کثرت میں وحدت فطرت کا منصوبہ ہے اور ہندو نے اسے قبول کرلیا ہے۔ دوسرے مذاہب میں سے ہر مذہب ایک مخصوص متعین عقیدہ مرتب کرتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ سماج اسے اپنانے پر مجبور ہو۔ وہ سماج کے سامنے صرف ایک کوٹ رکھتا ہے جیسے جیک جان اور ہنری کا سب پر فٹ ہونا چاہیے۔ اگر وہ جان یا ہنری پر فٹ نہیں ہوتا تو انہیں کوٹ کے بغیر جاڑے کے بدلے کو اوڑھنے، چلا جانا چاہیے۔ ہندوؤں نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ وجودِ مطلق (ABSRAUT) کو اضافی طور پر ہی پایا یا خیال کیا، یا بیان کیا جاسکتا ہے۔

اسی طرح جان کلارک آرچر اپنی کتاب "جدید دنیا کے بڑے مذاہب" میں ہندومت کی تعریف کے ذیل میں لکھتا ہے:۔
ہندومت کی اصطلاح وسیع بھی ہے اور مبہم بھی کسی بہتر تعریف کے موجود نہ ہونے کے باعث ہم اس لفظ کا استعمال ہندو مذہب کے مفہوم میں کرسکتے ہیں:

بالفاظ دیگر ہندو وہ ہے جو ہندومت کا پیرو ہو اور ہندومت کے ذیل میں صرف سناتن دھرمی، آریہ سماجی، جینی، بدھ وغیرہ آتے ہیں دیگر مذاہب کے لوگ نہیں۔ اس لیے میں معزز مقالہ نگار کے اس نظریے سے اختلاف کروں گا کہ ہندوستانی مسلمان یا ہندوستانی عیسائی بھی اپنے لیے لفظ ہندو کا استعمال کریں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک مشترک نام کے طور پر ہندوستانی یا بھارتی لفظ استعمال کیا جاسکتا ہے جس طرح امریکہ میں رہنے والوں کے لیے امریکن لفظ استعمال کیا جاتا ہے یا جیسے ہم عرب ممالک کے ہر باشندے کو، چاہے اس کا تعلق کسی مذہب یا فرقے سے ہو عرب کہتے ہیں۔

(باقی اگلے صفحہ پر)

آخری بات [1]

ایک صرف میں ہی نہیں تمام تعلیم یافتہ لوگ غیر جانب دار ہوکر ہندو مسلم اتحاد کے مقصد سے اس تحقیقی مقالے کو یقیناً پسند کریں گے۔ اور ملک میں امن و امان پیدا کرنے کا ماحول پیدا کریں گے۔ بھارتیہ جن کلکی کو بھگوان مانتے ہیں، مسلمان انھیں کلکی اوتار (آخری رسول) کے پیرو ہیں۔ کلکی اوتار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ یہ بھارتیوں کی زبردست اصلاح کریں گے۔ ان جذبات و احساسات کو لے کر ہر ایک بھارتی چاہے وہ اپنے آپ کو ہندو کہے یا انڈین۔ کلکی اوتار پر یقین کرے۔ کیونکہ وہی آخری رسول ہیں۔ جو گھوڑے پر چڑھنے اور تلوار رکھنے کی حقیقت کو ثابت کریں گے۔ اب جو زمانہ ہے یا آئندہ آنے والا ہے وہ گھوڑوں اور تلواروں کے زمانے سے بہت دور ہو گیا ہے۔

بھارتی مسلمانوں کو اپنا ہی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسلمان بھارتیوں کے سب سے بڑے فلاح کار ثابت ہونگے

میں نے یہ تحقیقی مقالہ کسی جانب داری کے جذبے سے نہیں لکھا ہے۔ ضمیر کی آواز نے مجھے اس کے لیے آمادہ کیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والے فسادات جو اکثر وقوع پذیر ہوا کرتے ہیں۔ اور ان فسادات کو دھرم کے عین مطابق سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہایت شرمناک اور خدا کو ناراض کرنے والی چیز ہے۔

میرا کام صرف اس قدر ہے کہ میں سچائی کو دوسروں تک پہنچا دوں۔ اس پر یقین بہم پہنچانا اور عمل پیرا کرنا یقیناً میرا کام نہیں ہے یہ تو صرف اللہ کی رحمت و عنایت پر ہی منحصر ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جن "احمد" کی پیشین گوئی کی تھی۔ وید ویاس جی نے جن کلکی کا تفصیلی انداز سے ذکر کیا ہے ان کی گواہی دینا میرا کام ہے۔ عیسائی آخری رسول کو مانیں یا نہ مانیں لیکن بھارتی (ہندو) انہیں ضرور مانیں گے۔

کلکی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں جو حقائق مجھ پر منکشف ہوئے انہیں دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ہندو جن کلکی کے منتظر بیٹھے ہیں وہ آبھی چکے اور وہ یقینی طور پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

ہندا ابھی نہ سہی لیکن جب اس بات سے سب لوگ واقف ہو جائیں گے تب مسلمانوں کا دین اسلام بھارت میں مروج وشنو، شیو، شاکت، جین اور بودھ سب ہی اسے قبول کر لیں گے۔ اور پھر اس طرح ایک عظیم معاشرہ عالم وجود میں آئے گا۔

(بقیہ حاشیہ) لہٰذا اس وضاحت کے بعد اب میں معزز مقالہ نگار نے جہاں مشترک نام کے لیے لفظ ہندو استعمال کیا ہے اس کی جگہ ہندوستانی یا بھارتی استعمال کروں گا۔ جو مناسب بھی اور معقول بھی۔ (و-ا)

[1] نوٹ:- مقالہ کا اس آخری حصہ کی صرف تلخیص پیش کی جا رہی ہے۔ (و-ا)

ارتقاءِ آدم سے متعلق چند معروضات

(ابو محمد امام الدین، رام نگری)

جنوری کے زندگی میں ارتقاءِ آدمؑ کے عنوان سے ڈاکٹر احسان اللہ خاں صاحب پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا مضمون شائع ہوا ہے۔ یہ موضوع جتنی تفصیل کا متقاضی ہے فاضل مضمون نگار نے اتنے ہی اجمال اور اختصار سے کام لیا ہے جیسے کسی سرکاری فیصلے کا عوام کے نام اعلان ہو۔

مضمون میں بتایا گیا ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب اکبرآبادی کی زیرِ صدارت ایک نشست ہوئی جس میں مسلم یونیورسٹی کے ایک درجن سے زائد اسلام پسند اساتذہ شریک تھے۔ اس نشست کا مقصد تخلیقِ آدم سے متعلق قرآن کی آیتوں پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ غور کیا گیا اور نتیجے میں دو نقطۂ نظر سامنے آئے۔

پہلا یہ کہ قرآن مجید کے ان تمام جملوں اور فقروں سے جو تخلیقِ آدم سے متعلق ہیں، حضرت آدم کی تخلیق مخصوص ہی کا مفہوم نہیں نکلتا بلکہ ڈارون کے نظریۂ ارتقا کی بھی پوری گنجائش نکلتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کی رو سے بہرحال قرآن مجید سے حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کا مفہوم نکلتا ہے اور اس کے برخلاف ڈاروِنی ارتقاء کی بھی پوری گنجائش نکلتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں قرآنی بیان دو متضاد نقطہائے نظر کا حامل ہے۔

دوسرا نقطۂ نظر یہ کہ ڈاروِنی ارتقاء ایک مشاہداتی حقیقت ہے جسے غلط فہمی سے نظریہ کہا جاتا ہے۔ تخلیقِ آدم سے متعلق قرآن مجید کے تمام بیانات کا ارتقائی مفہوم لینا چاہیے اور حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کے نظریہ پر مکمل کر تنقید کرنی چاہیے۔

مولانا احمد سعید صاحب نے صدر کی حیثیت سے اسی دوسرے نقطۂ نظر کی حمایت کی۔ حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق کسی خاص طریقے پر نہیں ہوئی۔ وہ بھی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے انسانیت کی منزل تک پہنچے۔

اوپر کے دونوں نقطہائے نظر میں اصول ارتقاء کارفرما ہے۔ پہلے نقطہ نظر کے مطابق قرآن مجید سے حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کا مفہوم بھی نکلتا ہے۔ ارتقاء ایک نظریہ ہے اور اس کے لیے بھی قرآن مجید میں گنجائش موجود ہے۔ اور دوسرے دو نقطۂ نظر میں پہلا نقطہ نظر ارتقاء کے مشاہدہ اور واقعہ بن جاتا ہے اور حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کا نظریہ قطعاً غلط ہو جاتا ہے۔

مجھے اپنے متعلق اہل علم ہونے کا دعویٰ نہیں لیکن یہ میرے عقیدے کا سوال ہے اس لیے میں ارتقاء سے متعلق اپنے مطالعہ کی بنا پر یہ کہنے کے لیے مجبور ہوں کہ ارتقاء کا نظریہ منکرین خدا کا پیدا کردہ ہے اور خدا کے عقیدہ کو غلط ثابت کرنے ہی کی غرض سے اسے ایجاد کیا گیا ہے۔ کہیں کی اینٹ اور کہیں کے روڑے کے بھان متی کا کنبہ جوڑ دیا گیا ہے۔ ارتقاء کا مشاہداتی واقعہ ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کے مضبوط نظریہ ہونے کے دلائل بھی تسلی بخش نہیں ہیں رہا منکرین خدا سائنس دانوں کا اسے مان لینا تو وہ تو اور بہت کچھ مانتے ہیں۔ دیکھنے کی چیز ان کا عقیدہ نہیں ثبوت ہے۔ جن دلائل و شواہد سے مطمئن ہو کر یہ فیصلہ کیا گیا ہے ان کو سامنے لایا جائے تاکہ میرے جیسے محدود العلم لوگ بھی ان کو دیکھیں اور ان پر غور کریں

حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مخصوص اور ان کی خلافت کے متعلق سورہ بقرہ میں قرآنی بیان اس طرح ہے۔

پھر اس وقت کو بھی یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ "میں زمین میں (اپنا) ایک خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں" انھوں نے عرض کیا "کیا تو زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والا ہے جو اس میں خرابی پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا۔ جب کہ ہم تیری سپاس گزاری کرتے ہوئے تیری تسبیح و تقدیس کرتے رہتے ہیں"۔ اللہ نے فرمایا "میری نگاہ میں وہ باتیں ہیں جن کی تمہیں خبر نہیں" پھر ایسا ہوا کہ اللہ نے آدم کو سب نام سکھا دیے۔ اس کے بعد انہیں فرشتوں کے سامنے پیش فرما کر کہا (جن انسانوں کے بارے میں تم نے وہ رائے ظاہر کی تھی ذرا) ان سب کے نام تو بتاؤ اگر تم (اپنے خیال میں) سچے ہو فرشتوں نے جواب دیا۔ برتر ہے تیری ذات ہم تو صرف اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے بلاشبہ تو ہر بات کا جاننے والا ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔

(مولانا صدر الدین اصلاحی تیسیر القرآن)

اس قرآنی بیان سے حضرت آدم کی تخلیق مخصوص بالکل واضح ہے۔

اس کے آگے کی آیتوں میں فرشتوں کے حضرت آدم کو سجدہ کرنے [illegible]

جنت میں جگہ دیے جانے اور پھر دنیا میں بھیجے جانے کا ذکر ہے۔ مسئلۂ ارتقا کے پیش نظر تخلیق آدم کے اس قرآنی بیان کی روشنی میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً

۱۔ مسئلۂ ارتقا کی رو سے اول اول ایک ہی مرد اور ایک عورت کے جرثومے وجود میں آئے اور وہی ارتقا کرتے ہوئے بندر یا لنگور کے درجے تک پہنچنے کے بعد ترقی کر کے انسان بن گئے یا بیک وقت بہت سے مردوں اور عورتوں کے جرثومے پیدا ہوئے اور بہت سے بندر اور لنگور انسان بنے اور ان سے انسانی نسل کا سلسلہ جاری ہوا؟

۲۔ اگر اس طرح انسان بنے تو بنتے کیوں نہیں جاتے؟ کروڑوں سال کے مختلف ڈھانچوں کو جوڑ کر ارتقاء ثابت کرنے کے کیا معنے؟ کچھ مشاہداتی ثبوت کیوں پیش نہیں کیے جاتے

۳۔ قرآن مجید کہتا ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي	اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے
خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ	تمہیں ایک نفس سے پیدا کیا اور اسی کی (جنس)
مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	سے اس کا جوڑا پیدا کر دیا۔ پھر ان دونوں سے
كَثِيرًا وَنِسَاءً (سورہ نساء آیت ۱)	بہت سے مردوں اور عورتوں کو پھیلا دیا۔

اس آیت کی رو سے ڈارونی ارتقاء کیسے ثابت ہوتا ہے؟ اگر مٹی میں یہ استعداد پیدا ہو گئی تھی کہ اس میں انسان بننے والا جرثومہ پیدا ہو تو بیک وقت بہت سے جرثومے پیدا ہو گئے ہوں گے جن سے انسانی نسل کا سلسلہ چلا ہو گا

۴۔ ڈارونی ارتقاء کی روشنی میں حضرت آدم کی تخلیق اور ان کی خلافت کے متعلق اللہ تعالیٰ اور فرشتوں میں جو مکالمہ ہوا وہ کب ہوا۔ جب حضرت آدم کا جرثومہ پیدا نہیں ہوا تھا یا اس کے بعد یا جب وہ بندر یا لنگور کے درجے تک ترقی کر کے انسان بننے والے تھے؟

۵۔ مسئلۂ ارتقا کی رو سے انسان بننے والے جرثومے تو دنیا میں پیدا ہوئے لیکن قرآنی بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ حضرت آدم کی تخلیق دنیا میں ہوئی۔ قرآن مجید میں کہیں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے کہ وہ دنیا میں پیدا کیے گئے ہوں یہاں سے جنت میں بھیجے گئے ہوں اور پھر وہاں سے دنیا میں لوٹائے گئے ہوں۔

۶۔ قرآن مجید کے متعدد آیتوں میں حضرت آدم کی تخلیق کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

[illegible]

اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا "

دیکھیے سورہ ص، آیات ۷۱، ۷۲، اور سورۂ حجر آیات ۲۸ و ۲۹

ان آیتوں کی ڈاروِنی ارتقا سے مطابقت کیسے ہوگی ؟

حضرت آدم اور انسانیت کی پیدائش کے متعلق قرآن مجید کے ایک مقام پر ہے :-

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔"

(المومنون ۱۴، تفہیم القرآن)

یہ ہے قرآنی ارتقا جسے ڈاروِنی ارتقا سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ آیت بھی اسی حقیقت کی مظہر ہے کہ حضرت آدم کی پیدائش مخصوص طریقے پر ہوئی۔ اس قرآنی ارتقا کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ یہ ارتقا کی تعریف میں نہیں آتا۔ ارتقا کی مدت نو مہینے کی ہو یا ننانوے کروڑ سال کی، اصولاً دونوں صورتوں میں ارتقا، ارتقا ہے۔ بچہ ماں کے بطن میں یک وقت دو ہاتھ، دو پاؤں، دو آنکھوں اور دو کانوں وغیرہ کے ساتھ پوری انسانی صورت میں نمودار نہیں ہو جاتا بلکہ ترقی کرکے ہی پورا انسان بنتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی تخلیق کے بارے میں فرمایا ہے۔ لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (والتین) ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ کیا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بدصورت لنگور سے خوبصورت انسان بنا دیا؟ ایسا نہیں۔ انسان کی ابتدا ہی بہترین ساخت سے ہوئی ہے۔

سورہ اعراف کی آیت گیارہ بھی حضرت آدم کی تخلیق کے بارے میں ہے۔ اس آیت کے حاشیے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں :-

"تخلیق انسانی کے اس آغاز کو اس کی تفصیلی کیفیت کے ساتھ سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ ہم اس حقیقت کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتے کہ مواد ارضی سے بشر کس طرح بنایا گیا۔ پھر اس کی صورت گری اور تعدیل کیسے ہوئی اور اس کے اندر روح پھونکنے کی نوعیت کیا تھی لیکن بہرحال یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید انسانیت کے آغاز کی کیفیت ان نظریات کے خلاف بیان کرتا ہے جو موجودہ زمانے میں ڈاروِن کے متبعین سائنس کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ ان نظریات کی رو سے انسان غیر انسانی اور نیم انسانی حالت کے

مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت کو پہنچا ہے اور اس تدریجی ارتقاء کے طویل خط میں کوئی نقطہ خاص ایسا نہیں ہو سکتا جہاں سے غیر انسانی حالت کو ختم قرار دے کر نوع انسانی کا آغاز تسلیم کیا جائے۔ بخلاف اس کے قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ انسانیت کا آغاز خالص انسانیت سے ہوا ہے۔"

آگے چل کر مولانا لکھتے ہیں :-

"اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ دوسرا تصور انسان چاہے اخلاقی اور نفسیاتی حیثیت سے کتنا ہی بلند ہو مگر اس تخیل کی خاطر ایک ایسے نظریہ کو کیسے رد کر دیا جائے جو سائنٹفک دلائل سے ثابت ہے لیکن جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ کیا فی الواقع ڈاروینی نظریہ ارتقا سائنٹفک دلائل سے ثابت ہو چکا ہے؟ سائنس سے محض سرسری واقفیت رکھنے والے لوگ تو بے شک اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ نظریہ ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے لیکن محققین اس بات کو جانتے ہیں کہ الفاظ اور ہڈیوں کے لمبے چوڑے سروسامان کے باوجود ابھی تک یہ صرف نظریہ ہی ہے اور اس کے جن دلائل کو غلطی سے دلائل ثبوت کہا جاتا ہے وہ دراصل محض دلائل امکان ہیں۔"

قرآن میں حضرت آدم کی تخلیق کے سلسلے میں جتنی آیتیں ہیں ان میں کہیں بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ کسی جانور سے ترقی دے کر انسان بنائے گئے تھے بلکہ اس کے برعکس ان میں واضح اشارات موجود ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنے دست قدرت سے ابتداءً ہی انسان بنایا تھا اور ان کے سر پر اپنی خلافت و نیابت کا تاج رکھا تھا۔ کچھ خبر نہیں کہ ڈارون کے بیان کیے ہوئے عمل ارتقاء آدم کی گنجائش قرآن کریم میں کس طرح نکالی جاتی ہے۔ البتہ آیتوں کی معنوی تحریف کر کے اس کی گنجائش نکال لینا ایک الگ بات ہے۔

نومبر و دسمبر ۱۹۶۹ء کے زندگی میں مسئلہ ارتقاء پر ایک تنقید شائع ہوئی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ کے نزدیک وہ محض طفلانہ اور جاہلانہ خامہ فرسائی ہے یا اس میں کچھ علمی وزن بھی ہے۔ جب تک اس کا جائزہ سامنے نہ آئے اسے کیسے بے حقیقت مانا جائے؟ جب اسلام پسند اساتذہ نے زندگی میں اس قطعیت کے ساتھ یہ مسئلہ اٹھا دیا ہے تو اس تنقید کے متعلق بھی ڈاکٹر احسان اللہ خاں صاحب کو اظہار خیال کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسئلہ ارتقاء پر عیسائی علماء اور منکرین خدا کے جس مناظرے کا ذکر کیا ہے اس میں بتایا ہے کہ ہکسلے نے اپنے دلائل سے ذہین طبقے کے ذہن کو مسخر کر لیا، اور وہ مذہب سے روز بروز بدظن ہونے لگا۔ میرے مطالعہ کے مطابق تو یہ ذہین طبقہ نہ تھا بلکہ وہ نہ تھا تو آمادہ فطرت یقیناً تھا اور مذہب کا باغی

طبقہ مسئلہ ارتقاء کے وجود میں آنے سے پہلے ہی پیدا ہوچکا تھا اور اس کی مذہب بیزاری اس کی ذہنی آوارگی کا نتیجہ تھی۔ خدا کو ماننے سے انسان کو وحی و رسالت کو بھی ماننا پڑتا ہے۔ اس سے انسانی اعمال وافعال پر جو پابندی عائد ہوجاتی ہے اس سے ذہین اور درحقیقت آوارہ مزاج طبقہ آزادی چاہتا تھا۔ اس کو اپنی آوارہ مزاجی کے لیے ایک نام نہاد علمی سہارا مل گیا۔ پھر کیوں نہ ارتقاء کی مزعومہ حقانیت کو مقبولیت حاصل ہوتی

میں یہاں وحیدالدین خاں صاحب کی ایک کتاب کے چند ضروری اقتباسات پیش کررہا ہوں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سائنس دانوں کے نزدیک مشاہدے کی واقعیت کیا ہے۔ وحیدالدین خاں صاحب نے قانون تجاذب سے بحث کرتے ہوئے نیوٹن کا ایک خط نقل کیا ہے جو اس نے بنٹلی کو لکھا تھا اس میں نیوٹن نے لکھا ہے

۱۔ "یہ ناقابلِ فہم ہے کہ بے جان اور بے حس مادہ کسی درمیانی واسطے کے بغیر دوسرے مادہ پر اثر ڈالتا ہے۔ حالانکہ دونوں کے درمیان کوئی تعلق نہیں ہوتا۔"

ایک ایسی ناقابلِ مشاہدہ اور ناقابلِ فہم چیز کو آج بلا اختلاف سائنسی حقیقت سمجھا جاتا ہے۔ کیوں محض اس لیے کہ اگر ہم اس کو مان لیں تو ہمارے کچھ مشاہدات کی اس سے توجیہ ہوجاتی ہے گویا کسی چیز کے حقیقت ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ براہ راست ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آرہی ہو بلکہ وہ غیر مرئی عقیدہ بھی اسی درجے کی ایک حقیقت ہے جس سے ہم مختلف مشاہدات کو اپنے ذہن میں مربوط کرسکتے ہوں۔ یلنڈ غیر مشہود حقائق کے مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"جب ہم کسی مشاہدے کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیشہ ہم جو حیاتی مشاہدے سے کچھ زیادہ مراد لیتے ہیں اس سے مراد حیاتی مشاہدہ نیز معرفت ہوتا ہے جس میں تعبیر کا جزو بھی شامل ہو۔ یہی وہ اصول ہے جس کی بنیاد پر عضویاتی ارتقاء..... کے حقیقت ہونے پر سائنس دانوں کا اجتماع ہوگیا ہے۔"

۲۔ (مومنین ارتقاء کے اقوال کے حوالوں کے بعد) یہ نظریہ جس کی صداقت پر سائنس دانوں کا اس قدر اتفاق ہوگیا ہے کیا اسے کسی نے دیکھا ہے یا اس کا تجربہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اور نہ ایسا ہوسکتا ہے ارتقاء کا مزعومہ عمل اتنا پیچیدہ ہے اور اتنے بعید ترین ماضی سے متعلق ہے جس کو دیکھنے یا تجربہ کرنے والوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

۳۔ سر آرتھر کیتھ جو خود بھی ارتقاء کا حامی ہے اس نے ارتقاء کو مشاہداتی یا تجرباتی حقیقت کے بجائے ایک عقیدہ قرار دیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

(انگریزی عبارت نقل کرنے کے بعد) یعنی نظریہ ارتقاء مذہب عقلیت کا ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ چنانچہ ایک سائنسی انسائیکلو پیڈیا میں ڈارونزم کو ایک ایسا نظریہ کہا گیا ہے جس کی بنیاد توجیہہ بلامشاہدہ ... پر قائم ہے :

پھر ایک غیر مشاہدہ اور ناقابل تجربہ چیز کو علمی حقیقت کیوں سمجھا جاتا ہے اس کی وجہ اے۔ ای مینڈر کے الفاظ میں یہ ہے :-

۱۔ یہ نظریہ تمام معلوم حقیقتوں سے ہم آہنگ .... ہے

۲۔ اس نظریہ میں ان بہت سے واقعات کی توجیہ مل جاتی ہے۔ جو اس کے بغیر سمجھے نہیں جا سکتے۔

۳۔ دوسرا کوئی نظریہ ابھی تک ایسا سامنے نہیں آیا جو واقعات سے اس درجہ مطابقت رکھتا ہو۔

اگر یہ استدلال نظریہ ارتقاء کو حقیقت قرار دینے کے لیے کافی ہے تو یہی استدلال بدرجہا زیادہ شدت کے ساتھ مذہب کے حق میں موجود ہے ایسی حالت میں نظریہ ارتقاء کو سائنسی حقیقت قرار دینا اور مذہب کو سائنسی ذہن کے لیے ناقابل قبول قرار دینا صرف اس بات کا مظاہرہ ہے کہ آپ کا مقدمہ اصلاً طریق استدلال کا مقدمہ نہیں ہے بلکہ وہ نتیجہ سے متعلق ہے ایک ہی طریق استدلال سے اگر کوئی خالص طبیعیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے فوراً قبول کر لیں گے اور اگر کوئی الہٰیاتی نوعیت کی چیز ثابت ہو تو آپ اسے رد کر دیں گے۔ کیونکہ یہ نتیجہ آپ کو پسند نہیں۔

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مذہب ایمان بالغیب کا نام ہے اور سائنس ایمان بالشہود کا حقیقت یہ ہے کہ مذہب اور سائنس دونوں ایمان بالغیب پر عمل کرتے ہیں۔

(۴) بقول سر آرتھر ایڈنگٹن ..... دور جدید کا سائنس داں جس میز پر کام کر رہا ہو وہ بیک وقت دو میزیں ہیں۔ ایک میز تو وہ ہے جو ہمیشہ سے عام انسانوں کی میز رہی ہے اور جس کو چھونا اور دیکھنا ممکن ہے دوسری میز اس کی علمی میز سائنٹفک میز ہے اس کا بیشتر حصہ خلا ہے اور اس میں بے شمار ناقابل مشاہدہ الکٹرون دوڑ رہے ہیں اسی طرح ہر چیز کے دو نسخے .... ہیں جن میں سے ایک تو قابل مشاہدہ ہے اور دوسرا صرف تصوراتی ہے اس کو کسی بھی خوردبین یا دوربین سے دیکھا نہیں جا سکتا :

(علم جدید کا چیلنج صفحہ ۶۳ تا ۶۷)

میں پچھلے دنوں کسی عالم میں مسلم یونیورسٹی کے اسلام پسند اساتذہ کی نشست ہوئی اور نظریہ ارتقاء سے بحث کی

بنیاد محض بے بنیاد قیاسات پر ہے۔ قرآن مجید کو بالائے طاق رکھ دینے کا فیصلہ صادر کر دیا گیا۔ دور حاضر کے اسلام پسند اساتذہ اس سے کیسے متاثر ہو گئے، اور کیسے یہ دھمکی دے دی گئی کہ ارتقاء ایک مسلمہ حقیقت ہے اس کی مخالفت خواہ کسی مقصد سے کی جائے خود اس مقصد کی جڑ کھودنے کے مترادف ہے۔

یعنی اگر مسلمان ارتقاء پر ایمان نہ لائیں گے اور حضرت آدم کی تخلیق مخصوص کے نظریے پر جو مشاہداتی حقیقت کے خلاف ہے کھل کر تنقید نہ کریں گے تو اسلام کا استیصال ہو جائے گا یعنی اسلام کے حق میں یہ ناگزیر ہو گیا ہے کہ مسلمان اس ارتقاء پر ایمان لائیں کہ حضرت آدم جرثومے سے ترقی کرتے ہوئے بندر یا لنگور کے مرتبے تک پہنچے اس کے بعد انسان بن کر خلافت الٰہیہ کے منصب پر فائز ہوئے۔ اگر مسلمانوں نے اس عقیدے کو قبول کر لیا تو سارے منکرین خدا سائنس داں اسلام پسند بن جائیں گے۔

نظریۂ ارتقاء مادہ پرستی کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ اس نظریہ اور انکار خدا میں لاینفک تعلق ہے آپ نظام کائنات سے خدا کی ہستی اور اس کی حکمت و قدرت کو ثابت کرتے رہیے جو مادہ پرست اور خدا کے منکر ہیں وہ آپ کی کسی دلیل کو نہ مانیں گے۔ وہ ہر اس چیز کو جو ان کی بے قید زندگی کے مناسب حال ہو گی عقلی قیاس اور استنباط سے قبول کر لیں گے مگر خدا کو اسی وقت مانیں گے جب آپ اس کا وجود طبیعی قوانین سے ثابت کر دیں گے اور یہ آپ کے لیے ممکن نہیں۔ مگر جو خدا کو ماننا چاہیں گے انہیں خدا کو ماننے کے لیے ڈاروینی ارتقاء کے ماننے کی کوئی مجبوری لاحق نہ ہو گی۔

برٹرنڈ رسل

کیا کہنے ہیں ان کی دانشوری کے وہ بہت بڑے "دانشور" تھے۔

- وہ عظیم برطانوی فلسفی اور ماہر ریاضی تھے۔
- انھوں نے ریاضی، منطق، فلسفہ، سماجیات اور سیاسیات وغیرہ سے متعلق ۔۔ سے زیادہ کتابیں لکھی ہیں۔
- صرف ۳۰ سال کی عمر میں ان کو رائل سوسائٹی کا فیلو بنایا گیا۔ اس عمر میں یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا۔
- انہیں آرڈر آف میرٹ کے خطاب سے نوازا گیا۔
- انہیں ادب کا نوبل پرائز ملا اور بھی متعدد بڑے انعامات حاصل کیے

ان کی دانشوری کا کمال یہ تھا کہ وہ خدا کے منکر تھے۔ (اور)

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

تربیت میں ناکامی کے اسباب

(مولانا سلیمان فرخ آبادی)

زمانہ گواہ ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ ترقی و تنزل اور عروج و زوال میں ہمیشہ اچھی یا بری تربیت کو دخل رہا ہے۔ جن افراد یا قوموں نے اچھی تربیت حاصل کی وہ بام عروج پر پہنچ گئیں اور جن افراد یا قوموں نے بری تربیت پائی وہ قعر مذلت میں جا پڑیں۔

تربیت دراصل نام ہے کسی نصب العین کے لیے تیاری کا، کسی منزل کے لیے راہرو منزل میں عشق منزل پیدا کرکے اسے نشو ونما دینے کا۔ اس لیے تربیت اور اس میں کامیابی یا ناکامی پر سوچنے سے پہلے اس منزل یا نصب العین کو متعین کرنا ہوگا جس کے لیے تربیت لینا یا دینا ہے۔ مگر مسلمان اور امت مسلمہ کا نصب العین اور منزل تو متعین ہے۔ اسلام پر چلنا، اسلام کو رواج دینا اور اسلامی راج قائم کرنے کی جد وجہد کرنا تاکہ ہمارا خالق، مالک اور حاکم ہم سے خوش ہو اور ہمیں لازوال نعمتوں سے نوازے۔ یہی ہمارا نصب العین اور ہماری منزل مقصود ہے۔

اس نصب العین کے لیے ہم اپنے کو، اپنی اولاد کو، اپنی قوم اپنے اہل وطن اور اپنے پورے سماج بلکہ دنیا کے انسانیت کو تیار کرنا چاہتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہم خود بھی تیار ہونا اور تربیت لینا چاہتے ہیں دوسروں کو بھی اس کے لیے آمادہ اور تیار کرکے تربیت دینا چاہتے ہیں۔ یہ صرف ہماری ایک خواہش نہیں ہے بلکہ ہم ایک عرصے سے اس نصب العین کے لیے عملاً میدان میں اترے ہوئے ہیں اور متعدد تربیتی کورس مکمل کر چکے ہیں۔ اس کے لیے ہم پیہم اپنی تربیت کرنے اور دوسروں کو تربیت دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر پوری کامیابی ہمارے قدم کیوں نہیں چومتی اس کے چند اسباب ہیں۔

اس کا پہلا سبب یقین کی کمی، ایمان کا ضعف اور اذعان کا اضمحلال ہے۔ [illegible]

اور پختہ یقین ہی انسان کو اقامت دین کے لیے پاپڑ بیلنے، خوشنودیٔ رب کے لیے تن من دھن کھپانے اور اسلامی انقلاب کے لیے قربانیاں دینے پر ابھار سکتا ہے۔ اٹھا کر کھڑا کر سکتا بلکہ دوڑنے اور پیہم دوڑنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

نہاں خانۂ دل میں جھانک کر دیکھیے۔ آپ کا ایمان کس حالت میں ہے مر رہا ہے، سسکیاں لے رہا ہے، دم توڑ رہا ہے اس کی سانس اکھڑ چکی اور نبضیں ڈوب چکی ہیں یا زندہ اور متحرک ہے تڑپتا اور اچھلتا ہو؟ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ راکھ کے ڈھیر میں چنگاری چمک رہی ہے جو شعلہ جوالہ بن سکتی ہے دہکتا ہوا آفتاب اور چمکتا ہوا مہتاب بن سکتی ہے صرف ہمارے عزم کی ضرورت ہے مومنانہ عزم کی۔

ایمانیات پر جس قدر اذعان حاصل ہوگا عقاید جس قدر پختہ ہوں گے، آپ کو اپنے نصب العین کی صداقت میں بھی اسی قدر رسوخ حاصل ہوگا عشق منزل جس قدر بڑھے گا منزل پر پہنچنا بھی اسی قدر یقینی ہوتا چلا جائے گا پھر حصول مقصد اور وصول منزل کی تربیت میں بھی آپ اور ہم انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

(۲) تدبر و تفکر کی کمی

دوسرا سبب تدبر و تفکر کی کمی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دماغ و دل اور ذہن و فکر کی صلاحیتوں سے نوازا ہے تاکہ وہ اشیاء میں غور و فکر کرے، ان کی حقیقتوں کا کھوج لگائے، ان کے حسن و قبح کا فیصلہ کرے اور بہتر نتائج اخذ کر کے ترقی کی منزلوں پر گامزن ہو، خلافت کی ذمہ داریاں اور امانت کا بار گراں انسان کو سونپنے کی وجہ یہی ہے کہ وہ شعور و ادراک کی قوتوں کا مالک ہے۔ اب اگر انسان تدبر و تفکر سے کام نہیں لے گا تو ہرگز اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کر سکے گا اور نہ بار امانت کا حق ادا کر سکے گا۔

کائنات کے آغاز و انجام میں نظام کائنات کی غرض و غایت میں سورج اور چاند کے طلوع و غروب میں سیاروں کے چلنے اور ستاروں کے چمکنے دمکنے میں رات دن کے آنے اور جانے میں، غرض کہ تمام آیات آفاق میں جس قدر غور و فکر کرو گے اسی قدر تمہیں اپنے ایمانیات میں رسوخ حاصل ہوگا اور ایمانیات میں رسوخ سے نصب العین کی حقانیت میں اذعانی کیفیت بڑھے گی۔ جو آخر کار تمہیں حرکت عمل پر مجبور کر دے گی۔

اسی طرح اپنے جسمانی نظام میں اپنی بساط بھر غور و فکر بھی آپ کو ایمانیات کے رسوخ سے نصب العین کے لیے حرکت تک پہنچنے میں مدد دے گا۔ آیات آفاق اور آیات انفس میں غور و فکر کے علاوہ آیات قرآنی میں غور و فکر آپ کو شعور حیات بخشے گا، احساس زندگی عطا کرے گا، ذوق بندگی دے گا، نصب العین کے لیے تڑپ اور منزل مقصود کا عشق پیدا کرے گا، تربیت کی اہمیت دل میں بٹھائے گا، مقاصد تربیت واضح کرے گا [illegible]

رہنمائی فرمائے گا، صحیح و غلط نصب العین میں امتیاز کرنا سکھائے گا، تربیت کی اچھائی برائی اور کامیابی و ناکامی کے گُر سجھائے گا

آئیے غور و فکر کی عادت ڈالیں، آئیے تدبر و تفکر کے لیے آمادگی پیدا کریں اور عزم کریں کہ غور و فکر کی بنیاد ذکرالٰہی کو قرار دیں گے پھر دیکھیے کامیابی ہمارے قدم چومے گی اور کامرانی ہمارے آگے دوڑے گی۔ مقاصد تربیت اور ذرائع تربیت دونوں غور و فکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی ذہنی صلاحیتوں کو غفلت کی نیند سلا دیں گے تو اپنے نصب العین کو کبھی حاصل نہ کر سکیں گے، خدارا غفلت سے باز آیئے اور تدبر و تفکر سے کام لیجیے۔

۳۔ ذرائع تربیت میں شعور کا فقدان

تیسرا سبب ذرائع تربیت میں شعور کا فقدان ہے۔ ذکرالٰہی صفات باری تعالٰی کا تذکر، آخرت میں جواب دہی کا احساس نماز، روزہ، انفاق فی سبیل اللہ، کلام پاک کی تلاوت، سیرت نبویؐ کا مطالعہ، اپنا نصب العین، اپنی حیثیت اور منصب خلافت کا احساس بیدار اور زندہ رکھنے کی فکر اور محاسبۂ نفس وغیرہ تربیت کے ذرائع ہیں۔ یہی اگر غفلت کی نذر ہو جائیں تو آخر ہم کس طرح اپنی یا دوسروں کی تربیت میں کامیاب ہو سکیں گے۔ ذکرالٰہی یا تو ہم کرتے ہی نہیں یا پھر وہ صرف ذکر لسانی ہوتا ہے حالانکہ قلب و دماغ اور عمل بھی جب تک ذاکر اور شاغل نہ ہو ذکر درحقیقت ذکر کامل ہوتا ہی نہیں، صفات باری تعالٰی کا تذکر تربیت کی جان اور اصلاح کی روح ہے مگر کون ہے جو اس روح سے خالی نہیں اور کون ہے جو عملاً اس جان کی ناقدری کا مجرم نہیں، کیا آپ کو اس جرم کا اعتراف ہے؟ کیا آپ کو انفعال گناہ میسر ہے؟ کاش ایسا ہوتا! کیونکہ انفعال گناہ بہر حال بہتر ہے۔

آخرت میں جواب دہی کا احساس ہی تھا جس نے عرب کے بدوؤں کو اللہ کا سپاہی بنا کر کھڑا کر دیا۔ جنہوں نے قیصر و کسریٰ کی طاغوتی سلطنتوں کے غرور کبریائی کو خاک میں ملا دیا اور اللہ کی زمین پر ایک سرے سے دوسرے تک اللہ کا کلمہ بلند کر دیا لیکن آج اس جواب دہی کے فقدان نے ورثہ سلطنتیں رکھنے والی امت مسلمہ کو خود اپنے ملکوں اور اپنی سلطنتوں میں بھی الٰہی قوانین نافذ کرنے سے محروم رکھا ہے بلکہ وہ لوگ اس قدر پستی میں جا گرے کہ طاغوتی نظام قائم کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکے ——— آخرت کی جواب دہی سے محروم ہو کر آدمی اپنے نفس کا پجاری اور اپنی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے۔ پھر بھلا وہ کوئی کارنامہ کس طرح انجام دے سکتا ہے تربیت میں ناکامی کا ایک سبب اسی احساس کا فقدان یا کمی ہے جس قدر ممکن ہو ہمیں یہ احساس پیدا کرنا

چاہیے ورنہ کامیابی سے ہمکنار ہونا ممکن نہیں ـــــ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ عبادتیں انسان کو بندگی رب کے لیے تیار کرتی ہیں وہ بندگی رب جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ وہ بندگی رب جس سے انسانی زندگی کا کوئی میدان کوئی شعبہ اور کوئی پہلو محروم نہیں رہتا وہ بندگی رب جس سے زندگی میں تابندگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ بندگیِ رب جس سے ایوان حکومت، میدانِ سیاست، تجارت کی منڈیاں معاشرت کی گلیاں، انفرادی زندگی کی پگڈنڈیاں، ہر ایک میں اعلیٰ انسانیت فروغ پاتی ہے، اعلیٰ اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں۔ یہی عبادات ہیں جو انسان کی، اس کے فکر و نظر کی، اس کے کردار اور سیرت کی، اس کی امنگوں اور آرزوؤں کی اس کے اخلاق اور فطری صلاحیتوں کی اس طرح تربیت کرتی ہیں کہ انسان واقعی انسان بن جاتا ہے۔ انسانی سوسائٹی حقیقی معنے میں اعلیٰ انسانی سوسائٹی بن جاتی ہے۔

ان عبادات سے غافل ہو کر آدمی آخر کس طرح بندگی رب کا حق ادا کر سکتا ہے؟ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اپنے کو کس طرح تیار کر سکتا ہے؟ اقامت دین کے لیے دوسروں کی تربیت میں کس طرح کامیاب ہو سکتا ہے قولی اور عملی شہادت کے لیے اپنی یا دوسروں کی تربیت میں کیونکر کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔

عبادات شعوری اور مقصدی ہوں، عبادات ذوق و شوق اور قلب و دماغ کی پوری آمادگی سے ادا کی جائیں، انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر ادا کی جائیں۔ غرض کہ اس طرح ادا کی جائیں جس طرح ان کے ادا کرنے کا حق ہے تو یقیناً تربیت لینے اور تربیت دینے کے دونوں کاموں میں وہ ہماری مدد و معاون ہو سکتی ہیں۔ ذرا اپنا محاسبہ تو کیجیے۔ کیا واقعی آپ عبادات کا حق ادا کرتے ہیں؟ اگر نہیں تو پھر تربیت میں ناکامی کا شکوہ کیسا؟ ـــــ یہی حال تلاوت کلام پاک اور سیرت و سنت نبوی کے مطالعہ کا ہے یا تو ہم بالکل اس سے غافل ہیں یا اگر ہم تلاوت کرتے بھی ہیں تو پھر وہ صرف الفاظ کی تلاوت ہوتی ہے اور مطالعہ سیرت صرف روایتی مطالعہ ہوتا ہے۔ تلاوتِ کلام پاک اور مطالعہ سیرت نبوی کا مقصد اگر حصول ہدایت ہو تو ہدایت ملے گی، اپنی تربیت پیش نظر ہو تو یہ مقصد حاصل ہو گا، دوسروں کی تربیت کی حکمتیں اگر آدمی سیکھنا چاہتا ہو تو اس سلسلے میں بھی اپنی جستجو کے مطابق حصہ پائے گا اور اگر صرف حصول ثواب کے لیے پڑھے گا تو صرف ثواب حاصل ہو گا لیکن تربیت سے آدمی محروم ہی رہے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کی سعی و جہد کے مطابق اس کو اجر دیتا ہے ارشاد ربانی ہے لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ

ہمارا نصب العین خوشنودی رب کا حصول ہے۔ بندگیِ رب اور اقامت دین ہے۔ اعلاء کلمۃ اللہ [illegible]

ہے۔ دعوت اسلامی اور تبلیغ دین ہے اگر ہم اپنے نصب العین پر سوچتے رہا کریں اس کو فروغ دینے کی تدبیریں سوچتے رہا کریں اس کے لیے بے چین اور متفکر رہا کریں اس کے برپا کرنے کی آرزو بیدار رکھا کریں تو یقیناً ہمارا یہ سوچ بچار ہماری تربیت میں مدد دے گا۔ اسی طرح کائنات میں اپنی حیثیت اور زمین پر اپنے منصب کے متعلق غور وفکر اور سوچ بچار ہمارے اندر باطل سے انقباض پیدا کرے گا اور فروغ حق کے لیے ہمارے قلب و دماغ میں بے چینی اور تڑپ پیدا کرے گا اور یہ فکرمندی یقیناً تربیت میں مفید ثابت ہوگی۔

اپنی ذمہ داریوں کے سلسلے میں محاسبے سے غفلت وہ گھن ہے جو پہلے اور ہماری تربیتی جد وجہد کو اندر سے کھوکھلا اور رہا ہے ناکام کیے ہوئے ہے ہر وقت اور ہر کام میں اپنا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے متعین کمزوریوں کو نشانہ بنا کر یا متعین اوصاف حمیدہ کو پروان چڑھانے کی نیت کرکے محاسبہ کرنا اور کرتے رہنا تربیت کے لیے انتہائی ممد و معاون ہے کیا محاسبہ ہم نے چھوڑ نہیں رکھا ہے پھر کیوں ہم شکوہ سنج ہیں؟ غرض کہ ذرائع تربیت کا استعمال اگر شعور و اخلاص کے ساتھ کیا جائے تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے گا اور تربیت میں ناکامی کا منہ ہمیں انشاء اللہ ہرگز نہیں دیکھنا پڑے گا۔

عملی جد وجہد سے گریز یا غفلت

تربیت میں ناکامی کا چوتھا سبب نصب العین کے لیے عملی جد وجہد سے گریز یا غفلت ہے انسان نے جس چیز کو اپنا نصب العین قرار دیا ہو اور وہ اسے نصب العین قرار دینے میں مخلص ہو تو لازماً وہ اس کے حصول کے لیے ہاتھ پیر مارے گا، اپنی زبان اپنے ہاتھ پیر اپنے مال و دولت ہر ایک کے ذریعے کوشش کرے گا اور اپنے تن من دھن سے اپنی منزل مقصود پر پہنچنے کے لیے دوڑ دھوپ کرے گا اور جس قدر ہاتھ پیر مارے گا جس قدر دوڑ دھوپ کرے گا اس قدر وہ اس سلسلے کی تربیت میں بھی کامیاب ہوگا اس کی مثال بالکل اس شخص کی ہے جو تیراکی سیکھنا چاہتا ہو اگر خشکی پر تیرنے کی کوشش میں ایڑی سے چوٹی تک زور صرف کرے تب بھی قیامت تک اسے کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اگر پانی میں اتر کر اور دریا میں کود کر ہاتھ پیر ہلانا شروع کر دے تو یہ حرکت ہی وہ تربیت ہے جس سے وہ اپنی مراد حاصل کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام مخلصین جو اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامت دین کو اپنا نصب العین قرار دے چکے ہیں ان کے لیے دعوتی میدان میں کودنا ناگزیر ہے ورنہ وہ اس سلسلے کی تربیت میں یقیناً ناکام ہی رہیں گے۔ آئیے عہد کریں کہ ہم دعوت و تبلیغ کے لیے لازماً حرکت میں آئیں گے اور عملی میدان میں کود پڑیں گے۔

دوئی اور دعوت میں بُعد

پانچواں سبب دوئی اور دعوت میں بعد ہے۔ جس نظام زندگی کو آپ برپا

کرنا چاہتے ہیں آپ کی زندگی میں اس کی جھلک نظر آنا چاہیے۔ جن افکار و نظریات کو عام کرنا آپ کے پیش نظر ہے خود آپ کے افکار و نظریات وہی ہونا چاہئیں جس طرز کی سیرتیں ڈھالنا آپ کا مقصود ہے خود آپ کی سیرت اس کے مطابق اور آپ کا اپنا کردار اس کے موافق ہونا چاہیے۔ سماج کی تعمیر جن بنیادوں پر کرنا آپ کا مطمح نظر ہے خود آپ کا گھر اس کا نمونہ ہونا چاہیے۔

غرض کہ آپ کی زندگی آپ کی دعوت سے جس قدر ہم آہنگ ہوگی اسی قدر آپ کامیاب ہوں گے اور آپکی زندگی میں آپ کی دعوت سے جس قدر بُعد ہوگا اسی قدر آپ نہ صرف اپنے نصب العین تک پہنچنے میں بلکہ اس کے حصول کی جدوجہد اور اس سلسلے کی تربیت میں بھی ناکام و نامراد رہیں گے آپ کی زندگی کو تناقضات سے پاک ہونا چاہیے ورنہ دنیا میں ناکامی کا منہ دیکھنے کے علاوہ خدا کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ آپکی زندگی بے رنگی یا دو رنگی نہیں یک رنگ ہونا چاہیے۔ آپ کی زندگی آپ کی اپنی دعوت کے ہم رنگ ہوگی تب ہی آپ اس کے لیے اپنے کو ڈھالنے اور دوسروں کو اس کے لیے ہموار کرنے کی جدوجہد میں کامیاب ہوسکیں گے۔ اپنا جائزہ لیجیے آپ کی زندگی میں کوئی تناقض تو نہیں ہے؟ کوئی بے رنگی یا بدرنگی یا دو رنگی تو نہیں ہے؟ غرض کہ داعی کی زندگی اور اس کی دعوت میں بُعد ناکامی کا ایک بڑا سبب ہے جس قدر جلد یہ بعد دور ہوگا اسی قدر جلد اپنی تربیت میں بھی آپ کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی ان شاء اللہ۔

۶۔ تعلق اور اُنس و محبت کا فقدان

چھٹا سبب داعی اور مخاطبین مربی اور تربیت کے محتاج افراد میں انس و محبت کا فقدان یا کمی ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنے مخاطبین اور مدعوئین کے لیے ہمیشہ سچی ہمدردی، خیر خواہی اور دل سوزی کے مالک ہوتے تھے اور یہ جذبۂ خیر خواہی ان کی زندگی اور دعوتی جدوجہد سے ہر شخص محسوس کر لیتا تھا لہذا ہر طالب خیر اور جویائے حق ان کی طرف ایسا کھنچتا تھا جس طرح لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی یہی ہمدردی، خیر خواہی اور دل سوزی اپنے حواریوں اور رفقاء کار کے ساتھ انس و محبت کا روپ دھار لیتی وہ اپنے مومن ساتھیوں کی تربیت میں کامیابی کی بلندیوں تک پہنچ جاتے تھے اس کی وجہ یہی انس و محبت ہوتی تھی کیونکہ داعی کی ہمدردی سے ہمدردی کا، دل سوزی سے دل سوزی کا اور محبت سے محبت مدعوئین اور مخاطبین میں بھی پیدا ہو جاتی تھی لہذا وہ ان کی تربیت میں کامیابی و کامرانی سے ہمکنار ہوتے تھے۔

جائزہ لیکر دیکھیے آپ کو اپنے مدعوئین سے ہمدردی اور دل سوزی ہے؟ کیا آپ [illegible]

نئے زمانے کا ایک نیا مذہب ۔ نشہ

(جناب فرحت قمر ایم اے)

اس حقیقت کے باوجود کہ نشہ خوری کو تمام دنیا میں مذموم اور نقصان دہ سمجھا جاتا ہے۔ نشہ خوری کی عادت عالمگیر طور پر بڑھتی جا رہی ہے۔ نشہ آور اشیاء میں شراب ایک عام اور قدیم چیز ہے لیکن آج کے ترقی یافتہ دور میں تیز دواؤں، گولیوں، کیپسولوں اور نشہ آور انجکشنوں کے دور میں شراب ایک فرسودہ سی شے بنکر رہ گئی ہے۔ شراب کی حیثیت مغربی تہذیب میں تیز کافی کے مقابلے میں معمولی چائے کی طرح رہ گئی ہے۔ تاہم اس کی تباہ کاری دنیا میں کم نہیں ہے۔ شراب پینے والوں کی تعداد کا تو اندازہ بھی نہیں لگ سکتا۔ شراب کے ہاتھوں دماغی و جسمانی طور پر تباہ ہو جانے والوں کی تعداد دنیا میں ڈھائی کروڑ ہے۔ فرانس میں اس تباہ کاری کا اوسط سب سے زیادہ ہے اور وہاں کی عورتیں بھی دوسرے ممالک کے مقابلے میں اس معاملے میں آگے ہیں شراب کی وجہ سے مرنے والوں کی شرح بھی اس ملک میں سب سے زیادہ ہے اور حکومت کو شرابیوں کی دیکھ بھال و علاج کرنے کے لیے سات ارب روپیہ سالانہ خرچ کرنے پڑتے ہیں (نیویارک ٹائمز)

امریکہ میں تقریباً ۱۲ کروڑ بالغ لوگ شراب پیتے ہیں۔ شراب کے استعمال پر سالانہ تقریباً ایک کھرب روپیہ صرف ہوتا ہے۔ مغربی جرمنی میں بھی شرابیوں کی تعداد چار لاکھ بتائی جاتی ہے۔ سنجیدہ اور چھوٹے سے ملک میں بلجیم، ہالینڈ اور کناڈا [illegible] ملک ہے [illegible] آبادی [illegible] میں سے ایک [illegible] شرابیوں میں سے ایک [illegible] ہے (ماہنامہ ترجمان ۱۹۶۹)

روس میں ایک بڑی تعداد قومی شراب "ووڈکا" کے ہاتھوں تباہ ہے اور ہندوستان میں نشہ بندی کی [illegible] عادت [illegible] ہے

اچھی شراب مہنگی ہونے کی وجہ سے یا شراب پر پابندی کے سبب لوگ اسپرٹ، تھنر، مکھچر تک پی جاتے ہیں۔ ٹھرّا اور کچی شراب کے علاوہ کچھ دل والے تو چاچھ کے ساتھ مٹی کا تیل بھی پی جاتے ہیں۔ شراب کو اسلام نے ام الخبائث کہا ہے۔ اس کا نشہ انسان کے فکر سلیم اور ضمیر کو تھپک کر جرم و گناہ کو اس کی نظر میں معمولی بنا دیتا ہے لیکن مذکورہ بالا اشیاء تو انسانی صحت و دماغ کو مکمل طور پر تباہ کر دیتی ہیں۔ بھنگ، چرس، گانجہ، دھتورا، افیون، کوکین وغیرہ شراب کے علاوہ دیگر نشہ آور اشیاء ہیں جن کا استعمال اب مشرقی ممالک سے نکل کر مغربی ممالک میں بھی قبول عام حاصل کر رہا ہے۔ لوگ اخلاقی کھوکھلے پن اور منفی فکر کی ایسی دلدل میں پھنستے چلے جا رہے ہیں کہ جہاں سے نکلنے کی نہ ان میں ہمت باقی ہے نہ خواہش اور بزبانِ غالب دن رات کی "یک گونہ بے خودی" ہی ان کی معنوی نجات رہ جاتی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جن کو "مہذب نشہ" کہا جا سکتا ہے۔ "ایل ایس ڈی کی کہانی" مصنف جان کیش مین رقمطراز ہیں کہ "ریاستہائے متحدہ امریکہ میں تین کروڑ اشخاص خواب آور یا تحریک پیدا کرنے والی گولیوں (PEP PILLS) کے عادی ہیں۔ دواساز کارخانے کھربوں کی تعداد میں یہ گولیاں اور کیپسول ہر سال بناتے ہیں اور ان کی آدھی تعداد تمام دنیا میں بلیک مارکیٹ میں پھیل جاتی ہے۔" لوگ ان دواؤں سے نشے کا کام لیتے ہیں بڑھتی ہوئی یہ عادت انسانیت کے لیے خطرناک ہے کیونکہ اس قسم کی ادویہ مہلک ہوتی ہیں۔ خواب آور گولیوں سے ہی اندازاً تین ہزار اموات صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال واقع ہو جاتی ہیں مسکن، دردکش اور مانع حمل گولیاں بھی اپنا کام کرتی ہیں۔ امریکہ کے ڈرگ کمشنر جارج لارک کے بیان کے مطابق ان گولیوں کے استعمال سے موت اور مختلف بیماریوں کے علاوہ نوجوانوں میں جرائم کا رجحان تشدد آمیز قتل، خودکشی اور معاشرے کو تباہ کرنے والی دیگر قبیح حرکات میں قابل لحاظ اضافہ ہوا ہے۔ اندازہ کیجیے اس معاشرے کا جہاں "مہذب" انسان سونے کے لیے بھی گولی کھاتا ہے اور جاگ کر چست ہونے کے لیے بھی! دیگر نشوں کی طرح ان اشیاء کی بھی عادت پڑ جاتی ہے اور نتیجہ میں واقع ہوتے ہیں تشنج کے دورے، اعصاب کی تباہی، دماغ کی نسوں کا پھٹنا، پاگل پن، تشدد کا جنون وغیرہ! ارتقاء کی بلندیوں پر پہنچے آج کے معاشرے میں جس قدر نقصان دہ دوائیاں ہر مسئلے کے حل کے لیے یکہ کی کے طور پر کھائی جاتی ہیں۔ تاریخ کے کسی بھی دور میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ گھر میں موجود رہنے کی وجہ سے بچے بھی آسانی سے ان کا استعمال سیکھ لیتے ہیں۔

موجودہ تہذیب کا ان سب سے خطرناک تحفہ ہے ایل۔ ایس۔ ڈی جو کوکین سے دو سو گنا زیادہ طاقتور

اناج کی ایک بیماری ارگٹ کے مارے ہوئے دانوں کے کالے مغز سے حاصل ہونے والے لائی سرجک ایسڈ سے یہ نئی دوائی "سوئیٹزرلینڈ کے ایک کیمیادان اسبرٹ ہوف مین نے کوئی تیس سال پہلے تیار کی تھی اور ایک گرام کے ۲۵۰ ویں حصہ کی ایک خوراک خود کھا کر اپنا تجربہ لکھا تھا "مجھے زمان و مکان کا احساس نہ رہا — اعصاب اور اعضا پر قابو ختم ہو گیا۔ مجھے یہ خوف ہونے لگا کہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کچھ دیر بعد مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنے جسم سے باہر نکل رہا ہوں — مر رہا ہوں " (فطرت کے خطرناک تحفے" ص۲)

ہوف مین نے صحیح لکھا تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے، ایل ایس ڈی کا اثر — ہوف مین خود بھی کئی مہینے تک پاگل رہا۔ انجکشن کے ذریعے خون میں براہ راست شامل کی جانے والی اس مہلک شے کے اثرات مندرجہ ذیل واقعات سے ظاہر ہوتے ہیں جو آج کے زمانے میں سماجی اصلاح، جرائم کی روک تھام اور تحقیقات کا کام کرنے والوں نے مختلف لوگوں سے مل کر بیان کیے ہیں۔

ایک شخص نے ایل ایس ڈی کے نشے کے زیر اثر یہ سوچا کہ وہ اڑ سکتا ہے اور اس یقین کے تحت اس نے دسویں منزل کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی۔ ظاہر ہے کہ وہ کیا اڑتا اس کا طائر روح ضرور اڑ گیا۔ ایک اور شخص نے کار چلاتے ہوئے ٹریفک کی سرخ روشنی کو ایک حسینہ سمجھا اور اس کے اشارے پر عملی طور پر جان دے دی۔ ایک نوجوان نے نشے کے زیر اثر اپنی بصارت جاتی ہوئی محسوس کر کے اپنی آنکھ نوچ پھینکی۔ ایک شخص نے فرش پر اس لیے سونا شروع کیا کہ اس کو اپنا بستر صرف دو انچ کا لگتا تھا۔ ایک اور شخص کو نشے میں احساس ہوا کہ اس کو انسانی قربانی دینی چاہیے اور نتیجہ میں اس نے اپنی محبوبہ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ ایک لڑکی نیم برہنہ حالت میں چیختی ہوئی سڑک پر نکل آئی۔ کیونکہ اس کو وہم ہو گیا تھا کہ سانپ کی طرح اس کی کینچلی اتر رہی ہے۔

ایل ایس ڈی کا نشہ دس بارہ گھنٹہ تک رہتا ہے۔ صرف سرور کے عالم میں ہی اس قسم کی حرکات سرزد نہیں ہوتیں بلکہ بہت سے افراد کو صرف ایک ہی مرتبہ کے تجربے کے بعد اور کچھ کو کئی بار یہ نشہ استعمال کرنے کے بعد مختلف قسم کے وہم ہو جاتے ہیں۔ ایک خوراک کے استعمال کے مہینوں یا سالوں بعد بھی مضر اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔ ایک واقعہ سے اس نشے کا لرزہ انگیز انجام ظاہر ہے۔ ایک نوجوان نے پولیس افسر کو بیان دیتے ہوئے کہا:۔

مجھے ایل ایس ڈی استعمال کیے ایک مہینہ سے زائد ہو گیا لیکن مجھے اب بھی یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میرے ناک، کان اور انگلیوں سے کیڑے رینگ رینگ کر باہر نکل رہے ہیں۔ میں ان کو چن کر فرش

پر پھینکتا ہوں اور وہ پھر ان ہی سوراخوں میں واپس رینگ جاتے ہیں "

معاذ اللہ! کتنے عبرت ناک حالات ہیں! یورپ اور امریکہ کے دماغی اسپتالوں میں نشے کے ایسے شکار ہزاروں کی تعداد میں مستقل دماغی خرابی کے امکان کے ساتھ بھرے ہیں اور نہ جانے کتنے معاشرے کو تباہ کر رہے ہیں اور پھر یہ بھی تو انتہا نہیں۔ ابھی ایل۔ ایس۔ ڈی کا نام محدود تعلیم یافتہ طبقہ تک ہی پہنچا تھا کہ ایس۔ ٹی۔ پی اور میتھے ڈرین نامی دوا اور نشہ آور اشیاء تیار ہو گئیں جن کا اثر ایل۔ ایس۔ ڈی سے بھی زیادہ قوی ہے اور جن کا نشہ تین چار دن رہتا ہے اور یہ بھی کوئی انتہا نہیں ــــ انتہا تو وقت بتائے گا جب دنیا میں اندھوں، پاگلوں اور اپاہجوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر بڑھ جائے گی۔ (یہ چیزیں انسانی خون کے سرخ ذرات کو تباہ کر کے سینکڑوں پیچیدہ بیماریوں کا اور تناسلی جراثیم کو کمزور کر کے ناقص الاعضاء بچوں کی پیدائش کا سبب بنتی ہیں۔)

یہ ظاہر ہے کہ یہ نشے حیرت انگیز طور پر تباہ کن ہیں لیکن افسوس ہے آج کے مہذب اور تعلیم یافتہ دماغ پر جو ہر غلط چیز پر علم اور فلسفے کا ملمع چڑھا دیتا ہے۔ ایل۔ ایس۔ ڈی جیسی مہلک شے کے بارے میں ۱۹۵۰ء میں آلڈس ہکسلے جیسے نامور فلسفی نے کہا تھا کہ اس میں دماغ کو وسعت دینے کی طاقت ہے۔ اس کے بعد ہارورڈ یونیورسٹی کے کچھ پروفیسروں نے اس کو اپنا اور اس گروہ کا سرغنہ ٹموتھی لیاری تو اس کا "مبلغ" بن گیا۔ اس نے ایل ایس ڈی کو فلسفہ کا جامہ پہنا دیا اور اشاعت کی کہ اس کے استعمال سے انسان روح اور مابعد الطبیعیات کے اسرار و رموز کو سمجھتا ہے۔ اس کے اثر کو اس نے "مراقبہ" کی کیفیت سے مثال دی اور اس کے نشے کے زیر اثر ہونے والے الٹے سیدھے احساسات کو "الہام" کہا۔ آج کے زمانے میں جبکہ انسان کسی اخلاقی نظام کی عدم موجودگی کی وجہ سے اپنی بڑھتی ہوئی مشکلات کا حل ڈھونڈھنے کے لیے ہر نئی شے کی طرف لپکتا ہے۔ ٹموتھی کے اس "روحانی انکشاف" کی طرف بھی لپکا۔ سینکڑوں، ہزاروں اور پھر لاکھوں "پیرو" اس نئے "مذہب" کے بنتے گئے اور ان کو دیکھ کر ٹموتھی نے فخریہ اعلان کیا کہ ۱۹۷۰ء تک ان کی تعداد صرف امریکہ میں دو کروڑ سے زائد ہو جائے گی۔ اس قبیح شے کے شکار خود فریبی کے زعم میں اپنے کو عقلمند سمجھتے ہیں۔ ایل۔ ایس۔ ڈی کو "پاٹ" اور میتھے ڈرین کو "سپیڈ" کے شاعرانہ ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے نشے کو "روحانی سفر" کہتے ہیں اور منتہائے کمال پر پہنچ کر کھلم کھلا کہتے اور دیواروں پر لکھتے ہیں "ایل۔ ایس۔ ڈی خدا ہے" (نعوذ باللہ)

کیا آپ اس کو دور دور کی بات سمجھتے ہیں؟ کیا آپ سوچتے ہیں کہ امریکہ اور یورپ کے افراد ہی نشے کے سمندر میں غرق ہیں؟ جی نہیں۔ بلیک مارکیٹ، اسمگلنگ اور ہپیوں کی وجہ سے ان نشہ آور اشیاء نے [illegible] دنیا

کے ہر ملک میں پہنچ چکے ہیں۔ جی ہاں صورت حال کچھ ایسی ہی ہو چکی ہے کہ چونکا جائے اور سوچا جائے۔ آج کی ہندو نئی نسل سب کچھ جانتے ہوئے بھی آگ سے کھیل رہی ہے۔ جل بھی رہی ہے لیکن بے حس ہے۔ نشہ کے حامی نعرہ لگاتے ہیں "نشہ استعمال کرو، دماغ کی نسیں کھولو، مست ہو جاؤ اور سماج کو ٹھکرا دو۔" فرار اور مستی لذت کے اس منفی طرز فکر سے بنی نوعِ انسان کو مستقبل میں کیا نقصان اٹھانا پڑے گا اس کا اندازہ ہر ذی شعور انسان لگا سکتا ہے۔

لیکن اس کا علاج کیا ہے؟ حقیقتوں اور مسائل کے ذکر سے ہی تو کام نہیں چلتا۔ علاج! نشہ خوری اور دوسرے تباہ کن مسئلوں کا حل صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے اسلام کی تعلیمات پر صحیح طور سے عمل کر کے روح کا اس ابدی نشہ میں غرق ہو جانا جس کا حصول ہر اس فرد کے لیے کھلا ہے جو قرآن کو سمجھے اور اس پر عمل کرے۔ مومن بنے اور بقول اقبال:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

(بقیہ صفحہ ۴۴)

نہیں ہے —

ہمارے مربیوں کو بھی اپنے رفقاء کے ساتھ اپنے تعلق کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان کے ساتھ آپ کو قلبی لگاؤ ہے؟ نجی اور ذاتی دلچسپی ہے انس و محبت کا برتاؤ ہے اور تعلق ہے؟ خود رفقاء کو بھی اپنے مربیان کرام کے ساتھ اپنے تعلق کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان کے ساتھ ارادت اور عقیدت اور انس و محبت ہے کہ نہیں؟ آپس کے تعلقات کا بھی مطالعہ ضروری ہے رابطہ ہے یا صرف ضابطہ کی رفاقت ہے۔ یاد رکھیے صرف ضابطہ کا تعلق جو گہری شخصی دلچسپی سے خالی ہو تربیت حاصل کرنے یا رفقاء کی تربیت کرنے میں کافی نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تربیت کرنے والوں اور تربیت حاصل کرنے والوں میں انس و محبت کا تعلق خیر خواہی اور ہمدردی کا برتاؤ ضروری ہے۔

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ

محمد اللہ کے رسول اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکرین حق کے مقابلے میں سخت، مضبوط اور قوی ہیں اور آپس میں نرم دل ہیں۔ اپنے بھائیوں کے ہمدرد و مہربان، ان کے سامنے نرمی سے جھکنے والے اور تواضع و انکسار سے پیش آنے والے ہیں۔

(قرآن)

محمد قطب (مصر)

اسلام اور آزادئ فکر

ترجمانی عرفان خلیلی

"آپ نرے تنگ نظر ہیں" ۔۔۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ "آزادئ خیال کی تو آپ کو ہوا تک نہیں لگی ہے۔"

"یہ آپ کیسے سمجھ بیٹھے کہ میں تنگ نظر ہوں؟" میں اس کی طرف مخاطب ہوا۔

"کیا آپ وجود خدا کے قائل ہیں؟ اس نے ایک اور سوال کر دیا جیسے اس نے میرے سوال کو سنا ہی نہ ہو

"یقیناً ۔۔۔ یہ تو میرا ایمان ہے کہ خدا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" میں نے پورے یقین کے ساتھ جواب دیا۔

"کیا آپ نماز پڑھتے ہیں ۔۔۔ کیا آپ روزے رکھتے ہیں ۔۔۔؟ وہ سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔

"ضرور ۔۔۔ ضرور ۔۔۔ یہ تو ایک مسلمان کے فرائض میں داخل ہیں۔" میں بلا تامل اس کے سوالات کے جوابات دے رہا تھا۔

"اسی لیے میں تو کہتا ہوں کہ آپ دقیانوسی خیالات رکھتے ہیں، آپ رجعت پسند ہیں۔" اس نے فاتحانہ انداز میں آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن آپ نے میرے سوال کا جواب تو دیا نہیں؟ میں نے پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ سوال کیا۔

"آپ کا سوال ۔۔۔؟" اس نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں ۔۔۔" میں نے سنجیدگی کے ساتھ کہنا شروع کیا۔ "میں نے یہ دریافت کیا تھا کہ آپ نے مجھے تنگ نظر کیسے سمجھ لیا؟"

"اوہ ۔۔۔ آپ اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ ان "خرافات" پر یقین رکھنے والا ۔۔۔ جس کا کوئی [illegible]

کیا آزاد خیال کہلایا جاسکتا ہے؟" اس نے اس انداز میں بات پوری کی جیسے وہ بہت بلندی سے بول رہا ہو
"اور آپ ــــ؟" اب میری باری تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے سوالات کرنا شروع کیے۔ "آپ کس بات پر ایمان رکھتے ہیں ــــ؟ آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ ساری کائنات کس نے تخلیق کی ہے ــــ؟ یہ زندگی کے آثار ــ جن کا آپ مشاہدہ فرما رہے ہیں ــ کس کے مرہونِ منت ہیں ــــ؟"

"نیچر ــ نیچر ــــ!" اس نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا آپ وضاحت فرمائیں گے کہ یہ "نیچر" کیا چیز ہے؟" میں نے بڑے سکون کے ساتھ مسکراتے ہوئے پھر سوال کیا۔

"نیچر ــ! یہ وہ پوشیدہ طاقت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے ــ جس کی حدود کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اور ہاتھ نچا نچا کر سمجھانا شروع کیا۔ "اس کے باوجود وہ اپنا اظہار کرتی رہتی ہے جسے ہماری اور آپ کی سب کی قوتِ مدرکہ محسوس کرتی ہے۔"

"تو یوں کہیے کہ آپ مجھے ایک غیبی طاقت کے مقابلے میں دوسری غیبی طاقت کی دعوت دے رہے ہیں۔"

"جی ہاں ــ جی ہاں۔" اس نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

"لیکن ــــ وہ وجوہات سمجھ میں نہیں آتیں جن کے باعث ہم اپنے الٰہ واحد کو چھوڑ کر آپ کی بتائی ہوئی ایک دوسری غیبی طاقت پر ایمان لے آئیں، خصوصاً جب کہ ہمارا خدا ہمیں اطمینانِ قلب، سکونِ خاطر اور طمانیت عطا فرماتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ کا نام نہاد خدا (نیچر) نہ ہماری آوازوں کو سنتا ہے اور نہ ہماری تسلی و تشفی کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے۔"

جب کسی نام نہاد "ترقی پسند" سے گفتگو ہوتی ہے تو وہ آزادیٔ فکر کے سلسلے میں اسی قسم کے الجھے ہوئے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ان کے نزدیک آزاد خیالی یا فکری آزادی اس وقت پایۂ تکمیل کو پہنچتی ہے جبکہ خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا جائے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ فکری آزادی نہیں ہے بلکہ فکری آوارگی اور ذہنی انارکی ہے اور دہریت کی طرف قدم بڑھانے کی کھلی چھوٹ ہے۔ حقیقت میں یہ ان کا نقطۂ آغاز ہے، جہاں سے آگے بڑھ کر وہ اسلام کے سر "فکری آزادی پر پابندی" کا الزام تھوپ کر اسے مطعون کرنا اور پھر برا بھلا کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ فکری آزادی سے مراد الحاد اور دہریت لیتے ہیں اور چونکہ اسلام دہریت کی طرف جانے سے روکتا ہے اس لیے ان کی یہ ساری تگ و دو "حبِ علی" میں نہیں، بلکہ "بغضِ معاویہ" میں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا فکری آزادی اور دہریت ایک ہی چیز ہیں؟ کیا آزادیٔ فکر کی اولین

ضرور دہریہ ہوتا ہے۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ اس نہج پر سوچنے والے وہ پریشان خیال لوگ ہیں جن کو یورپ کی حریت پسندی کی تاریخ نے ورغلا دیا ہے۔ وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یورپ میں مقامی طور پر کچھ ایسے خصوصی حالات پیدا ہوگئے تھے جن کی وجہ سے وہاں دہریت کا نفوذ ہوا۔ اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ دنیا میں ہر جگہ ویسے ہی حالات موجود ہیں جن کے زیر سایہ دہریت پلتی پھولتی ہے۔

آیئے اب ذرا یورپ کے ان حالات کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیں جن کے تحت وہاں دہریت پروان چڑھی اس میں شک نہیں کہ وہاں کلیسا نے مذہب کے نام پر جیسے جیسے مظالم ڈھائے ہیں ان کا نتیجہ مذہب بیزاری ہی کی شکل میں ظاہر ہونا چاہیے تھا اور وہی ہوا۔ کلیسا نے سائنس کو مذہب کا دشمن قرار دے کر اسکو نیست و نابود کر دینے کی کوششیں کیں۔ سائنس دانوں کے خلاف سخت سے سخت تعذیبی کارروائیاں کی گئیں اور ساتھ ہی ساتھ باطل عقائد و نظریات کے ایک پشتارے کو من جانب اللہ قرار دے کر ان پر لادنے کی کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سائنسداں کلیسا سے اپنا رشتہ منقطع کرنے پر مجبور ہو گئے اور دہریت کی رو میں بہہ گئے۔ یورپ کے ذی فہم اور روشن خیال افراد کے لیے یہ ایک لمحۂ فکریہ تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ان دو متباین راستوں میں سے کس کو اختیار کیا جائے۔

(۱) خدا پر فطری یقین

(۲) سائنس کے عملی اور اثباتی حقائق کو تسلیم کرنا۔

اب اگر وہ پہلا راستہ اختیار کرتے ہیں تو لامحالہ ان کو کلیسا سے منسلک ہونا پڑے گا جس کی حرکات سے وہ بیزار ہو چکے تھے۔ اب رہا دوسرا راستہ، اسی میں انھوں نے اپنی عافیت سمجھی اور فطری راستہ (نیچر کے نام سے اسے اختیار) کر لیا۔ اس کے بعد انھوں نے کلیسا سے یہ مطالبہ کیا کہ:۔

"اپنے خدا کو واپس لے جاؤ جس کا نام لے کر ہمارے گلوں میں اپنی غلامی کا قلادہ ڈالتے ہو۔ ہماری جیبوں پر ڈاکے ڈالتے ہو — ہماری گردنوں پر ظالمانہ ڈکٹیٹر شپ کا جوا رکھتے ہو — ہمیں توہمات میں پھانس کر بے وقوف بناتے ہو۔ تمہارے خدا پر ایمان لانے کا یہ مطلب ہے کہ ہم تارک الدنیا ہو کر رہبانی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائیں — جاؤ اب ہم تمہارے پھندے میں نہیں آسکتے۔ اب ہم اپنا [illegible] بنائیں گے جس میں تمہارے خدا جیسی بہت سی صفات ہوں گی لیکن وہ ایسا [illegible] کو غلامانہ زندگی بسر کرنے پر مجبور کرے۔ اخلاقی عقلی اور مادی بے جا پابندیاں [illegible]

کرتا ہے ۔

یہ تھے وہ حالات جن کی وجہ سے یورپ میں نیچریت یا دہریت نے جنم لیا لیکن خدا کے فضل سے اسلام میں ایسا کوئی موڑ نہیں ہے جو انسانوں کو خدا پرستی کی بجائے دہریت کی طرف لے جائے ۔ یہ ایک ایسی صاف ستھری شاہراہ ہے جس پر کوئی ایسا دوراہا نہیں پڑتا جو چلنے والوں کو بہکا دے کہ وہ کدھر جائیں ۔ صرف ایک اللہ ہے ۔۔۔ اسی نے ساری کائنات کی تخلیق فرمائی ہے اور سب کو اسی کے پاس واپس جانا ہے ۔ یہ ایک ایسا سیدھا سادہ سا نظریہ بلکہ حقیقت ہے جس کا انکار ایک کٹر سے کٹر نیچری اور دہریہ بھی نہیں کر سکتا ۔ بشرطیکہ اس کی فطرت مسخ نہ ہو چکی ہو ۔

اسلام میں یورپین کلیسا کی طرح پادریت کا کوئی عہدہ نہیں ہوتا ۔ دین اسلام ایک ایسی مشترکہ میراث ہے جس سے ہر مسلمان اپنی فطری، روحانی اور عقلی صلاحیت کے مطابق فائدہ اٹھا سکتا ہے ۔ اسلام کی نظر میں سارے انسان برابری کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کے ساتھ ان اعمال کے مطابق سلوک کیا جائے گا جو انہوں نے حیات دنیوی میں کیے ہوں گے ۔ ان میں نسبتاً قابل احترام وہ لوگ ہیں جو خدا ترس ہیں خواہ وہ انجینیر ہوں یا ڈاکٹر، دست کار ہوں یا صناع، مزدور ہوں یا سرمایہ دار ۔ اسلام کسی خاص پیشے یا طبقے میں محدود نہیں ہے اور نہ اس میں کسی پیشہ ورانہ پادری کی ہی گنجائش ہے جس کی رہنمائی کے بغیر عبادات نامکمل رہتی ہوں ۔ ہاں ۔۔۔ ایسا ضرور ہے کہ کچھ افراد اپنے آپ کو قانونی مہارت میں مختص کر لیتے ہیں جس کی امن عامہ برقرار رکھنے کے لیے ضرورت بھی ہے لیکن اسلامی قانون کی نظر میں ان کو اس سے زیادہ کوئی خاص اہمیت حاصل نہیں ہوتی جتنی کہ ان ہی جیسے منصب رکھنے والوں کو دوسرے ممالک کے دساتیر میں حاصل ہے ۔ ان کی حیثیت حکومت کے مشیر قانون کی ہوتی ہے ۔ غرضیکہ اسلامی قوانین میں علماء اور عوام، امراء اور ماتحت، سرمایہ دار اور مزدور سب برابر ہیں ۔

اسی طرح دنیائے اسلام کے بڑے سے بڑے دینی ادارے کو لے لیجیے ۔ ان کے سربراہوں کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کلیسا کے پادریوں کی طرح کسی کو نذر آتش کرنے یا کسی اور قسم کی وحشیانہ سزا کا حکم دے سکیں ۔ ان کو [illegible] حاصل ہے کہ وہ عوام یا خواص کے ان نظریات وعقائد کی تردید یا ان پر تنقید کر سکیں جو اسلامی [illegible] ۔ دوسری طرف عوام میں سے ہر ہر فرد کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ بڑے سے بڑے [illegible] علماء روش پر نکتہ چینی کر سکتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اسلام کسی فرد یا طبقے کی جاگیر

نہیں ہے بلکہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے "یہ ایک مشترکہ میراث کی حیثیت رکھتا ہے" اور ہر مسلمان خواہ وہ کسی بھی نسل، طبقہ یا پیشہ سے تعلق رکھتا ہو اپنے علم اور تقوی کی بنیاد پر مذہبی معاملات میں اظہار خیال کرنے اور اس کی عملی صورتیں بیان کرنے کا حق رکھتا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے اسلامی حکومت سے متعلق ایک غلط فہمی کو ۔۔۔ جو اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے ۔ دور کرنا ضروری سمجھتا ہوں ۔ نہ جانے یہ غلط فہمی کہاں سے پیدا ہو گئی ہے، جبکہ تاریخی شواہد بھی اس کا ساتھ نہیں دیتے کہ اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی سارے بڑے بڑے مناصب اور عہدوں کے ذمہ داروں کو بیک قلم معطل کر کے ان کی جگہ علماء کو گورنر، وزراء اور اعلیٰ افسران مقرر کر دیا جائے گا۔ اس کی حیثیت سوائے گمراہ کن پروپیگنڈے کے اور کچھ نہیں ہے۔ حقیقت میں اسلامی حکومت ہاتھوں کے بدلنے کا نام نہیں ہے ۔ مثلاً اگر کل تک حکومت کو چلانے والے میاں رام اور رابرٹسن تھے تو اس کا شمار غیر اسلامی حکومت میں ہوا اور آج اگر ان کی جگہ پر عبداللہ اور حسن محمود آجائیں تو وہ اسلامی حکومت کہلانے لگے ۔ یہ تصور یا طرز فکر قطعاً غلط ہے ۔ اسلامی حکومت حقیقتاً نام ہے اُس طرز حکومت کا جس کی بنیاد شریعت الٰہی پر رکھی گئی ہو جس کا نظام حکومت شریعت کے اصولوں کے مطابق ہو ۔ اسلامی حکومت قائم ہونے پر انجینیر، ڈاکٹر اور ماہرین معاشیات کا تو ذکر ہی کیا سربراہانِ حکومت تک کو بدلنے کی ضرورت نہیں پیش آتی بشرطیکہ وہ اسلامی طرزِ حکومت کو جان و دل سے اپنالیں اور اپنی زندگیوں میں اسلامی تعلیم کے مطابق تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں ۔ ذرا تاریخ اٹھا کر دیکھیے، ایک دو نہیں ایسی دسیوں مثالیں مل جائیں گی ۔

اسی طرح کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہوئے سنے گئے ہیں کہ سائنس پڑھنے سے عقائد بگڑ جاتے ہیں ۔۔۔ یہ ایک مضحکہ خیز الزام ہے جس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ۔ تاریخ سے ایک بھی تو ایسی مثال نہیں دی جا سکتی کہ جس میں حقیقی سائنس کے اصول اور اسلامی اصول بر سر پیکار نظر آتے ہوں ۔ اگر ایک طرف آپ کلیسائی دور حکومت میں سائنس دانوں کے خلاف ایک طوفان اٹھتا ہوا دیکھیں گے تو دوسری طرف اسلامی حکومت کو سائنس دانوں کی سرپرستی کرتے ہوئے پائیں گے ۔ بلکہ مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ اسلام خود ایک سائنٹفک دین ہے ۔ اسلام نے کورانہ تقلید کی ہمیشہ مذمت کی ہے اور اس کے مقابلے میں ہر ہر قدم پر سوچ بچار اور غور و فکر کی دعوت دی ہے ۔ قرآن پاک اس قسم کی آیتوں سے بھرا ہوا ہے جن میں انسانوں کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ آفاق و انفس کا مشاہدہ کریں ۔ کائنات اور خود اپنے وجود پر غور کریں ۔ کیا یہ ساری کی

ساری چیزیں خود بخود وجود میں آگئی ہیں یا ان کا کوئی خالق بھی ہے جو اپنی حکمت، تدبر اور دانائی سے ساری کائنات کے نظم کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اس موقع پر اگر میں اس کا حوالہ دوں تو ناموزوں نہ ہوگا کہ موجودہ مغربی سائنس دانوں میں بہت سے ایسے تھے جو دہریہ تھے، اللہ کے وجود کے قائل نہ تھے۔ اپنی سائنٹفک تحقیق کے ذریعے وہ وجود باری تعالےٰ کے ماننے پر مجبور ہوگئے اور پکار اٹھے کہ مافوق الفطرت اور قادر مطلق ہستی کوئی ایسی ضرور ہے جس کے اشاروں پر کائنات کا نظم چل رہا ہے۔

مختصر یہ کہ اگر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو اسلامی تعلیمات میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملتی جو انسانوں کو اسلام سے متنفر کرکے دہریت کی طرف لے جائے۔ اب رہے مشرقی دنیا کے علمبرداران دہریت تو یہ بے چارے اپنے مغربی آقاؤں کے اندھے مقلد ہیں۔ یہ آزادیٔ فکر کا نعرہ بلند کرکے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں اور پھر بڑی حکمت عملی سے ان کو عقائد، طریق عبادت اور مجموعی طور پر پورے مذہب کے خلاف بغاوت پر ابھارتے ہیں۔ یورپ میں تو اس کی ضرورت کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ میں تحریر کر چکا ہوں وہاں عوام کو غلط عقائد اور توہمات میں پھانسا جا رہا تھا۔ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے یہ تگ و دو ضروری تھی لیکن اسلام تو خود انسانوں کو آزادیٔ فکر کی دعوت دیتا ہے پھر آخر اس غلط فکر و عمل کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ———

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر ان نام نہاد آزاد خیالوں کے دلوں کو ٹٹولا جائے تو یہ حقیقت مبرہن ہو جائے گی کہ یہ فکری آزادی سے خاک دلچسپی نہیں رکھتے بلکہ اخلاقی بگاڑ (MORAL CORRUPTION) اور بے لگام جنسی تراج (ان کنٹرولڈ سیکسوئل انارکی) کے خواہاں ہیں اور اپنی اس بدنیتی کو چھپانے کے لیے فکری آزادی کا نعرہ بلند کرتے ہیں۔ ان کا یہ نعرہ مذہب اور اخلاقیات کے خلاف گوریلا جنگ سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ ان کی اسلام دشمنی اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلام فکری آزادی کے لیے کچھ حدود مقرر کرتا ہے بلکہ اصل سبب یہ ہے کہ اسلام ان کے سفلی جذبات اور انسانیت کے درمیان ایک رکاوٹ ہے۔

آزادیٔ خیال کے علمبرداروں کا ایک الزام یہ بھی ہے کہ اسلامی طرز حکومت آمرانہ ہے کیونکہ ریاست کو حد سے زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور چونکہ یہ سارے اختیارات اور اقتدار مذہب کے نام پر غصب کیے جاتے ہیں۔ اس لیے بے چارے عوام احتراماً اس کے سامنے گردن جھکا دیتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے آپ کو اس جابر حکومت کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ حکومت کا تمام اختیار اور اقتدار غصب کر لینا اور عوام کا آنکھیں بند کرکے اسے تسلیم کر لینا، آمریت کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ بایں صورت آزادیٔ فکر ہمیشہ کے

یہ ختم ہو جاتی ہے اور کسی کو بھی حکمرانوں کے خلاف زبان کھولنے یا ان پر نکتہ چینی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی اور اگر کوئی سر پھرا یہ جرأت کرتا بھی ہے تو اسے مذہب اور خدا کا باغی قرار دیا جاتا ہے۔

یہ اعتراض ان کی کم علمی یا پھر ہٹ دھرمی کی غماضی کرتا ہے کیونکہ دیکھنے میں یہ اعتراض جتنا وزنی معلوم ہوتا ہے حقیقت میں اس سے زیادہ کھوکھلا ہے۔ اس سلسلے میں بہتر یہ ہے کہ قرآن پاک کی دو آیات اور خلافت راشدہ کے دو واقعات پیش کر دیے جائیں جن کی روشنی میں حق شناس دل خود فیصلہ کر لیں گے کہ معترض کا اعتراض وزنی ہے یا جواب کی حقیقت۔ قرآن پاک صاف صاف کہتا ہے۔

وامرھم شوریٰ بینھم (شوریٰ-۳۸) اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں

ایک جگہ اور فرمایا گیا ہے:۔

واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء-۵۸) اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔

آئیے، اب خلافت راشدہ پر ایک نظر ڈالیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد جو پہلا خطبہ دیا ہے اس کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ آپ نے مسجد نبوی میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"تم میری اس وقت تک اطاعت کرو جب تک میں خدا اور رسول کی اطاعت کرتا رہوں اور اگر میں خدا اور رسول کی نافرمانی کروں تو تم پر اطاعت ضروری نہیں"

خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:۔

"اگر تم مجھ میں کوئی کجی پاؤ تو تمہارا فرض ہے کہ میری اصلاح کر دو"

حاضرین میں سے ایک شخص کھڑا ہوا اور تیز لہجے میں بولا:۔

"اے عمر! اگر تم میں ذرہ برابر بھی کجی پیدا ہوئی تو خدا کی قسم ہماری تلواریں تمہارے سارے بل نکال دیں گی"

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جبر و استبداد اور ظلم و تعدی کو ہوا دینے والوں نے اپنے چہروں کو مذہب کے نقابوں میں چھپا رکھا تھا۔ یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آج کل بھی مذہب ہی کی آڑ لے کر چند ملکوں میں مطلق العنانی اور قتل و غارت گری مچائی جا رہی ہے۔ لیکن —— کیا صرف مذہب ہی ایک ایسی اوٹ ہے جس کے پیچھے سے ڈکٹیٹر اپنا حربہ چلاتے ہیں۔؟ کیا ہٹلر بھی مذہب ہی کے نام پر اپنی آمریت چلاتا رہا تھا؟ یا یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اسٹالن بھی اپنے زمانے کا ایک جابر ڈکٹیٹر تھا جس نے پولس اسٹیٹ قائم کر رکھی تھی

اس نے اپنے دورِ استبداد میں جو کچھ کیا مذہب ہی کا نام لے کر کیا ؟ دنیا کے یہ سارے جابرہ اور ڈکٹیٹر جن میں ماؤزے تنگ، جنرل فرانکو، چیانگ کائی شیک اور جنوبی افریقہ کا میلن بھی شامل ہیں، کیا مذہب کے نام پر ہی حکومت کر رہے ہیں یا نہیں، قطعاً ایسا نہیں ہے۔ بلکہ اس بیسویں صدی کو — جس نے اب مذہب کے اقتدار سے چھٹکارا حاصل کرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے — ایسے ایسے دیو صفت ڈکٹیٹروں سے پالا پڑا ہے جنہوں نے انسانیت کو طرح طرح کے پرکشش اور قابلِ احترام ناموں سے گمراہ کرنے کی کوشش کی اور کر رہے ہیں۔

میں آمریت کی حمایت نہیں کرنا چاہتا اور نہ کوئی شخص جس میں ذرہ برابر بھی حریت پسندی اور ضمیر کی بیداری موجود ہے — ایسا کر سکتا ہے، لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ بلند و برتر اور عمدہ سے عمدہ اصولوں پر بھی اپنی ہوس پرستی کی پردہ پوشی کی خاطر کیچڑ اچھالا جائے، ان کو داغدار کر کے پیش کرنے کی کوشش کی جائے۔ کیا فرانسیسی انقلاب کے دوران — آزادی کے نام پر — گھناؤنے سے گھناؤنے جرائم کا ارتکاب نہیں کیا گیا — ؟ لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ آزادی کے خلاف ایک مہم شروع کرنے کے لیے ان جرائم کو عذر بنا لیا جائے۔ قانون کی خاطر سیکڑوں نہیں ہزاروں بے گناہوں کو جیل خانوں میں ٹھونس دیا جاتا ہے، طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا جاتا ہے۔ تو کیا دنیا کے سارے قوانین کو کالعدم قرار دینا صحیح ہوگا — ؟ اسی طرح اگر جبر و تشدد، ظلم و زیادتی چند ممالک میں مذہب کے نام پر روا رکھی گئی ہو۔ تو کیا مذہب سے کنارہ کش ہو جانا ہمارے لیے مناسب ہوگا — ؟ ہاں — یہ درست ہے کہ اگر کوئی مذہب ناانصافی، دھاندلی اور ظلم و تشدد کا سبق دیتا ہے تو اس سے فوراً دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اس مقام پر یہ حقیقت میں واضح کر دوں کہ اسلام پر کسی حال میں بھی یہ الزام عائد نہیں ہوتا کیونکہ اس کا دامن صرف اپنوں کے ساتھ نہیں بلکہ غیروں حتّٰی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف، مساوات اور انسانی ہمدردی کے قابلِ قدر واقعات سے بھرا ہوا ہے۔

استبداد یقیناً قابلِ مذمت شے ہے لیکن اس کا مقابلہ صرف اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کو خدا پرستی کی دعوت دی جائے، ان کو اس آزادی کا احترام کرنا سکھایا جائے جس کی حمایت مذہب کرتا ہے۔ خدا ترس صاف باطن اور سچی آزادی کا احترام کرنے والے لوگ اپنے حکمراں کو غلط سمت چلنے سے روک سکتے ہیں اور اسے مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ اپنی حدود کے اندر رہے — کیونکہ عوام کی طاقت ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ انصاف کو پھیلانے اور ظلم کا استیصال کرنے کے سلسلے میں جو کارہائے نمایاں اسلام نے انجام دیے ہیں ان کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو یہ حق دیتا ہے کہ اگر ان کا حکمراں کوئی غلط قدم اٹھائے

تو وہ بڑھ کر اسے روک دیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :۔

"جو شخص کسی برائی کو دیکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اسے روک دے"

ایک دوسری حدیث شریف میں ہے :۔

"سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے افضل جہاد ہے" (ترمذی)

کلمۂ اختتامیہ کے بطور میں "ترقی پسند آزاد خیال" لوگوں کو ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں کہ "آزادی حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ مذہب سے کنارہ کشی اختیار کی جائے بلکہ لوگوں میں ایک ایسی انقلابی روح بیدار کرنے کی ضرورت ہے جو ناانصافی کو ختم کرے اور انصاف کو فروغ دے۔ یہ اسپرٹ اور یہ جذبہ صرف اسلامی تعلیمات ہی پر عمل کرنے سے پیدا ہو سکتا ہے"

اعلان ملکیت ماہنامہ زندگی

و دیگر تفصیلات فارم IV رول نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت — دفتر زندگی رام پور۔ یوپی

(۲) مدت اشاعت — ماہانہ

(۳ و ۴) طابع و ناشر — احمد حسن

وطنیت ہندوستانی پتہ بازار کلاں۔ رام پور۔ یوپی

(۵) ایڈیٹر — سید احمد عروج قادری

وطنیت ہندوستانی پتہ گھیر سیف الدین خاں رام پور۔ یوپی

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کی حد تک صحیح ہیں

احمد حسن

انانیت کا روگ

ہر زندہ اور عاقل انسان میں اپنے وجود کا احساس ہوتا ہے اور اسی احساس وجود کا نام انا ہے۔یہی انا انسان کو شعور، وقار اور خود شناسی عطا کرتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ اپنی حد کے اندر رہے۔ "میں ہوں" ایک صحیح احساس ہے لیکن اگر یہ آگے بڑھ کر "میں ہی ہوں" بن جائے تو اسی کا نام انانیت ہے اور یہ انانیت ایک ایسا روگ ہے جو کسی انسان کو لگ جائے تو پھر اس سے چھٹکارا پانا آسان نہیں رہتا۔ انانیت اور کبر ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔ کبر و غرور کبھی حسن و جمال پر ہوتا ہے، کبھی زر و مال پر، کبھی منصب و جاہ پر، کبھی کسی کمال ہنر اور ان سب میں بدترین قسم کا غرور وہ ہے جو کسی احمق انسان کو اپنے علم و فہم پر ہوتا ہے۔ علمی انانیت کی سطح سب سے پست اس لیے ہے کہ یہ حقیقی علم کی عین ضد اور فی الواقع جہل کی پیداوار ہوتی ہے۔ صحیح علم سے خود شناسی اور غلط علم سے خود پرستی پیدا ہوتی ہے۔ جو بے چارہ علمی انانیت میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے سوا سب کو جاہل سمجھتا ہے وہ اپنے کوزے کو دریا سمجھتا ہے اور دوسروں کے دریا کو کوزہ قرار دیتا ہے۔ مجھے اب تک جن لوگوں کے ساتھ کچھ دنوں زندگی گزارنے کا موقع ملا ہے ان میں ایک صاحب کی علمی انانیت دیوانگی کی حد تک جا پہنچی تھی، وہ عالم بھی تھے، حکیم بھی تھے اور شاعر بھی۔ یہ تو یاد نہیں کہ وہ کسی عالم کو آدھا عالم بھی مانتے تھے یا نہیں لیکن یہ خوب یاد ہے کہ وہ حکیم اجمل خاں کو آدھا حکیم اور غالب کو آدھا شاعر کہتے تھے۔ پتہ نہیں وہ بے چارے زندہ بھی ہیں یا اس جہان گزراں سے گزر گئے۔ بات یہ ہے کہ ترقی یافتہ انانیت انسان کو اپنی ذات کے خول میں بند کر دیتی ہے اور پھر اس تاریک خول میں اسے اپنی ذات کے سوا کسی دوسری چیز کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ ترقی کا دور ہے اس لیے انانیت بھی ترقی کر رہی ہے، کتنے ہی ایسے لوگ موجود ہیں جو خدا کا بھی انکار کر رہے ہیں مگر ان کے کمال دانشوری کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا ہے۔ انکار خدا کے بعد تو خود پرستی سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خود پرستی اور خدا پرستی دونوں یک جا کس طرح ہو جاتی ہیں۔ ان

دنوں کچھ مسلمان دانشور بھی اپنی انانیت کا ڈنکا بجا رہے ہیں، ان کے علم کی مقدار تو بہت تھوڑی ہے البتہ چرب زبانی اور انشا پردازی کی مقدار کچھ زیادہ ہے، ان بے چاروں کو بھی ہر معاملے میں اپنی ذات ہی آخری اتھارٹی نظر آتی ہے۔ ان میں سے بعض کی انانیت سوشلزم کے سامنے سربسجود ہو گئی ہے، ان کی رجز خوانی صرف اسلام اور مسلم قیادتوں کے مقابلے میں ہے۔ مسلمانوں میں سوشلزم کا استحکام مسلم قیادتوں کے انہدام کے بغیر ممکن بھی تو نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کا مستقبل سوشلزم کے ساتھ چپک گیا ہے اس کی گفتگو حقیقت پسندی اور اسلام کا نام سطحیت اور نعرہ بازی ـــــ سوشلزم غور و فکر کی پیداوار ہے اور اسلام جذباتیت کا نتیجہ ہے اس لیے اب اس زمانے میں اس کا نام وہی گروہ لے سکتا ہے جو اس نام کے پردے میں اپنے اقتدار کا خواہاں ہو ان کے نزدیک اس وقت خلوص اور بے لوثی کے ساتھ صرف سوشلزم کی خدمت کی جا سکتی ہے، غریب بے در سوشلزم کو اقتدار سے کیا واسطہ؟ کیا خوب ہے یہ انانیت اور کیا خوب ہے مسلمانوں کی خدمت کا مخلصانہ جذبہ

ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کسی مسلم جماعت کا ساتھ دینے پر آمادہ تو ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ وہ ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے حاضر ہو، ان سے پالیسی اور پروگرام متعین کرائے اور ان کے حکم کے مطابق آگے بڑھے تب یہ آشیرواد دیتے ہوئے اس کے پیچھے چلیں گے

یہاں بات اسی انانیت کی آ گئی یعنی جب تک کسی جماعت اور قیادت کو اپنی سند سے نہ نوازیں نہ کسی مسلم جماعت کا وجود ہے اور نہ کسی مسلم قیادت کا۔ کوئی ان سے پوچھے کہ اگر کسی مسلم قیادت کا وجود نہیں ہے تو آپ خود قیادت کا جھنڈا کیوں بلند نہیں کرتے اور جس مہم میں آپ دوسروں کو جھونکنا چاہتے ہیں اسے لیکر خود کیوں آگے نہیں بڑھتے۔ کیا آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے یا آپ نے مسلم قیادتوں کے انہدام ہی کی ذمہ داری سنبھالی ہے؟ اللہ ہم میں سے ہر شخص کو انانیت کے روگ سے محفوظ رکھے۔

ایک ضروری اعلان

رقم بھیجتے وقت یا خط و کتابت میں براہ کرم خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ اس کے بغیر تعمیل ارشاد میں دشواری ہوگی۔

منیجر

فن اسماء الرجال تالیف مولانا تقی الدین ندوی مظاہری صفحات ۱۱۰ کاغذ، طباعت، کتابت بہتر۔
قیمت: ایک روپیہ پچھتر پیسے۔ ناشر: مکتبہ فلاح دارین۔ ترکیسر۔ سورت۔ گجرات۔

اس سے پہلے فاضل مؤلف کی ایک کتاب "محدثین عظام اور ان کے علمی کارنامے" پر زندگی اپریل ۶۷ء میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کی زیر تبصرہ تالیف بھی علم الحدیث ہی سے متعلق ہے۔ مولانا آج کل دارالعلوم فلاح دارین ترکیسر کے شیخ الحدیث ہیں۔ اس کتاب پر بھی مولانا ابوالحسن علی ندوی کا مقدمہ ہے۔ اس مقدمے میں وہ تحریر فرماتے ہیں

> اس زبان (اردو زبان) میں زیادہ تر حدیث کے متون کے تراجم ہوئے۔ حدیث کی تاریخ و تدوین یا محدثین کے سیر و تراجم پر کتابیں لکھی گئیں لیکن رجال، فن جرح و تعدیل، شرائط قبول حدیث، علل و اسقام حدیث، فن اسناد، مختلف ائمۂ حدیث کے معیار صحت و ضعف، موضوعات وغیرہ پر بہت کم توجہ کی گئی جس سے وہ اردو داں حضرات یا ضعیف الاستعداد طلبہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے جو کسی وجہ سے ان مآخذ سے براہ راست استفادہ نہیں کر سکتے ـــــ عزیز گرامی مولوی تقی الدین ندوی سلمہ تعلیم یافتہ طبقہ کے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے پہلے "محدثین عظام" کے نام سے ایک متوسط کتاب لکھی اب فن اسماء الرجال اور فنون حدیث پر وہ دوسری کتاب پیش کر رہے ہیں جس میں اس فن کی معتمد کتابوں کا بڑا قابلِ قدر اور لائق استفادہ خلاصہ اور ان کی تحقیقات کے نتائج آ گئے ہیں۔" (ص ۶-۵)

کتاب کے بارے میں مولانا کی اس رائے پر کسی اضافے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ فاضل مولف نے یہ مختصر کتاب ۹۰ کتابوں سے استفادہ کر کے مرتب کی ہے۔ اخیر میں انھوں نے فن اسماء الرجال کی اہم و مشہور کتابوں کا تعارف بھی کرایا ہے۔ مثلاً حالات صحابہؓ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں سے دس کتابوں پر تعارف لکھا ہے تاریخ رجال کی اہم کتابوں میں سے ۸ کتابوں کے بارے میں مختصر نوٹس لکھے ہیں۔ اس کتاب کا یہ حصہ بھی خاصہ معلومات افزا

ہے۔ امید ہے کہ مدارس عربیہ کے طلبا اس کتاب سے استفادہ کریں گے۔

خلائی دَور ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ۔ صفحات ۳۴ قیمت ۵۰ پیسے۔ مطبوعات حلقہ طلبہ منتسبین جماعت اسلامی پٹنہ۔ بہار

ڈاکٹر ضیاء الہدیٰ ایک بہت ہی ذہین وفطین صاحب علم ہیں اور یہ مختصر پمفلٹ ان کی ذہانت وفطانت کا ایک تازہ ثبوت ہے۔ وہ بہت دنوں سے انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں جمعہ کا خطبہ دیتے ہیں۔ ان کے خطبوں سے استفادے کے لیے جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک اچھی خاصی تعداد جمع ہوتی ہے۔ یہ پمفلٹ بھی ان کا ایک خطبہ ہے جو انھوں نے انجمن میں دیا تھا۔ چاند پر انسان کے قدم رکھ دینے کے بعد نا واقف مسلمانوں میں جو ایک بے چینی سی پیدا ہوئی تھی اسے دور کرنے کے لیے یہ خطبہ دیا گیا تھا انھوں نے اسلامی تعلیمات کے اشارات سے انسان کی سائنسی ترقیوں اور خلائی بلند پروازیوں کا ایک پورا خاکہ مرتب کرکے دکھایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا چاند پر قدم رکھنا تو آئندہ ترقیوں کے لحاظ سے ایک ابتدائی قدم ہے۔ ظاہر ہے کہ آئندہ کیا واقعات رونما ہوں گے اس کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کی غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر انسان چاند سے بھی بلند سیاروں میں پہنچ جائے تو ہمیں نہ کسی تاویل کی ضرورت ہے اور نہ ہمارے لیے انکار کی کوئی وجہ ہے جو لوگ سائنس اور قرآن دونوں سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے یہ پمفلٹ ایک تحفہ ہے۔

واقعہ معراج کے ذیل میں ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ حضورؐ کا سفر سدرۃ المنتہیٰ تک براق پر ہوا تھا۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس سلسلے میں جو احادیث آتی ہیں وہ اپنے درجے کے لحاظ سے بھی مختلف ہیں اور ان کے اندر بیان واقعات میں تقدم وتاخر بھی بہت ہے۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر قرآن میں اس سلسلے کی تمام احادیث کو جمع کرنے کے بعد اپنی جو تحقیق لکھی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت جبریلؑ حضورؐ کو براق پر سوار کرکے بیت المقدس تک لے گئے۔ اور وہاں براق کو ایک خاص چٹان کے ساتھ باندھ دیا۔ پھر وہاں سے وہ حضورؐ کو کسی سواری کے بغیر آسمانوں پر لے گئے۔ یہاں تک کہ حضورؐ سدرۃ المنتہیٰ پہنچے اور پھر وہاں سے حضورؐ بیت المقدس واپس آئے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی امامت کی اور پھر براق پر سوار ہو کر مکہ معظمہ واپس تشریف لائے۔ غرض یہ کہ براق پر آپ کا سفر صرف بیت المقدس اور وہاں سے واپسی میں ہوا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ براق کا چہرا آدمی کے چہرے جیسا تھا۔ یہ بات کسی بھی صحیح ماخذ سے ثابت نہیں

یہ محض قصے کہانی کی بات ہوگی — جیسا کہ لکھا گیا بحیثیت مجموعی یہ پمفلٹ لائق مطالعہ ہے۔

معارف الحدیث جلد پنجم تالیف محمد منظور نعمانی۔ صفحات ۴۰۰ قیمت مجلد گرد پوش کے ساتھ ۵ روپے ناشر: کتب خانہ الفرقان کچہری روڈ۔ لکھنؤ۔

عمدہ کاغذ اور عمدہ و واضح کتابت و طباعت، مضبوط جلد اور سادہ و سنجیدہ گرد پوش کے ساتھ یہ کتاب ۵/ میں مہنگی نہیں ہے۔ مولانا محمد منظور نعمانی کی تالیف کا یہ سلسلہ "معارف الحدیث" کافی مقبول ہوا ہے۔ ہمارے پاس تبصرے کے لیے یہی زیر تبصرہ پانچویں جلد آئی ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے چار جلدیں اور شائع ہو چکی ہیں۔ اس جلد کے متعلق محترم مؤلف نے دیباچے میں تحریر فرمایا ہے:-

اس جلد میں اذکار و دعوات سے متعلق ۲۲۲ حدیثوں کی تشریح کی گئی ہے۔ پہلی جلدوں کی طرح اس جلد کی حدیثیں بھی زیادہ تر "مشکوٰۃ المصابیح" اور "جمع الفوائد" سے لی گئی ہیں۔ کچھ حدیثیں "کنز العمال" سے بھی لی گئی ہیں اور تخریج میں انہیں کتابوں پر اعتماد کیا گیا ہے۔ بعض حدیثیں براہ راست کتب صحاح، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد وغیرہ سے بھی لی گئی ہیں۔ (صفحہ ۱)

واضح اور مطلب خیز ترجمہ اور مختصر تشریح کی وجہ سے یہ کتاب ہر خاص و عام کے لیے مفید بن گئی ہے اس کتاب الاذکار والدعوات کے مضامین کی مفصل فہرست بھی دی گئی ہے۔ محترم مؤلف نے ذکر، دعاء، استغفار و توبہ اور صلوٰۃ وسلام کی حقیقت پر بھی مختصر اور دل نشین انداز میں روشنی ڈالی ہے — مولانا نے احادیث کی جو مختصر تشریحات کی ہیں ان میں کا ایک ٹکڑا نمونے کے طور پر یہاں نقل کیا جا رہا ہے۔

دعاء دراصل ان دعائیہ الفاظ کا نام نہیں ہے جو زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کو تو زیادہ سے زیادہ دعا کا لباس یا قالب کہا جا سکتا ہے۔ دعا کی حقیقت انسان کے قلب اور اس کی روح کی طلب اور تڑپ ہے اور حدیث پاک میں اسی کیفیت کے نصیب ہونے ہی کو باب دعاء کے کھل جانے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور جب بندے کو وہ نصیب ہو جائے تو اس کے لیے رحمت کے دروازے کھل ہی جاتے ہیں — اللہ تعالیٰ نصیب فرمائے۔ (صفحہ ۱۱۹)

متن حدیث پر اعراب لگانے میں کاتب نے کہیں کہیں غلطی کی ہے۔ بعض اردو الفاظ بھی غلط چھپ گئے ہیں

اس کتاب پر مقدمہ ڈاکٹر میر ولی الدین ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے لکھا ہے۔ یہ مقدمہ حدیث کے دین میں حجت ہونے

پر لکھا گیا ہے اور اس میں مستشرقین و متغربین کے خیالات کی تردید کی گئی ہے۔ مقدمہ بجائے خود فاضلانہ ہے لیکن اس جلد کے ساتھ اس کی مناسبت سمجھ میں نہیں آئی۔ اس مقدمے کو تو پہلی جلد کے ساتھ شائع ہونا چاہیے تھا۔

کنز العمّال ۔ کتابُ الایمان

ترتیب و ترجمہ سید فرید الدین عرف اچھے میاں وکیل۔ صفحات ۴۱۶
ناشر انسٹی ٹیوٹ آف اورینٹل اسٹڈیز۔ صولت لائبریری، رامپور، یوپی

شیخ علی متقی رحمۃ اللہ علیہ کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث کنز العمال' احادیث کا ایک انسائکلوپیڈیا ہے۔ اگر اس کی تمام جلدوں کا اردو میں ترجمہ ہو جائے تو یہ ایک بڑا کام ہے۔ اسے مفید بنانے کے لیے دو باتیں بہت ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مفصل مقدمہ لکھ کر کے کم ان کتابوں کا درجہ بیان کر دیا جائے جن سے شیخ علی متقی نے احادیث نقل کی ہیں۔ کیونکہ نہ احادیث کی تمام کتابیں ایک درجہ کی ہیں اور نہ خود احادیث ایک درجہ کی ہیں۔ وکیل صاحب نے یہ کام انجام نہیں دیا ہے۔ چونکہ ابھی زیر تبصرہ کتاب ترجمے کی پہلی جلد ہے اس لیے ابھی موقع باقی ہے۔ دوسری بے حد ضروری بات یہ ہے کہ ترجمہ صحیح اور قابل فہم ہو۔ کتاب کے اخیر میں یہ عبارت درج ہے۔ " بعد سماعت و تصحیح مولانا حاجی عبدالوہاب خاں صاحب محدث مدظلہٗ اور حضرت مولانا حاجی حافظ وجیہ الدین خاں صاحب مدظلہٗ محدث " لیکن اس کے باوجود ترجمے کی غلطیاں اب بھی باقی رہ گئی ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں چار مثالیں اس لیے پیش کی جا رہی ہیں کہ جناب وکیل صاحب اپنے ترجموں پر نظر ثانی فرمائیں۔

ص۳۷ پر حدیث ۷۰ کے تحت فقہ الرجل او فقہ صاحبکم" کا ترجمہ کیا گیا ہے " اس شخص یا اپنے ساتھی کو فقہ سکھلاؤ"۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔

ص۱۹۵ پر حدیث ۵۰۲ کا ایک ٹکڑا یہ ہے:۔ ایما رجل ارتد عن الاسلام فادعہ" اس کا ترجمہ جناب وکیل صاحب نے یہ کیا ہے: جو مرد اسلام سے مرتد ہو جائے اسے چھوڑے رکھو" "فادعہ" کا ترجمہ "چھوڑے رکھو" بالکل غلط ہے۔ اگر فَدَ عْہُ ہوتا تو یہ ترجمہ صحیح ہوتا۔

ص۱۹۹ پر حدیث ۵۱۴ کے تحت اخذ ابن مسعود قوما ارتدوا عن الاسلام من اہل العراق" کا ترجمہ کیا گیا ہے " حضرت ابن مسعودؓ نے اہل عراق کے کچھ لوگوں کو حاصل کیا جو مرتد ہو گئے تھے۔ ان عبارتیں اخذ کا ترجمہ ...

ص۲۲۴ پر حدیث ۶۴۵ کے تحت حدیث کے ایک جملے کا ترجمہ یہ کیا ہے۔ " اگر ایسا کیا تو جنت کی نافرمانی نہیں کریں گے" جنت کی نافرمانی نہ کرنا چونکہ عجیب بات نظر آئی اس لیے وکیل صاحب نے ترجمے میں ...

ہو جائیں گے) کی عبارت بڑھائی ہے حالانکہ جو ترجمہ انھوں نے کیا ہے وہی بالکل غلط ہے ۔
بحیثیت مجموعی جناب وکیل صاحب کی یہ خدمت لائق تحسین ہے ۔

---

(۱) فرسٹ پرائمر آف اسلام } انگریزی زبان میں — ناشر
(۲) سکنڈ پرائمر آف اسلام } — بورڈ آف اسلامک پبلیکیشن دہلی

مذکورہ بالا بورڈ جس کے ماتحت انگریزی زبان کا ہفتہ وار اخبار ریڈئیس نکلتا ہے ۔ اب اس نے اپنی اسکیم کے مطابق انگریزی زبان میں کتابیں شائع کرنا بھی شروع کر دیا ہے ۔ ابھی حال میں اس نے مسلمان بچوں کے لیے زیر تبصرہ دو ابتدائی کتابیں اعلیٰ معیار طباعت کے ساتھ شائع کی ہیں ۔ بہت اچھا چکنا سفید کاغذ واضح ٹائپ ہر صفحہ سرخ چوکھٹے اور سرخ گل کاری سے مرصع اور دوسری ابتدائی کتاب میں سبز رنگ استعمال کیا گیا ہے ۔ دونوں کتابوں کا ٹائٹل بھی جاذب نظر ہے ۔ پہلی کتاب میں مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی کے فوٹو اور دوسری کتاب میں مسجد شاہجہانی دہلی اور کعبہ کے فوٹو بھی ہیں ۔ ناشر نے دیباچے میں اس صورت حال کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے مسلمان بچوں کی اسلامی تعلیم ایک مشکل مسئلہ بن گئی ہے ۔ وقت کی یہ ایک قابل لحاظ ضرورت تھی کہ انگریزی زبان میں بھی مسلمان بچوں کے لیے ایسی کتابیں شائع کی جائیں جن کے ذریعے وہ اسلامی عقائد و عبادات سے واقفیت حاصل کریں ۔ بورڈ آف اسلامک پبلیکیشن نے یہی ضرورت بہت اچھی طرح پوری کرنے کا ارادہ کیا ہے اور ابتدائی قدم کے طور پر اس نے یہ دو ابتدائی کتابیں شائع کی ہیں ۔

پہلی کتاب میں خدا ۔ اسلام کا مفہوم ۔ مسلم ۔ فرشتے ۔ آسمانی صحائف ۔ قرآن ۔ اللہ کے پیغمبر ۔ آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ۔ زندگی بعد موت ۔ کلمہ طیبہ اور چند دوسرے کلمات کے عنوانات پر مختصر اور بنیادی باتیں سکھائی گئی ہیں اور دوسری کتاب میں ایمان ۔ عبادت ۔ نماز ۔ زکوٰۃ ۔ روزہ اور حج پر بچوں کے ذہن کے مطابق باتیں لکھی گئی ہیں ۔ ناشر نے دیباچے میں انگریزی جاننے والوں اور ان کتابوں سے استفادہ کرنے والوں سے مشورے بھی طلب کیے ہیں ۔ ہم امید کرتے ہیں کہ یہ دونوں کتابیں مقبول ہوں گی اور اس سلسلے کی مزید کتابیں شائع ہو سکیں گی ۔ یہ دونوں کتابیں ریڈئیس بک ڈپو جامع مسجد دہلی ۶ سے طلب کی جا سکتی ہیں ۔ پہلی کتاب کی قیمت ۵۰ / ا ہے ۔

(ع ق)

بقیہ صفحہ ۸ اشارات

اور یہ بھی سن لیجیے کہ پولیس خود آئی نہیں تھی بلکہ مخالف عناصر کی مدد کے لیے لائی گئی تھی جو لوگ اس جلسے میں شریک تھے ان کے بیانات اخبارات میں شائع ہوئے ہیں کہ حملہ آوروں نے متعدد بار حملے کیے لیکن جماعت اسلامی کے کارکنوں نے ان کو پسپا کر دیا اور جب "بہادر حملہ آوروں" نے یہ دیکھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکیں گے تو پولیس کو لے آئے جس سے پہلے ہی سانٹھ گانٹھ ہو چکی تھی اور اب پولیس کی سنگینوں کے زیر سایہ انھوں نے اپنی بہادری کے کارنامے انجام دیے۔ یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ یہ بہادر وہ "شریف" لوگ تھے جو ٹرکوں میں بھر بھر کر خاص اسی کام کے لیے لائے گئے تھے — جماعت اسلامی پاکستان کے جنرل سکریٹری چودھری رحمت الٰہی صاحب نے ۱۸ جنوری شام کے وقت ڈھاکہ سے لاہور جو مختصر اطلاع دی تھی وہ یہ ہے :-

آج سہ پہر تین بجے ڈھاکہ کے پلٹن میدان میں جماعت اسلامی ڈھاکہ کے زیر اہتمام جلسہ عام شروع ہوا اور جماعت کے راہنماؤں نے ملکی و ملی مسائل پر تقاریر شروع کیں۔ جلسہ میں پچاس ہزار کے لگ بھگ لوگ پہنچ چکے تھے کہ ۳ ½ بجے کے قریب پلٹن میدان کی طرف شہر سے آنے والے راستے پر شرپسند عناصر نے ہلہ بول دیا۔ جماعت اسلامی کے کارکنوں اور سامعین نے حملہ آوروں کو جلسہ گاہ سے نکال دیا۔ بعد ازاں جلسہ ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ اس دوران میں مختلف اطراف سے غنڈے جنھوں نے جلسہ گاہ کی طرف آنے والے راستے روک رکھے تھے۔ پنڈال پر حملہ آور ہوتے رہے لیکن کارکنوں نے انہیں روکے رکھا ۴ بجے کے قریب نماز عصر کا وقفہ ہوا جب بیس پچیس ہزار افراد نماز عصر پڑھ رہے تھے تو غنڈوں نے بھرپور حملہ کیا لیکن پہرے پر موجود کارکنوں نے زخمی ہونے کے باوجود انہیں نمازیوں تک نہ پہنچنے دیا اور جلسہ گاہ سے باہر مار بھگایا۔ دو گھنٹہ تک جلسہ کی کارروائی باقاعدہ جاری رہی اور حملے ہوتے رہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو ۴ ½ بجے تقریر کرنے کے لیے جلسہ گاہ میں پہنچنا تھا۔ اس سے قبل ۴ ½ بجے پولیس نے آکر جلسہ گاہ کی حفاظت کا ذمہ لیا اور کارکنوں کو مدافعت سے روک دیا گیا۔ اس کے بعد پولیس کی آنکھوں کے سامنے کھلے دروازوں سے ہزاروں مسلح افراد جلسے کے نہتے اور پرامن سامعین پر اچانک حملہ آور ہو گئے۔ یہ شیخ مجیب اور مولانا بھاشانی کی حمایت میں نعرے لگاتے ہر طرف بھاگ رہے تھے اور لاٹھیوں اور دوسرے ہتھیاروں سے ہر طرف تباہی مچا رہے تھے اس سے جلسہ جاری رکھنا ممکن نہ رہا اور ان سیاسی غنڈوں کے ہاتھوں چار پانچ سو افراد زخمی ہو گئے اور پولیس [illegible] کے باوجود کچھ

کی جان کو خطرہ لاحق ہوگیا۔ سیکڑوں طلبا و شہری زخمی حالت میں ہسپتال پہنچائے گئے۔ اس غنڈہ گردی کے نتیجے میں جماعت اسلامی کے دو کارکن جاں بحق ہوگئے اور سیکڑوں مجروح حالت میں ہسپتال میں زیر علاج ہیں (ایشیا لاہور)

جناب جیلانی بی اے نے ڈھاکہ میں بیٹھ کر جو روداد قلم بند کی ہے اس کی بھی چند سطریں پڑھیے:

"اب جو بھی کارروائی ہوئی وہ پولیس کی موجودگی میں اس کی آنکھوں کے عین سامنے۔ گویا اس کی رضا سے ہوئی۔ غنڈوں نے پہلے پریس گیلری کو توڑا۔ پھر اسٹیج کو دیا سلائی دکھا دی۔ اسٹیج پر پاکستان کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اسٹیج کی پیشانی پر لا الٰہ الا اللہ کا بڑا کپڑا لٹک رہا تھا۔ ڈوبنے والے سورج کے آخری تاران پر لرز رہے تھے۔ آگ کے اٹھتے ہوئے شعلوں نے ان کو اور تاباں کر دیا۔ آگ بڑی سرعت سے پھیل رہی تھی اس میں پاکستان کا پرچم بھی غائب ہوگیا اور لا الٰہ الا اللہ کا بینر بھی۔ جب شعلے یہ سب کھا چکے تو پھر ان کی زبان مسجد کے پچھواڑے کو چاٹنے لگی۔ (ایشیا لاہور)

یہ ان حالات کی معمولی سی جھلک ہے جن سے آج کل پاکستان گزر رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے اجتماع میں ہنگامے کے بعد بھی اب تک یہ چیز رکی نہیں ہے۔ پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی (پی ڈی پی) کے جلسے میں اس کے بعد بھی ہنگامہ ہوا ہے۔ ۱۸ جنوری کو ڈھاکہ المیہ کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے جنرل یحییٰ خان سے پوچھا تھا۔

ڈھاکہ میں آج جو کچھ ہوا ہے اس کے بعد میں جنرل یحییٰ خان صاحب سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مارشل لا ریگولیشن ۶۰ کس غرض کے لیے نافذ کیا گیا تھا اگر اس ریگولیشن کے بعد بھی غنڈہ گردی ہی کو ملک کے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے اور قیام امن کی کوئی ذمہ داری مارشل لا کے حکام کو انجام نہیں دینی ہے تو آخر ملک کے مستقبل کا کیا ہوگا؟ (ایشیا)

پاکستان کی نوکر شاہی کو ایک ڈکٹیٹر کے زیر سایہ آمریت کی جو چاٹ لگی ہے وہ جمہوریت کے لیے ایک بڑی رکاوٹ بن چکی ہے اس رکاوٹ کو دور کیے بغیر یہاں کوئی جمہوری نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اخبارات لکھ رہے ہیں کہ اگر انتظامیہ لاعلاج ہو چکا ہے تو انتخابات فوج کے زیر نگرانی کرائے جائیں۔ اس وقت اگر پاکستان کے باشندے ایک بڑی آزمائش کا سامنا کر رہے ہیں تو جنرل یحییٰ خان کی آزمائش بھی چھوٹی نہیں ہے وہ اگر پاکستانی عوام کو اقتدار منتقل کرنے میں مخلص ہیں تو انہیں آزادانہ و غیر جانبدارانہ انتخابات کا پوری سختی کے ساتھ انتظام کرنا ہوگا اور اس کے بعد ۱۲۰ دن میں آئین سازی کے معاملے میں بھی اپنا پورا تعاون دینا ہوگا۔ دنیا ان کے خلوص اور اعلانات کو اس طرز عمل سے

چاہیے کی جو وہ اس نازک موقع پر اختیار کریں گے۔

علاقائی تعصب اور کمیونسٹوں کی "سرخ جنت" کے پروپگینڈے میں بڑی کشش ہے کیونکہ اس سے انسان کی حیوانیت اور نفسانیت کو لذت ملتی ہے لیکن اس کے باوجود مغربی پاکستان کی طرح، مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کی اکثریت بھی نہ علاقائیت کے جال میں پھنسی ہے اور نہ سرخ جنت پر فریفتہ ہوئی ہے وہ اپنی بے عملی اور بدعملی کے باوجود اب تک اسلام اور اسلامی نظام ہی کو پسند کرتی ہے اور اس کے خلاف کسی دوسرے نظام کو ووٹ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے مجیب الرحمٰن اور بھاشانی دونوں اس سے واقف ہیں۔ جہاں تک بھاشانی کا تعلق ہے، وہ انتخابات کے کھکھیڑ میں پڑنا ہی نہیں چاہتے وہ جانتے ہیں کہ اشتراکی نظام کہیں بھی آزادانہ انتخابات کے ذریعے قائم نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ یہ نظام فطرت انسان کی عین ضد ہے۔ ۱۹۶۹ء میں جبکہ ایوب خاں کے اقبال کا سورج ڈوب رہا تھا اور جمہوریت، انتخابات اور حق بالغ رائے دہی کی گفتگو چل رہی تھی تو انھوں نے برملا اعلان کیا تھا کہ ان کی پارٹی نہ انتخابات میں حصہ لے گی اور نہ اسے منعقد ہونے دے گی۔ وہ پولنگ بوتھوں میں آگ لگا دے گی اب اس وقت اس مسئلے میں خود ان کی پارٹی کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا ہے اس وقت تک جبکہ یہ سطریں لکھی جا رہی ہیں ان کی پارٹی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان نہیں کیا ہے اور نہ یہی ظاہر کیا ہے کہ وہ حصہ نہیں لے گی۔ البتہ مجیب الرحمٰن صاحب کے بارے میں بڑی غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ جب سے تناسب آبادی کے لحاظ سے انتخابات کا اعلان ہوا ہے وہ وزیر اعظم بن جانے کا خواب دیکھنے لگے ہیں۔ امید یہی ہے کہ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ سوال صرف یہ ہے کہ کیا فی الواقع پاکستان میں آزادانہ و غیر جانبدارانہ انتخابات منعقد ہو سکیں گے۔

Monthly 'ZINDGI' Rampur, March 1970, Regd. No. L-680

تاریخ ابن خلدون

حصہ ششم — غزنوی اور غوری سلاطین

سلطان محمود غزنوی اور ہندوستان میں پہلی سلطنت کے بانی شہاب الدین غوری کی فتوحات کے مستند حالات —

صفحات ۵۶۸ — قیمت صرف ۱۵ روپے

حصہ ہفتم — سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین اور فتنۂ تاتار—

سلجوقی اور خوارزم شاہی خانوادوں کے حالات و کوائف' خانہ جنگیں' عیسائیوں کا مقابلہ' قفار کرج اور قفچاق کی جد و جہد' ترکوں کی یورش' تاجداران سلجوقیہ اور سلوک خوارزم کی مدانعانہ کوششیں' چنگیز خاں کا خروج' تاتاریوں کا عالمگیر طوفان- ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی کی عبرتناک داستان—

قیمت صرف ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ—

مکتبہ زندگی و کانتی - رامپور - یو۔پی

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

رامپور

فی پرچہ ۸۰ پیسے

سالانہ آٹھ روپے

ماہنامہ

زندگی رامپور

(مدیر: سید احمد قادری)

سالانہ چندہ		سالانہ چندہ
ہندوستان سے -/۸		غیر ممالک سے
پاکستان سے -/۸		۱۲ شلنگ
ششماہی		ہوائی ڈاک سے
ہندوستان سے -/۴		۴۰ شلنگ
پاکستان سے -/۴		
فی پرچہ: ۸۰ پیسے		

جلد:- ۴۴ | محرم الحرام ۱۳۹۰ھ مطابق اپریل ۱۹۷۰ء | شمارہ: ۴

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر ماہنامہ زندگی رامپور یوپی

مالک۔ جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر۔ سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر۔ احمد حسن۔ مطبع۔ روہیلا پرنٹنگ پریس رام پور یوپی
مقام اشاعت:۔ دفتر زندگی رام پور یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

اس دفعہ لوک سبھا میں صدر جمہوریہ ہند کے خطبہ پر پانچ دن کی بحث کے بعد وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جو جوابی تقریر کی وہ بڑی زوردار اور پر جوش تھی۔ جن سنگھ نے پہلے تو صرف مسلمانوں کو ہندیانے کا نعرہ بلند کیا۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی کہ اس پر زیادہ واویلا مچانے کی ضرورت پڑتی کیونکہ ہندوستان کے ہر باشندے کو یہ پیدائشی حق حاصل ہوگیا ہے کہ وہ یہاں کے مسلمانوں کے خلاف جو کچھ چاہے، کہے، اس کی کوئی گرفت نہیں ہے لیکن مشکل یہ آپڑی کہ اب جن سنگھ نے ہندیانے کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے اور اس کی لپیٹ میں وہ تمام لوگ بھی آگئے ہیں جو سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے لگا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض جن سنگھیوں کی گستاخی اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ خود وزیر اعظم کو ہندیانے کی بات کرنے لگے ہیں۔ جن سنگھ کا یہ نعرہ سوشلزم کی راہ کا روڑا بھی بن سکتا ہے۔ اس لیے وہ لوگ جو اپنے آپ کو ترقی پسند سمجھ رہے ہیں اس پر بہت واویلا مچا رہے ہیں۔ وزیر اعظم بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ اس جن سنگھی نعرے کی تردید فرما رہی ہیں۔ لوک سبھا کی جوابی تقریر اس نعرے کے خلاف جوش سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں اس کے چند اقتباسات پیش کیے جا رہے ہیں۔

۴ مارچ۔ وزیر اعظم نے کہا کہ صدر جمہوریہ نے اپنے خطبے میں کہا ہے کہ ہندوستان کے مسائل بالکل ہندوستانی طرز سے حل کیے جانے چاہئیں لیکن مسٹر اٹل بہاری باجپئی مسلمانوں کے ہندستانیانے کی بات کرتے ہیں۔ اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ہندوستانی اپنے ملک سے محبت کرے تو اس کے بارے میں کوئی جھگڑا نہیں لیکن اگر اس نظریے میں تخصیص کی گئی ہے تو یہ بات اتنی معصومانہ نہیں ہے جتنی ظاہر کی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسٹر باجپئی اور وہ لوگ جو انہیں کی طرح سوچتے ہیں اس کا ایک خاص

مقصد ذہن میں رکھتے ہیں وہ اپنے کو اس کا جج بنانا چاہتے ہیں کہ کون ہندوستانی ہے اور کون نہیں؟ یہ بات انتہائی شرارت آمیز ہے ...... انھوں نے کہا دراصل یہ نعرے محض رجعت پسندی کو چھپانے کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ انہیں بے نقاب کیا جانا چاہیے ..... انھوں نے کہا میرے نزدیک ہر وہ بچہ جو ہندوستان میں پیدا ہوا ہے۔ ہندوستانی ہے۔ انھوں نے نعرہ ہائے تحسین کی گونج میں کہا کہ اگر کوئی شخص ملک کے ساتھ بے وفائی کرتا ہے تو غداروں کی سزا کے لیے قانون موجود ہے اور ایسے لوگوں کو عدالت مجاز سماعت کے بعد سزا دے سکتی ہے لیکن ہندوستانی ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کسی پارٹی یا گروہ کی صوابدید پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

قومی آواز لکھنؤ ۶ مارچ ۱۹۷۰ء

وزیراعظم کی یہ بات اتنی معقول ہے کہ جن سنگھ بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک جن سنگھی ممبر نے ان کے جواب میں کہا کہ ہندیانے کا مطلب ہندوستانی کلچر ہے۔ اس پر انھوں نے پوچھا کہ کیا معزز ممبر اس کے فیصلے کے لیے کوئی عدالت ذہن میں رکھتے ہیں یا ان کا خیال ہے کہ یہ کام ان کی پارٹی کے سپرد کر دیا جائے۔

اس سلسلے میں وزیراعظم کی تقریر بڑی واضح مدلل اور معقول ہے لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے جمہوریت اور سوشلزم رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہ واضح ہے اور نہ مدلل بلکہ ہندیانے کے سلسلے میں جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کے بالکل برعکس ہے۔ انھوں نے ایک بات تو یہ کہی ہے کہ جمہوریت، سوشلزم اور سیکولرزم کے بغیر بے معنی ہے اور دوسری بات یہ کہی ہے کہ جو لوگ اس کی مخالفت کر رہے ہیں وہ رجعت پسند ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا:

گزشتہ چند ماہ کے دوران جو واقعات رونما ہوئے ہیں ان کا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک طرف ترقی پسند جمہوری طاقتیں اور دوسری طرف رجعت پسند عناصر اکٹھا ہوتے جا رہے ہیں۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سوشلزم کا جمہوریت سے کیا تعلق ہے؟ دنیا کے نقشے پر کوئی ایک ملک بھی ایسا نہیں ہے جہاں جمہوریت اور سوشلزم یکجا ہوں۔ یہ نظام جہاں بھی آیا ہے غیر جمہوری طریقوں سے آیا ہے اور جہاں بھی قائم ہے غیر جمہوری طریقوں سے قائم ہے۔ سوشلزم پر ایمان رکھنے والے ایک اردو روزنامے کے اداریے میں میں نے پڑھا کہ: جمہوریت اور ڈکٹیٹرشپ میں وہی رشتہ ہے جو آگ اور پانی میں ہے اور دونوں کو ساتھ

ساتھ رکھا نہیں جا سکتا ہے ۔" میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ٹھیک یہی بات سوشلزم پر بھی صادق آتی ہے ۔ جمہوریت اور سوشلزم میں بھی آگ اور پانی ہی کا رشتہ ہے اور آج تک یہ دونوں کہیں کسی ملک میں بھی یک جا نہیں ہو سکے ہیں ویسے کہنے کو تو ہٹلر اور مسولینی بھی اپنے نظام کو جمہوری ہی کہتے تھے اور ماؤزے تنگ کے خیال میں آج دنیا کا سب سے بڑا جمہوری ملک سرخ چین ہے

وزیر اعظم نے اپنی تقریر میں "ہندوستانی" کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ہر بچہ جو ہندوستان میں پیدا ہوتا ہے وہ ہندوستانی ہے اسی طرح یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ سوشلزم کیا ہے اور ترقی پسندی و رجعت پسندی کسے کہتے ہیں اور اس کا فیصلہ کون کرے گا ؟ کیا معزز وزیر اعظم اس کے فیصلے کے لیے کوئی عدالت ذہن میں رکھتی ہیں یا ان کا خیال ہے کہ یہ کام ان کے یا ان کی پارٹی کے سپرد کر دیا جائے ؟ —— انسان کی یہ عجیب و غریب کمزوری ہے کہ دوسروں کے کسی دعوے کو صحیح یا غلط ثابت کرنے کے لیے جو معقول روش اختیار کرتا ہے وہ اپنے کسی دعوے کے وقت بالکل فراموش کر دیتا ہے اور اس کے اپنے دعوے کے لیے دلیل صرف اس کی زبان اور اس کی طاقت ہوتی ہے ۔ عوام کی بھیڑ کو سبز باغ دکھا کر اپنے ساتھ ملا لیجیے ۔ پھر آپ کا ہر دعویٰ ثابت ہے ۔

—— (۲) ——

اس سال درس گاہ جماعت اسلامی ہند رام پور کے "تعلیمی ہفتہ" کے پروگرام کے ساتھ ایک مزید تقریب کا اضافہ ہو گیا تھا ۔ بورڈنگ میں رہنے والے طلبہ کے لیے ایک جدید دارالاقامہ کی تعمیر مکمل ہوئی تھی اور اس کے افتتاح کے لیے مملکت سعودی عربیہ کے محترم سفیر کو زحمت دی گئی تھی جسے انھوں نے اپنی مصروفیتوں اور مشغولیتوں کے باوجود قبول کر لیا تھا ۔

۴ مارچ ۷۰ء کو فضیلت مآب شیخ انس یوسف یاسین (سفیر سعودی عرب) رام پور تشریف لائے اور دارالاقامہ کا افتتاح فرمایا ۔ اس موقع پر مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند نے عربی میں ایک خطبۂ استقبالیہ پڑھا تھا ۔ اس کا اردو ترجمہ چھپوا لیا گیا تھا اور اصل عربی خطاب سے پہلے حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا تھا ۔ ہمارے سامنے وہی اردو ترجمہ ہے ۔

حمد و صلوٰۃ، سلام تحیۃ الاسلام اور صاحب السعادۃ سفیر محترم کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا

> اس وقت ہمارے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ ہم عالی جناب کا شکریہ ادا کریں وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جناب باری میں حمد و ثنا کے گلہائے عبودیت کا نذرانہ پیش کریں ۔ یہ اللہ ہی کا احسان ہے کہ اس نے ہم لوگوں کو اسلامی اخوت اور دین کے رشتے میں مربوط کر کے ایک امت بنا دیا اور ہمارے اندر اتحاد

واتفاق کی وہ روح پیدا کی جو ایک جسم کے اعضاء میں نظر آتی ہے۔ اگر جسم کے کسی حصے میں تکلیف ہو تو پورا جسم بے قرار ہو جاتا ہے اور آنکھوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔"

مولانا نے یہ لکھ کر ہم سب کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ تعلیم یاد دلائی جس میں آپ نے مسلمانوں کو "جسم واحد" کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ عالی جناب شیخ انس جس مملکت کے سفیر ہیں اس موقع پر اس کے بیدار مغز سربراہ کی یاد بھی آئی جو اپنے ملک کو جدید و قدیم تعلیم سے آراستہ کرنے کی طرف خاص توجہ دے رہے ہیں۔ مولانا نے فرمایا۔

"ہمیں اس بات کی نہایت خوشی ہے کہ سعودی عرب کے سربراہ الملک فیصل کو دین اور اس کی تعلیمات کی اشاعت اور کتاب وسنت پر عمل درآمد کی دعوت دینے سے خاص دلچسپی ہے اور چار پانچ سال قبل میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ شاہ کے حسن توجہ کی بنا پر گزشتہ چند سالوں میں سعودی عرب نے تعلیمی میدان میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ چنانچہ وہاں کثرت سے مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں جن میں ایک اہم یونیورسٹی جس سے تمام دنیا کے مسلمانوں کو نفع پہنچ رہا ہے۔ مدینہ یونیورسٹی ہے جہاں ہر خطے سے مسلمان طلبہ پہنچ رہے ہیں اسی طرح یہ بات بھی ہمارے لیے بڑی خوش آیند ہے کہ شاہ فیصل اسلامی اخوت کو مضبوط بنانے اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کی طرف بھی متوجہ ہیں اور اسی کا یہ اثر ہے کہ شرق اوسط میں جو المیہ مسلمانوں کو پیش آیا ہے اس سے ان کو سخت قلق اور اضطراب لاحق ہوا جو ان کی اس تقریر سے بھی واضح ہے جو ابھی حال میں حج کے موقع پر حاجیوں کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمائی۔ شاہ، مسلمانوں کو ان مصائب سے نجات دلانے کے لیے جو کوششیں کر رہے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان کے وجود کو باعث خیر و رحمت بنائے اور ان کو ان کی نیک خواہشات میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین!"

اس وقت دنیا کے نقشے پر متعدد مسلمان ملک نظر آتے ہیں لیکن ان تمام ملکوں میں صرف سعودی عرب کو یہ سعادت اور شرف حاصل ہے کہ وہاں شرعی قوانین نافذ ہیں اور اس کے نتیجے میں وہ دنیا کا سب سے زیادہ پرامن ملک بنا ہوا ہے۔ اس پہلو سے بلاشبہ وہ ان تمام لوگوں کی تائید کا مستحق ہے جو دین اسلام پر یقین رکھتے اور شرعی قوانین کی تنفیذ کو ایک اہم دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ شاہ فیصل، حرمین شریفین کے خادم اور کتاب وسنت پر عمل کے داعی اور مبلغ ہیں۔ ہم اسی حیثیت سے ان کا احترام اور ان کی تائید کرتے ہیں۔ بادشاہت کو ہم صحیح نہیں سمجھتے لیکن ایسا بادشاہ جو اپنے ملک میں امن وامان قائم اور شرعی قوانین نافذ کرے ہمارے نزدیک اس مسلمان صدر جمہوریہ سے

لاکھ گنا بہتر ہے جس نے مسلمان ملک میں غیر اسلامی قوانین نافذ کر رکھے ہوں اور جس کے زیر سایہ الحاد پروان چڑھ رہا ہو شاہ فیصل اور ان کی سرگرمیوں کا ذکر کرنے کے بعد امیر جماعت اسلامی ہند نے اپنے خطبے میں تعلیم کے مسئلے پر روشنی ڈالی :-

دنیا کے احوال و ظروف پر جن لوگوں کی نگاہ ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ الحادی اور مادی قوتیں دنیا کی کس طرح رہنمائی اور سربراہی کر رہی ہیں ؟ اسی طرح یہ بات بھی واضح ہے کہ ان کی قوت وحیات کا سرچشمہ ان کا نظام تعلیم و تربیت ہے ۔ انہیں اسی سے زندگی و توانائی ملتی ہے ۔ نیز اس پہلو سے سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام تعلیم میں کوئی جوہری فرق بھی نہیں ۔ یہ دونوں ہی ایک ایسے زہریلے درخت کی شاخیں ہیں جسے الحاد اور مادہ پرستی کے پانی سے سینچا جاتا ہے اسی لیے ان دونوں کے نظام ہائے تعلیم و تربیت میں جزوی اختلاف اور تفاوت کے باوجود یکساں نتائج برآمد ہو رہے ہیں ۔ نتائج کے لحاظ سے دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے ۔ دونوں ہی نئی نسل کی تعلیم و تربیت کے لیے تعلیمی میدان میں اسی ٹیڑھی راہ پر چلتے ہیں جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے ۔ پھر یہی نئی نسل ان تعلیمی اداروں سے نکل کر دنیا کی باگ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہے تمام کاموں کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر آتی ہے جس کا نتیجہ اخلاقی زوال اور انتشار کی شکل میں سامنے آ رہا ہے ۔ دلوں کا اطمینان عنقا ہو گیا ہے ۔ دنیا تباہی کے جہنم کے کنارے پہنچ گئی ہے ۔ یہ سب کچھ دین اور اس کی تعمیری بنیادوں سے انحراف کا نتیجہ ہے تعمیر سیرت و کردار کی دینی بنیادوں کو آج ماضی کی فرسودہ بات سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہے اور ان کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ عصر حاضر کے تقاضوں سے میل نہیں کھاتیں چنانچہ پروردگار کی معصیت، آخرت کا تمسخر اور اسی قبیل کی دوسری باتیں ہماری روزانہ کی زندگی کا معمول بن گئی ہیں جنہیں چشم سر سے دیکھا جا سکتا ہے

اس کے بعد مولانا نے اس بات پر اظہار افسوس کیا ہے کہ ہندوستان آزادی کے بائیس سال گزر جانے کے بعد اب بھی مغرب کی فکری غلامی میں جکڑا ہوا ہے اور ایک مذہبی ملک ہونے کے باوجود اس کا نظام تعلیم مغربی نظام تعلیم کا چربہ ہے ۔ تعلیم کے پہلو سے اپنے ملک کے حالات کا مختصر تجزیہ کرنے کے بعد مولانا نے لکھا ہے ۔

ان حالات میں پوری قوم کو عموماً اور مسلمانوں کو خاص طور سے مغرب کی اس مادی تہذیب و ثقافت کے مفاسد سے بچانا وقت کی ایک ایسی اہم ضرورت ہے جس کا اندازہ ہر شخص لگا سکتا ہے ۔ نئی نسل میں اس کے جو نتائج ظاہر ہو رہے ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اصلاح حال کے لیے بڑی سے بڑی قربانی سے

بھی دریغ نہ کیا جائے ورنہ جب تک یہ اصلاح نہ ہوگی تب تک صرف مادی ترقی اور ظاہری بلندی ملک کو حقیقی خوش بختی اور خوش حالی کی منزل پر نہ پہنچا سکے گی اور اگر مسلمان خدانخواستہ ان تباہ کن نتائج سے اپنے آپ کو محفوظ نہ کرسکے تو بحیثیت مسلمان کے ان کے لیے اپنے وجود کو باقی رکھنا بھی دشوار ہوجائے گا چہ جائیکہ وہ اپنے پیغام سے دنیا کو روشناس کرائیں اور اپنی ذمہ داریوں کو باحسن وجوہ انجام دیں۔"

درس گاہ جماعت اسلامی رام پور کے بارے میں مولانا نے فرمایا:۔

یہ چھوٹی سی درس گاہ اس لائق ہے کہ اسے ایک بڑی دانش گاہ سمجھا جائے۔ دراصل یہ ایک خاص نظام تعلیم و تدریس کی کڑی ہے جس کی زمانے کو آج سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس سے پورا ملک فائدہ اٹھا سکتا ہے اور خاص طور سے مسلمانوں کے لیے تو اس کی اہمیت اور ضرورت ہوا اور پانی سے بھی زیادہ ہے۔ یہی وہ واحد نظام تعلیم ہے جو ہندوستان میں ان کے بحیثیت مسلمان باقی رکھنے کا ضامن ہوسکتا ہے۔ اسی سے وہ اس لائق ہوسکتے ہیں کہ اپنے پیغام کو لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اپنے فرائض کو ادا کرسکیں اور بحیثیت مسلمان ان کے کندھوں پر اعلان حق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں ہیں انہیں ادا کرسکیں۔

تعلیم کے میدان میں جماعت اسلامی ہند جو کچھ کرتی رہی ہے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

جماعت اسلامی نے پہلے دن ہی سے اس ضرورت کو اپنے سامنے رکھا ہے چنانچہ وہ دیگر میدانوں میں اپنی سرگرمیوں کے ساتھ تعلیم و تربیت کے میدان میں بھی پوری توجہ صرف کرتی ہے۔ اس سلسلے میں اس کی کوشش کے دو پہلو ہیں

اول۔ ملک کے تمام باشندوں کو موجودہ نظام تعلیم و تدریس کے مفاسد کی طرف متوجہ کرنا اور مذہب و اخلاق کی بنیاد پر نظام تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں لانے پر آمادہ کرنا۔

ثانی۔ مسلمانوں کو ایک ایسے نظام تعلیم و تدریس سے متعارف کرانا جو انہیں ان کے دین سے مربوط کردے اور انہیں اس لائق بنادے کہ وہ مسلمان کی طرح زندگی گزار سکیں، اپنی ذمہ داریوں کو بحیثیت مسلمان کماحقہ ادا کرسکیں۔ اسی طرح یہ نظام تعلیم و تدریس ایسا ہونا چاہیے جو انہیں عصری علوم سے بھی آگاہ کرسکے۔

مولانا نے "درسی کتب" اساتذہ کی تعلیم و تربیت" ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں بھی موجودہ صورت حال

اور آئندہ کے ارادوں کا ذکر کیا۔

سعودی عرب کے سفیر صاحب السعادہ شیخ انس یوسف یاسین نے عربی میں لکھی ہوئی ایک جامع تقریر پڑھ کر سنائی ——— انھوں نے بعثت نبوی سے پہلے جزیرۃ العرب کے تاریک ماحول کا مختصر لفظوں میں نقشہ کھینچا۔ اور پھر یہ دکھایا کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی تعلیم و تربیت نے کس طرح اس ظلمت کدہ کو بقعۂ نور بنایا قرآن کے انقلاب آفریں پیغام نے اس کی کایا پلٹ دی۔ اس سرزمین سے علم و حکمت کا ایک ایسا چشمہ پھوٹا جس نے دنیا کے ایک بڑے خطے کو سیراب کیا۔ محترم سفیر نے بتایا کہ اسلام میں علم کا مقام اس پہلی وحی سے معلوم ہوتا ہے جو غار حرا میں محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتری تھی۔ انھوں نے سورہ علق کی ابتدائی پانچ آیتیں پڑھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مسلمان دنیا میں جہاں بھی گئے کتاب وسنت کا علم اپنے ساتھ لیتے گئے اور آج بھی دنیا کے سیکڑوں مقامات پر ان کے وہ علمی آثار موجود ہیں جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میری نظر میں علم برائے علم کوئی شے نہیں ہے۔ اگر اس کے ساتھ اس پر عمل نہ ہو۔ پھر انھوں نے عربوں کی موجودہ ہزیمت کا اعتراف کیا اور بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج وہ خود اس علم و عمل سے عاری ہو گئے ہیں جس نے ماضی میں انھیں عزت بخشی تھی۔ اس کے بعد انھوں نے شاہ فیصل کی ان سرگرمیوں کا ذکر کیا جو وہ تعلیم و تدریس کے میدان میں انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی لکھی ہوئی تقریر میں بھی اور زبانی گفتگو میں بھی جو بات بہت زور دے کر کہی وہ یہ تھی کہ ہم پر "رجعت پسندی" کا جو الزام لگایا جاتا ہے ہم اس سے ذرہ برابر کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہم فخر کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے لیے جو راہ پسند کی ہے وہ نہ شرق سے ماخوذ ہے اور نہ غرب سے۔ ہم نے اپنے لیے وہ راستہ اختیار کیا ہے جو کتاب وسنت نے ہمیں دکھایا ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ عہد جدید میں "رجعت پسندی" ایک ایسی گالی ہے جسے بہت سے علماء بھی کھانے کے لیے تیار نہیں ہیں اور محض اس گالی سے بچنے کے لیے وہ اپنی ترقی پسندی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ رجعت پسندی کا الزام لگانے والے خود ان لوگوں سے زیادہ "رجعت پسند" ہیں جن پر وہ یہ الزام لگاتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کا نام انھوں نے "رجعت پسندی" رکھا ہے اور اس کی نافرمانی کا نام "ترقی پسندی" اور یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی شیطان نے کی تھی جس نے آدم ؑ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس لیے ان "ترقی پسندوں" کا رشتہ اس عہد سے جا ملتا ہے جبکہ حضرت آدم ؑ اس دنیا میں آئے بھی نہ تھے۔

ترکِ شبہات

مولانا ابواللیث صاحب ندوی نے دورۂ حلقہ میسور کے موقع پر ہبلی میں ارکان حلقہ میسور کے ایک اجتماع میں ریاض الصالحین کے باب الورع وترک الشبہات (پرہیزگاری اور مشتبہ چیزوں کو ترک کرنا) سے حدیث کا درس دیا تھا جس کو ریکارڈ کر لیا گیا تھا لیکن ریکارڈنگ ٹھیک نہیں ہو سکی۔ متن حدیث کے بعض الفاظ اور جملے غائب ہو گئے اور مولانا کے بعض الفاظ بھی ریکارڈ نہیں ہو سکے، یا دوبارہ سننے میں سمجھ میں نہیں آسکے۔ ہم نے ریاض الصالحین سے متن حدیث کے الفاظ بھی ٹھیک کیے ہیں۔ ان کا ترجمہ بھی کیا ہے اور مولانا کے درس کو حتی الوسع مربوط کرنے کی کوشش کی ہے۔

(ادارہ)

(۱) عن النعمان بن بشير رضي الله عنهما قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول ان الحلال بين وان الحرام بين وبينهما مشتبهات لا يعلمهن كثير من الناس فمن اتقى الشبهات استبرأ لدينه وعرضه ومن وقع في الشبهات وقع في الحرام كالراعي يرعى حول الحمى يوشك ان يرتع فيه الا وان لكل ملك حمى الا وان حمى الله محارمه

نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے شک حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنہیں بہت سے لوگ نہیں جانتے تو جس نے مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنا دین اور آبرو بچالی اور جو مشتبہ چیزوں میں پڑا وہ حرام میں بھی جا پڑے گا جیسے چرواہا جو مخصوص چراگاہ کے آس پاس اپنے جانور چراتا ہے۔ قریب ہے کہ وہ جانور اس چراگاہ میں بھی چرنے لگیں۔ خبردار! ہر بادشاہ کے لیے

الا ان فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب متفق علیہ

ایک مخصوص چراگاہ ہوتی ہے۔ خبردار! اللہ کی حمی وہ چیزیں ہیں جنہیں اس نے حرام قرار دیا ہے؟ خبردار! جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ ٹھیک رہتا ہے تو سارا جسم ٹھیک رہتا ہے اور جب وہ فاسد ہوجاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہوجاتا ہے۔ خبردار! وہ لوتھڑا قلب ہے۔

(۲) عن انس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم وجد تمرة فی الطریق فقال لولا انی اخاف ان تکون من الصدقة لاکلتھا (متفق علیہ)

حضرت انس رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے راستے میں ایک کھجور پڑی پائی تو آپ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ شاید یہ صدقہ کی ہو تو میں اس کو کھا لیتا۔

(۳) عن النواس بن سمعان عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال البر حسن الخلق والاثم ماحاك فی نفسك وکرھت ان یطلع علیہ الناس (مسلم)

نواس بن سمعان رضؓ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نیکی حسن خلق ہے، اور گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم ناپسند کرو کہ لوگ اس سے مطلع ہوں

(۴) عن وابصة بن معبد قال اتیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال اجئت تسال عن البر؟ قلت نعم فقال استفت قلبك، البر ما اطمانت الیہ النفس واطمئن الیہ القلب والاثم ماحاك فی النفس وتردد فی الصدر وان افتاك الناس وافتوك

وابصہ بن معبد رضؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کیا تم نیکی کے بارے میں سوال کرنے آئے ہو؟ میں نے کہا ہاں! تو آپ نے فرمایا: اپنے دل سے پوچھو نیکی وہ ہے جس پر قلب مطمئن ہو اور گناہ وہ ہے جو دل میں کھٹک اور تردد پیدا کرے۔ اگرچہ لوگ اس کے بارے میں تمہیں (جواز کا) فتوے دیں۔

(۵) عن الحسن بن علی رضی اللہ عنھما قال حفظت من رسول

حسن بن علی رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات یاد رکھی ہے

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دع ما یریبک الیٰ ما لا یریبک (ترمذی)	آپؐ نے فرمایا جو چیز تمہیں شک میں مبتلا کرے اسے چھوڑ دو اور وہ چیز اختیار کرو جو تمہیں شک میں مبتلا نہ کرے
(۶) قال اللہ تعالیٰ وتحسبونہ هَيِّنًا وَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِيمٌ ۝	اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اور تم اسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی
وقال اللہ تعالیٰ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ	اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: بے شک تمہارا رب گھات میں ہے۔

مولانا ابواللیث اصلاحی نے پہلے دونوں آیتوں کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا۔

پہلی آیت سورۂ نور کی آیت ہے اس کا تعلق واقعۂ افک سے ہے۔ زوجۂ رسولؐ پر بہتان لگایا گیا تھا۔ یہ بات ایسی تھی کہ لوگوں کو اس کے سنتے ہی اس کے غلط ہونے پر یقین کر لینا چاہیے تھا۔ لیکن منافقین کی اٹھائی ہوئی شرارت پر بہت سے لوگ سادہ لوحی سے اس معاملے کے تمام پہلوؤں پر غور کیے بغیر اس شر میں مبتلا ہو گئے۔ انھوں نے جو کچھ سنا اس کو نشر کرنا شروع کر دیا اور اس بات کی پرواہ نہ کی کہ اس سے ایک مومنہ قانتہ کی عزت و عصمت پر حرف آتا ہے۔ اس سے خود رسولؐ کی ذاتِ اقدس معرض بحث میں آتی ہے اور اس کا نہایت ناخوش گوار اثر اس وقت کے مسلم معاشرے پر طاری ہوتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کے ضمن میں بہت سے تنبیہی کلمات ارشاد فرمائے ہیں منجملہ ان کے آیت کا ایک ٹکڑا یہ بھی ہے کہ تم لوگ اس کو بہت آسان سمجھ رہے تھے۔ درآں حالیکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی بات تھی۔ اس میں تنبیہ کی گئی ہے کہ اس طرح کے معاملات کے وقت آدمی کو سمجھ بوجھ سے کام لینے کی ضرورت ہے اور بہت سی باتیں جو بجائے خود اپنے نتائج کے اعتبار سے بہت عزیز ہوتی ہیں اگر ان کی اہمیت کو دل میں جگہ نہ دی جائے، اس کا احساس ٹھیک طور سے نہ کیا جائے اور ایک معمولی بات سمجھ کر آدمی اس میں مبتلا ہو جائے۔ اس کا نتیجہ بڑا ہی خطرناک برآمد ہوتا ہے۔ اس مفہوم کو رسولؐ نے ایک اور موقع پر بھی واضح فرمایا ہے۔ آپ نے ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ لوگ باتیں کرتے ہیں اور اس کی کوئی خاص اہمیت محسوس نہیں کرتے۔ دل ان کا اس طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں لیکن بسا اوقات باتوں میں کچھ باتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ اس کے لیے قیامت تک اجر کا ایک دروازہ کھل جاتا ہے اور اس کے برعکس ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں کہ وہ کہہ گزرتا ہے کوئی خاص اہمیت اس کے ذہن میں نہیں ہوتی

لیکن اس کا نہایت ہی خوفناک نتیجہ قیامت کے دن اس کے سامنے آئے گا۔ یہی مفہوم اس آیت کا بھی ہے کہ کچھ لوگوں نے اس واقعہ کو بہت آسان سمجھا تھا حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑا واقعہ تھا۔ گویا تنبیہ کی گئی ہے کہ آدمی کو کسی بات پر بلا تحقیق یقین نہیں کر لینا چاہیے۔

دوسری آیت میں اللہ نے ارشاد فرمایا ہے — ان ربك لبالمرصاد کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ گھات میں ہے مطلب یہ کہ آدمی جو کچھ بھی کہتا سنتا ہے عمل کرتا ہے اللہ کی نگاہوں میں وہ فعل آتا رہتا ہے۔ اس بات کا استحضار انسان کو بہت سی برائیوں سے محفوظ رکھنے والی چیز ہے۔ انسان کو اگر اس کا استحضار ہو کہ ہمارا ہر قول و فعل اللہ تعالیٰ کے علم میں آتا ہے اور اس کے رضا یا غضب کا موجب بنتا ہے تو آدمی محتاط زندگی گزارنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ اپنی گفتگو میں اور اپنے ہر عمل میں احتیاط کی روش اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے بعد رسولؐ کا ایک قول حضرت نعمان بن بشیر نقل فرماتے ہیں — انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے کہ حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے اور ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہات ہیں یعنی مطلب یہ کہ اللہ و رسولؐ کے کلام کے پیش نظر بہت سی چیزوں کے بارے میں یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ حلال ہے یا حرام، اس لیے کہ حلال یا حرام ہونے کے بارے میں واضح ہدایات یا واضح ارشادات ہیں لیکن بہت سے امور ایسے ہیں جن کے بارے میں واضح ہدایت نہیں ہے اور ظاہر ہے کسی بھی شریعت میں تمام امور کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا کہ جس کے بارے میں صراحت اور واضح شکل میں تمام باتیں بیان کر دی گئی ہوں اس لیے کہ ایسے امور کا دائرہ بہت زیادہ ہے اور شریعت کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ بیٹھ کر کے تمام چیزوں کو مختلف ضوابط کے تحت قلمبند کر دیا گیا ہو بلکہ جن چیزوں کے بارے میں سوالات پیدا ہوئے، اُن کے بارے میں واضح ہدایات دے دی گئیں البتہ ایسے معاملات کے سلسلے میں کہ دلوں میں کوئی سوال نہ اٹھ رہا ہو بے وجہ ان کو معرض بحث میں نہیں لایا گیا۔ اس لیے کہ یہ ذہن بھی کوئی سنجیدہ ذہن نہیں ہے کہ بے وجہ و بے ضرورت بہت سے امور پر غور و فکر کیا جائے اور بغیر ضرورت کے اس کے بارے میں احکام و ہدایات دے دیے جائیں بلکہ اس موقع پر اور متعدد مواقع پر رسولؐ نے لوگوں کو بے وجہ سوالات کرنے سے روکا بھی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے سوال کی وجہ ہی سے ایک چیز تم پر فرض ہو جائے۔ درآں حالیکہ اب تک اس کے بارے میں اللہ نے کوئی حکم نازل نہیں کیا ہے۔ بہرحال بہت سی چیزیں ہیں کچھ مختلف اسباب کی بنا پر ان کے بارے میں کوئی واضح ہدایات نہیں دی گئیں۔ پھر یہ واقعہ بھی ہے کہ بہت سے ایسے امور ہوتے ہیں کہ جن کے سلسلے میں واقعی ہدایات موجود ہوتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ امت کا

ہر فرد ان واضح ہدایات سے واقف ہی ہو یا واقف ہوا اس طرح سے کہ اس کو کسی طرح کا کوئی شک یا تردد پیش نہ آ سکے۔ اس لیے ایسے امور کہ جن کے بارے میں فی الواقع کوئی واضح ہدایت موجود نہ ہو یا ایسے امور کہ جن کے بارے میں واضح ہدایات موجود ہوں لیکن کسی وجہ سے کسی خاص فرد یا بہت سے افراد کے علم میں وہ ہدایات نہ ہوں اور اس بنا پر وہ شک و تردد میں مبتلا ہو جایا کرتے ہوں ایسے لوگوں کی روش ایسے امور کے سلسلے میں کیا ہونی چاہیے؟ اور کون سا رویہ تقویٰ اور مومنانہ زندگی کے مطابق ہو سکتا ہے؟ کوئی ضابطہ اور قاعدہ یا کوئی ہدایت دی جانی چاہیے تھی۔ اس لیے آپؐ نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ حلال بھی بین ہے اور حرام بھی بین ہے اور ان دونوں کے درمیان مشتبہات ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ ان کا حکم شریعت میں کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ ایسے امور کے سلسلے میں ایک مومن کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ شک و شبہہ کی بات سے دور رہے، شبہے کے ساتھ کسی فعل کو اختیار نہ کرے بلکہ ایسے مشتبہ امور سے دور رہنے اور اپنے کو بچانے کی کوشش کرے ۔۔۔ آپ نے فرمایا کہ جو شبہات سے بچے گا وہ اپنے دین کو، اپنی عزت کو بچالے گا، محفوظ کرلے گا اور جو شبہات میں پڑے گا وہ حرام میں پڑ جائے گا۔ یعنی مطلب یہ کہ ایک مومن کی روش مشتبہات سے بچنے کی ہونی چاہیے۔ مشتبہ امور میں شبہہ کے ساتھ کسی فعل کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے جس چیز کے بارے میں ذرا بھی شبہہ ہو جائے کہ دین میں اس کی گنجائش ہے یا نہیں تو مومن کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنے دین کو محفوظ رکھنے اور عزت یعنی ایک مومنانہ زندگی کی جو شان ہونی چاہیے اس کو قائم و برقرار رکھنے کے لیے وہ شبہات سے بچنے کی کوشش کرے اس لیے کہ درحقیقت اس کا انسان کی زندگی پر بڑا اثر پڑتا ہے کہ وہ ایسے مشتبہ امور کے سلسلے میں کیا روش اختیار کرتا ہے۔ اگر اس کے اندر اتنی ڈھیل ہو کہ وہ ذرا بھی کسی کام کے کرنے کی گنجائش سمجھتا ہوا دراس کا نفس پوری طرح مطمئن بھی نہ ہوا اور وہ اسے کر گزرے تو پھر رفتہ رفتہ یہ ڈھیل بہت آگے بڑھ جاتی ہے اور پھر انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے اور جو برائیوں سے بچنے کا واقعی جذبہ ہونا چاہیے وہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ روش منجر ہوتی ہے اس بات کی طرف کہ وہ پھر کھلم کھلا جو حرام کی چیزیں ہوتی ہیں ان کا بھی وہ مرتکب ہونے لگتا ہے بخلاف اس کے اگر انسان میں تقویٰ کی یہ کیفیت پیدا ہو جائے کہ شبہہ کی بات سے بھی وہ دور رہنا چاہے اور جو بات مشتبہ ہو اس سے بچنے کی کوشش کرنے لگے تو پھر اس صورت میں وہ برائیوں سے بہت زیادہ محفوظ رہے گا پھر اس کی زندگی متقیانہ اور پاکبازانہ زندگی ہو سکے گی۔ اس لیے آپ نے فرمایا ومن وقع فی الشبہات وقع فی الحرام جو

شبہات میں پڑگیا وہ حرام میں پڑگیا یعنی مطلب یہ کہ شبہات تو وہی چیزیں ہیں کہ جن کے جائز و ناجائز ہونے کے دونوں پہلو ہوسکتے ہیں لیکن ایسے امور کے عادی ہوجانے کے بعد اس کا قوی امکان ہوتا ہے کہ پھر وہ حرام کا مرتکب ہونے لگے گا۔ پھر آپ نے فرمایا۔ کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ آپ نے اس کو ایک ظاہری مثال سے واضح فرمایا کہ جیسے بادشاہوں کی متعین چراگاہیں ہوتی ہیں جو مخصوص ہوتی ہیں ان کے جانوروں کے چرنے کے لیے اور اس کی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ بادشاہ کے علاوہ کسی اور کو اس کے قریب بھی اپنے جانوروں کو لے جانے اور چرانے کی اجازت نہیں ہوتی لیکن اگر کوئی جرات کرکے اس کی چراگاہ کے قریب اپنے جانوروں کو لے جا رہا ہو تو ہوسکتا ہے کہ وہ جانور اس میں بھی منہ مارنے لگے اور اس طریقے سے اس بادشاہ کے غیظ و غضب کا موجب بن جائے جس کو وہ پسند نہ کرتا ہو۔ آپ نے اس مثال کے ذریعے فرمایا کہ دیکھو ہر بادشاہ کے لیے اپنی چراگاہیں ہوتی ہیں اور اللہ کی چراگاہ اس کے محارم ہیں۔ جن چیزوں کو اس نے حرام قرار دیا ہے اس کی حیثیت ویسی ہی ہے جیسے دنیوی بادشاہوں نے اپنی چراگاہیں متعین کرلی ہوں کہ اس کے اردگرد بھی کسی دوسرے کے گلّے کے قریب ہونے کو گوارا نہیں کرسکتا۔ اسی طریقے سے یہ محارم اللہ کی حمی ہیں۔ اللہ اس کو پسند نہیں کرسکتا کہ اس کے قریب بھی انسان جائے جس طرح سے کہ بادشاہ کی چراگاہ ہے جس میں ظاہر ہے کہ ہر وہ چیز ہوگی جس کی طرف جانور لپک سکتا ہے اور اس کے قریب پہنچ کر اس کا زیادہ امکان ہے کہ وہ اپنے کو بچا نہ سکے اور اس میں گھس پڑے۔ یہی حال اللہ کے محارم کا بھی ہے کہ جو لوگ اس کے اردگرد گھوم رہے ہوں گے، اس کے قریب سے گزر رہے ہوں گے ان کے لیے زیادہ امکان ہے کہ وہ محارم میں مبتلا ہوجائیں۔ اس لیے کہ محارم میں واقعی اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دلکشی کی کیفیت رکھی ہے اور اس کے قریب گھومنے کی صورت میں اس کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ ان حرام چیزوں کی ظاہری کشش انسان کو اپنی طرف متوجہ کرلے اور اس میں وہ مبتلا ہوجائے۔

پھر آپ نے فرمایا ـــــ جسم میں ایک ٹکڑا ہے اگر وہ ٹھیک ہوجائے تو پورا جسم ٹھیک ہوسکتا ہے اور اگر وہ خراب ہوجائے تو پورا جسم خراب ہوسکتا ہے اور آپ نے فرمایا کہ وہ قلب ہے ـــ درحقیقت انسان کی تمام ترشقاوت و سعادت اس کے اچھے یا برے ہونے کا دارومدار دل کی صفائی ستھرائی اور اس کی اچھی حالت پر باقی اور قائم رہنے ہی میں ہے۔ انسان اپنے دل کو جتنا زیادہ پاکیزہ بنانے کی کوشش کرے گا اس کو ٹھیک حالت پر قائم رکھنے کی کوشش کرے گا تو اس کے تمام اعضاء و جوارح پر اس کے اثرات ظاہر ہوں گے ـــ اگر دل میں فساد ہو تو پھر اس صورت میں اس کی آنکھ اور کان اور تمام اعضاء و جوارح طرح طرح

کی برائیوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔ درحقیقت اصلاح کا تمام تر دارومدار پورے جسم میں قلب کی اصلاح ہے
قرآن مجید میں آپ دیکھیں گے کہ ایمان، تقویٰ اور احسان ان سب کا تعلق دل کی صلاح سے ہے۔ بخلاف
اس کے کفر اور شرک، نفاق اور حسد وبغض یہ ساری چیزیں جو روحانی قسم کے امراض ہیں ان سب کا ذکر فساد
قلب اور امراض قلب ہی کے طور پر کیا گیا ہے۔ ان سب برائیوں سے نجات کی شکل یہی ہے کہ دل کو اپنے
صاف رکھا جائے اور اگر وہ کسی مرض میں مبتلا ہو گیا تو اس مرض کے ازالے اور دفعیے کی کوشش کرے
اس طرح کے تمام امراض کی علامات قرآن وسنت میں واضح کر دی گئی ہیں اور علاج بھی بتا دیا گیا ہے۔ بہرحال
انسان کے لیے قلب کی اصلاح یا درستگی کی فکر سب سے مقدم کام ہے اور اس چیز کا تعلق درحقیقت قلب ہی سے ہے

عن انس ان النبی وجد تمرۃ فی الطریق حضرت انسؓ روایت فرماتے ہیں کہ رسولؐ
نے کھجور کا ایک ٹکڑا یا دانہ راستے میں پڑا ہوا پایا تو آپ نے فرمایا۔

لولا انی اخاف ان تکون — اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقے کا
من الصدقۃ لاکلتھا — دانہ ہے تو میں اسے کھا لیتا۔

اس حدیث کا منشا تو درحقیقت یہ ہے کہ رسولؐ اس کی تلقین فرمانا چاہتے ہیں کہ جو گری پڑی چیزیں ہوں
اور وہ کھانے کے استعمال میں آسکتی ہوں تو یونہی چھوڑ نہ دینا چاہیے۔ یہ درحقیقت ایک طرح کا کبر کا رویہ
ہوگا کہ محض کسی چیز کے گر جانے کی وجہ سے اگر وہ قابل استعمال بھی ہے تو بھی ہم اسے چھوڑ دیں۔ دیگر بہت سی
احادیث سے بھی اس کا یہی مفہوم نکلتا ہے — آپ نے فرمایا کہ اگر کھانے پینے کی کوئی چیز گر پڑی
ہو تو اسے اٹھا لینا چاہیے اور گرد و غبار اگر اس میں لگی ہو تو صاف کر کے اسے استعمال میں لانا چاہیے۔ حدیث
کا اصل منشا تو درحقیقت یہی ہے لیکن اس باب میں کہ جس میں یہ دکھانا مقصود ہے کہ ایک متقیانہ زندگی کس چیز
کا نام ہے اور شبہات سے بچنا اس سلسلے میں کتنا ضروری ہے اس کے ثبوت کے طور پر یہ روایت یہاں نقل کی
گئی ہے یعنی اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس متقیانہ طرز عمل کو واضح کرنا مقصود ہے کہ محض اس بنا پر
کہ وہ کھجور کا دانہ صدقہ کا نہ ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جائز نہیں تھا محض اس اندیشے کی بنا پر
آپ کھانے کے لیے اٹھانے کے روادار نہ ہوئے۔

وعن النواس بن سمعان — حضرت نواس بن سمعانؓ سے روایت ہے کہ
عن النبیؐ قال البر حسن — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ تقویٰ

الخُلق　حُسنِ خلق کا نام ہے

اس مختصر جملے کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ حسن خُلق کا دین میں بڑا مقام ہے بلکہ اصلی نیکی درحقیقت حسن خلق ہی کا نام ہے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا طرز اختیار کرنا ان کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آنا، اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرنا یہی درحقیقت نیکی ہے۔

آپ نے فرمایا ـــ والاثم ما حاك فی نفسك (ایک ظاہری علامت اور پہچان آپ نے بتائی) کہ گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کرے اور تم اسے برا سمجھو کہ لوگ اس پر مطلع ہو جائیں۔ اگر کسی کے پاس علم دین نہ ہو یا اسے یہ سہولت بھی حاصل نہ ہو کہ وہ کسی چیز کے ثواب یا گناہ ہونے کے بارے میں استفسار کرسکے تو آپ نے اس کا ایک پیمانہ بتایا کہ ہر وہ بات کہ جو تمہارے دل میں کھٹک پیدا کر رہی ہو جسے تم محسوس کر رہے ہو اور تم اسے پسند نہ کرتے ہو کہ اس کام کو کرو اور لوگ اسے دیکھیں۔ بلکہ تم اسے برا سمجھتے ہو کہ لوگ اس سے واقف ہو سکیں تو ایسی بات جس کے سلسلے میں تمہارے دل میں تردد پیدا ہوا اور اس کے بارے میں تمہارا یہ خیال ہو کہ یقیناً وہ کوئی بری چیز ہے۔ اسی بنا پر تم یہ پسند نہیں کرتے ہو کہ لوگ اس سے واقف ہو سکیں تو ایسی باتوں کے سلسلے میں تمہاری روش یہ ہونی چاہیے کہ سرے سے اس کے قریب بھی نہ جاؤ۔ ہر وہ بات کہ جس میں انسان کو یہ اندیشہ ہو کہ اللہ نے اسے جائز نہیں قرار دیا ہے اور یہ اندیشہ بھی اس درجے کا ہو کہ پھر تم ساتھ ہی یہ بھی پسند نہ کرتے ہو کہ لوگ اس سے واقف ہو سکیں کہ تم نے اس بات کا ارتکاب کیا ہے تو ایسی باتوں کو دیکھ کر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ چاہے دین میں اس کی گنجائش ہی کیوں نہ نکلتی ہو لیکن پھر بھی وہ بات ایسی نہیں ہے کہ اپنے دل کی اس حالت کے ساتھ ساتھ تم اس فعل کے مرتکب ہو۔ اس کھٹک کے پیدا ہونے کے بعد ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس کو اختیار نہ کرو اگرچہ مفتیوں کے نزدیک وہ جائز ہی کیوں نہ ہو لیکن تمہارے دل میں اگر اس کے سلسلے میں کھٹک ہے تو پھر تمہیں اس سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہی ایک مومن کی شان ہے۔

ایک دوسری روایت حضرت وابصہ بن معبدؓ کی ہے کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا کہ تم آئے ہو تاکہ نیکی کے بارے میں سوال کرو تو انھوں نے کہا کہ ہاں۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر انکشاف ہو گیا کہ وہ آئے ہیں سائلانہ حیثیت سے اور غالباً وہ بر کے بارے میں ہی سوال کرنا چاہتے ہیں۔ واقعہ بھی ایسا ہی تھا وہ بر کے بارے میں سوال کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ اپنے دل سے تم پوچھو۔ بر وہ ہے کہ جس پر نفس کو اطمینان ہوا اور جس پر قلب مطمئن ہوا۔

گناہ وہ ہے کہ جو نفس میں تردد پیدا کرے، دل میں کھٹک پیدا کرے۔ اگرچہ لوگ فتویٰ دیں۔ اس روایت کا مفہوم بھی وہی ہے جو اس سے پہلی روایت کا ہے۔ اصل میں کسی انسان کو کوئی بھی فعل اس وقت کرنا چاہیے جب کہ اس کے صحیح اور کار ثواب ہونے پر قلب پوری طرح سے مطمئن ہو۔ اگر اس پہلو سے کھٹک ہے تو کھٹک کے ساتھ کسی فعل کا ارتکاب یہ مومن اور صفت ایمان کے منافی ہے پورے وثوق کے ساتھ فیصلہ ہونے کے بعد ہی کہ وہ مومن کا کام ہو سکتا ہے اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ شبہہ کی حالت میں اس سے بچنا ناگزیر ہے ورنہ زندگی کی روش بدل جاتی ہے اور پھر آدمی حرام اور غلط کاموں کے ارتکاب پر زیادہ جری ہو جاتا ہے یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔

اسی مفہوم کو ایک مختصر روایت میں آپ نے بیان فرمایا ہے جو مختصر جملہ ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ بعینہٖ وہ جملہ محفوظ کر لیا جائے۔ یہ اس طرح کے بہت سے معاملات میں روشنی کا موجب بنے گا۔ حضرت حسن بن علیؓ کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا:۔

حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دع ما یریبك الی ما لا یریبك (ترمذی)	تو چھوڑ دے اس چیز کو جو تجھے ریب و تردد اور شک میں مبتلا کر رہی ہے

الی ما لا یریبك اسے چھوڑ کے اس چیز کو اختیار کر جو تجھے کسی شک و شبہہ میں مبتلا نہ کر رہی ہو۔ یہ جامع کلام جو آپ نے ارشاد فرمایا اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی تقویٰ نام ہے اس کا کہ جس چیز کے بارے میں ذرا سا بھی شک و شبہہ ہو کہ جائز یا ناجائز ہے تو ایسی صورت میں اس کو ترک کر دینا چاہیے اور اس کے بجائے وہ چیز اختیار کرنی چاہیے کہ جس میں کسی پہلو سے کسی شبہہ کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ یہ مومن کے لیے بہترین جامع نصیحت ہے جسے اگر پیش نظر رکھا جائے تو انسان دین پر ٹھیک طور سے عملدرآمد کر سکے گا اور اپنے دین اور مومنانہ عزت کو وہ قائم و برقرار رکھ سکے گا۔

دلوں کا زنگ

آپ نے فرمایا۔ دلوں میں زنگ لگتا ہے جس طرح پانی سے لوہے میں زنگ لگ جاتا ہے۔ سوال کیا گیا اس زنگ کو صاف کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: موت کو بہت یاد کرنا اور قرآن کی بکثرت تلاوت کرنا۔ (حدیث)

نظامِ کائنات کی گواہی

مولینا مزمل حسین صدیقی ریسرچ اسکالر ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ

انسان فطری طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے، اپنے اردگرد کا جائزہ لیتا ہے، اور یہ قوت شاید انسان کو ہی ودیعت کی گئی ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ اپنے وجود کا احساس رکھتا ہے بلکہ اپنے اندر اور اپنے اردگرد کی تمام مخلوقات اور اشیاء کے درمیان ایک رشتہ اور ایک فرق محسوس کر رہا ہے۔

یہ چیز قدرت نے انسان کو پہلے دن سے ہی عطا کر دی تھی۔ مثال کے طور پر آگ جلانے کا طریقہ انسان کو آج سے نہیں بلکہ ہزاروں سال پہلے سے آتا ہے۔ جب کہ جانوروں میں ہمیں کوئی ایسی مثال نظر نہیں آتی بعض ماہرین علوم انسانیات (ANTHROPOLOGIST) کا کہنا تو یہ ہے کہ شاید آگ کے خوف پر قابو پا لینا یہ پہلی چیز ہے جو انسان کو غیر انسان سے ممتاز کرتی ہے۔ گرد و پیش کا ادراک اور اس سے استفادہ کرنے کی ایک عظیم قوت خالق کائنات نے انسان کو ودیعت کی ہے۔

یہاں ہم نے دو لفظ استعمال کیے ہیں۔ ایک 'ادراک' اور دوسرا 'استفادہ'۔ ادراک کے معنی جاننے پہچاننے اور کسی چیز کی حقیقت کو پا لینے کے ہیں، اسی کو دوسرے الفاظ میں علم اور معرفت بھی کہا جا سکتا ہے۔ استفادہ کا لفظ فائدہ اٹھانے اور حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ علم و معرفت کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ علم ہمیشہ عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ ارسطو ایک مشہور فلسفی کا کہنا تو یہ تھا کہ جہاں عمل نہ پایا جاتا ہو وہاں علم ہی نہیں پایا جاتا۔ ایسا علم جو عمل پر منتج نہ ہو اس کے نزدیک جہالت ہے۔ ارسطو نے اگرچہ بہت مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے اور علم و عمل کے فرق کو گڈمڈ کر دیا لیکن حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ نے اس سے زیادہ بہتر انداز میں بات کہی۔ انھوں نے فرمایا کہ علم عمل کو پکارتا ہے اور جب جواب نہیں پاتا تو رخصت ہو جاتا ہے۔ علم اور عمل کے درمیان ایک گہرا رشتہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک موٹی سی مثال یوں

سمجھیے کہ اگر میں آپ کو کوئی لطیفہ سناؤں تو اس میں جو لطف والی بات ہے اس کا اگر آپ نے ادراک کر لیا ہے تو فوراً ہنسی کا عمل آپ سے سرزد ہوگا۔ گو کہ بعض لوگ بغیر سمجھے ہوئے بھی کبھی کبھی صرف برابر والوں کو ہنستا دیکھ کر ہنس دیتے ہیں یا کبھی بعض بزرگ چھوٹوں کی محفل میں لطف کی بات پا لینے کے باوجود ہنسی ضبط کرے جاتے ہیں لیکن بہرحال یہ مثال کسی نہ کسی حد تک علم اور عمل کے رشتے کو واضح کر دیتی ہے۔

یہاں اس مضمون میں ہم یہ بات پیش کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح کائنات کے مشاہدے اور گرد و پیش کے جائزے اور ادراک نے زمانہ قدیم سے لیکر اب تک انسانوں کی زندگیوں پر اثر ڈالا ہے اور ان کے اعمال کو متاثر کیا ہے۔

قدیم مصریوں کے یہاں جس طرح اور بہت سے عقائد تھے اسی طرح ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ ساری کائنات ایک نظام کے تحت چل رہی ہے۔ یہ عقیدہ بذات خود ایک بہت اچھا عقیدہ ہے گو کہ اس کی تفاصیل میں مصریوں نے بت پرستی اور فرعون پرستی کو جگہ دے دی تھی لیکن عقیدہ بذاتہ یہ تھا کہ کائنات میں ایک نظام پایا جاتا ہے اس نظام کا نام انھوں نے مئات رکھا تھا۔ مئات کائنات کے نظام کے ساتھ ہی ساتھ انسانوں کے باہمی تعلقات کے لیے بھی استعمال کیا جانے لگا۔ انسانی اخلاق، لین دین، سیاست ہر ایک میں مئات ایک بنیادی اصول کی حیثیت رکھتا تھا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ جس طرح کائنات ایک مئات کے تحت چل رہی ہے جس کو سورج دیوتا سنبھالے ہوئے ہے اسی طرح یہ انسانی زندگی میں بھی جاری و ساری ہونی چاہیے ——
زمین پر مئات کو چلانے والا اور اس کی ابتری بحال کرنے والا سورج دیوتا کا نمائندہ فرعون ہے۔ یہاں ہمیں اس سے بحث نہیں کہ انھوں نے اپنی معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی زندگی کے لیے کیا اصول وضع کیے تھے بلکہ بتانا یہ مقصود ہے کہ کائنات کے نظام کے ادراک نے انسانوں کو اپنے نظام زندگی کے سوچنے اور بنانے پر مجبور کیا تھا۔ مصری تہذیب کے بعض محققین مثلاً ہنری فرانکفرٹ (Henri Frankfort) کا کہنا تو یہ ہے کہ مئات ایک زمانے میں اتنی اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ اس کو ایک روحانی اور اخلاقی نظام کی حیثیت سے سمجھا جانے لگا تھا۔ دوسرے الفاظ میں مصریوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ انسان کی شخصی زندگی میں بدنظمی گویا کائنات میں بدنظمی پھیلانے کے مترادف ہے۔

بدنظمی ایک منفی عمل ہے اور ہر بدنظمی اپنے نظم سے وابستہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ جس کو مصری نظم خیال کرتے ہیں ہم اس کو اپنے معیار سے بدنظمی سے تعبیر کریں لیکن نظم کا ایک تصور ان کے یہاں موجود تھا جس کو وہ

اپنے خیال میں کائنات کے نظم سے مقتبس سمجھتے تھے ۔

ایک دوسری مثال قدیم ہندوستانی تہذیب سے دی جاسکتی ہے ۔ آریہ جب ہندوستان آئے تو اپنے ساتھ بہت سے تہذیبی اور مذہبی عناصر لائے ۔ ان کے یہاں بھی ایک تصور 'ریت' یا رِتا (ऋत) پایا جاتا تھا ۔ آج بھی ہم اردو میں ریت کا لفظ استعمال کرتے ہیں کہتے ہیں کہ یہ زمانے کی ریت ہے' ریت بدل گئی وغیرہ وغیرہ ۔ ریت بھی اصلاً نظام کائنات کے لیے آریہ استعمال کرتے تھے ۔ آریہ ایک بت پرست قوم تھی جن کے بہت سے خدا تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ کائنات کو ایک خدا نے بنایا اور پھر وہ آرام کی نیند سو گیا ۔ کائنات کے نظام کو ایک دوسرا دیوتا سنبھالے ہوئے ہے ۔ اس دیوتا کا نام ورن (वरुण) تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ وَرن دیوتا وہی ہے جس کو بعد میں اشور کا نام دیا گیا اور زردشت کا مذہب یعنی ایران میں وہ اہرمن (یا اہورا) کے نام سے معروف ہوا ۔ وَرن دیوتا کائنات کے نظام یا ریت کی دیکھ بھال کرتا ہے ۔ یہاں پر جو چیز قابل غور ہے وہ یہ کہ وَرن کو گناہوں کی سزا دینے والا دیوتا بھی سمجھا گیا تھا ۔ ویدک عقیدے کے مطابق وَرن گناہوں کی سخت سزا دیتا ہے ۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ گناہ (اس سے بحث بالکل نہیں کی جارہی ہے کہ ویدک نظام زندگی کے مطابق گناہ کون کون سے عمل ہیں اور گناہ کا پورا تصور کیا ہے) نظام کائنات کو درہم برہم کر دیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ریت کا دیوتا وَرن اس کا نوٹس لیتا اور اس کی سخت سزا دیتا ہے ۔ کائنات پر غور وخوض اور اس کے ادراک نے قدیم آریاؤں کو مجبور کیا تھا کہ وہ سوچیں کہ انسان کی زندگی بھی ایک نظام اور اصول کے تحت بسر ہونی چاہیے ۔ یہ اصول اور نظام انھوں نے کس طرح بنائے کہاں ٹھوکریں کھائیں ۔ ان کے کون کون سے اصول سچے اور نبوت کے نور سے مقتبس معلوم ہوتے ہیں اور کون کون سے اصول انسانی تحریفات ہیں یہ ایک الگ موضوع ہے ۔

اس سلسلے کی تیسری اور آخری مثال ہمیں چین میں ملتی ہے ۔ کنفیوشس (زیادہ صحیح تلفظ کونفوتزو) تقریباً چھٹی صدی قبل مسیح کے نصف پر پیدا ہوا ۔ یہ بات قابل بحث ہے کہ آیا اس نے کسی مذہب کی تعلیم دی یا صرف ایک معلم خلاق تھا ۔ خدا اور روح کا تصور اس کے یہاں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے ۔ ایک بہت اہم خیال اس نے یہ پیش کیا کہ انسانوں کو اپنے باہمی معاملات میں لی (Li) کو اپنانا چاہیے ۔ لی کے مختلف معنے پیش کیے گئے ہیں ۔ بعض لوگوں نے کہا کہ اس کے معنے ہیں معروف طور وطریق ، بعض کے نزدیک اس کے معنے نظم وضبط اور بعض کے نزدیک اس سے مراد حسن انداز ہے ۔ کنفیوشس کا کہنا تھا کہ کوئی بھی کام چاہے وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو اگر وہ

بغیر نظم وضبط حسن انداز اور معروف طریقے کے کیا جائے تو وہی برا بن جاتا ہے لیکن اس سے بڑھ کر کنفیوشش کے
یہاں لی انسانی دائرۂ عمل اور اخلاق سے بڑھ کر کائنات کو محیط ہے۔ کنفیوشس مذہب کی مشہور کتاب لی چی
(مجموعہ ضوابط) میں کنفیوشس کا یہ قول ملتا ہے۔

"لی ایک ایسا اصول ہے جس کے ذریعے قدیم بادشاہوں نے آسمانی قوانین کو اس زمین پر جاری
کیا اور اس کے ذریعے انسانی فطرت کے مظاہر کو ضوابط کے تحت کیا۔ اسی لیے جس نے لی کو اپنایا وہی
زندہ ہے اور جو لی کو چھوڑ چکا وہ فنا ہو گیا۔"

آسمانی قوانین سے مراد پوری کائنات کا نظم وضبط ہے۔ کیونکہ آسمان قدیم چینیوں کے یہاں ایک دیوتا
سمجھا جاتا تھا۔ جس نے پوری کائنات کو بنایا ہے۔ کنفیوشس نے اپنے طریقے کا نام طریق آسمانی رکھا تھا۔

قدیم مصر، قدیم ہند اور قدیم چین کی یہ تینوں مثالیں بہت واضح انداز سے ہمارے سامنے یہ بات رکھتی
ہیں کہ انسان اپنے ماحول کا جائزہ لینے کا عادی اور اپنے مخلوقات کے درمیان ایک رشتہ دیکھنا چاہتا ہے
انسان کے مذہبی خیالات نے اس تصور کو بہترین زندگی کے لیے بنیادی خیال کیا ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں
کہ انسان اپنی فکر سے اتنے بلند خیال تک پہنچا ہو۔ بندوں کی رہنمائی کے لیے اور ان کی زندگیوں کو نظم وضبط
سے آشنا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر دور اور ہر زمانے میں اپنے مخصوص بندے چنے اور ہدایت نازل فرمائی۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہو گا کہ یہ کتاب بار بار انسان کو
متوجہ کرتی ہے کہ وہ کائنات پر غور کرے، اپنے گرد وپیش کا جائزہ لے، آسمان اور اس سے متعلق تمام چیزیں
سورج و چاند، تارے وسیارے، بادل و بارش، بجلیاں، کہر، ہوائیں اور آندھیاں اسی طرح زمین اور اس
سے متعلق تمام عجائب قدرت خشکی وتری، پہاڑ اور جنگل، وادیاں اور راستے انسان اور جانور۔ الغرض ان
میں سے کون سی چیز ہے جس پر غور کرنے کی دعوت نہ دی گئی ہو۔ قرآن کریم کی ان آیات کو آیات کونیہ کہا
جاتا ہے جن میں آفاق پر غور وفکر کرنے کی طرف بلایا گیا ہے۔ یہ آیتیں کبھی دلیل بنتی ہیں خدا کی وحدانیت اور
ربوبیت پر، کبھی رسالت اور اس کی ضرورت پر اور کبھی یوم جزا پر۔ اور ان سب کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما
ہے کہ بندے اپنا تعلق اپنے رب سے مضبوط کریں، اپنی زندگیوں کو بہتر بنائیں۔ اسی طرح کائنات میں ہم آہنگی
پیدا ہو گی اور یہاں امن وامان قائم ہو گا۔

امن وامان کے لیے عربی لفظ 'سلام' ہے۔ سلام ایک بہت ہی وسیع لفظ ہے اس کے معنے تمام اور مکمل

[illegible] کہتے ہیں۔ یہی لفظ عبرانی میں ذرا سے فرق سے شَلوم کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسےٰ علیہ السلام پر توریت نازل فرمائی تو اس کے ساتھ ہی ساتھ کہا گیا تھا کہ اگر تم ان احکام پر پوری طرح چلو تو تم سلامتی اور برکت سے نوازے جاؤ گے اور اگر اعراض کیا تو سلامتی اور برکت تم سے چھین لی جائے گی (استثناء باب ۲۸ میں اس کو بہت ہی وضاحت سے بتایا گیا ہے۔) قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ	کاش انھوں نے توریت اور انجیل اور
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ	ان دوسری کتابوں کو قائم کیا ہوتا جو اُن
مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ	کے رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں
فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ	ایسا کرتے تو ان کے لیے اوپر سے رزق برستا
(مائدہ ۶۶)	اور نیچے سے اُبلتا۔

اوپر اور نیچے ہر طرف سے سیری، روحانی اور جسمانی، اخلاقی و مادی ہر قسم کا جب ویلفیر ہو تو اس کو سلام کہا جاتا ہے۔ لفظ اسلام اپنے اندر اسی مفہوم کو لیے ہوئے ہے۔ اور اس کا مطلب ہے وہ طریقہ زندگی جو ہر قسم کے آرام اور سلامتی کی کفالت کرتا ہو۔

قرآن کریم کس طرح کائنات کے نظم وضبط اور عدل و توازن کو دلیل بنا کر بندوں کو نظم وضبط اور عدل و توازن کی تعلیم دیتا ہے۔ اس کے لیے سورۂ رحمٰن کی آیتیں بہت واضح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ	اور اس (اللہ) نے آسمان کو بلند کیا
اَلَّا تَطْغَوْا فِى الْمِيْزَانِ ۝ وَاَقِيْمُوا	اور میزان رکھا تاکہ تم میزان میں زیادتی نہ کرو
الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	اور وزن کو عدل کے ساتھ قائم کرو اور
الْمِيْزَانَ ۝ (رحمٰن ۷-۹)	میزان کو برباد نہ کرو۔

آسمان کی رفعتوں اور رب کائنات کی طرف سے ان میں ودیعت کردہ تناسق و توازن اس بات کی دلیل بن رہے ہیں کہ بندوں کو دعوت دی جائے کہ ان کی زندگیاں عدل اور توازن کے رشتے میں بندھ جائیں ان کو وزن قائم کرنے کی یعنی عدل و توازن کی تعلیم دی جا رہی ہے اور میزان کو نقصان پہنچانے سے روکا جا رہا ہے۔ کیونکہ اس سے خود ان کی اپنی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔

قدیم مصری ہندی اور چینی تمدنوں میں کائنات نے ایک دیوتا یا دیوتاؤں کی شکل اختیار کرلی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظم کا ذکر تو ملتا ہے، توازن کے تذکرے بھی آتے ہیں لیکن کائنات پر مسلسل غور وخوض اور اس کے نتیجے میں معاشرتی زندگی کو سنوارنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ کائنات بذات خود خدا بن گئی اور ظاہر ہے خدا کی تو پوجا کی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان تینوں تہذیبوں نے سائنس کی راہ میں قدم نہیں رکھا۔ ہندوستان میں علم نجوم اور افلاک کے زائچے پائے جاتے تھے لیکن ان کی حیثیت جادو کی ہے، سائنس کی نہیں۔ اسی طرح مصری اور چینی اپنے جادو کے کمالات میں مشہور رہے ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے یہاں کائنات کے خدا ہونے کا تصور نہیں ہے لیکن وہ اپنے قرب وجوار کے وثنی اور بت پرست معاشروں سے اتنے متاثر رہے کہ وہ بھی اس راہ میں قدم نہیں بڑھا سکے اور کائنات پر غور وفکر کا راستہ ان کے یہاں تقریباً بند ہے

اسلام نے اس تصور کی اصلاح کی۔ اس نے بتایا کہ کائنات ایک نظم کے تحت چل رہی ہے۔ یہ نظم بذات خود خدا نہیں ہے بلکہ خدا کا پیدا کردہ ہے اور اس کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ یہ اتنا انقلابی تصور تھا کہ اس نے عرب کے بادیہ نشینوں کو جو اپنے ماحول اور گرد وپیش میں محصور رہتے کائنات کی وسعتوں کے سامنے لاکر کھڑا کردیا۔ کائنات کو خدا نہ سمجھا جائے بلکہ اس پر غور وفکر کیا جائے وہ تصور ہے جس نے سائنس کو وجود بخشا اور یورپ کو یہ تصور نشاۃ ثانیہ کے وقت عربوں اور مسلمانوں سے حاصل ہوا۔ اس کے نتیجے میں کائنات میں پھیلنے بڑھنے اور اس کو زیادہ سے زیادہ جاننے کی کاوشیں شروع ہوگئیں اور آج یہ جس دور میں داخل ہوچکی ہے وہ آپ سب کے سامنے ہے۔

کائنات پر سارے غور وفکر کے باوجود آج مغرب کی زندگی غیر متوازن کیوں ہے؟ مغربی تہذیب اور تمدن کو جن لوگوں نے بھی غور سے اور ناقدانہ نگاہوں سے دیکھا ہے وہ اس سے واقف ہیں کہ یہ تہذیب عدم توازن کی شکار ہے۔ یہاں کی نہ سیاست متوازن ہے، نہ معاشرت۔ افراد کی باہمی زندگیاں، خاندانوں کے تعلقات، لوگوں کے ایک دوسرے سے معاملات، خورونوش، نشست وبرخاست، رہن سہن الغرض ہر چیز جو بظاہر منظم نظر آتی ہے بالحقیقت غیر متوازن ہے، اس کے بظاہر دو اسباب نظر آتے ہیں۔

پہلا سبب تو یہ کہ مغربی تہذیب جس کے بننے میں اسلامی تہذیب نے ایک درمیانی عامل اور MEDIUM کا کام کیا تھا۔ آج قدیم مصری، ہندی اور چینی تہذیبوں کے مقابلے میں بالکل دوسری سمت

پر کھڑی ہے۔ ان قدیم تہذیبوں میں کائنات خدا تھی، مغرب میں کائنات غلام سمجھی جاتی ہے اور خدا کا حقیقتاً انکار کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کائنات کا توازن اپنے آپ کو متوازن کرنے کی طرف نہیں بلاتا۔ خادم اور غلام کی اتباع نہیں کی جاتی اور نہ اس سے مثال لی جاتی ہے۔

دوسرا سبب جو اسی پہلے سبب سے پیدا ہوا ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب کائنات کو متوازن اور میزان پر مبنی نہیں مانتی۔ ان کا مقولہ ہے (UNIVERSE EQUAL'S CHAOS) کائنات نام ہے ابتری اور افراتفری کا۔ یہ تصور اسی لیے پیدا ہوا ہے کہ انسان کائنات کے پیچھے کسی مدبر اور حکمراں قوت کو نہیں مانتا۔ کائنات (UNIVERSE) کے اس (CHAOTIC) غیر متوازن تصور کو دیکھنا ہو تو آپ موجودہ مغربی نظام کی یونیورسٹی (UNIVERSITY) کو دیکھیے۔ طلبہ کے ہنگامے، بے اطمینانی اور عدم توازن اسی تصور کا نتیجہ ہیں۔ امریکہ کی مشہور و معروف یونیورسٹی ہارورڈ (HORVERD) جس کے بانیوں نے سترھویں صدی میں اس کے المبلم پر (VARITAS) (ایک لاطینی لفظ جس کے معنے ہیں سچائی اور حق۔ شاید بانیوں کا یہ خیال رہا ہو کہ یونیورسٹی اس لیے ہوتی ہے کہ وہاں حق کے متلاشی پائے جائیں) کندہ کیا تھا۔ اس کے ایک پروفیسر نے اس سال آنے والے طلبہ کو یونیورسٹی کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ وہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یونیورسٹی کا مطلب (CHAOS) ہے جس طرح کائنات (CHAOS) کا نام ہے۔

یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جو ہمارے نزدیک مغرب کی زندگی کو غیر متوازن کیے ہوئے ہیں۔ ہمارا یقین ہے کہ متوازن راہ وہی ہے جس کو اسلام نے پیش کیا۔ اس میں قدیم تہذیبوں کا صالح عنصر موجود ہے جس طرح جدید کا نافع عنصر۔

کوئی تضاد نہیں ہے

ایک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اخلاق و کردار کے لحاظ سے بہت پست سطح پر آگئی ہے۔
دوسری بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی اکثریت اسلامی نظام حکومت ہی چاہتی ہے۔ ان دو باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے کہ بدعملی اور بے ایمانی دو الگ چیزیں ہیں۔
اسلامی نظام حکومت کے مخالفین ان دونوں باتوں میں دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے تضاد ثابت کرتے ہیں۔

تخلیقِ آدم یا ارتقاءِ آدم

(جناب اکرام الدین صاحب، الہ آباد)

کائنات میں انسان کا وجود "ارتقائی راستے سے ہوا یا تخلیق خصوصی سے" یہ مسئلہ ایک انتہائی الجھا ہوا مسئلہ ہے اور جس قدر سائنسی انکشافات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس مسئلے کی پیچیدگی بڑھتی جا رہی ہے نظریۂ ارتقاء کے ثبوت میں متعدد مفروضے سامنے لائے گئے جو اس نظریے کی گتھیوں کو سلجھانے کی بجائے کچھ نہ کچھ نئی گرہیں لگا گئے۔ نظریہ ارتقاء کو ایک مسلم الثبوت حقیقت بنانے اور ثابت کرنے کے لیے دہریت پرست فلسفیوں کی ایک عظیم اکثریت صدیوں سے کام کر رہی ہے۔ ہزاروں مقالے اور کتابیں لکھی جا چکیں اور لکھی جا رہی ہیں۔ لیبارٹریز میں، باغات میں، کھیتوں میں اور جنگلات میں پودوں اور جانوروں پر تجربات ہو رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ کسی طرح بھی حل ہوتا نظر نہیں آتا۔

اس سلسلے کی تمام بحثوں اور علمی و عملی تگ و دو کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک طالب علم سمجھ نہیں پاتا کہ آخر علمی یا عملی دنیا کو اس مسئلے کے مکمل حل سے کیا فائدہ پہنچنے کی امید ہے کہ فلاسفہ کا اتنا زیادہ انہماک اس لاینحل مسئلے کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر انسان کا وجود ارتقائی راستے سے ہونا مکمل طور پر بلا کسی خامی کے ثابت بھی ہو جائے اور اسے ایک حقیقت بھی تسلیم کر لیا جائے تو انسان کی حیثیت پر اور پھر اس کے اخلاق و کارکردگی پر کیا اثرات ہوں گے اور اگر اس کا وجود خالق کے تخلیق خصوصی سے ہونا ثابت ہو جائے تو کیا فرق پڑے گا اور سائنس کی ترقی کی راہ میں کیا رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔ سائنس داں کو اپنے طبعی اور کیمیائی لیبارٹریز میں انجینیروں کو ٹیکنیکل کارخانوں میں ڈاکٹروں یا دوسرے عملی شعبوں کے ماہرین کو اپنے اپنے مخصوص میدان کار میں اس نظریے سے کیا رہنمائی ملتی ہے یا آئندہ ملنے والی ہے اور اسی قسم کے دوسرے متعلقہ مسئلوں پر غور کیا جائے تو صرف ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ سائنس کی عملی ترقی میں اس مسئلے کے حل ہونے

یا نہ ہونے سے کوئی مدد یا رکاوٹ تو نہ ہوگی، البتہ جس تصورِ کائنات کے ثبوت کے لیے ماضی کے دہریت پرست فلسفیوں نے اس نظریے کو پیش کیا تھا اس میں استحکام یا تزلزل ضرور پیدا ہوگا۔

علمی اور سائنسی بنیادوں پر اس تصورِ کائنات کے استدلال میں جس قدر زور پیدا کیا جاتا رہے گا اسی قدر کائنات کے مذہبی تصورات و اعتقادات میں ضعف و انتشار پیدا ہوتا جائے گا چنانچہ مغربی تہذیب کے علمبردار فلسفیوں کو نظریہ ارتقا کے استحکام کے لیے بہر نوع کوشش کرتے رہنا پڑے گا چاہے ان کے استدلال میں کتنی ہی خامیاں کیوں نہ ہوں اور ان میں ان خامیوں کا اعتراف بھی ہو کیونکہ یہ تہذیب اسی تصورِ کائنات پر قائم ہے جو نظریۂ ارتقا سے غذا حاصل کرتی رہتی ہے۔ اس کے کمزور پڑ جانے سے اس تہذیب کی عمارت میں رخنے پڑنا ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکیت اور سرمایہ داریت کے حاملین فلاسفہ نظریۂ ارتقا کو کسی نہ کسی شکل میں قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں اور ہر نئے سائنسی مشاہدے کا رشتہ حیاتیات کے شعبے میں جو کچھ نئی معلومات حاصل ہوتی ہیں چاہے وہ خالص نفسیات سے ہی متعلق کیوں نہ ہوں ارتقا کی کڑیوں سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں گو کہ ایسا کرنے میں انھیں بسا اوقات اپنے ضمیر کی آواز کو ایک بڑی حد تک دبانا پڑتا ہے۔

مغربی تہذیب کے یہ فلاسفہ اپنے طرزِ استدلال اور پیچ در پیچ تفصیلات کے ساتھ علمی فضا پر کچھ اس طرح چھا گئے ہیں کہ ان کے پیش کردہ نظریاتِ زندگی کی تردید کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ عیسائی علماء کی طرح ہمارے قرآنی نظریۂ زندگی کے حامل مفکرین الا ماشاء اللہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ چنانچہ اس صف کی کچھ قابلِ قدر شخصیتوں کی تحریروں اور گفتگوؤں پر غور کرکے حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے ان نظریات کو کیوں کر قبول کر لیا اور ان کے جواز و تشریح میں کلامِ الٰہی سے استدلال کرنے لگ گئے۔ راقم الحروف جو اتفاق سے علم الحیات اور نفسیات کا طالب علم رہ چکا ہے اور جس کا خصوصی موضوعِ تدریس و مطالعہ حیاتیات اب تک جاری ہے کسی طرح بھی مطمئن نہیں ہوتا کہ انسان کا وجود نظریہ ارتقا کے راستے ہی سے ہوا ہے۔ اسے ان تمام دلیلوں میں طبعی اور کیمیائی نقطۂ نظر سے اور خود حیاتیاتی نقطۂ نظر سے زبردست خامیاں نظر آتی ہیں جنھیں یہ لوگ یہ کہہ کر کوئی اہمیت نہیں دیتے کہ آنے والے زمانوں میں ایسے سائنسی تجربات کیے جا سکتے ہیں اور ایسے مشاہدے سامنے آ سکتے ہیں جو ان خامیوں کو دور کر دیں گے اور یہ بات بھی اپنی جگہ پر تعجب خیز ہی ہے کہ ان فلاسفہ میں سے سوائے اشتراکیت زدہ فلسفیوں کے کوئی بھی نظریۂ ارتقا کو مسلم الثبوت حقیقت تسلیم نہیں کرتا لیکن ذرا اس ستم ظریفی پر تو نظر کیجیے کہ ہمارے ان بزرگوں نے اسے مسلم الثبوت حقیقت سے بڑھ کر

مشاہداتی حقیقت تسلیم کرلیا ہے اب کسی کی کیا مجال کہ مشاہداتی حقیقت کے خلاف قلم اٹھائے۔ کاش کہ یہ حضرات اپنے مشاہدوں کا بھی ذکر فرماتے یا کم از کم ان سائنس دانوں کے مشاہدوں کو ہی بیان کر دیتے۔ جنھوں نے کسی نوع کے جاندار جسم کو دوسرے کے جسم سے ارتقاء کرتے ہوئے مشاہدہ کیا ہے۔ حیرت ہے کہ اہل ایمان غیبی باتوں کو مشاہداتی حقیقت کے زمرے میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے تو صرف ربوبیت کی تفسیر میں اس کی طرف اشارہ کرکے ہی چھوڑ دیا تھا لیکن ڈاکٹر رفیع الدین صاحب نے اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" میں اس نظریہ پر ایک مکمل باب قائم کرکے اس کے ثبوت میں اپنا سارا فلسفیانہ زور صرف کر ڈالا۔ ابھی حال میں مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں اس موضوع پر جناب مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کے زیر صدارت ایک مذاکرہ منعقد ہوا تھا مخالفت و موافقت میں متعدد مقالے پڑھے گئے اور آخر میں مولانا نے اپنی صدارتی تقریر میں درج ذیل نقطہ نظر کی حمایت کی۔

"چونکہ ارتقاء ایک مشاہداتی حقیقت ہے جس کو نظریہ سے موسوم کرنا غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ لہذا قرآن کریم کے ان تمام جملوں یا فقروں کا جو خلق آدم سے متعلق ہیں ارتقائی مفہوم لینا چاہیے اور تخلیق مخصوص کے نظریے پر جو مشاہداتی حقیقت کے خلاف ہے کھل کر تنقید کرنی چاہیے۔"

ماہنامہ زندگی کے جنوری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں اس مذاکرے کی روداد مولانا عروج قادری صاحب مدیر زندگی کی تنقید کے ساتھ شائع ہوئی تھی اسے دیکھ کر راقم الحروف نے باوجود بستر علالت پر ہونے اور لکھنے کی پوزیشن میں نہ ہونے کے ضروری سمجھا کہ اس سلسلے کے جتنے مضامین ایک مدت سے لکھے ہوئے پڑے ہیں ان میں سے وہ جو "قرآن اور علم جدید" پر بطور تنقید کے ہے فوری طور پر شائع کرنے کے لیے بھیج دیا جائے چنانچہ ارتقاء کی فائل میں سے اس مضمون کے منتشر اوراق نکالے گئے اور دوبارہ مرتب کرکے بھیجے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس مسئلے سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس سے کچھ استفادہ کرسکیں گے۔

قرآن اور علم جدید

جناب ڈاکٹر رفیع الدین احمد صاحب اپنی کتاب "قرآن اور علم جدید" کے صفحہ ۹۶ پر تحریر فرماتے ہیں:

"جو لوگ مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید کی طرف توجہ کریں ان کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کرکے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے

نزدیک مسلم نہیں۔ اگر ہم ایسا نہیں کریں گے تو ہم دنیا کے حکمار اور فضلار کو اپنے ساتھ متفق نہیں کر سکیں گے۔

ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ ارباب عقل و دانش کائنات کے متعلق جن تصورات پر متفق ہو جائیں انھیں علمی دنیا کے مسلمہ حقائق میں شمار کر لیا جائے اور پھر قرآنی آیات کی تشریح اس ڈھنگ سے کر دی جائے کہ حکمار اور فضلار سمجھ لیں کہ جن حقائق کو انھوں نے مدتوں کے بحث و مباحثہ اور تجربات و مشاہدات کے ذریعے پایا ہے وہ قرآن میں چودہ سو سال پہلے سے موجود ہیں اور مسلمانوں کا ان پر ایمان ہے۔ ایسا کرنا ڈاکٹر صاحب موصوف اس لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ دنیا کے حکمار اور فضلار قرآنی انکشافات پر متفق ہو سکیں اور ان قرآنی حقائق کی صحت کو تسلیم کر لیں جو ان کے نزدیک مسلم نہیں۔ یہ کام کوئی مشکل کام نہیں کیونکہ موصوف کے نزدیک کسی حقیقت کا قرآن میں لفظاً موجود ہونا ضروری نہیں ہے اگر وہ معنًی موجود ہو صرف اتنی قابلیت کی ضرورت ہے کہ قرآن کی تشریح اس ڈھنگ سے کر دی جائے کہ وہ حقیقت واضح ہو جائے۔ ڈاکٹر صاحب مجھے معاف فرمائیں اگر میں کہوں کہ موصوف نے اس بات پر اتنا غور نہیں کیا جتنا غور کرنے کے بعد موصوف کے ذہن سے یہ بات خود بخود دور ہو جاتی۔ آپ یہ لکھ کر کہ علمی صداقتیں قرآن میں اگر لفظاً نہیں تو معنًی ضرور موجود ہیں۔ قرآن کی تفسیر بالرائے کے لیے جواز اور راہ پیدا کر رہے ہیں اور فلاسفہ کو اس بات کا موقع فراہم کر رہے ہیں کہ جو چاہے اپنے اپنے فلسفے کے مطابق قرآن کی تشریح کرے کیونکہ ڈاکٹر صاحب کسی فلسفیانہ تصور کو جس طرح مسلمہ حقیقت تسلیم کرتے ہیں اسی طرح کتنے تصورات ہیں جن پر فلاسفہ کے کئی کئی گروہ متفق ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی قرآن کی مادی تشریح کرنا شروع کر دے اور قرآن کی اصطلاحات و آیات کو مختلف طریقوں سے مسخ کر کے ان سے روحانیت کے بجائے مادیت ثابت کر دے تو کیا ڈاکٹر صاحب اسے تسلیم کر لیں گے۔ اور اگر نہیں تو پھر تردید کیسے کریں گے۔ وہ تو ہر بات کے لیے کہہ دیا کرے گا کہ یہ ڈرامائی انداز میں قرآن کے اندر بیان کیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح ڈاکٹر صاحب نے قرآن اور علم جدید میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کسی حیوان مطلق کے بطن سے ثابت کرنے کے لیے متعلقہ آیات کی تشریح ارتقار کی روشنی میں کرتے ہوئے اس بات کے کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا کہ قرآن میں حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش ایک ڈرامائی انداز میں بیان کی گئی ہے — گویا اللہ تعالیٰ کا فرشتوں کو آگاہ کرنا کہ وہ زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہے۔ پھر ایک مشت خاک سے حضرت آدمؑ کا خلق کیا جانا پھر اللہ تعالیٰ کا اپنی روح پھونکنا، پھر فرشتوں کا سجدہ کرنا اور ابلیس کا سجدے سے اس لیے انکار کرنا کہ وہ آتش اور آدمؑ خاک کے بنے ہوئے ہیں۔ آدمؑ کا ایک مدت مقررہ تک کے لیے جنت میں گزارہ کرنا پھر ابلیس کے ذریعے بہکایا جانا اور اللہ تعالیٰ

کی حکم عدولی کرنا پھر معافی کا خواستگار ہونا اور دنیا میں نزول وغیرہ ساری باتیں بطور ڈرامہ کے قرآن میں بیان کی گئی ہیں ورنہ آدم کے وجود کی حقیقت وہی جو ارتقاء سے ثابت ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف اپنی کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر تحریر فرماتے ہیں:۔

"اب دیکھنا یہ ہے کہ عالمی ارتقاء کا نظریہ جس کا ایک حصہ ڈارون کا نظریہ ہے اور جس کی طرف ڈارون کا نظریہ رہنمائی کرتا ہے صحیح ہے یا غلط یعنی روح قرآنی کے مطابق ہے یا غیر مطابق۔ اگر وہ صحیح اور قرآنی تصور ہے تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ کائنات ایک ابتدائی حالت سے ترقی کرتی ہوئی چلی آئی ہے اور نوع انسانی ایک نوعِ حیوانات کی اولاد ہے جو اپنے جسم، دماغ اور نظام عصبی کی ساخت میں انسان سے کم تر درجے کی تھی اور پھر یہ نوعِ حیوانات اس سے بھی کمتر درجے کی ایک نوع سے پیدا ہوئی تھی۔ علیٰ ہذا القیاس"

"یہاں تک کہ ہم اس ایک خلیہ کے حیوان کی نوع تک پہنچ جاتے ہیں جو سب سے پہلے ظہور میں آیا تھا۔ اگر یہ تصور صحیح ہے تو ہمارے لیے ضروری ہو گا کہ ہم اسے اپنائیں اور اس کی روشنی میں قرآن کے مطالب اور مقاصد کو سمجھیں اور اسے قرآنی تصورات کی تشریح اور تفسیر اور غیر قرآنی تصورات کی تردید اور ابطال کے لیے کام میں لائیں"

"اس کے برعکس اگر تدریجی ارتقاء کا تصور غلط ہے تو ہمیں ان لوگوں کے خیالات سے متفق ہونا پڑے گا جو سمجھتے ہیں کہ کائنات کا ظہور ایک تدریجی تربیت سے نہیں ہوا اور بالخصوص موجودہ نسل انسانی ایک ایسے فرد کی اولاد ہے جو جسمانی لحاظ سے بالکل ہماری طرح تھا اور اپنی بیوی سمیت جنت سے نازل ہوا تھا۔ یا جیسا کہ لوگوں نے خیال کیا ہے کہ اس کا مٹی کا بت بنا کر اسے پھونک سے یکایک زندہ کر دیا گیا تھا اور پھر اس کے بعد کوئی فرد انسانی قدرت نے اس طریق سے پیدا نہیں کیا بلکہ ہر فرد توالد و تناسل کے ذریعے سے پیدا ہوتا رہا ہے۔ ایسی صورت میں تدریجی ارتقاء کے تصور کو علمی اور عقلی براہین سے غلط ثابت کرنے کی بہت بڑی ذمہ داری ہمارے کندھوں پر عائد ہو گی محض اس کے غلط ہونے کا ادعا ہمارے تبلیغی مقاصد کے لیے کافی نہ ہو گا۔ کیونکہ ہمارے دعوے کی بنا پر کسی ایسے تصور کو غلط ماننے کے لیے تیار نہیں ہو سکتی جو علمی تحقیق سے پے در پے صحیح ثابت ہو چکا ہو۔ اور اگر ہم علمی دلائل اور عقلی براہین کے بغیر اپنے دعوے پر اصرار کریں گے تو ہم دنیا کے ذہین تعلیم یافتہ طبقے کو اسلام سے بیزار کریں گے اور انہیں اسلام سے اور پیچھے ہٹائیں گے۔ لہٰذا ہمارا فرض ہو گا کہ اس کے خلاف علمی اور عقلی دلائل بہم پہنچانے کی پوری پوری کوشش کریں اور اگر تدریجی ارتقاء کا تصور فی الواقع غلط ہو گا تو خواہ دنیا اسے صحیح مان رہی ہو ضروری بات ہے کہ بالآخر ہم اپنی کوششوں سے اس کے خلاف عقلی دلائل و علمی براہین پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو جائیں گے

ڈاکٹر صاحب نے فیصلہ تو یہ کیا کہ اگر ارتقا کا تصور صحیح ہے تو اپنانا ہوگا اور اگر غلط ہے تو علمی دلائل اور عقلی براہین سے غلط ثابت کرنا ہوگا۔ لیکن اپنانے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں سمجھی۔ پتہ نہیں موصوف کو تصورِ ارتقا پر شرح صدر کیسے حاصل ہوگیا کہ اسے بلا کسی دلیل کے اپنا لیا اور اس کی روشنی میں قرآن کی تشریح کرنا ٹھان لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ارتقائیوں کی بڑی بڑی بحثوں سے آپ مرعوب ہوگئے اور ان کے عمل توجہ سے آپ پر ایک حالت نوم طاری ہوگئی۔ آپ نے اپنے سامنے ایک کھلا ہوا چیلنج محسوس کیا کہ "تصور ارتقار کو قبول کرو اور اگر چاہتے ہو کہ دنیا کے علمار اور فضلار قرآن کو بھی کوئی وزن دیں تو اس تصور کو قرآن سے ثابت کرو، ورنہ عقلی دلائل اور براہین سے اس کی تردید کرو۔

ڈاکٹر صاحب نے علمی اور عقلی براہین سے غلط ثابت کرنے کی ذمہ داری نہیں لی بلکہ قرآن سے صحیح ثابت کرنے کی ذمہ داری لے لی۔ کیونکہ بقول موصوف کے وہ ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی اور اس کے مقابلے میں یہ ذمہ داری ہلکی ہے اور آسان ہے۔ وہ مشکل اس لیے ہے کہ بہر حال ارباب عقل و دانش کے قائم کردہ تصورات جن پر موصوف کے معلومات کی حد تک سبھی متفق ہیں ایسے نامعقول تو ہیں نہیں کہ ان کے خلاف دلائل فراہم ہوسکیں اور وہ انھیں تسلیم کرلیں اور یہ آسان اس لیے ہے کہ قرآنی آیات کی تشریح اپنے تصور و خیال کے مطابق کرنے میں کوئی ایسی رکاوٹ پیدا نہیں ہوسکتی جو دور نہ کی جاسکے۔ کیونکہ علمار اسلام میں سے اگر کچھ حضرات اس تشریح کی مخالفت کریں گے تو کچھ حضرات ایسے بھی نکلیں گے جو موافقت کریں گے چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تفسیر "ترجمان القرآن" سے آپ کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ تصور ارتقار کے ابطال کی ذمہ داری آپ اس لیے لینا نہیں چاہتے کہ آپ کو ان سائنسی تجربات و مشاہدات کے مواقع حاصل نہیں ہیں جن کی تائید کا اس تصور کے حامل فلاسفہ دعوے کرتے ہیں اور اس دعوی کی تردید کے لیے انھیں تجربات و مشاہدات کے اعداد و شمار سے کام لینا پڑے گا۔ لیکن قرآن سے اس کے حق میں دلائل فراہم کرلینا اس لیے آسان ہے کہ اس کے لیے اعداد و شمار کی ضرورت نہیں بلکہ صرف حکمت استدلال سے کام لیا جاسکتا ہے۔ سب سے بڑی بات تو غالبًا یہ ہے کہ تصور ارتقار کی تغلیط کرکے ارباب عقل و دانش کی نظروں میں رجعت پسند بننا کیسے گوارا کرلیا جائے جب کہ اس سے اپنی ذات پر ہی آنچ نہیں آتی، بلکہ قرآن و اسلام بھی زد میں آجاتے ہیں۔ قرآن و اسلام سے ڈاکٹر صاحب موصوف ایک فطری و جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور فلسفہ جدیدہ سے بھی جناب کا علمی تعلق ہے۔ فلسفہ کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ ہر فلسفی مابعد الطبیعیاتی مسائل میں اپنا ایک الگ نقطہ نظر رکھتا ہے اور اسی کو بنیاد بناکر مظاہر کائنات کی توجیہ کرتا ہے اور دوسرے کے نقطہ نظر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے

ڈاکٹر صاحب بھی ایک فلسفی ہیں اور اپنے فلسفے کی بنیاد ایک ایسی علت کو قرار دینا چاہتے ہیں اور اس پر استدلال کرکے ایک ایسا نظامِ فلسفہ تیار کرنا چاہتے ہیں کہ دنیائے فلسفہ کے ثابت شدہ تصورات مثلاً نظریۂ ارتقاء وغیرہ اسی نظام فلسفہ کے ذریعے ثابت بھی کیے جاسکیں اور قرآنی حقیقت بھی قرار دیے جاسکیں بلکہ موصوف کی خواہش تو یہ ہے کہ جن جن تصورات پر اربابِ عقل و دانش متفق ہو جائیں ان سب کے لیے اس نظامِ حکمت کے ذریعے قرآن سے دلائل فراہم کرکے قرآنی صداقت ثابت کی جاسکے۔

جدید فلسفوں اور ان کے قائم کردہ نظریوں کے بارے میں جن تاثرات کا اظہار ڈاکٹر صاحب نے اپنی تصنیف کے اندر کیا ہے اور چاہتے ہیں کہ انھیں تاثرات کی ترویج تمام تعلیم یافتہ مسلم طبقے کے اندر بھی ہو جائے وہی تاثرات کم و بیش اکثر و بیشتر ان مسلمانوں کے بھی ہیں جو کسی نہ کسی درجے میں موجودہ علوم مغربی کو ہی عرفانِ حق کا ذریعہ سمجھتے ہیں حق کی راہ میں دورِ جدید کا یہ سب سے بڑا فتنہ ہے۔ اگر داعیانِ حق نے اس طرف توجہ نہ کی تو مغربی علوم کے دل دادہ مسلم فلاسفہ اپنی پے در پے کوششوں سے اسلامی تعلیمات کی روح کو مسخ کرکے رکھ دیں گے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس کتاب اور دیگر مضامین و مقالوں کے ذریعے جو وقتاً فوقتاً اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ قرآن کی معنوی تحریفات کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اسی احساس کے تحت راقم الحروف نے "قرآن اور علم جدید" پر تنقید کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ اس تنقید کی پہلی قسط خط کی شکل میں ماہنامہ 'فاران' میں شائع ہو چکی ہے جس میں مصنف کے صرف طرزِ استدلال پر اور ان کے اس نظامِ حکمت پر بحث کی گئی ہے جس کے ذریعے وہ قرآن کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں۔ راقم الحروف کی اس ناچیز کوشش کو اس سلسلے کی دوسری قسط سمجھنی چاہیے۔ اس میں ان فلسفیانہ تصورات پر بحث کرنی ہے جنھیں ڈاکٹر صاحب نے ثابت شدہ علمی صداقت قرار دیا ہے۔ ان تصورات میں سب پر بالا تصورِ ارتقا ہے جو مغرب کے تمام دوسرے کافرانہ نظریات پر حاوی ہے اور غذا پہنچاتا ہے اس لیے سب سے پہلے اسی پر بحث کرنا ہوگی۔

مسئلہ ارتقاء پر بحث کے کئی پہلو ہیں۔

(۱) اس کا تاریخی پس منظر

(۲) اس کا سائنٹفک تجزیہ

(۳) اس کا منطقی و فلسفیانہ پہلو

(۴) انسانی نفسیات پر تصورِ ارتقاء کا اثر

(۵) قرآن واسلام سے اس کی تردید وغیرہ۔

ان تمام پہلوؤں پر تفصیلات سے بحث کرنے کے لیے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے جو راقم الحروف کے زیر ترتیب ہے اور اب ان شاء اللہ جلد ہی پوری ہو جائے گی۔ اس کے سائنٹفک تجزیے کے لیے اس مقالے میں گنجائش نہیں الا یہ کہ چند اشارات پر کفایت کی جائے۔ اس کی تفصیلات میں مشاہدات کی خامیوں اور ان سے غلط نتائج نکالنے پر بحث کی گئی ہے جو صرف انھیں لوگوں کے لیے باعث دلچسپی ہو سکتی ہے جو نتائج اخذ کر کے پوری کائنات کے بارے میں نظریات قائم کرتے ہیں۔ یہاں تو اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ارتقار کا تصور ذہن میں کیسے آیا؟ آیا سائنسی تجربات و مشاہدات پر غور و فکر کے نتیجے کے طور پر یا ایک حقیقت کے انکار کے بعد مجبوراً اپنایا گیا جس طرح ڈاکٹر صاحب موصوف نے نظریہ ارتقار کو ایک ثابت شدہ حقیقت تسلیم کر کے اس کے مفہوم کی تلاش قرآن کی آیات میں کی ہے بالکل اسی طرح مادیین نے خالق کائنات کی کارفرمائیوں کا انکار کر کے کائنات کی مادی تشریح کے لیے نظریہ ارتقار کو اپنایا اور مظاہر کائنات میں اس کی کارفرمائیاں تلاش کیں اور دونوں کو اپنے اپنے دائرہ جستجو میں اپنے اعتقاد کے مطابق دلیلیں اور راہیں مل گئیں۔ مادیین بے چارے تو اب تک اس نکتے کی تلاش میں سرگرداں ہیں جس کے ملنے پر ہی تصور ارتقار کی حقیقت ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس اس نکتے کی پرواہ کیے بغیر تصور ارتقار کو حقیقت تسلیم کر لیا ہے۔ حالانکہ کسی ارتقائی نے اب تک کوئی ایسا نظریہ پیش نہیں کیا جو ارتقار کو حقیقت ماننے کے لیے مجبور کر دے۔ جتنے نظریات پیش کیے گئے اور ابھی تک نئے نئے نظریات پیش کیے جانے کا سلسلہ جاری ہے لیکن کوئی بھی نظریہ ارتقار کے سارے پہلوؤں کی تشریح نہیں کر سکا تا وقتیکہ ارتقار کے سارے پہلوؤں کی بے لاگ تشریح نہ ہو جائے اور کسی ایک نظریے پر سارے ارتقائی متفق نہ ہو جائیں تصور ارتقار کو ثابت شدہ علمی صداقت و حقیقت کا درجہ نہیں مل سکتا۔ جب ارتقائی خود اسے حقیقت مطلق تسلیم نہیں کرتے اور صاف اقرار کرتے ہیں کہ زندگی کے ظہور کا زمانہ کروڑوں سال پہلے کا ہے جس کے معلوم کرنے کا سائنس کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پتہ نہیں اس کا ظہور کیسے ہوا۔ کوئی تجربہ اور مشاہدہ اب تک نہیں کیا جا سکا جس سے ثابت ہوتا کہ زندگی کا ظہور اس طرح ہو سکتا ہے۔ روح اس طرح پیدا ہو سکتی ہے۔ جانوروں اور پودوں کی ایک نوع دوسرے سے تدریجاً پیدا ہوئی کہ انقلاباً؟ اور کس نوع کو کس نوع سے پہلے اور کس کو بعد میں آنے والی سمجھا جائے۔ پہلے جاندار جسم کی اکائی یعنی ایک خلیہ کا وجود ہوا یا اس مادے کا جس سے وہ خلیہ بنتا ہے۔ یہ اور اسی طرح کے سیکڑوں پہلو اور درجے ارتقار کے سلسلے میں ایسے موجود ہیں جو کسی نظریے سے بھی

حل نہیں ہوسکے۔ کوئی تجربہ ایسا عمل میں نہیں آیا جو ان تمام لاینحل پہلوؤں میں سے کسی ایک کا بھی حل پیش کرسکتا لیکن ڈاکٹر صاحب موصوف نے پتہ نہیں کون سا تجربہ کیا اور کس زبردست بات کا مشاہدہ کیا جس کی بنا پر اس حد کو پہنچ گئے کہ قرآنی آیات میں اس کا معنےٰ موجود ہونا ضروری سمجھا۔

مسئلۂ ارتقاء کا تاریخی پس منظر

نظریۂ ارتقاء سائنس کی نہیں بلکہ خالص فلسفۂ دہریت کی پیداوار ہے۔ یورپ کے اندر یہ نظریہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کی پیدائش سے سیکڑوں سال قبل چند فلسفیوں کے ذہن میں پیدا ہوا جنھیں اس بات کے تسلیم کرنے میں سخت تامل تھا کہ خالق کائنات نے ہر جزو کائنات کی الگ الگ تخلیق کی ہے۔ ہر جزء ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے ایک جزء دوسرے کا جنم داتا نہیں بلکہ سبھی مخلوق ہیں۔ یہ فلاسفہ خالق کائنات سے انکار کرنے کے بعد وجود کائنات پر غور و فکر کرنے لگے۔ تخلیق کائنات سے متعلق عجیب و غریب قسم کے قصے کئی پشتوں اور صدیوں سے چلے آرہے تھے کائنات کی تخلیق و انتظام میں ہزاروں دیوتاؤں کا دخل سمجھا جاتا تھا۔ ان دیوتاؤں کی ذات و صفات کا ایک مجموعہ تیار ہوگیا تھا جسے دیومالا کہتے ہیں۔ اس دیومالا کے اثرات جو عام ذہنوں پر رونما ہو رہے تھے مفکرین وقت کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے۔ مذہبی علماء و مشائخ جن کا حکومت میں اچھا خاصا دخل تھا آزاد خیال مفکرین کے درپے آزار تھے اور ان کی کسی معقول بات کے لیے اپنے اندر کوئی گنجائش نہیں رکھتے تھے۔ ان مفکرین پر اس کا ردعمل یہ ہوا کہ انھوں نے دیومالا کی بنیاد پر ہی ضرب لگانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اس مصمم ارادے کے ساتھ اور دل میں یہ بات لیے ہوئے کہ تخلیق کائنات میں کسی ماورائے فطرت طاقت یا ذات کی کارفرمائی تسلیم نہیں کرنی چاہیے جس کی بنیاد پر دیومالا قسم کی نامعقول عمارت کھڑی کی جاتی ہے۔ انھوں نے آثار کائنات پر غور کرنا شروع کیا اور اس حقیقت پر متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے کہ کائنات کی کسی شے کو بھی قرار و استقلال نہیں۔ ایک ایک ذرہ تغیرات کا ایک منظر پیش کر رہا ہے ایک مفکر ان مناظر کا مشاہدہ کرکے جو نتیجہ نکال سکتا ہے وہ یا تو یہ ہے کہ کوئی ایسی ذات ہے جو ان تمام تغیرات کے پس پردہ کام کر رہی ہے اور ایک خاص اسکیم اور قانون کے تحت انھیں وجود میں لا رہی ہے یا پھر یہ ہو کہ ہر شے اپنے آپ مختلف حالات میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ ان کے اندر خود ہی ایک ایسی حرکت موجود ہے جو انھیں کسی حالت پر برقرار نہیں رہنے دیتی۔ ہر ذرہ اپنا خالق ہے۔ اس مفکر کے ذہن میں یہ دونوں باتیں پیدا ہوتی ہیں لیکن چونکہ دیومالا کی نفرت کسی ماورائے فطرت قوت کے تسلیم کرنے میں مانع ہوتی ہے اس لیے لامحالہ دوسرا ہی

نتیجہ قابل توجہ ٹھیرتا ہے۔ اب وہ اپنی جگہ پہلے کر لیتا ہے کہ کائنات کی پیدائش نہیں ہوئی بلکہ یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی لیکن جب تغیرات پر غور کرتا ہے تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ایک ہی جز ہے جو اپنے حالات بدل بدل کر مختلف النوع اشیاء کا منظر پیش کرتا ہے۔ گویا ساری کائنات اس ایک ہی شے کا ظہور ہے۔ اس شے کو وہ کائنات کا ایک نقطہ آغاز تصور کرتا ہے اور بجائے پوری کائنات کے صرف اسی شے کو دائمی مان کر آگے بڑھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نقطہ آغاز سے اربوں سال کے ارتقائی عمل کے ذریعے ساری کائنات کا تدریجاً ظہور ہوا۔ یہ نقطہ آغاز مختلف فلسفیوں کا مختلف رہا۔ کسی نے ہوا کو، کسی نے پانی کو، کسی نے آگ کو، کسی نے اعداد و شمار کی اکائی کو، کسی نے مادے کو اور کسی نے عقل کو نقطہ آغاز تسلیم کیا اور اپنے اپنے نقطہ آغاز کو بنیاد بنا کر ساری کائنات کی تشریح کر ڈالی۔ گویا یہی نقاط آغاز مختلف فلسفیوں کے مختلف خدا ٹھہرے۔

لفظ EVOLUTION جس کے مفہوم کو اردو زبان میں ادا کرنے کے لیے تدریجی ارتقاء استعمال ہوتا ہے ایک یونانی لفظ (EVOLVERE) سے ماخوذ ہے جس کے معنے کسی لپٹی ہوئی چیز کا کھلتے رہنا ہے۔ جیسے سینما کی ریل (CINEMA REEL) جس میں ان سارے مناظر کی عکاسی موجود ہے جو پردہ سیمیں پر نظر آنے والے ہیں جیسے جیسے ریل کھلتی جاتی ہے طرح طرح کے مناظر سامنے آتے جاتے ہیں لیکن ارتقاء کے مفہوم میں ایک اور نہایت ضروری نکتہ شامل ہے وہ یہ کہ عالمگیر تغیر سے جو نئی نئی چیزیں پیدا ہوتی رہتی ہیں وہ یک بیک بے سان و گمان اور اتفاقیہ رونما نہیں ہو جاتیں بلکہ ہر تبدیلی سے جو نئی چیز یا کوئی نیا واقعہ وجود پذیر ہوتا ہے وہ پہلے کی کسی چیز یا واقعہ کے بطن سے ہی پیدا ہوتا ہے اور اپنے جنم داتا کے مقابلے میں کچھ زیادہ پیچیدہ اور ساخت میں کچھ زیادہ بہتر ہو کر نکلتا ہے۔ اس وقت جو اشیاء موجود ہیں چاہے جاندار ہوں یا غیر جاندار اپنی موجودہ شکل و صورت اور ساخت و ترکیب میں آنے سے پہلے زیادہ سادہ شکل و صورت اور زیادہ آسان ساخت و ترکیب کے تھے اور برسہا برس کے عمل ارتقاء کے ذریعے موجودہ حیثیت و ہیئت تک پہنچے۔ لیکن اس نظریے کا چونکہ کوئی سائنٹفک ثبوت مہیا نہیں ہو سکا تھا اسے عام مقبولیت حاصل نہیں ہو سکی۔ بلکہ کتابوں میں بند پڑا رہا۔ تقریباً ڈیڑھ دو ہزار سال بعد جب نشاۃ ثانیہ کا دور یورپ میں آیا تو نظریہ ارتقاء کا از سر نو ظہور ہوا۔ وہ اس طرح کہ پندرہویں صدی عیسوی میں نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے ساتھ فلسفہ پر انقلاب آفریں اثرات پڑنا شروع ہوئے اور اس دور کے مفکرین جو اب تک خالص خیالی دنیا میں سرگرداں تھے، مشاہدہ و تجربے کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ سائنسی تجربات شروع ہوئے۔

نئے نئے انکشافات ہوتے گئے اور تجربات کو آگے بڑھانے کے لیے نئے نئے نظریات قائم کیے گئے لیکن سائنس دانوں نے ان نظریات کو کوئی مستقل حیثیت کبھی نہیں دی وہ انھیں ایک ناپائیدار تصور ہی خیال کرتے رہے جو دوسرے انکشافات کے ذریعے مستقبل میں رد کیے جا سکتے ہیں اور ان کی جگہ پر دوسرے نظریات آ سکتے ہیں لیکن فلسفۂ دہریت کے علمبرداروں نے انھیں بطور قانون قدرت کے اختیار کیا۔ فشتے، شیلنگ اور ہیگل کے فلسفوں نے دہریت کے ابھرنے کا راستہ بند کر رکھا تھا اور دہریت دم توڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ان فلاسفہ کے دلائل کا جواب نہ دے سکنے کی وجہ سے فلسفہ دہریت کے اثرات ختم ہو گئے تھے۔ لیکن فلسفۂ دہریت تصوریت کی جنگ میں دہریت کے حامیین سائنسی اختراعات و نظریات کو اپنی مدافعت کے لیے بطور اسلحہ استعمال کرنے پر مجبور ہوئے۔ اب انھوں نے سائنسی نظریات کے ذریعے مادی اور عقلی مسائل حل کرنے شروع کیے۔

لیکن چونکہ انسانیت کے مسائل صرف مادی اور عقلی ہی نہیں ہوتے بلکہ اخلاقی اور روحانی بھی ہوتے ہیں جو سائنس کی ایجادات و نظریات سے کسی طرح حل نہیں ہو رہے تھے جس کی وجہ سے مادہ پرستوں کی کور دب رہی تھی۔ وہ اسی تلاش میں تھے کہ کہیں سے کوئی سائنس داں حیاتیات پر تجربہ کر کے ایسا نظریہ پیش کر دے جس سے فلسفۂ تصوریت کی طرف سے اٹھائے ہوئے اخلاقی اور روحانی مسائل کا حل نکالا جا سکے ورنہ باوجود ان تمام نظریات کے مادیت کا تصوریت کے سامنے ٹھیرنا ناممکن ہے۔ انھیں حالات میں ڈارون نے اپنے مشاہدات کا نتیجہ جو اس نے دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کر کے حاصل کیا تھا ایک مقالے کی شکل میں پیش کیا۔ ڈارون خود فلسفۂ دہریت کا دل دادہ تھا اور دہریت کے خاندان و ماحول میں پرورش و تربیت پا چکا تھا۔ مادہ پرستوں نے جب اس مقالے کو دیکھا تو ان کی مانگی مراد نظر آئی۔ انھوں نے لاینحل سوالات کے جواب اس مقالے سے اخذ کر لیے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی سوال یہ تھا کہ ہمارے جسم کے مختلف اعضا کی ساخت و ترتیب سے ایک مقصد کا اظہار ہوتا ہے جسے بغیر ایک حکیم و علیم ذات کی مداخلت کے پیدا ہونا ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ خالص میکانکی طاقت کے ذریعے جسم کے اعضا کی حرکت تو ثابت کی جا سکتی ہے لیکن ان کی حرکت میں جو مقصدیت پائی جاتی ہے اس کی کسی طرح توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ اس مسئلے کا حل مادہ پرستوں نے ڈارون کے تنازع للبقا، فطری انتخاب اور بقائے اصلح کے اصول ثلاثہ سے اخذ کر لیا۔

تصور ارتقا کو فروغ دینے میں ڈارون کا ہاتھ صرف اس قدر ہے کہ اس نے اس تصور کو ایک سائنٹفک نظریے کی شکل میں تجربات و مشاہدات کی روشنی میں پیش کیا۔ اس کے پہلے اس تصور کو سائنس کا تعاون حاصل نہیں

تھا۔ بلکہ سائنس داں اسے ایک غیر معقول تصور سمجھ کر کوئی توجہ نہیں دیتے تھے۔ ڈارون بھی تجربہ و مشاہدے کے اشارات سے جو اس نے دنیا کے مختلف پودوں اور جانوروں کے ساتھ کیے نظریہ ارتقا تک نہیں پہنچا بلکہ اس کے ذہن پر پہلے ہی سے یہ تصور مسلط ہو چکا تھا۔ اسے سائنٹفک حیثیت دینے کے لیے ہی اس نے مختلف النوع پودوں اور جانوروں کے اعضاء و جوارح کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ و مشاہدے کے بعد اپنے نتائج مدون کرنے کی فکر میں تھا ہی کہ مالتھس (MALTHUS) کا مقالہ جو اس نے نظریہ آبادی پر ضبطِ تحریر کیا تھا اس کے ہاتھ آگیا۔ اس مقالے نے اس کی رہنمائی کی اور فوراً وہ سرا اسے مل گیا جسے پکڑ کر اپنے مطالعہ و مشاہدے کے نتائج کو ایک نظریے کی شکل دے سکا۔ تنازع للبقا کے لیے مالتھس کے مقالے نے رہنمائی کی اور یہی ڈارون کے پیش کردہ نظریے کی اصل ہے۔

ڈارون کی سائنٹفک تشریح کے بعد سے تصورِ ارتقا کی اہمیت بڑھنے لگی۔ کچھ دنوں تک تو ڈارون کے اصول ثلاثہ جو اس نے ارتقاء کی تشریح کے لیے قائم کیے تھے مرکزِ توجہ بنے رہے اور لوگوں کے ذہن اس پر غور و فکر کے لیے مجبور ہوئے۔ کتنوں نے سائنٹفک تشریح کے آگے سرِ تسلیم خم کیے اور کتنے ایسے بھی نکلے جو ڈارونیت (ڈارون کے اصولِ ثلاثہ) کے ناقابلِ شکست سپاہی بن کر کھڑے ہوئے لیکن بہت جلد ہی اس پر تنقیدوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تنازع للبقا کا اصول مالتھس کے نظریہ آبادی کے ساتھ دفن کر دیا گیا لیکن دوسرے اصول فطری انتخاب کے ماننے والے اور نہ ماننے والے دونوں ہی قسم کے فلاسفہ کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ تیسرے اصول بقاءِ اصلح کا بھی وہی حشر ہوا جو تنازع للبقاء کا ہوا۔ اس طرح ڈارونیت کا تو ایک حد تک خاتمہ ہو چکا ہے لیکن تصورِ ارتقاء کے ثبوت کے لیے جو سائنٹفک طریقہ اس نے اختیار کیا تھا وہ دوسرے ارتقائیوں کے لیے مشعلِ راہ کا کام کرتا رہے گا۔ اب ارتقا اور ڈارونیت لازم و ملزوم نہیں رہ گئے جو ارتقاء کے معنے ڈارونیت سمجھتا ہے وہ تاریخ ارتقاء سے بے خبری کا ثبوت پیش کرتا ہے۔

(باقی)

تحریف کے معنے اور اس کی چند شکلیں

تحریف کے معنے بات یا کلام کے بدل دینے کے ہیں اس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں مثلاً ایک بات کی دیدہ و دانستہ ایسی تاویل کر دی جائے جو قائل کے منشاء کے بالکل خلاف ہو یا کسی عبارت اور کلام میں ایسی کمی بیشی کر دی جائے جس سے اس کا اصل مدعا بالکل خبط ہو کر رہ جائے یا کسی فقرہ و معانی لفظ کا وہ ترجمہ کر دیا جائے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہو یا واضح بات کو سوالات اٹھا کر مبہم بنا دیا جائے۔

مشرقی ممالک میں اشتراکیت

(جناب عبدالحمید، صدیقی)

مغربی ممالک میں جب صنعتی انقلاب برپا ہو رہا تھا تو اس کے نمودار ہونے کے ساتھ ہی اہل مغرب نے مشرقی ممالک کی طرف حریصانہ نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کیونکہ زود پیداواری اور کثیر پیداواری کے لیے یہ ناگزیر تھا کہ دنیا کے مختلف گوشوں میں ایسی منڈیاں تلاش کی جائیں جہاں سے انہیں بھاری مقداروں میں نہایت سستے داموں خام مال فراہم ہو سکے اور جہاں وہ اسی مال کی مصنوعات کو لوٹا کر بہت زیادہ قیمت وصول کر سکیں۔ اپنے اس مقصد کو اہل یورپ نے مختلف اوقات اور مختلف حالات میں مختلف طریقوں سے حل کیا۔ آغاز میں تو انھوں نے یہی غنیمت سمجھا کہ مشرقی ممالک میں انہیں چند تجارتی سہولتیں حاصل ہو جائیں مگر ان کاروباری تعلقات میں جب ان پر مشرقی ممالک کی کمزوریاں آشکار ہوئیں اور انہیں اس امر کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں سیاسی غلبہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے تو انھوں نے فوج کشی کر کے ان ممالک پر بالجبر تسلط قائم کر دیا۔ مگر اس تسلط میں بھی ان کے پیش نظر ہمیشہ یہی بات رہی کہ ان ممالک کو خام مال کی خریداری اور مصنوعات کی کھپت کے لیے منڈیوں کے طور پر استعمال کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے یہاں جو مدت حکمراں کی حیثیت سے گزاری اس میں اجنبی بن کر رہے اور عام آبادی کے ساتھ گھل مل کر زندگی بسر کرنے سے عمداً گریز کیا۔ اس بات کا البتہ انھوں نے ضرور التزام کیا کہ مشرقی اقوام کا اپنی تہذیب، اپنے تمدن، اپنے مذہب، اپنی روایات پر سے اعتماد متزلزل ہو اور ان کے اندر مغربی تہذیب و ثقافت اور مغربی افکار و نظریات کے لیے عقیدت کے جذبات پیدا ہوں۔ وہ اپنی دنیا خود آباد نہ کر سکیں۔ اور اگر کبھی مغرب کی سیاسی غلامی سے آزاد بھی ہوں تو ذہنی غلامی میں گرفتار رہنا پسند کریں۔

اہل مغرب نے سیاسی تفوق کے قیام کے ساتھ ہی اس امر کو بھانپ لیا تھا کہ مشرق کا بیدار ہونا یقینی ہے اور اس بیداری کے بعد اسے مدت دراز تک سیاسی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھنا امر محال ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے

اس کے باشندوں کو ذہنی طور پر غلام بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا۔ اسے ایک ایسا نظام تعلیم دیا جس سے انہیں اپنے معتقدات، اپنے افکار و نظریات پر اعتماد کو سخت دھکا لگا۔ لیکن وہ انہیں مغربی تہذیب کا پوری طرح پرستار نہ بنا سکے۔ اہل مغرب کی ان مذموم کارروائیوں کا سب سے زیادہ نقصان مسلمان قوم کو پہنچا اور ان کے ظلم و ستم کا ہدف زیادہ تر مسلمان ہی بنے۔

اسلام کے سوا مشرقی ممالک میں جتنی تہذیبیں اور جتنے فکری نظام تھے ان میں سے کوئی تہذیب اور فکری نظام ایسا نہ تھا جو مغربی افکار سے براہ راست متصادم ہو۔ جس طرح اہل مغرب نے مذہب کو زندگی کا ایک گوشہ تصور کر کے حیات اجتماعی کی عمارت خالص مادہ پرستی کی بنیادوں پر استوار کر رکھی تھی بالکل اسی طرح مسلمانوں کے ماسوا مشرق کی دوسری اقوام نے مذہب کو زندگی کے اجتماعی معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا اور یہ فرض کر لیا تھا کہ مذہب کو سیاست، معیشت اور معاشرت سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے اور ان سارے معاملات کو دنیوی نظریات و قواعد کے مطابق طے کرنا چاہیے۔

یہ انداز فکر اور یہ طرز عمل مسلمانوں کے ضمیر سے مغائرت رکھتا ہے۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کے اندر اسلام کے ساتھ سچی اور گہری وابستگی انگریز کے اس برصغیر میں آنے سے پہلے بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی ورنہ اسے یہاں قدم جمانے اور مسلمان ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کی جرات نہ ہوتی۔ دنیا پرستی نے اس قوم کے بڑے حصے کو خدا پرستی سے غافل کر دیا تھا۔ مگر اس سے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اسلام سے اس عملی بے تعلقی کے باوجود اس حقیقت کے ہمیشہ معترف رہے کہ ان کی ذلت اور رسوائی کا سبب صرف یہی ہے کہ انھوں نے اللہ کے دین کو چھوڑ دیا ہے۔ دنیا کی دوسری قوموں نے تو ترک مذہب کو فلاح کا ذریعہ سمجھا لیکن مسلمانوں نے اسے ہمیشہ اپنی تباہی و بربادی کا واحد سبب خیال کیا۔ یہ چھپا ہوا احساس ان کے اندر ہمیشہ موجود رہا کہ ان کی زندگی کا نقشہ اللہ اور اس کے رسول کی دی ہوئی تعلیمات سے مختلف ہوا اور یہی ان کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ لہذا اگر وہ دنیا میں اقبال مند ہونے اور عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے آرزو مند ہیں تو انہیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر یہی احساس مختلف تحریکات کی صورت میں وقتاً فوقتاً نمودار ہوتا رہا۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان کی علمی کوششیں، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی تحریک، دیوبند، ندوہ اور اسی نوعیت کے دینی مدارس کا قیام، تحریک خلافت، تحریک پاکستان، سب اسی احساس کے مختلف مظاہر ہیں اور یہ عجیب بات ہے کہ مغربی تہذیب جس قوت کے ساتھ مسلمانوں کے اندر سرایت کرنے کی کوشش کرتی رہی اسی شدت کے ساتھ تصادم

ہوتا رہا سطح میں اہل مغرب اس آویزش کو مسلم قوم کی ہٹ دھرمی اور تعصب پر محمول کرتے ہیں۔ چناں چہ اس موضوع پر جتنی کتب بھی منظر عام پر آئی ہیں ان کے مطالعے سے یہی پتہ چلتا ہے کہ ان کی نظر میں یہ قوم اپنی دشمن ہے اور اسے اپنی برائی اور بھلائی کی کوئی تمیز نہیں۔ ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس میں اس امر کا صحیح طور پر جائزہ لیا گیا ہو کہ جب ساری قومیں مغربی تہذیب ہی میں اپنی فلاح ڈھونڈ رہی ہیں تو آخر مسلمان قوم کیوں اس سے بار بار متصادم ہوتی اور اس کا راستہ روکتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسری اقوام کے تعلقات میں بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں۔ یوں تو اہلِ مغرب کی اس ناسمجھی کے کئی اسباب ہیں مگر ان میں دو بڑے نمایاں ہیں۔

(۱) صنعتی انقلاب کے بطن سے الحاد کی جو تحریک نمودار ہوئی (اور جسے جنم دینے میں اس وقت کے مذہبی حلقے کا بڑا دخل تھا) اس کا واسطہ ایک ایسے مذہب سے پڑا جس نے صدیوں پیشتر ایک نظام حیات کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کے ضمیمے کی حیثیت سے زندہ رہنا گوارا کرلیا تھا اور اپنے اس موقف کو اپنا مقدر سمجھ رکھا تھا۔ اس وجہ سے الحاد کی تنگ نظر پادریوں اور ان کے خود ساختہ نظریات سے تو پنجہ آزمائی ضرور ہوئی مگر مذہب سے اس کا تصادم نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام اس کش مکش کو غیر متعلق تماشائی کی حیثیت سے دیکھتے رہے۔ تاریخ کے اسی تجربے کو سامنے رکھ کر الحاد نے اسلام کے خلاف جنگ جیتنے کی کوشش کی اور یہاں بھی دینی رہنماؤں کو اپنے ظلم و استبداد کا نشانہ بنایا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اسلام اور کفر کی اس کش مکش میں صرف علماء ان کے مدِ مقابل بن کر آئیں گے مگر عام مسلم آبادی اس سے بے تعلق رہے گی اور وہ چند سو یا چند ہزار ملاؤں کو رسوا اور بدنام کرکے یا ان پر مظالم ڈھا کر مغربی الحاد کو امت مسلمہ پر مسلط کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔

گزشتہ دو سو سال کے واقعات نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اہل مغرب نے اسلام کے مزاج اور مسلمانوں کے اس کے ساتھ تعلق خاطر کو سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے۔ یہ دین چند ملاؤں کی اجارہ داری نہیں جنہیں مٹا دینے سے اسے مٹایا جاسکتا ہو بلکہ یہ امت کی عظیم اکثریت کی عقیدت اور محبت کا مرکز ہے اور اس کے قلب و دماغ میں یہ خیال پوری طرح راسخ ہے کہ اس کی بگڑی اگر کسی صورت میں بن سکتی ہے تو اسلام کو ہی سچے دل سے اپنا کر بن سکتی ہے۔ اس ایک صورت کے سوا اس کی فلاح و بقا کی کوئی دوسری صورت نہیں۔ امت مسلمہ کا اسلام پر اعتماد ابھی جوں کا توں قائم ہے۔ یہ فی الحقیقت اس کی بڑی بدنصیبی ہے کہ کسی مسلمان ملک میں بھی سنجیدگی اور اخلاص سے یہ کوشش نہیں کی گئی کہ اجتماعی معاملات کو طے کرنے کے لیے رشد و ہدایت کے اس واحد سرچشمے کی طرف دل و جان سے رجوع کیا جائے۔ اسلام کا نام تو بلاشبہ

وقتاً فوقتاً استعمال ہوتا رہتا ہے۔ اس مقدس نام پر لوگوں کو دھوکے بھی دیے جاتے ہیں مگر اسے خلوص نیت کے ساتھ اپنانے کی کوشش نہیں کی جاتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام کے دل میں اگر نفرت و حقارت کے جذبات پائے جاتے ہیں تو وہ اسلام کے خلاف نہیں بلکہ ان لوگوں کے خلاف ہیں جو اس مقدس نام سے ناجائز فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اس کی تقدیس ان کے دلوں میں پوری طرح موجود ہے اور وہ اسے ایک خاص مذہبی طبقے کی میراث نہیں سمجھتے، بلکہ اپنی زندگی کی سب سے قیمتی متاع سمجھتے ہیں۔ اس بنا پر جب اس پر کوئی آنچ آتی نظر آتی ہے تو وہ اس المیے کو خاموش تماشائی کی حیثیت سے نہیں دیکھتے، بلکہ آگے بڑھ کر دشمن کی یلغار کو روکتے ہیں۔

(۲) اہل مغرب نے اس معاملے میں جس دوسری اہم حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے وہ یہ ہے کہ الحاد اور مسیحیت کی پہلی جنگ سیاست، معیشت اور معاشرت کے میدانوں میں نہیں لڑی گئی، بلکہ تخیلات اور مابعد الطبیعیات کے دور دراز گوشوں میں لڑی گئی تھی۔ اہل مذہب نے مسیحیت کے نام پر کائنات کے بارے میں عجیب و غریب نظریات گھڑ رکھے تھے جن میں سائنسی انکشافات کے مقابلے میں آنے کی قوت نہ تھی مگر ہر شخص میں نہ تو اتنا علم تھا اور نہ شعور کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان فیصلہ کر سکتا اور یہ دیکھ سکتا کہ علمی تحقیقات کے سامنے توہمات زیادہ دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ اس کے مقابلے میں آج اسلام اور الحاد کے درمیان جنگ ان میدانوں میں لڑی جا رہی ہے جن میں انسانوں کو کوئی فریب نہیں دیا جا سکتا۔ حقائق کا حقائق سے مقابلہ ہے، شواہد کی شواہد سے ٹکر ہے اور زندگی کے ٹھوس مسائل میدان عمل میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ میں اپنی اس بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔

مغربی مفکرین اور سائنس دانوں اور مسیحی پادریوں کے مابین جو آویزش ہوئی اس کا محور زمین کی حرکت، چاند کی گردش، کائنات کا آغاز و انجام یا اسی نوعیت کے دوسرے طبیعیاتی مسائل تھے۔ اس آویزش نے بعض اوقات تشدد کی صورت بھی اختیار کی جس کے نتیجے میں نہایت قیمتی جانیں بھی تلف ہوئیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسائل خواہ کتنی ہی بنیادی اہمیت کے حامل ہوں اور ان پر تحقیق نتائج کے اعتبار سے خواہ کتنی ہی دور رس ہو، مگر ایک عام آدمی کے لیے یہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتے اور وہ بے چارہ نہ تو اتنا علم رکھتا ہے اور نہ ایسے سائنسی آلات رکھتا ہے جو اسے کسی حتمی نتیجے پر پہنچنے میں مدد دیں۔ اس کے نزدیک ان کی حیثیت سنی سنائی باتوں کی سی ہے جس دلیل پر دل کو اطمینان ہو گیا اسے قبول کر لیا اور جس سائنس دان کے علم پر بھروسہ کر لیا اس کی تصریحات کو صحیح مان لیا۔ ان مسائل کے بارے میں عام لوگوں کے نظریات یا میلانات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

مگر اسلام اور الحاد کی کشمکش بالکل واضح ہے۔ اس کے مختلف محاذوں کو بھی لوگ اچھی طرح جانتے ہیں جس گولہ بارود سے

یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے اس کے عناصر ترکیبی کو بھی ہر شخص بخوبی سمجھتا ہے۔ پھر جن مسائل میں تصادم ہو رہا ہے وہ بھی سب لوگوں پر پوری طرح آشکارا ہیں اور ہر فرد ان کی نوعیت کو اچھی طرح جانتا ہے اور پہچانتا ہے مثلاً کون اس حقیقت سے آج ناواقف ہے کہ جس ملک میں سرمایہ داری آتی ہے وہاں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوتا ہے وہاں ملکی دولت کا بیشتر حصہ ایک محدود طبقے کے اندر سمٹ کر رہ جاتا ہے، وہاں لوگوں کے اندر ہوس زر پیدا ہوتی ہے اور بے کسوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں جب اشتراکیت آتی ہے تو سنگین قسم کی آمریت کا تسلط قائم ہوتا ہے اور انسانوں کو بے جان آلات کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے منحوس سائے میں لطیف احساسات کی پنکھڑیاں مرجھا جاتی ہیں اور اخلاق اور روحانیت کی مٹی پلید ہو جاتی ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جو سورج سے زیادہ روشن ہیں۔ انہیں جاننے کے لیے کسی گہرے علم، کسی وسیع تجربہ گاہ اور کسی بیش قیمت سائنسی سامان کی ضرورت نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جو جنگ ان کھلے میدانوں میں لڑی جا رہی ہو اس کے بارے میں عام آبادی کو کسی قسم کے دھوکے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ تلخ اور افسوسناک حقیقت آخر عوام کی نظر سے کس طرح اوجھل رہ سکتی ہے کہ جن جن ممالک کی طرف سرمایہ داری اور اشتراکیت نے رخ کیا وہاں دنیا پرستی کا دور دورہ ہوا اور خدا سے بغاوت اور مذہب سے انحراف کی راہ ہموار ہوئی اور انسان نے مادی دنیا اور اس کی لذات ہی کو اپنی زندگی کا مقصود و مطلوب قرار دیا۔

ان حقائق کے کھل کر سامنے آ جانے کے بعد اگر مسلم قوم کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جائے تو وہ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں لعنتوں میں سے کسی لعنت کو بھی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ اہل مغرب نے ایک طویل تجربے کے بعد اس حقیقت کو کسی حد تک سمجھ لیا ہے اس لیے انھوں نے اب مسلمانوں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ طریق کار اختیار کر رکھا ہے کہ سرمایہ داری نے مسلم ممالک میں جس افلاس کو جنم دیا ہے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور عوامی جذبات کو مشتعل کر کے مسلم قوم کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ اس کی غربت اور فاقہ مستی کا اگر کوئی کارگر علاج ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ اشتراکیت کی راہ اختیار کرے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو کہ سرمایہ داری اور اشتراکیت تو ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کی آپس میں سر پھٹول بھی ہوتی رہتی ہے۔ پھر سرمایہ داری مسلم ممالک میں اشتراکیت کی ہمنوائی کیونکر کر سکتی ہے مگر یہ حالات کا بالکل سطحی مطالعہ ہے۔ سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کی اساس مادیت ہے۔ اس بنا پر اصل کے اعتبار سے وہ دونوں ایک ہیں۔ ان کے درمیان جو کچھ فرق ہے وہ محض طریق کار کا ہے۔

سرمایہ داری نظام میں مادیت کی یلغار پیدائش دولت سے شروع ہوتی ہے اور پھر وہ مذہب و اخلاق کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور ملک کے سارے وسائل کو براہ راست اپنی تحویل میں لینے کے بعد مذہب، اخلاق اور معاشرت پر حملہ آور ہوتی ہے اور اس پر اپنا تسلط قائم کرتی ہے۔

اشتراکیت کی ٹیکنک زیادہ مؤثر اور انقلاب انگیز ہے کیونکہ اقتدار پر بالجبر قبضہ کرنے کی وجہ سے کسی قوم کی پوری دولت، اس کے سارے وسائل اور ملک کی پوری انتظامی مشینری، الغرض اس کی پوری قوت اس کے ہاتھ میں سمٹ آتی ہے اور پھر کوئی ادارہ یا گروہ اس کی غیر معمولی طاقت کی تاب نہیں لا سکتا۔ چناں چہ مسلمان قوم کو مغربی تہذیب میں رنگنے اور اسے معاشرتی، معاشی اور فکری اعتبار سے مغرب کا غلام بنانے کے لیے اشتراکی انقلاب زیادہ موزوں اور مناسب ہے۔ اہل مغرب کے نزدیک یہ حربہ کس قدر موثر ہے اس پر کئی ایک کتب شائع ہوئی ہیں ہم ذیل میں ایک کتاب تجدد کا چیلنج کے بعض اقتباسات پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہوگا کہ سرمایہ دارانہ ممالک مشرقی ممالک میں اشتراکیت کے فروغ کو کیوں ضروری سمجھتے ہیں اور اس کے تسلط کے لیے آمریت کی کیوں تائید کرتے ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ جو انقلاب پسند طبقہ (معاشرے کی مغربی نظریات کے مطابق) تجدید کے لیے آگے بڑھے گا وہ اس کام کو آزاد جمہوری فضا کے اندر سرانجام نہ دے سکے گا۔ ان نظریات کے تسلط کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ معاشرتی اور معاشی قوت کا بیشتر حصہ حکومت کے قبضے میں ہو، تاکہ وہ رائے عامہ کے علی الرغم بہت سے ناپسندیدہ اقدام کر سکے اور لوگوں کی روایات اور ان کے دل پسند نظریات کو ہدف تنقید بنا سکے۔ معاشی ترقی کا خواب آزاد معیشت میں کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

جمہوریت ہر بیماری کا تریاق نہیں ہو سکتی اور نہ یہ ہر ملک کے لیے موزوں اور مناسب ہے۔ انسانی ارتقاء میں بعض ایسی منازل بھی آتی ہیں جن میں مطلق العنانیت ایک ناگزیر ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ (اس قوم کے دل و دماغ کو) صدیوں کی روایت کے ملبے سے صاف کیا جائے اور جاہل عوام پر ایسے تغیرات ٹھونسے جائیں جنھیں وہ خوشی سے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں۔ مشرقی قوموں کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تبدیلی سے پہلے غیر معاشی حالات میں تغیر لایا جائے۔ اس بنا پر ان سارے ممالک کی اولیں ضرورت ہے کہ یہاں ایک ایسی نئی قیادت کو ابھارا جائے جو ان سارے تغیرات کے بوجھ کو اٹھانے اور ان کے خطرات کو مول لینے کے لیے تیار ہو اور اپنے دل کی گہرائیوں سے اس بات کا مصمم ارادہ رکھتی ہو کہ اسے اپنے معاشرے کی روایات کو قوت کے ساتھ توڑنا ہے اور عوام کو اس غیر معمولی ایثار کے لیے آمادہ کرنا ہے جو اہل مغرب کو مختلف تغیرات میں سے

گزرتے ہوئے کرنا پڑا۔

یہ نئی قیادت اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑی سخت اور متشدد ہونی چاہیے اور اسے اس حقیقت کا برملا اظہار کرنا چاہیے کہ وہ جمہوری طریقوں سے حکومت کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اس کی سیاسی بصیرت میں صرف دو عزائم ہی کارفرما ہونے چاہییں۔

(۱) معاشرے کو زیر و زبر کرنے کا عزم۔ (۲) اور معاشرے کو ایک آہنی نظم و ضبط میں جکڑنے کا ارادہ

اس نئی قیادت کو یہ بات پوری طرح ذہن میں رکھنی چاہیے کہ روایتی اداروں اور روایتی افکار کے اندر تبدیلی آہستہ آہستہ نہیں بلکہ یک لخت ہی لائی جاتی ہے۔ کسی معاشرے کے مختلف شعبوں میں پیوند کاری یا اس کے کسی ایک گوشے یا دوسرے گوشے میں تبدیلی نئی پیچیدگیاں پیدا کرتی ہے۔ اس بنا پر نئی اور بامقصد قیادت کو ایک وار میں زندگی کا پورا ڈھانچہ بدل دینا چاہیے تاکہ اس کا ماضی سے آناً فاناً رشتہ منقطع ہو جائے اور اس کے اندر نئی متوازن عادات ابھر سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ نئی قیادت ایک ایسی آمرانہ ریاست کی تشکیل کرے جو مروجہ نظام کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے اور ایک ہی دھکے کے ساتھ لوگوں کو اپنی روایات کی دلدل سے نکال دے اور ان کے قدیم معتقدات اور مذہبی اعمال پر پوری شدت سے حملہ آور ہو۔ نیز اس قیادت کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ فرد کے حقوق کو نظر انداز کرے۔ معاشرے میں جن اداروں اور گروہوں کو کسی قسم کے تحفظات حاصل ہیں انہیں ان سے محروم کرے اور کسی جماعت یا مفاد کو تجدد کی راہ میں حائل نہ ہونے دے۔

یہ نئی قیادت جس گروہ کو معرض وجود میں لائے گی وہ بڑا سخت جان، بڑا منظم اور تنظیمی صلاحیتوں سے پوری طرح بہرہ مند ہوگا۔ اس میں بلاشبہ کچھ خامیاں بھی ہوں گی مگر اس میں اتنی قوت اور خود اعتمادی ضرور ہوگی کہ وہ تجدید کی راہ میں ان ساری رکاوٹوں کو دور کر سکے جنہیں بعض معاشرتی روایات نے جنم دیا ہے۔

اس نئی قیادت کو سب سے پہلے سست رفتار معاشرتی قوتوں سے نبرد آزما ہونا ہے اور مغرب میں نشاۃ ثانیہ اور تحریک احیاء العلوم نے جس روح کو جنم دیا ہے اسے اچھی طرح اپنا کر آگے بڑھنا ہے۔ مغربی اقدار، مغربی احساسات، مغربی محاسن اور مغربی نقطۂ نظر سے قائدانہ صلاحیت کو اپنائے بغیر کوئی ترقی ممکن نہیں اور جب تک مشرقی معاشرے اپنے آپ کو مغرب کی ساری صفات سے اچھی طرح متصف نہیں کر لیتے، ان میں جدید مسائل کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کی اہلیت پیدا نہیں ہو سکتی۔

اس منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ایک ایسا نیا نصب العین درکار ہے جو نہ صرف معاشرتی اقدار کے قدیم پیمانوں کو پوری قوت کے ساتھ تبدیل کر دے بلکہ نئے نظام اخلاق کی بھی صورت گری کرے۔

یہ نصب العین ایک ایسا تیزاب ہو جس میں مروجہ معاشرتی روابط خود بخود تحلیل ہو کر رہ جائیں۔ اس انقلاب انگیز نصب العین کی کئی شکلیں اور صورتیں ممکن ہیں مگر اس کا مقصد بہر طور یہ ہونا چاہیے کہ وہ مذہب اور اس کی روایات کی بے ہنگم قوتوں کو پامال کرے اور توڑے اور ایک ایسا نیا مضبوط انسان پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو جو اپنے آپ کو پوری طرح تبدیل کرے اور معاشرے کو بھی مکمل طور پر بدل ڈالے جب تک اس نئے نصب العین میں لوگوں کی زندگیوں میں بالجبر انقلاب لانے اور پرانی روایات کو توڑنے کی قوت پیدا نہیں ہوتی۔ ایسی روایات جنہوں نے ذہنوں کو زنگ آلود کر کے عوام کی صلاحیتوں کو بے کار بنا دیا ہے۔ اس وقت تک وہ صحیح معنوں میں حریت اور آزادی کے حصول کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔"

مسٹر سینائے نے اپنی کتاب میں مشرق کو مغربی تہذیب کا پرستار بنانے کے لیے جو نسخہ پیش کیا ہے اس کے اجزا کا بار بار مطالعہ کیجیے اور دیکھیے کہ کس چالاکی اور ہوشیاری کے ساتھ بربادی کا یہ مرکب تیار کیا گیا ہے اور اگر مشرق کی کوئی ہوشمند قوم اس کی ہولناکیوں کا احساس کرتے ہوئے اس زہر کو پینے سے انکار کر دے۔ تو اسے زبردستی پلانے کے لیے کس تشدد کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ یہ سارا پروگرام اس مفروضے پر طے کیا گیا ہے کہ مشرق کی ساری اقوام فکر و نظر کے اعتبار سے تہی دامن ہیں۔ وہ اپنے پاس کوئی ایسا انقلابی نصب العین اور ضابطہ نہیں رکھتیں جن کے بل پر وہ دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی بسر کر سکیں۔ انہیں اگر دنیا میں خوش حالی کی زندگی بسر کرنا ہے تو اس کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ مغربی تہذیب و تمدن کو پوری طرح اپنانے کی کوشش کریں۔ مگر یہ ہمہ گیر انقلاب کسی مشرقی قوم کو آزادی کی فضا مہیا کر کے جمہوری طریق سے لایا نہیں جا سکتا۔ کیونکہ ان اقوام کا مذہب اور اس کی روایات اس انقلاب کی راہ میں حائل ہو جاتی ہیں۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنے اور مشرقی قوموں کو بالجبر مغربی تمدن میں رنگنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انہیں کسی ایسے انقلاب انگیز نصب العین کو اپنانے پر مجبور کر دیا جائے جس سے ان کے فکر و نگاہ کے زاویے اور جذبہ و احساس کے ڈھانچے دفعتاً تبدیل ہو جائیں اور وہ خود اپنی مذہبی روایات توڑ کر اور اخلاقی ضابطوں سے بغاوت کر کے مغربی افکار و نظریات اور مغربی تمدن کی علمبردار بن جائیں۔

کسی قوم کو اس کی روایات سے بیگانہ بنانا کوئی ایسا کام نہیں جس کے لیے وہ خوش دلی سے تیار ہو جائے۔ اس بنا پر مسٹر سینائے نے کھل کر یہ کہا ہے کہ یہ کام آمریت، تشدد کی مدد سے ہی بخوبی سرانجام دے سکتی ہے۔ چنانچہ اس

نئی قیادت کی کامیاب جدوجہد کے لیے تین چیزیں از بس ضروری خیال کی ہیں ۔

(۱) ایک ایسا خیال انگیز نصب العین اور معاشرت، سیاست اور معیشت کا ہمہ گیر نظام جو سیلاب بنکر امڈ پڑے اور مذہب اور مذہبی روایات کو پوری قوت کے ساتھ اپنے ساتھ بہالے جائے اور مغربی تہذیب کی نشو ونما کے لیے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ زمین ہموار کر دے ۔

(۲) اس نئی قیادت کا مزاج سراسر آمرانہ ہو اور وہ قوم پر نہایت سخت قسم کی آمریت مسلط کرے اور اپنے انقلاب انگیز عزائم کی تکمیل میں رائے عامہ کو قطعاً درخور اعتنا نہ سمجھے، بلکہ اگر کسی گوشے سے بھی اختلاف کی معمولی آواز بھی بلند ہو تو اسے سختی سے دبا دے ۔

(۳) یہ قیادت انقلاب کے لیے تشدد پر کامل ایمان رکھتی ہو اور قوم سے ہر بات جبر کے ساتھ منوانے کے لیے تیار رہو۔ جو لوگ اس کے انقلابی پروگرام کا ساتھ دینے میں ذرا سست رفتاری کا ثبوت دیں انہیں بلا تامل نیست و نابود کر دے ۔

مسٹر سینائے کے تجزیے کے مطابق یہ کام صرف اشتراکیت کے ہاتھوں ہی بڑی خوبی کے ساتھ سرانجام پا سکتا ہے اور صرف کامریڈوں کے جتھے انقلابی ضرورت کو پورا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ فاضل مصنف کے قول کے مطابق اشتراکیت ایک ایسا انقلاب انگیز نصب العین ہے جو طوفان بنکر اٹھتا ہے اور مذہب اور اس کی روایات کو چشم زدن میں تاراج کر کے رکھ دیتا ہے۔ دوسرے اشتراکیت آمریت کی راہ اختیار کرنے کی وجہ سے بڑی منہ زور ہوتی ہے اور اس کی بے حس جکڑ بندیاں اشتراکیت کے علمبرداروں کو دین اور اخلاق برباد کرنے کی کھلی چھٹی مہیا کرتی ہیں اور انہیں اس بات کے مواقع فراہم کرتی ہیں کہ وہ ان لوگوں کو جو اس کی راہ میں مزاحم ہوں اذیت ناک عذاب دے کر موت کے گھاٹ اتار دے۔ مادیت، آمریت اور تشدد یہ وہ تثلیث ہے جس پر ہر اشتراکی پورا پورا ایمان رکھتا ہے اور ان تینوں میں سے کسی ایک کا انکار اشتراکی شریعت میں ناقابل معافی جرم ہے ۔

اس ضمن میں سینائے صاحب کا استدلال ملاحظہ فرمائیں ۔

"دورِ جدید میں اشتمالیت بیسویں صدی کے سرمایہ دارانہ انقلاب کا نہایت اچھا نعم البدل ہے جو بدقسمتی سے روایت پرست معاشروں میں کامیابی کے ساتھ برپا نہ کیا جا سکا۔ یہ نظام بلاشبہہ متشددانہ اور کلیت پسندانہ ہے مگر پس ماندہ معاشروں کو صنعتی اور جدید بنانے اور معاشی تعلیمی اور سائنسی میدانوں میں انہیں مغرب زدہ بنانے کے لیے یہ نہایت ہی کارگر ہتھیار ہے اور پھر چونکہ اس میں کسی معاشرت کی گہری روایات کے انکا

کا بھی حوصلہ ہوتا ہے اس لیے کسی نئے صنعتی معاشرے کی تعمیر و ترقی کے لیے اس سے بے پناہ قوت مہیا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ نظام اپنی وحشیانہ طاقت کے بل بوتے پر پوری قوم کو کام پر لگا سکتا اور معاشرے کو زیر و زبر کر سکتا ہے اور وحشیانہ بے حسی کے ساتھ ہر جماعت اور طبقے کے دعوے کو نظر انداز کر سکتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہو۔ پھر اس نظام کو برپا کرنے میں لوگوں پر جو مصائب آئیں یا وہ جن شدائد سے دوچار ہوں سوشلزم ان کے بارے میں آنکھیں بند کر کے آگے بڑھنے کی تلقین کرتا ہے۔

اشتمالیت نے خود آگے بڑھ کر ایک ایسی "مملکتی سرمایہ داری" یا نوکر شاہی کو جنم دیا ہے جو کسی صنعتی معیشت کا نقشہ تیار کرنے، اسے کامیابی کے ساتھ چلانے اور اس کا بہتر طور پر انتظام و انصرام کرنے کے لیے انسانوں کے اندر مغربی صفات اور خوبیاں پیدا کرتی ہے۔ "مملکتی سرمایہ داری کی تشکیل اشتمالیت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔"

مسلمانوں بالخصوص دیندار مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سینائے صاحب کی ان تصریحات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں اصل کے اعتبار سے کچھ بھی فرق ہے؟ اور کیا اشتراکیت کا مقصد مغرب کی اسی مادیت کو فروغ دینا نہیں ہے جسے سرمایہ داری اپنے جلو میں لے کر آگے بڑھی ہے؟ ان کے مابین اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ جس بگاڑ کو سرمایہ داری آہستہ آہستہ لاتی ہے اسے اشتراکیت یک بار قوت کے زور سے آناً فاناً مسلط کر دیتی ہے۔ سرمایہ داری جس مفسدانہ و مہلکانہ عمل کا آغاز کرتی ہے، اشتراکیت اسے نہایت سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے۔

ڈھاکہ میں عظیم الشان اسلامی کانفرنسیں

پلٹن میدان میں جماعت اسلامی کے جلسے میں جو کچھ پیش آیا اس سے مشرقی پاکستان کے عوام کے حوصلے اور عزائم شکست کھانے کے بجائے اور بلند ہو گئے۔ ڈھاکہ شہر نے ۲۳ جنوری کو لال باغ کی شاہی مسجد میں ہزاروں علماء اور مشائخ کو جمع ہوتے اور اسلامی نظام قائم کرنے کا عہد کرتے ہوئے دیکھا۔ اس اجتماع عظیم کی صدارت مولانا ظفر احمد عثمانی نے انجام دی۔ ۲۴ جنوری کو رمنا ریس کورس کے وسیع و عریض میدان میں ایک عظیم اجتماع عام منعقد ہوا اس میں ڈیڑھ لاکھ مسلمان شریک ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے متعدد معتقد علمائے دین نے اس اجتماع سے خطاب کیا۔ مشائخ کانفرنس اور جمعیۃ العلماء اسلام (تھانوی گروپ) کے جلسے کی عظیم کامیابی کے بعد اسلامیان مشرقی پاکستان کی اسلامی کانفرنس ۸ فروری کو رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں ہوئی۔ ۲۶ ہزار رضاکار انتظام میں مشغول تھے حاضری کم و بیش پانچ لاکھ تھی۔

(ہفتہ وار زندگی لاہور)

لاٹری

ایک خوش رنگ، مگر کڑوا پھل

(جناب سید علی، کلکتہ)

ہمارا ملک ہندوستان جتنا عظیم ہے ہمارے رہنما اتنے عظیم نہیں رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک ترقی کی منفی سمت میں زیادہ پھل پھول سکا ہے۔ اگرچہ بہت تعمیری اقدامات مختلف محاذوں پر کیے بھی گئے ہیں لیکن تقلیدی ذہن کے نیچے تعمیری نقش ونگار دب کر رہ گئے ہیں۔ ہندوستانی افکار واذہان پر مغرب کے گہنائے ہوئے آفتاب کی شعاعیں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لیے سارا ڈھانچہ ہی مغرب کا رہین منت ہے۔ سماجی ہو یا معاشی یا تعلیمی ہر ایک شعبے پر یورپی چھاپ پڑی ہوئی ہے اور یہی سبب ہے کہ یورپ جب اپنے ہلاکت خیز تجربوں سے بیزاری کا اظہار کرنے لگتا ہے تو اس کی چیخ و پکار ہمارے ملک کے کانوں میں دل نواز اور سریلی آواز بنکر گونج اٹھتی ہے اسی ٹوٹے ہوئے ساز کی لے پر پورا ملک تھرکنے لگتا ہے یورپ نے عورتوں کو آزادی کے نام پر اس اس انداز سے لوٹا کہ وہاں کے روشن خیال مصلحین بھی چیخ اٹھے اور ہم نے اس چیخ کو لتا منگیشکر کی مدھر آواز سمجھ کر لبیک کہا اور اس تجربے سے گذر رہے ہیں جس تجربے کے بعد یورپ اپنے سماجی کھوکھلے پن پر ماتم کر رہا ہے۔ اب ہپی ازم کے نام پر جو سماج وہاں تیار ہو رہا ہے اور جو شہروں کی اکتا دینے والی زندگی سے گھبرا کر پہاڑوں اور غاروں میں پناہ لینے پر آمادہ ہے ہم اسی چھوت کی بیماری کو اپنے مریض ملک میں بہ آسانی پھیلنے کا موقع فراہم کر رہے ہیں —— اور المیہ تو یہ ہے کہ یہ سب ملک کی ترقی کے نام پر ہو رہا ہے۔

یورپ اگر ام الخبائث، شراب کو پانی کی جگہ استعمال کر سکتا ہے تو یہ ملک بھی کیوں پیچھے رہتا۔ چنانچہ مرد تو مرد صنف نازک میں بھی شراب نوشی کا چلن تیزی کے ساتھ بڑھتا چلا جا رہا ہے اور شراب نوشی ترقی کا ایک اہم زینہ سمجھی جانے لگی ہے۔ اس کی آمدنی طلبہ کی فلاح وبہبود اور تعلیمی ترقی کا بہترین وسیلہ بن چکی ہے۔ اس راہ میں گاندھی

بھی رول نہیں بن سکے جن کی عظمت کی ہر لیڈر سو بار مالا جپتا ہے — یہ چسکا اب طلبہ اور طالبات میں بھی جڑ پکڑ رہا ہے۔ دیکھیے اس ملک کی نسل پرستی کا جنون کس انداز سے غالب آتا ہے۔

ایک اطلاع کے مطابق ہندوستانی معیار تفریح بلند کرنے اور غیر ممالک کے سیاحوں کی دلچسپیوں کے لیے جاپان سے دل بہلانے والی خواتین درآمد کی جانے والی ہیں اور اس طرح زرمبادلہ میں اضافے کا کافی امکان ہے۔ غالباً جاپان کا انتخاب اس لیے کیا گیا ہے کہ اس نے ۲۵ برسوں کے اندر (جو ہندوستان کی حصول آزادی سے صرف دو سال زائد ہے) محیر العقول ترقی کی ہے۔ ہو سکتا ہے اس ترقی میں وہاں کی دل بہلانے والی مشہور عالم دوشیزائیں "گیشا" ہی کا عمل دخل ہو۔

ہمارے ملک میں ایک تازہ لعنت وبائی شکل میں پھوٹ پڑی ہے اور وہ ہے لاٹری۔ یہ وہی لاٹری ہے جس کے موجد بھی یورپی ممالک ہیں جہاں خوش حالیاں اُبلتی ہیں اور جہاں دولت کی ریل پیل نت نئی تباہیوں کی تلاش میں رہتی ہے۔ سولھویں صدی سے بیسویں صدی کے وائل تک مغربی اور کئی ایک ایشیائی ممالک نے لاٹری کے تلخ تجربات کیے اور جب اس کی وجہ سے اخلاقی دیوالیہ پن اور معاشی بحران کا سامنا ہوا تو انھوں نے اپنے ملک سے اس کو نکال باہر کیا اور اب اسے ہندوستان نے اچک لیا ہے اس نئے جادو کے ڈنڈے سے صنعتوں کے آسمان سے باتیں کرنے اور رفاہی و فلاحی اسکیموں کے اوج کمال پر پہنچنے کے روشن امکان پیدا ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لاٹری انگریزوں نے اپنے دور حکومت میں رائج کی تھی اور اس سے حاصل شدہ آمدنی مختلف رفاہی کاموں میں استعمال کی جاتی تھی۔ ایک اسکیم یہ بھی تھی کہ کلکتہ کو عروس البلاد بنایا جائے گا۔ لیکن برطانیہ کی پارلیامنٹ کے کچھ ارکان نے لاٹری بند کر دینے کی تجویز پیش کی اور بالآخر اسے بند کر دیا گیا۔ نہ جانے انہیں اس کا کیسے خیال آیا کہ کلکتہ تو نئی نویلی دلہن بن جا سکتا ہے لیکن بہتوں کے سہاگ اجاڑ کر۔

اب پھر لاٹری کا عام چلن ہو گیا ہے اور گجرات کے علاوہ تمام ریاستوں میں حکومت کی سرپرستی میں اسے بھرپور فروغ دیا جا رہا ہے۔ اس وقت درجنوں قسم کی لاٹریوں کے ٹکٹ فروخت ہو رہے ہیں۔ اس لاٹری سے جہاں حکومت کو خاطر خواہ فائدہ ہو رہا ہے وہاں دو چار خوش نصیبوں کے نصیبے جاگ اٹھے ہیں البتہ لاکھوں انسانوں کی جیب کی رقمیں مقدر کے کھیل میں ضائع ہو رہی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ خوش فہمیوں میں دن گزارنے کی عادت بھی پڑ جاتی ہے۔

یہ دیکھا جا رہا ہے کہ لاکھوں افراد جو مزدوری کرتے ہیں یا نوکری، جن کی تنخواہیں اور اجرتیں اپنے کنبے کی پرورش

کے لیے اس ہوشربا گرانی میں ناکافی ہوتی ہیں وہ راتوں رات لاکھ پتی بن جانے کے چکر میں اپنی آمدنی کا معتد بہ حصہ کئی کئی لاٹریوں کے ٹکٹ خریدنے میں صرف کر رہے ہیں نتیجے کے اعلان تک ان کے ذہنوں میں لاکھوں روپیے کی جھنجھناہٹ گونجتی رہتی ہے۔ نت نئی کاروں کا سلیکشن ہوتا رہتا ہے۔ عمدہ بیش قیمت گھڑی، صوفہ سیٹ، ریڈیو سیٹ ۔۔۔۔ اور بہت سارے خوابوں کے محل تعمیر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے اعصاب پر ان کی قوت کارکردگی پر اور لازمًا کارخانوں صنعتی اداروں اور دوسرے وسائل پیداوار پر اس کا گہرا اثر پڑتا ہے اور پیداوار متاثر ہوتی ہے۔ دو چار قسمت والے دس بیس روپیے میں یقینًا لاکھ پتی بن جاتے ہیں لیکن لاکھوں کی آرزوئیں اور تمناؤں کا خون کر کے ــــ کیا یہ قتل جائز ہے؟ ناکام افراد میں نفسیاتی طور پر حرص و آز کی پیاس بڑھتی ہے، وہ جھنجھلاہٹ کے شکار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس مرتبہ نہ سہی دوسری بار، پھر نہ سہی پھر سہی ۔۔۔ اور اس طرح نہ ختم ہونے والا چکر چل پڑتا ہے۔ دوسری طرف جن خوش نصیبوں کے پلّے اچانک اتنی بڑی رقم کا بوجھ آپڑتا ہے بسا اوقات وہ اسے سہار نہیں پاتا، یا دوسروں کی نگاہوں میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگتا ہے اور گویا بددیانتی کے فروغ کا ایک نیا دروازہ کھل جاتا ہے۔

کچھ دنوں پہلے یہ خبر نظر سے گزری کہ ایک معمولی کلرک نے اپنی پوری تنخواہ سے لاٹری کے لیے ٹکٹ خرید لیے لیکن قسمت نے دھوکہ دیا، ایسے اس کی فکر ہے کہ ایک مہینے تک اس کے بیوی بچے کیا کریں گے ــــ قرض، بھیک چوری یہی سب راہیں تو باقی رہ جاتی ہیں۔

لاٹری کی لعنت رفتہ رفتہ بچوں اور عورتوں میں بھی اپنا اثر و نفوذ بڑھاتی چلی جا رہی ہے۔ بچوں اور عورتوں کی قسمت لاٹریوں سے آزمائی جاتی ہے گویا سعد و نحس، خوش قسمت اور بد قسمت کا مدار لاٹری میں کامیابی یا ناکامی پر ہے توہم پرستی تو خود ایک قابل علاج مرض ہے مگر لاٹری اس مرض کو اور مہلک بنانے میں معاون ہو گئی ہے۔ اس کا نتیجہ آگے چل کر کیا رخ اختیار کرے گا وہ وقت ہی فیصلہ کرے گا۔

اب تو یہ بھی دیکھا جا رہا ہے کہ جہاں گلی گلی کوچوں کوچوں میں لاٹری کے ٹکٹ فروخت کرنے والی گاڑیاں گھوم گھوم کر خوابیدہ قسمتوں کو جگانے کا مژدہ سناتی پھرتی ہیں اور طرح طرح کی تحریص و ترغیب دلاتی رہتی ہیں وہاں چھوٹے چھوٹے بچوں میں اس عادت بد کو فروغ دینے کے لیے وقت شناس دکان دار بھی نکل آئے ہیں۔ وہ بیسیوں چیزیں جن میں کھلونے، بسکٹ، اور صابن وغیرہ ہوتے ہیں پھیلا کر پانچ پیسے فی ٹکٹ کی لاٹری بچوں سے فروخت کرتے ہیں۔ ایک بچہ کی قسمت یاوری کرتی ہے تو اسے چند کھلونے نصیب ہو جاتے ہیں، بقیہ بچے پھر ٹکٹ خریدتے ہیں، پھر کھیلتے ہیں ۔۔۔۔

اور پھر نہیں کہا جاسکتا کہ پیسے نہ رہنے پر یہ بچے کیا کیا حرکت کریں گے ۔

لاٹری کی سرکاری شکل تو ایک ہی ہے لیکن پرائیوٹ طور پر بے شمار شکلیں دن بدن جنم لے رہی ہیں۔ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے جب شادی بیاہ، سودا سلف، نوکری اور ملازمت کے لیے اور حکومت چلانے کے لیے لاٹری کی کوئی اور شکل نکلتی ہے

اس کارخانۂ عجائبات میں یہ کوئی تعجب کی بات تو نہیں مگر تھوڑی سی حیرت کی بات تو ہے کہ سرمایہ داری کے خلاف دن بھر میں ستر بار لعنت کرنے والے اشتراکی حضرات کس طرح اس دام فریب کے شکار ہوئے ۔کیرلا اور بنگال ان دونوں ریاستوں میں جہاں کمیونسٹوں کا خاصا زور ہے لاٹری کا کاروبار پورے زور وشور کے ساتھ فروغ پا رہا ہے اور حکومت کی براہ راست سرپرستی میں ۔ یہ فلسفہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ایک شخص محنت ومشقت کرکے لاکھوں روپیہ جمع کرے تو وہ سرمایہ دار ہو جائے اس کی حاصل کی ہوئی دولت میں غریبوں اور مزدوروں کا مساوی حق ثابت کیا جائے اور ہو سکے تو تشدد اور لوٹ مار کرکے بھی ان کے درمیان تقسیم کرائی جائے لیکن یہی کام لاٹری کے ذریعے بغیر محنت ومشقت کے صرف ایک دو چار روپیہ میں لاکھوں روپیہ چند افراد کی مٹھی میں آجائے تو یہ قسمت کا کھیل بن جائے ۔ اور یہ کھیل بھی کتنا منصفانہ ہے کہ فرسٹ انعام اگر چار لاکھ تو سکنڈ انعام پونے چار لاکھ نہیں گھٹ کر پچاس ہزار اور تھرڈ انعام بیس ہزار قسمت کے گریڈ کا یہ کتنا نرالا انداز ہے ۔

یاد پڑتا ہے کہ ایک انگریزی اخبار میں ابھی حال ہی میں ایک خط شائع ہوا ہے جس میں لینن کی ایک کہانی کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ لینن کو ایک گائے فروخت کرنی تھی اس نے اسکی قیمت پچاس روبل رکھی۔ مگر اس نے فروخت کرنے کے بجائے بذریعہ لاٹری گائے الگ کرنے کا فیصلہ کیا ۔ایک ایک روبل کے سو ٹکٹ فروخت ہوئے اور لاٹری کے ذریعے ایک خوش قسمت کو وہ گائے ملی ۔

شیطانی کام

اے ایمان لانے والو! یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور یہ پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں ان سے پرہیز کرو ۔ امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی ۔شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے ۔

(قرآن)

رسائل و مسائل

ایک وضاحت

جنوری سنہ ۸۰ء میں جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب کا ایک مضمون زندگی میں شائع ہوا تھا اسے پڑھ کر جناب عرشی نعمانی آندھرا پردیش نے انہیں ایک خط لکھا تھا ہم یہاں وہ خط اور محترم انعام صاحب کا جواب نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

خط

محترمی و مکرمی۔ السلام علیکم

جنوری ۸۰ء کے ماہنامہ زندگی رام پور میں آپ کا مقالہ "تعلیم یافتہ غیر مسلموں سے دعوتی مذاکرات" غور سے پڑھا۔ آپ نے ان حضرات کے سامنے اسلام کو نہایت صحیح طریقے پر پورے وقار کے ساتھ پیش فرمایا ہے اور جماعت کا بھی نہایت اچھے انداز میں تعارف کرایا ہے۔

آخر میں آپ نے جن تین نکات پر اہل علم و فکر کو دعوت غور و فکر دی ہے، وہ نکات بھی نہایت ہی اہم اور قدر و قیمت کے لائق ہیں۔ نیز ان نقاط نظر پر جس انداز میں آپ نے نقد فرما کر صحیح راہ عمل کی نشان دہی فرمائی ہے اس سے اقامت دین کا کام کرنے والوں کے لیے ان خطوط پر کام کرنے کا ایک واضح راستہ متعین ہو گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اقامت دین کا کارنامہ نہ منفی حسن اخلاق سے انجام دیا جا سکتا ہے اور نہ اسلام کی دنیوی برکات کو پیش کر کے اسلامی نظام زندگی کو غالب نظام کی حیثیت سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں اصل اہمیت فلاح آخرت کی ہے نہ کہ فلاح دنیا کی۔ وہ دنیا کو دارالعمل اور دارالامتحان قرار دیتا ہے نہ کہ دارالجزاء۔ اسلام کی نگاہ میں دنیا مزرعۃ الآخرۃ ہے یہاں انسان کے ہر عمل کا ثمرہ لازمی طور پر حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا انحصار مشیت الٰہی پر ہے، نہ کہ ہماری کوشش و تدبیر پر۔

بلا شبہ انسان اسلام پر سچے دل سے عمل پیرا ہو کر دنیوی فلاح اور مادی فوائد سے بھی بہرہ مند ہو سکتا ہے لیکن دنیوی فلاح و کامرانی اور مادی فوائد و برکات کا حصول اسی وقت ممکن ہو گا جب کہ اسلام تمام نظامہائے زندگی پر غالب اور حکمراں ہو جائے اور اسے کلی اقتدار حاصل ہو جائے۔ اگر اسلام محکوم اور اقتدار سے محروم ہو تو اس سے نہ دنیوی برکات حاصل ہوں گی اور نہ مادی فوائد ہی حاصل ہوں گے۔ رہا حسن اخلاق سے دلوں کا جیتنا، تو بقول آپ کے، کسی انسان کو اسلام قبول کرنے اور اپنے قدیم عقیدے سے دست بردار ہونے پر مجرد حسن اخلاق آمادہ نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے سوز دروں اور گرمی ایمان کی ضرورت ہے اور یہ سوز و گداز اور حرارت ایمانی پیدا نہیں ہو سکتی۔ تا وقتیکہ داعیان دین اپنے دین کے لیے جان دینے اور کٹ مرنے کے لیے تیار نہ ہو جائیں۔ اس چمن کی آبیاری ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ ہم اس کو اپنے خون جگر سے نہ سینچیں اور جس اقتدار کو ہم اپنے لہو سے نہ خریدیں وہ ہمارے لیے ننگ و عار ہے۔ مرد مومن کی خودی کا مقام تو اس قدر اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس کی نظر میں "بخشے ہوئے فردوس" بھی نہیں جچتے۔

بہرحال آپ نے ایک نادر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور غیر مسلمین کے سامنے دعوت دین پیش کرنے کا حق ادا کر دیا لیکن اس ناچیز کا احساس یہ ہے کہ پنڈت جی اپنے مقصد میں مخلص نہیں ہیں۔ ان کے بیان سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک سیاسی منصوبہ لے کر آپ کی خدمت میں تشریف لائے تھے۔ ورنہ ان کے خواب کا تاثر بعد کے مباحث اور مذاکروں میں گم نہ ہو جاتے۔ ان کے خواب سے ان کے فکر و خیال کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ خدا پرستوں کے اتحاد کی تجویز میں سٹ کر رہ جاتی ہے۔ ان کا مقصد یہ نظر نہیں آتا کہ وہ اسلام کو سمجھنا یا قبول کرنا چاہتے ہیں بلکہ ان کا اصلی مقصد تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ملک کی ترقی پسند طاقتوں کے مقابلے میں خدا پرستوں کا ایک نام نہاد محاذ قائم کیا جائے اور اپنی جماعت کی جارحانہ فرقہ پرستی کو خدا پرستی کے پردے میں چھپا دیا جائے۔

"خدا پرست" کا لفظ تو ان کے لیے ہرگز زیب نہیں دیتا۔ ممکن ہے وہ خدا کے وجود کے قائل ہوں لیکن ان سے پوچھیے کہ کیا وہ خدا کو "ایک" بھی مانتے ہیں۔ خدا کو ماننا ایک الگ چیز ہے اور خدا کو ایک اور صرف "ایک" ماننا چیزے دیگر۔ جب تک وہ خدا کو "ایک" نہیں مانتے ان کی خدا پرستی ایک لفظ بے معنی ہے۔ اور کسی حقیقی خدا پرست سے ان کا اتحاد ناممکن اور محال ہے۔

مجھے تو ان کے "خواب" اور ان کی "تجویز اتحاد" میں ملک کی اقلیتوں، بالخصوص مسلمانوں کے لیے دام ہم رنگ زمین کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ میرے نزدیک یہ دراصل حکمراں جماعت کی پھوٹ سے ایک قسم کے ناجائز انتفاع اور اقتدار

حکومت پر قبضہ کرنے کی ایک سیاسی چال ہے۔ جن لوگوں کی نظر ملک کے موجودہ حالات پر ہے وہ اس چال کو بآسانی تاڑ سکتے ہیں۔

اگر میرا یہ تاثر کسی درجے میں بھی غلط یا بعید از قیاس ہو تو براہ کرم اس کی تصحیح فرما دیں تاکہ میں اپنے اس تاثر کو مٹا دوں اور اپنے خیال کی اصلاح کر لوں۔ مناسب ہو تو نجی طور پر جواب سے سرفراز فرمائیں، یا ممکن ہو تو ماہنامہ زندگی ہی کے ذریعے فقط۔ والسلام

جواب

مکرمی ومحترمی ——— السلام علیکم ورحمۃ اللہ

گرامی نامہ ملے کئی روز ہوگئے، لیکن جواب پیش کرنے میں دیر اس لیے ہوگئی کہ میں ان دنوں بیمار بھی رہا اور تیماردار بھی۔ اس تاخیر کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

آپ نے میرے خیالات کی تائید کرکے جو میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ میں اس پر مشکور ہوں۔ ساتھ ہی میرے دل میں یہ احساس بھی پیدا ہوا کہ جب آپ ان خیالات کو صحیح سمجھتے ہیں اور خوش اسلوبی کے ساتھ اظہار مافی الضمیر کی صلاحیت بھی اللہ نے آپ کو بخشی ہے تو یہ خیالات مختلف اسالیب اور مؤثر انداز میں زبان و قلم کے ذریعے دوسروں تک پہنچانا ان شاء اللہ آپ کی مقبول عبادت ہوگی۔

پنڈت جی کے بارے میں آپ نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے وہ بحالات موجودہ بعید از قیاس نہیں۔ اور یہ باتیں امکان عقلی کے طور پر میرے سامنے بھی تھیں مگر میں نے اس بات کو صحیح سمجھا کہ ہمیں تو مخاطب کو نیک نیت ہی سمجھ کر بات کرنا چاہیے ورنہ اگر ہم نیت پر شبہہ کرکے چلیں گے تو دعوت الی اللہ کے راستے بند ہو جائیں گے۔ اسی وجہ سے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مخاطب اور گفتگو حق کی جانب بڑھے۔ چنانچہ اسی گفتگو کی صرف دو باتوں کو آپ ملاحظہ فرمائیں۔ ان میں آپ کو یہی چیز نظر آئے گی۔ مثلاً تماشا پر کمیونزم کی اس طاقت پر جس کی وجہ سے وہ نفوذ کر رہا ہے اور خدا پرستوں کی اس کمزوری پر جس کی وجہ سے وہ پسپا ہو رہے ہیں جو روشنی ڈالی گئی ہے اس میں یہی بات ہے کمیونسٹوں کی طاقت کا جواز اور خدا پرستوں کے کمزور رہنے کی جو وجہ اس گفتگو میں بیان کی گئی ہے اس سے ہٹ دھرمی کے بغیر انکار مشکل ہے۔ اور ان دونوں باتوں کو مان لینے کے بعد جو چیز ابھر کر سامنے آتی ہے وہی علمی اور عملی اسلام ہے۔ اسی طرح خدا پرستوں کا محاذ بنانے کے سلسلے میں جو یہ کہا گیا کہ کام سے بھی پہلے خبریں پریس میں آنے سے زیادہ

ضروری کام یہ ہے کہ اس پریس کا سدھار کیا جائے جو زہر پھیلا رہا ہے۔ اس بات میں بھی میرے پیش نظر یہی چیز تھی
آپ اس بات سے اتفاق فرمائیں گے کہ داعی کے دل میں مخاطب کے لیے سچی خیرخواہی کا جذبہ ہونا ضروری ہے۔ اس صورت میں مخاطب کو حریف نہیں ہمدردی کا مستحق ہی سمجھا جا سکتا ہے لیکن اگر کبھی حقیقت پسندی کے تقاضے سے اس کو حریف ہی ماننا پڑے تب بھی شاید دو تین ہی طریقے اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ یا تو اس پر اپنے طرزِ عمل سے ظاہر کر دیا جائے کہ ہم آپ کو اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حکمت نہیں ہوگی۔ یا مناسب انداز میں اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ یہ شاید فرار کہلائے۔ یا پھر جوش یا مداہنت کا شکار ہو کر آدمی ان خطوط پر چل پڑے جو مخاطب نے کھینچے ہیں اور اس میدان میں پہنچ جائے جو مخاطب کا میدان ہے۔ اس صورت میں ہار یقینی ہے۔ میں نے ان میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا اور مخاطب کو اس نقطے پر لانے کی کوشش کی جہاں پہنچنے کے بعد اگر وہ حق کے متلاشی ہیں تو آسانی کے ساتھ حق تک پہنچ جائیں۔ اور اگر خدانخواستہ حریف بن کر کشتی لڑنے یا اپنے کسی مقصد کے لیے ہم کو استعمال کرنے کی غرض سے تشریف لائے ہیں تو اپنے کو بے بس پائیں۔

رہی یہ بات کہ وہ خدا پرستی کا دعوے کرنے کے باوجود خدا کو اس طرح ایک نہیں مانتے جس طرح اس کا حق ہے تو برادرم! یہ بات تو ظاہر ہے اور ہمیں یہی تو کام کرنا ہے کہ جو لوگ خدا کو مانتے تو ہیں لیکن حقیقی توحید سے ناآشنا ہیں ان پر توحید کی حقیقت اور اس کے تقاضے واضح کیے جائیں۔

ان مذاکرات کو مرتب کرنے میں میرا مقصد ان باتوں کو سامنے لانا تھا جو میری رائے میں اہم ہیں اور جو مقالے کے آخر میں بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے بہت سی وہ باتیں چھوڑ دی گئی ہیں جو اس مقصد کے لیے ضروری نہیں تھیں لیکن یہ بات شاید دلچسپی سے خالی نہ ہو کہ انہی مذاکرات کے دوران گرو گولوالکر صاحب بھوپال تشریف لائے ان کی آمد سے پہلے ایک روز پنڈت جی نے مجھے بتایا کہ گرو جی کے پی۔ اے آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں نے خود ان کے پاس جانے پر اصرار کیا لیکن پنڈت جی نے نہیں مانا اور ان کو ساتھ لے کر میرے مکان پر تشریف لے آئے اتفاق سے وہ ایک ہفتہ وار پروگرام کا وقت تھا جس میں کچھ نوجوان قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہم نے ان کی اجازت سے وہ پروگرام جاری رکھا اور یہ دونوں صاحبان بغور سنتے رہے۔ اس روز مطالعہ میں شکر اور توحید کا بیان تھا اس لیے مطالعہ کے بعد بھی یہی چیزیں گفتگو کا موضوع بن گئیں۔ دونوں نے دلچسپی لی۔ اور کسی بات سے اختلاف نہیں کیا۔ جو صاحب آج ہی تشریف لائے تھے وہ بہت باخبر، خوش بیان اور تجربہ کار آدمی ہیں۔ دیر تک ہم سب ان کے تجربات سے مستفید ہوتے رہے اور آخر میں طے ہوا کہ گرو گولوالکر صاحب سے وہ مجھے ملائیں گے اور ملاقات وغیرہ کا

ملے کرکے وہ خود ہی مطلع کریں گے۔ پھر جس روز گرو صاحب تشریف لائے اس روز کئی بار ان کے دفتر سے فون پر بتایا گیا کہ ابھی گرو جی مصروف ہیں وقت ملتے ہی ہم آپ کو مطلع کریں گے لیکن شاید انہیں وقت نہیں ملا۔ اور میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ اتنی زیادہ فکر نہ کریں کہ گرو صاحب کو زحمت ہو۔

ریڈیو کی خرید فروخت

سوال

مزامیر اور نغمہ و سرود کی ممانعت تو مسلم ہے اس میں کلام کی گنجائش نہیں ہے لیکن بعض صاحبان کا ریڈیو کے بارے میں خیال ہے کہ یہ بھی مزامیر میں داخل ہے اس سے فحش گانے سنے جاتے ہیں اس لیے اس کی تجارت اور اس کی مرمت جائز نہیں ہے اور اس سے حاصل شدہ آمدنی حرام ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ریڈیو ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے مفید معلومات اور ملک ملک کی خبریں حاصل ہوتی ہیں۔ یہ بذات خود ایک اچھی ایجاد ہے اگر اس کو نغمہ و سرود سننے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو اس میں اس آلے کا کوئی قصور نہیں ہے اس لیے اس کی تجارت کے حرام ہونے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ بتائیں کہ کیا اس کی بیع یا مرمت سے حاصل شدہ آمدنی حرام ہے؟

جواب

آپ کا خیال صحیح ہے۔ ریڈیو گانے بجانے کا کوئی آلہ نہیں ہے بلکہ ایک مشین ہے جو خاص قاعدے ضابطے کے ساتھ ہوا کی لہروں سے آواز کو جذب کرتی اور اس کو پھیلاتی ہے جیسے لاؤڈ اسپیکر جو آواز کو بڑھا دیتا ہے۔ ریڈیو، ڈھولک یا سارنگی اور بانسری نہیں ہے جس کو ہاتھ یا منہ سے بجایا جاتا ہو اس کو مزامیر میں داخل کرنا صحیح نہیں ہے ریڈیو یا لاؤڈ اسپیکر کے غلط استعمال سے خود ان مشینوں کو ناجائز قرار دینا غلط ہے۔ لوگ لاؤڈ اسپیکر کو بھی گانے بجانے کی محفلوں میں بلکہ مشرکانہ تقریبات میں بھی عام طور سے استعمال کر رہے ہیں لیکن اس کی تجارت یا مرمت سے حاصل شدہ آمدنی کو کوئی بھی حرام نہیں کہتا۔ مزامیر ان آلات کو کہتے ہیں جو بذات خود گانے بجانے میں استعمال کیے جاتے ہیں، جیسے ستار، ہارمونیم، پیانو اور بانسری وغیرہ جو صاحبان ریڈیو کو مزامیر میں داخل سمجھتے ہیں۔ ان سے کہیے کہ اس لفظ کے معنے کسی لغت میں دیکھ لیں یا کسی جاننے والے سے دریافت کرلیں۔ ریڈیو کی تجارت یا مرمت سے حاصل شدہ

آمدنی حرام نہیں ہے۔

جھاڑ پھونک، تعویذ اور گنڈے

خط

یہاں ایک صاحب جھاڑ، پھونک، تعویذ اور گنڈے کا کام، نا خلق کے جذبے سے کرتے ہیں۔ جہاں تک میری اطلاع ہے کوئی اجرت ان چیزوں کی نہیں لیتے۔ ان کے معمولات تقریباً وہی ہیں جو بہشتی زیور میں حکیم الامتؒ نے اپنے معمولات کے طور پر درج کیے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کی جن آیات کا استعمال درج ہے ان کے سیاق و سباق اور مفہوم سے ان امراض کا کوئی تعلق بجز ایک آدھ لفظ کے نہیں ہے۔ مثلاً زچگی کے لیے سورہ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ کی ابتدائی آیتیں جن میں قیامت کا ہیبت ناک منظر پیش کیا گیا ہے۔ محض اَلْقَتْ مَا فِیْهَا وَ تَخَلَّتْ کی لفظی رعایت کو سامنے رکھ کر اس کام کے لیے اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس تمہید کو سامنے رکھ کر درج ذیل سوالوں کا مفصل و مدلل جواب زندگی میں دیجیے۔

(۱) کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ میں سے کسی سے مستند طور پر یہ ثابت ہے کہ انھوں نے نیلے دھاگے پر قرآن کی آیات پھونک کر شفائے امراض یا دفع آسیب کے لیے کسی کو دیا ہو یا یہ عمل کرنے کی ہدایت فرمائی ہو۔

(۲) کیا قرآن کی آیات کو ان کے اصل سیاق و سباق سے الگ کر کے اور ان کے منشاء و مفہوم سے قطع نظر ازالۂ امراض اور تیسیر ولادت کے لیے استعمال کرنا صحیح ہے۔

(۳) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کن مخصوص سورتوں اور آیات کو ازالۂ امراض کے لیے جھاڑ پھونک کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔

(۴) کیا جھاڑ پھونک صرف کلام الٰہی کے ذریعے ہی جائز ہے؟

جواب

جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے دنیا کے ہر انسانی معاشرے میں رائج رہے ہیں۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اس وقت بھی عرب میں رائج تھے اور جس طرح ان کی پوری زندگی میں شرک اور مشرکانہ اعمال رچ بس گئے

تھے اسی طرح جھاڑ پھونک کے الفاظ بھی شرک و کفر سے ملوث تھے۔ احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں حضورؐ نے جھاڑ پھونک کی ممانعت فرما دی تھی لیکن جب لوگوں کے دلوں میں توحید راسخ ہو گئی تو آپ نے ایسے جھاڑ پھونک کی اجازت دے دی جس میں شرک کا کوئی اثر یا مشرکانہ کلمات نہ ہوں بلکہ آپ نے اپنے قول و عمل سے جاہلیت کے مشرکانہ جھاڑ پھونک کو موحدانہ جھاڑ پھونک میں تبدیل کر دیا۔ جھاڑ پھونک کے لیے احادیث میں رقیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ منتر یا افسوں سے کیا جاتا ہے۔ اس کی ممانعت اور پھر رخصت کے بارے میں یہاں دو صحیح حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

عن جابر قال نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن الرقى فجاء آل عمرو بن حزم فقالوا يا رسول الله انه كانت عندنا رقية نرقي بها من العقرب وانت نهيت عن الرقى فقال اعرضوها فعرضوها عليه فقال ما ارى بها باسا من استطاع منكم ان ينفع اخاه فلينفعه

(مشکوٰۃ، کتاب الطب الرقی، بحوالہ مسلم شریف)

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک سے روک دیا تھا۔ پھر آپ کے پاس عمرو بن حزم کے خاندان کے کچھ لوگ آئے اور انھوں نے کہا یا رسول اللہ ہمارے پاس ایک منتر تھا جس کے ذریعہ ہم بچھو کا زہر دور کرنے کے لیے جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے اور آپؐ نے اس سے منع فرما دیا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ منتر پیش کرو۔ انھوں نے آپ کے سامنے اسے پیش کیا اسے سنکر آپؐ نے فرمایا مجھے اس میں کچھ حرج نظر نہیں آتا۔ تم میں سے جو شخص (اس کے ذریعے) اپنے بھائی کو نفع پہنچا سکے اسے نفع پہنچانا چاہیے۔

اس حدیث سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ آپ نے ایسے جھاڑ پھونک سے منع فرمایا تھا جس میں شرعی اعتبار سے کوئی قابل اعتراض اور لائق اجتناب چیز ہو۔ دوسری یہ کہ قرآن کی آیات اور احادیث میں منقول کلمات کے علاوہ دوسرے کلمات سے بھی جھاڑ پھونک کی جا سکتی ہے۔ تیسری یہ کہ اگر جائز اور مباح جھاڑ پھونک سے کسی کو فائدہ پہنچ سکتا ہو تو اسے فائدہ پہنچانا چاہیے۔

دوسری حدیث یہ ہے:-

عن عوف بن مالک الاشجعی قال کنا نرقی فی الجاھلیۃ فقلنا یا رسول اللہ کیف تری ذالک فقال اعرضوا علی رقاکم لا باس بالرقی مالم یکن فیہ شرک

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم شریف)

عوف بن مالک اشجعی رضؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے تو ہم نے کہا۔ یا رسول اللہ آپ اس کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ نے فرمایا اپنے منتر میرے سامنے پیش کرو (پھر آپ نے قاعدہ کلیہ کے طور پر فرمایا) منتروں میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک ان میں شرک نہ ہو۔

شارحین حدیث نے "شرک نہ ہو" کی تشریح یہ کی ہے کہ ان میں شرک وکفر کے صریح کلمات نہ ہوں اور نہ ایسے کلمات ہوں جن کے معنی ومطلب سے شرک وکفر لازم آتا ہو۔ اسی حدیث کے پیش نظر علماء نے لکھا ہے کہ جس جھاڑ پھونک کا معنی ومطلب واضح نہ ہو وہ جائز نہیں ہے۔ مباح صرف وہی منتر ہوگا جس کے معنی معلوم ہوں اور اس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ کلمات قرآن وحدیث کے علاوہ دوسرے جائز ومباح کلمات سے جھاڑ پھونک جائز تو ہے لیکن اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ازالۂ امراض کے لیے جس جھاڑ پھونک کی تعلیم دی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے دعا اور استعاذہ کے بہترین کلمات ہیں۔ شافی مطلق اور موثر حقیقی اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس لیے دفع امراض کے لیے اسی کی بارگاہ میں دعا اور استعانت۔ بس یہ حقیقت ہے اس جھاڑ پھونک کی جس کے کلمات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام نے سکھائے ہیں۔ محدثین کرام نے اس کے لیے کتب احادیث میں مستقل ابواب لکھے ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب میں آپ کے سوالات کے مختصر جوابات عرض کرتا ہوں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا کسی صحابی کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کہ انھوں نے کسی شخص کو کسی رنگ کے دھاگے پر بھی قرآن کریم کی آیات پھونک کر ازالہ امراض یا دفع آسیب کے لیے دیا ہو اور نہ یہ معلوم ہے کہ حضورؐ نے یا کسی صحابی نے اس کی ہدایت کی ہو

(۲) کسی بات کا ثبوت مہیا کرنے کے لیے آیات کے سیاق وسباق اور منشا ومفہوم کی رعایت ضروری اور لازمی ہے لیکن ازالۂ امراض اور حصول برکت کے لیے جیسا کہ آپ نے لکھا ہے صرف رعایت لفظی کافی ہے۔ ولادت کی آسانی کے لیے سورۂ انشقاق کی ابتدائی آیتوں کی تدبیر کا ذکر علامہ ابن قیم نے بھی زاد المعاد میں کیا ہے۔

(۳) جہاں تک میرا مطالعہ ہے سورۂ فاتحہ، سورۂ الکافرون، سورۂ اخلاص اور معوذتین (سورۂ الفلق و سورۂ الناس) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جھاڑ پھونک کے طور پر استعمال فرمایا ہے۔

(۴) جیساکہ اوپر دو احادیث کی تشریح میں گزرا آیات و احادیث کے علاوہ دوسرے جائز و مباح کلمات سے بھی جھاڑ پھونک جائز ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ اس کے لیے قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے کلمات ہی استعمال کیے جائیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے اشعۃ اللمعات میں لکھا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن اور اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم دیے ہوئے کلمات کے علاوہ کسی دوسرے مباح اور جائز کلمات سے بھی جھاڑ پھونک کرنا مکروہ ہے۔ احادیث ہی کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ حضورؐ نے جائز اور مباح جھاڑ پھونک کی رخصت دے دی تھی لیکن جب صحابۂ کرام کو قرآنی کلمات اور نبی علیہ السلام کے سکھائے ہوئے کلمات کی تاثیر کا علم ہوگیا تو انھوں نے انہیں دونوں پر اکتفا اور دوسری ہر قسم کی جھاڑ پھونک سے اجتناب کیا۔ علماء نے لکھا ہے کہ جن کلمات کو پڑھ کر دم کرنا جائز ہے ان کو لکھ کر بطور تعویذ استعمال کرنا بھی جائز ہے۔

ایک ملک دو پالیسیاں

مارچ ۷۰ء کے اشارات میں لکھا گیا تھا کہ پاکستانی انتخابات کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ غیر جانبدارانہ ہو سکیں گے؟ وہاں کا انتظامیہ ابھی سے تنبیہ کر رہا ہے کہ وہ غیر جانبدار نہیں ہے؟ ہم یہاں معاصر ایشیا لاہور کے ایک اداریے کا اقتباس اور ایک بیان نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

ہمیں افسوس ہے کہ کوئٹہ کے ایک جلسے میں ایک تعلیمی ادارے کے چند ارکان نے ایک مقرر کے، مولانا مودودی پر بے بنیاد حملوں کی وضاحت کے لیے کچھ سوالات کر دیے جس پر جلسے میں ہنگامہ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ پولیس نے بڑی عجلت دکھائی اور سوال کرنے والوں کو فوراً گرفتار کر لیا کہ انھوں نے مارشل لا کے ضابطہ ۶ کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس خبر میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مقرر صاحب کے بارے میں فی الحال غور کیا جا رہا ہے کہ وہ بھی اس ضابطے کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے یا نہیں؟ لیکن خبر سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مقرر صاحب کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے۔ وہ ضابطے کی خلاف ورزی کے مرتکب پائے گئے ہیں یا نہیں اور ان کی گرفتاری بھی عمل میں آئی ہے یا نہیں بہر حال یہ خبر تو عام پھیل گئی ہے کہ سوال کرنے والے گرفتار شدگان جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں ہمیں اس خبر کے دو ہی دن بعد کوئٹہ کے ذمہ داران جماعت کا ایک بیان موصول ہوا ہے جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ سوال کرنے والوں کا جماعت سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔

جماعت اسلامی سے ان لوگوں کا بہر حال کوئی تعلق ہو یا نہ ہو لیکن کوئٹہ کی خبر سے متصلاً بعد ایک دوسری خبر نے ہمیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ وہ خبر حیدر آباد کے ایک مقام تلہار کی ہے، جہاں ایک جلسہ عام جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں گڑبڑ تلاوت کلام پاک سے شروع ہوتی ہے اور تا اختتام جلسہ جاری رہتی ہے۔ گڑبڑ کرنے والوں نے اسٹیج پر قبضہ کرنے کی کوشش بھی کی جو منتظمین کی خوبی انتظام نے ناکام بنا دی لیکن نہ کوئی پولیس حرکت

میں آئی، نہ کوئی گرفتاری عمل میں آئی۔

یہ واقعہ ۱۱ فروری کا ہے۔ ۱۵ فروری کو حیدرآباد میں مفتی محمود کا جلسہ ہوتا ہے۔ اس میں مولانا مودودی پر نہایت توہین آمیز طریقے سے بے محابا تنقید ہوتی ہے۔ جلسے کے انجام پر میر رسول بخش تالپور نے سرخ ٹوپیوں کا ایک غیر قانونی جلوس نکالا جس میں دیگر اشتعال انگیز نعروں کے ساتھ یہ نعرے بھی بلند ہوتے رہے۔

"ایک مودودی سو یہودی" اور اس کے ساتھ مفتی کا یہ فتویٰ بھی تھا کہ "یہودی اگر مجھے مل جائے تو اس کا خون پی جاؤں اور ہڈیاں چبا جاؤں لیکن پھر بھی جنت میں جاؤں گا۔"

(ملاحظہ ہو بیان مولانا وصی مظہر قیم جماعت اسلامی حیدرآباد مندرجہ جنگ کراچی مؤرخہ ۱۸ فروری ۷۸ء)

انتظامیہ کی ٹھنڈک کا کمال یہ ہے کہ اس کے باوجود کوئی نوٹس نہیں لیا گیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ملک کے ایک ہی حصے میں دو پالیسیاں کیسے چل رہی ہیں؟ جو بات بلوچستان میں مارشل لا ضابطہ کے خلاف ہے وہ سندھ میں اس کے خلاف کیسے نہیں رہی۔ پھر اس کی خلاف ورزی اگر جماعت اسلامی سے ہوتی ہے تو جرم، لیکن جماعت اسلامی کو گالیاں دینے والے کرتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ یہ کوشش خاص طور پر موجودہ مارشل لا کے دوران میں کی گئی ہے جو بغیر کسی سیاسی تعصب کے آیا ہے کہ جماعت اسلامی کو تشدد پسند (MILITRNT) ثابت کیا جائے اور موجودہ مارشل لا انتظامیہ جس کے متعلق بہر حال یہ حسن ظن قائم ہے کہ یہ کسی سیاسی جانبداری میں ہرگز ملوث نہیں ہے۔ اس معاملے میں خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ درآں حالیکہ اس گیارہ ماہ کی مدت میں جماعت اسلامی اور اس کی ہم خیال جماعتیں شدید تشدد کا ہدف بنی ہیں۔ مشرقی پاکستان میں عبدالمالک شہید کو حکومت کی تعلیمی پالیسی کی حمایت کے جرم میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا لیکن حکومت کی پالیسی کے خلاف نعرے لگانے اور قرارداد پاس کرنے والے قاتل ابھی تک کوئی سزا نہیں پا سکے ہیں۔ پلٹن میدان میں جماعت اسلامی کے جلسۂ عام پر حملہ ہوا۔ دو کارکن شہید اور چھ سو سے اوپر زخمی ہوئے۔ لیکن جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے ان افراد میں سے کوئی ایک بھی گرفتار نہیں ہوا جو درحقیقت اس غنڈہ گردی کے منتظم تھے۔ درآں حالیکہ سارا ڈھاکہ جانتا ہے کہ بلوہ کرنے والے کون لوگ تھے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی یونین کے انتخاب کے سلسلے میں بیلٹ بکس توڑنے والوں پر تو انتظامیہ حرکت میں نہ آئی لیکن وائس چانسلر کی رہائش کے چند شیشے ٹوٹنے پر فوراً متحرک ہو گئی۔

اس کے مقابلے میں دوسری جانب سراسر نرمی ہی کا پہلو رہا۔

۷ار دسمبر ۱۹۶۹ء کو ڈھاکہ میں طلبہ نے جو جلوس نکالا اس میں آزاد بنگلہ کے نعرے لگے اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ انہیں "مورجن سین کا بنگلہ" چاہیے۔ مورجن سین ایک دہشت پسند بنگالی تھا۔

اس جلوس کے سرغنوں پر مارشل لا ضابطہ کے تحت مقدمہ چلا تو وہ غائب ہو گئے۔ اور عوامی لیگ کے سکریٹری کے ایک بیان پر صدر مملکت نے انہیں معاف کر دیا۔

صادق آباد میں بھٹو صاحب پر حملہ محض افسانہ تھا لیکن مقامی انتظامیہ سے لے کر صدر مملکت تک نے جن جذبات کا اظہار کیا تھا ہمیں افسوس ہے کہ وہ پلٹن میدان کے "قتل عام" پر نہیں ملے۔

جو مارشل لا نظریہ پاکستان کے تحفظ کے لیے لگا تھا اور جس نے نظریہ پاکستان اور سالمیت ملک کے بدخواہوں کو متنبہ کیا تھا کہ اسلام اور سالمیت ملک کے خلاف ان کی کوئی حرکت فوج کے غیظ و غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہوگی۔ اس کے عہد میں قرآن جلانے کے مقدمے کو واپس اور بھاشانی صاحب پر قاتلانہ حملے کے افسانے کو باقی رکھا گیا۔ کیا اس لیے کہ وہ مقدمہ جماعت اسلامی کا تھا اور یہ بھاشانی صاحب کا ہے؟ ہم اس تلخ نوائی پر معذرت خواہ ہیں لیکن واقعات کی مسلسل شہادت انتظامیہ کے نرم گوشوں کو چھپائے بغیر نہیں رہ سکی ہے۔

کیا جماعت اسلامی کو اس لیے تھوڑا سا ملائم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ "انتہا پسند مذہبی طبقہ" ہے۔

ہم اس کے جواب میں بڑے ادب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا عقیدے کے مطابق عمل کی تلقین انتہا پسندی ہے؟ اگر یہ انتہا پسندی ہے تو کیا اعتدال پسندی یہ ہے کہ آدمی زبانی تو اسلام کا دم بھرے لیکن عمل میں اس سے کوسوں دور رہے۔ اگر عقیدے کے مطابق عمل انتہا پسندی ہے تو پھر ملک سے وفاداری کی تلقین بھی انتہا پسندی ہے کیوں کہ ملک سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے نہ صرف زبانی محبت کی جائے بلکہ عملی محبت بھی کی جائے۔

جماعت اسلامی پر مذہبی انتہا پسندی کا الزام عائد کر کے درحقیقت اس کی تصویر کو مسخ کیا جا رہا ہے لیکن ہم آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ جماعت اسلامی انتہا پسند کیسے ہے اور وہ معتدل کون ہیں جو مطلوب ہیں کیا وہ معتدل وہ ہیں جو چھ نکات اور گیارہ نکات پیش کر رہے ہیں۔ اسلام کے ساتھ سوشلزم کی پیوندکاری کر کے پاکستان کی بنیادوں پر عوام کا یقین متزلزل کر رہے ہیں یا وہ جو ملک کے حصے بخرے کرنے کے درپے ہیں؟

سیاسی جماعتوں کو طوفانوں سے سابقہ رہتا ہے ان کی ہمت کی آزمائش ان کے مقابلے ہی میں ہوتی ہے جماعت اسلامی اس سلسلے میں سوائے اپنے رب کے کسی سے پناہ اور مدد کی طلب گار نہیں ہے۔ حکومت سے اگر کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو صرف اس لیے کہ حکومت سے اگر کہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو صرف اس لیے

کہ حکومت کی انتظامی پالیسی کا ذرا سا عدم توازن بھی ملک کو خطرات سے دوچار کرسکتا ہے۔ ہماری یہ شکایت بھی خود غرضانہ نہیں ہے بلکہ حب ملک کے جذبے پر مبنی ہے۔

بیان

لاہور۔ ۱۹ فروری۔ چوہدری رحمت الٰہی سکرٹیری جنرل جماعت اسلامی پاکستان نے حسب ذیل بیان برائے اشاعت جاری کیا ہے۔

گزشتہ چند دن میں کوئٹہ، حیدرآباد اور تلہار (ضلع حیدرآباد) میں ایسے افسوسناک واقعات ہوئے ہیں جو اس مقصد کو نقصان پہنچانے والے ہیں جس کے لیے یکم جنوری سے سیاسی سرگرمیاں بحال کی گئی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک واقعہ میں کسی نہ کسی ضابطۂ مارشل لاء کی خلاف ورزی ہوئی ہے لیکن مقامی انتظامیہ کا رویہ ان تینوں میں ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد رہا ہے۔ کوئٹہ میں جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کے جلسے میں کوئی سوال یا اعتراض کرنے پر فوراً گرفتاریاں عمل میں آئیں جبکہ تلہار میں جماعت اسلامی کے جلسے کے آغاز سے اختتام تک غنڈہ گردی ہوتی رہی لیکن آج آٹھ دن گزر جانے کے باوجود اب تک کوئی کارروائی سامنے نہیں آئی۔ حیدرآباد میں جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کے ناظم اعلیٰ مفتی محمود اور میر رسول بخش تالپور (پیپلز پارٹی) کی قیادت میں غیر قانونی جلوس نکالا گیا جس میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف انتہائی اشتعال انگیز نعرے لگائے جاتے رہے لیکن اس پر کئی دن گزر جانے کے بعد بھی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔

یہ واقعات خلاف قانون اور آزادانہ انتخابات کے ذریعے پرامن انتقال اقتدار کی راہ میں رکاوٹ ہونے کی حیثیت سے تو افسوسناک ہیں ہی، لیکن ان کا یہ پہلو بھی کم افسوسناک نہیں کہ ان میں انتظامیہ کی طرف سے دو پیمانے استعمال کیے جارہے ہیں۔ ایک جماعت اسلامی کے خلاف اشتعال انگیزی اور جماعت اسلامی کے جلسوں میں غنڈہ گردی کے لیے اور ایک دوسری بعض سیاسی جماعتوں کے خلاف ہونے والی اسی قسم کی حرکتوں کے لیے۔ ہم ابھی تک یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ یہ دو معیار انصاف مقامی حکام کی جانب سے بالائی ہدایات کی پابندی کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی عدم پابندی کی وجہ سے قائم ہو رہے ہیں لیکن ایسے واقعات کی تعداد رفتہ رفتہ اتنی بڑھتی جارہی ہے کہ اگر اس صورت حال پر قابو پانے کی کوئی فوری کوشش نہ کی گئی تو یہ حسن ظن شاید زیادہ عرصہ برقرار نہ رہ سکے گا۔ ویسے بھی پورے ملک میں ہدایات اور ضابطوں کی یکساں

پابندی اگر نہ ہو تو خود یہ بھی کوئی قابل رشک پوزیشن نہیں ہے ۔ بالخصوص مارشل لا کے دوران ۔

اس سلسلے میں دوسری قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ مشتعل ہو کر کوئی کارروائی کرنا اور اشتعال لانا دونوں ہی قابل مذمت اور قابل گرفت اقدام ہیں ۔

لیکن اب تک اشتعال انگیزی کے خلاف کوئی ضابطہ حرکت میں نہیں آیا ۔ حالانکہ پر امن سیاسی سرگرمیوں کے لیے اشتعال انگیزی اور جھوٹے الزامات کو روکنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اشتعال انگیزی کے ردعمل میں ہونے والی کسی سیاسی حرکت یا کھلم کھلا غنڈہ گردی کو روکنا ضروری ہے ۔

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے وہ خدا کے فضل و کرم سے اس سے زیادہ سخت حالات میں سے کامیابی کے ساتھ گزر چکی ہے اور ہر قسم کے حالات میں اخلاق و شرافت اور آئین و قانون کی پابند رہی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی وہ اپنی ان روایات کو قائم رکھے گی ۔

تنقید و تبصرہ

بہاریں لوٹ آئیں گی وصی اقبال صفحات ۸۰ ۔ کتابت و طباعت روشن ۔ قیمت ایک روپیہ
ناشر :۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی ۶

جناب وصی اقبال صاحب قارئین زندگی نا واقف نہیں ہیں ۔ اس سے پہلے بھی ان کی ایک کتاب پر تبصرہ شائع ہو چکا ہے اور ابھی ان کے قلم سے زندگی کے دو شماروں میں ایک ہندی پمفلٹ "کلکی اوتار اور محمد صاحب" کا ترجمہ شائع ہوا ہے ۔ وصی اقبال صاحب کو کہانیاں اور ناول لکھنے کا خاص ذوق ہے ۔ وہ اپنے سامنے تعمیری مقاصد رکھتے ہیں اور انہیں کہانیوں کا روپ دیتے رہتے ہیں ۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی ایک طویل کہانی ہے ۔ اس کا مقصد یہ دکھانا ہے کہ اسلامی اخلاق کردار اور قول و عمل سے اسلام کی تبلیغ و اشاعت ایک انقلاب آفریں چیز ہے اور ایسے چند مسلمانوں کی سعی بھی گاؤں کے گاؤں کو اسلام کے سانچے میں ڈھال سکتی ہے ۔ موجودہ دور کے افسانہ نگار اور فن افسانہ نویسی سے واقف لوگ اس کتاب کو کہانی قرار دیں گے یا وعظ ؟ یہ تو وہ جانیں لیکن ہم جیسے لوگ جو اصل مقصد پر نظر رکھتے ہیں اسے پڑھ کر متاثر ہوں گے کسی کتاب کو پڑھ کر اگر قلب پر اچھا اثر مترتب ہو تو مقصد حاصل ہو اب اسے کوئی کہانی کہے یا وعظ ۔

ص ۴۳ کے آخر میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے کا جو واقعہ لکھا گیا ہے تحقیق سے وہ غلط ثابت ہو چکا ہے ۔ ان سے فعل زنا کا ارتکاب نہیں ہوا تھا ۔ اس کے بارے میں ایک تحریر زندگی میں بھی شائع ہو چکی ہے ۔

بحیثیت مجموعی کتاب دلچسپ اور سبق آموز ہے ۔

تاریخ ابن خلدون

حصہ سوم — خلافت بنو عباس۔

خلافت عباسیہ کے بانی المنصور السفاح کی سفاکی، بغداد کی تعمیر، ابو مسلم خراسانی کی سرکشی، نبوت کے دعویدار ابن مقنع کا خروج، ہارون کے بیٹوں امین اور مامون کی کشمکش سے لیکر المعتضد مکتفی باللہ تک کے واقعات—

بڑی تختی — ۳۵۲ صفحات — قیمت صرف نو روپے نوے پیسے

حصہ چہارم — زوال بغداد کی کہانی۔

۴۲۴ صفحات قیمت صرف گیارہ روپے

حصہ پنجم — امیران اندلس اور خلفائے مصر۔

امیر عبدالرحمن الداخل سے لیکر آخری دور زوال تک گلستان اندلس کی کہانی ایک بے مثال تمدن کی ابتدا اور انتہا۔ شرقی خلافت کے اندر فرقوں کی پیداوار ترکوں کی یلغار اور فاطمیوں کے عروج و زوال کی عبرت ناک داستان—

صفحات ۵۸۴ قیمت صرف ۱۵ روپے

ملنے کا پتہ—

مکتبہ زندگی و کائنات رامپور - یو۔پی

Monthly 'ZINDGI' Rampur, April 1970, Regd. No. L-688

تاریخ ابن خلدون

حصہ ششم — غزنوی اور غوری سلاطین

سلطان محمود غزنوی اور ہندوستان میں پہلی سلطنت کے بانی شہاب الدین غوری کی فتوحات کے مستند حالات—

صفحات ۵۶۸ — قیمت صرف ۱۵ روپے

حصہ ہفتم — سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین اور فتنۂ تاتار—

سلجوقی اور خوارزم شاہی خاندانوں کے حالات و کوائف' خانہ جنگیوں' عیسائیوں کا مقابلہ' قفار کرج اور قفچاق کی جد و جہد' ترکوں کی یورش' تاجداران سلجوقیہ اور سلوک خوارزم کی مدافعانہ کوششیں' چنگیز خاں کا خروج' تاتاریوں کا عالمگیر طوفان— ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی کی عبرتناک داستان—

قیمت صرف ۱۲ روپے

ملنے کا پتہ—

مکتبہ زندگی و کانتی - رامپور - یو - پی

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

ماہنامہ

زندگی

رامپور

فی پرچہ ۸۰ پیسے

سالانہ آٹھ روپے

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
۲ا شلنگ
ہوائی ڈاک سے
۴ا شلنگ

زندگی

(مدیر:- سید احمد قادری)

سالانہ چندہ
ہندستان سے -/۸
پاکستان سے -/۸
شش ماہی
ہندوستان سے -/۴
پاکستان سے -/۴
فی پرچہ:- ۸۰ پیسے

جلد: ۴۴ | ربیع الاول ۱۳۹۰ھ مطابق جون ۱۹۷۰ء | شمارہ:- ۶

اس دائرے میں ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپکی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہورہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال فرمائیں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپکی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔

منیجر:- ماہنامہ زندگی رام پور یوپی

مالک - جماعت اسلامی ہند - ایڈیٹر - سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر - احمد حسن - مطبع - رامپور پرنٹنگ پریس محلہ قلعہ رامپور

مقام اشاعت - دفتر زندگی رام پور - یوپی

اشارات

(سید احمد قادری)

مسائل کو حل کرنے، جھگڑوں کو نمٹانے، حقوق کا مطالبہ کرنے اور اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے زبانی اور تحریری وعظ و پند کی حد تک اب بھی دنیا کے سربراہ حضرات افہام و تفہیم اور باہمی گفت و شنید ہی کو صحیح اور مفید قرار دیتے ہیں۔ تشدد اور جارحیت کی مذمت کرتے ہیں، معاملہ بین الاقوامی ہو یا مقامی، نصیحت یہی کی جاتی ہے کہ اسے خوش اسلوبی کے ساتھ بات چیت کے ذریعے طے کیا جائے لیکن جہاں تک عمل کا تعلق ہے انہیں ناصحان گرامی قدر کا طرز عمل تشدد اور جارحیت کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کی قراردادوں اور دنیا کی ترقی یافتہ و ترقی پذیر مملکتوں کے سیاسی رہنماؤں کی تقریروں اور تحریروں کو جمع کیا جائے تو وہ کاغذ کے ایک بڑے پشتارے سے کم نہ ہوں گی لیکن عمل کی دنیا میں یہ کاغذی پشتارہ انسانی خون کی دھارے کے نیچے سرگل رہا ہے۔ عملی طور پر آج ماؤزی تنگ کی ہدایت پر عمل کیا جا رہا ہے جنھوں نے "لاٹھی اور بھینس" کے پرانے فارمولے کو نیا فلسفہ بنا کر پیش کیا ہے ——— افسوس ہے کہ ہمارا ملک بھی تشدد اور قتل و غارت گری کا ایک لمبا چوڑا اڈہ بن چکا ہے۔ یہ وہ ملک ہے جہاں گاندھی جی زندگی بھر اہنسا کو ایک طریق زندگی اور فلسفہ حیات کی طرح پیش کرتے رہے۔ لیکن صرف یہی نہیں کہ وہ خود ہنسا کا شکار ہوئے بلکہ ان کا فلسفہ عدم تشدد، گوڈسے اور ساورکر کے فلسفہ تشدد کے نیچے دب کر رہ گیا اور یہاں مسائل کو حل کرنے کا صرف ایک طریقہ رائج ہو گیا اور وہ ہے تشدد، جارحیت، پبلک املاک کی تباہی و بربادی، قتل، لوٹ مار اور آتش زنی یہاں تک کہ یہاں زندہ انسانوں کو جلا ڈالنا بھی روزمرہ کا معمول بنتا جا رہا ہے۔ آج نکسلیوں کی جارحیت اور طلبہ کے تشدد پر وہی لوگ چیخ رہے ہیں جنھوں نے کل تشدد کو ایک ناقابل استثنا شے سمجھ لیا تھا

اس لیے کہ اس کا ہدف صرف مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے اخبارات و رسائل اور ان کے رہنما برابر تنبیہ کرتے رہے کہ اگر آج ظالموں کے ہاتھ نہ پکڑے گئے تو کل یہ ہاتھ صرف مسلمانوں پر نہیں اٹھیں گے بلکہ ان لوگوں پر بھی اٹھیں گے جو آج انہیں چھوٹ دے رہے ہیں لیکن اپنی حکومت اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی مسلسل سازشوں کے سوا اس طرح کا مشورہ ان کے لیے قابل توجہ نہ بن سکا۔ ابھی پارلیمنٹ میں وزارت داخلہ کے مطالبات زیر بحث دس گھنٹہ کا مباحثہ ہوا ہے اسے ہم بڑھتے ہوئے تشدد کے خلاف ایک لمبی چیخ کہہ سکتے ہیں۔ لوک سبھا کے آنریبل ممبروں کی یہ چیخ و پکار ملک کی محبت کا نتیجہ نہیں بلکہ خوف کا مظاہرہ ہے وہ اب پنجہ تشدد کو اپنے گلوں کی طرف بڑھتے دیکھ کر شور مچا رہے ہیں لیکن ان کے شور میں سنجیدہ فکر کی علامت اب بھی موجود نہیں ہے۔

نکسلیوں نے ظلم و ستم اور قتل و غارت کا جو بازار گرم رکھا ہے وہ توقع کے خلاف نہیں ہے وہ اب موقع غنیمت دیکھ کر کمیونزم کے اصل طریقے پر عمل کر رہے ہیں جس کو ماؤ نے کچھ اور زہریلا کچھ اور کٹیلا بنا دیا ہے مارکسی کمیونسٹ دل سے نکسلیوں کے ساتھ ہیں لیکن زبان سے ان پر تنقید کر رہے ہیں لینن کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر نکسلیوں نے کلکتہ میں جو جلوس نکالا اس میں شریک ہونے والے لوگ اپنے ہاتھوں میں ماؤ کی لال کتاب اٹھائے ہوئے تھے اور "ماؤ زندہ باد" "گاندھی ازم کو تباہ کرو" کے نعرے لگا رہے تھے وہ لینن کی تصویریں بھی اٹھائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھیں گے اور رجعت داروں کے سر قلم کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ مدنا پور سے موصول ایک اطلاع کے مطابق نکسلیوں نے ایک کالج پر حملہ کیا اور کافی نقصان پہنچایا۔ انھوں نے گاندھی جی کی تصویر اتار کر پھینک دی اور اس کی جگہ ماؤ کی تصویر لگا دی کھڑک پور میں انھوں نے ایک مسافر بس کو آگ لگا دی۔ ضلع ۲۴ پرگنہ میں صرف چار نوجوانوں نے جو نکسلی بتائے جاتے ہیں ایک کالج کے پرنسپل کے دفتر پر حملہ کیا اور بجلی کے تار کاٹ دینے کے بعد انھوں نے پتھر مار مار کر گاندھی جی کی ایک تصویر خراب کر دی اور دفتر کی دیواروں پر ماؤ کی تصویریں بنا دیں۔ کلکتہ کے ایک ہسپتال میں انھوں نے حملہ کر کے دو پولس والوں کو مجروح کر دیا۔ ایک زخمی کی حالت نازک ہے۔ یہ ایک دن کے صرف ایک اخبار میں شائع شدہ خبروں کی مختصر فہرست ہے۔ ورنہ نکسلی مغربی بنگال میں بالخصوص اور ملک میں دوسرے حصوں میں "بہت کچھ" کر رہے ہیں۔

شری جیوتی باسو سابق وزیر داخلہ مغربی بنگال جو نکسلیوں پر تنقید کرتے ہیں خود خون کے دریا بہا دینے کا

دھمکی دے رہے ہیں ان کے دورِ حکومت میں جوت داروں سے چھین کر جو زمین کسانوں میں تقسیم کر دی گئی تھی اس کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اگر وہ زمین ان سے واپس لی گئی تو خون کے دریا بہا دیئے جائیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ اب ہمارے پاس اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے کہ لینن کے بتائے ہوئے راستے پر سوشلسٹ انقلاب کے لیے کام کریں۔ سابق وزیر داخلہ نے یہ الزام بھی لگایا کہ صدر راج کا فائدہ اٹھا کر مفاد پرست عناصر نے پولیس کی مدد سے خوف و دہشت کی ایک مہم چلا رکھی ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ لینن کے جس راستے کی طرف انھوں نے اشارہ کیا ہے وہ کیا ہے؟ اور یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ کل تک جو پولیس ان کے اشارہ چشم و ابرو پر متحرک تھی وہی اب مورد الزام ہے۔

ماؤ کو اپنا لیڈر اور رہنما ماننے والے جو کچھ ہندوستان میں کر رہے ہیں اسی قسم کے کارنامے وہ پاکستان میں مولانا بھاشانی اور مسٹر بھٹو کی قیادت میں انجام دے رہے ہیں۔ قابل غور یہ بات ہے کہ ہندوستان میں وہ یہاں کی عظیم الشان جمہوریت کے تحت جو کچھ کر رہے ہیں تقریباً وہی کچھ پاکستان کی بدنام آمریت کے تحت بھی کر رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں جمہوریت کی وجہ سے انہیں مار دھاڑ لوٹ مار اور قتل و غارت کی سہولت ذرہ زیادہ حاصل ہے اور وہاں مارشل لا کی وجہ سے کچھ دبے دبے سے ہیں۔ ورنہ ایوبی دور کے آخری لمحات میں انھوں نے جس بہیمیت کا مظاہرہ مشرقی پاکستان میں کیا تھا ابھی نکسلی اس طرح کا مظاہرہ یہاں نہیں کر سکے ہیں۔ بھاشانی کا گروپ صاف صاف اعلان کر رہا ہے کہ وہ انقلاب الکشن سے نہیں آ سکتا جو وہ لانا چاہتا ہے۔ وہ انقلاب تو صرف بندوق کی گولی سے لایا جا سکتا ہے اور اس کا یہ اعلان ماؤ کے مطابق ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ماؤ جس راستے پر چل رہے ہیں اسی راستے پر چل کر لینن اور اسٹالن نے روس میں کمیونزم کو غالب کیا تھا۔ اس طرح ہندوستان اور پاکستان دونوں کے سروں پر ماؤ ازم کا خطرہ منڈلا رہا ہے۔

راقم الحروف نے مارچ ۷۰ء کے اشارات میں لکھا تھا:-

"اصل خطرہ مشرقی پاکستان کے سر پر منڈلا رہا ہے اور اس خطرے سے ہندوستان کو بھی اپنی آنکھیں بند نہیں رکھنی چاہیں۔ بھاشانی کے پردے میں چینی کمیونسٹ جو رول وہاں ادا کر رہے ہیں اسے ہمارے لیے بھی فکر انگیز ہونا چاہیے۔ مغربی بنگال میں مارکس وادی کمیونسٹ اپنا زور دکھا رہے ہیں اور مشرقی بنگال میں بھاشانی ماوزی تنگ کے نقشے پر جنگ چھیڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہ صورت حال

زندگی ربیع الاول ۹۱ھ

ہندوستان کے لیے قابلِ غور نہیں ہے؟ (زندگی مارچ ۷۱ء)

ادھر چند دن ہوئے مرکزی وزیر شری کے کے شاہ نے کہا ہے کہ اگر نکسلیوں نے ۷۲ء کے انتخابات میں اکثریت حاصل کر لی تو مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کے اتحاد کی کوشش تیز ہو جائے گی اور یہ چیز ہندوستان کے لیے قابلِ غور ہے کہ اس کے نتائج کیا برآمد ہو سکتے ہیں اور ۲۹ اپریل کے اخبار میں آسام کی پولیس کا یہ بیان نظر سے گزرا کہ "اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ آسامی نکسلیوں کا مشرقی پاکستان کے انتہا پسند کمیونسٹوں سے رابطہ ہے۔"

نکسلیوں کا زور پورے ملک میں کم اور مغربی بنگال میں زیادہ ہے وہاں اس گروہ نے جو افراتفری پھیلا رکھی ہے اس پر اب مرکزی حکومت کو بہت تشویش ہے۔ چنانچہ اس نے فیصلہ کیا ہے کہ مغربی بنگال میں امتناعی نظر بندی ایکٹ دوبارہ نافذ کیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس ایکٹ کو دوبارہ نافذ کر دینے سے ان کا زور کم ہو جائے گا؟ ہمیں تو یہ خطرہ ہے کہ اس ایکٹ کی زد میں وہ کمزور لوگ نہ آجائیں جو نکسلی نہ ہوں اور نکسلی قرار دے کر جیلوں میں ٹھونس دیے جائیں۔

نئی حکمراں کانگریس کو دو باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ سوشلزم کا جو نصب العین خود اس نے اختیار کر رکھا ہے اس میں اور مارکسی کمیونسٹوں کے نصب العین میں بنیادی اور جوہری فرق کیا ہے؟ دونوں میں اس طرح کا کوئی فرق ہے بھی یا نہیں؟ دوسری بات یہ کہ دستور ہند خود اس کے اپنے اختیار کردہ نصب العین کا ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب تقریروں اور بیانات کی حد سے گزر کر راجیہ سبھا میں ایک غیر سرکاری بل بھی لایا جا رہا ہے جس میں تجویز پیش کی گئی ہے کہ ۷۲ء کے الکشن سے پہلے ایک دستور ساز اسمبلی طلب کی جائے جو موجودہ دستور کو بدل کر اسے سوشلزم کے رنگ میں رنگ دے اور اس کے بعد انتخابات ہوں ——— اگر ان دونوں باتوں پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جائے تو نکسلیوں کا زور توڑنے کے لیے امتناعی نظر بندی ایکٹ کا ہتھیار ایک بے کار ہتھیار ثابت ہوگا۔ جب زار روس کی جابر حکومت کمیونسٹوں کا زور نہیں توڑ سکی بلکہ خود ٹوٹ گئی۔ تو اس ایکٹ میں کیا دم ہے کہ ان کا زور توڑ دے۔ کمیونزم کا زور صرف ایک ایسا نظام توڑ سکتا ہے جو اشتراکیت اور سرمایہ داری دونوں کی خرابیوں، کوتاہیوں اور انتہا پسندیوں سے پاک ہو۔ دنیا میں ایک ایسا نظام موجود ہے لیکن شاید ابھی وقت نہیں آیا ہے کہ دنیا کے سربراہ اس کی طرف دھیان دیں۔

نکسلی، ماؤ زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ دیواروں پر ماؤ کی تصویریں بنا رہے ہیں۔ ماؤ ازم کے

نعرے لکھ رہے ہیں، جوت داروں کے ظلم کرنے کی دھمکیاں دے رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ گاندھی ازم کو تباہ کردو کے نعرے بھی لگا رہے ہیں۔ ان کی تصویروں کو خراب کر رہے اور پھینک رہے ہیں۔ یہ سب خبریں پڑھ کر ذہن ملک کی نام نہاد بہادر تنظیموں اور گاندھی جی کے عقیدتمند عوام کی طرف جاتا ہے کہ یہ سب اس وقت کہاں روپوش ہیں۔ یہ بہادر تنظیمیں اب تک بیانات کے سوا کچھ نہیں کرسکی ہیں بلکہ ان کے بعض لیڈروں کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نکسلی فتنے کا رخ بھی مسلمانوں کی طرف موڑ دینا چاہتی ہیں۔ بہادری ہو تو ایسی اور مسلم دشمنی ہو تو اس درجے کی ــــ مسلمانوں پر "پاکستان زندہ باد" کے نعرے کا بالکل جھوٹا الزام لگاکر یہ تنظیمیں اپنی بہادری کا سکہ جماتی ہیں اور بسا اوقات مسلمانوں کے قتل کیے جانے اور لوٹے جانے کا سبب یہ بتاتی ہیں کہ انھوں نے پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا جس سے مشتعل ہوکر یہاں کے عوام نے انہیں سزا دی ہے لیکن نکسلی جو "ماؤ زندہ باد" کا سچا نعرہ لگا رہے ہیں اس کے خلاف نہ عوام میں اشتعال پیدا ہوا ہے اور نہ پولیس ایکشن کی ضرورت پڑ رہی ہے بلکہ اس کے برعکس مغربی بنگال میں پولیس کے افسر تک نکسلیوں کا نشانہ بن رہے ہیں۔ اگر مسلمان واقعی کہیں پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگا دیتے یا اپنے کسی جلوس میں مسٹر جناح یا موجودہ صدر پاکستان جنرل یحیٰی خان کی قد آدم تصویر اٹھا لیتے تو اب تک وہ ہزاروں کی تعداد میں قتل کیے جا چکے ہوتے اور ان کی سیکڑوں دکانیں، مکانات اور جائدادیں تباہ کی جا چکی ہوتیں۔ ابھی چائباسہ میں رام نومی کے جلوس پر مسلمانوں کی طرف سے بم پھینکنے اور ایک سپاہی کو قتل کر دینے کے سراسر جھوٹے الزام پر جس درندگی کا ثبوت دیا گیا اور ان کے خلاف جو پولیس ایکشن کیا گیا اس کی رپورٹیں اخبارات میں شائع ہو رہی ہیں، یہاں تک کہ سرودے تحریک کے ایک لیڈر نے بھی اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ پولیس نے فسادیوں کو دبانے کے بجائے ان کی حمایت کی ــــ یہی وہ گندہ امتیاز اور کمزوروں پر ظلم کی لعنت ہے جو ملک کو تباہی کے غار کی طرف دھکیل رہی ہے۔ آر ایس ایس اور جن سنگھ کے لیڈر خدا اور مذہب کو ماننے کا دعوےٰ کرتے ہیں انھیں کبھی ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہیے کہ کیا خدا اس ننگے امتیاز کی پالیسی اور کمزوروں پر اس ظلم کو پسند کرے گا؟ اور اگر کمزوروں میں یہ قوت نہیں ہے کہ وہ ظالموں کو سزا دلا سکیں تو کیا خدا میں بھی یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ ظالموں کو سزا دے سکے؟ اور انہیں کبھی ٹھنڈے دل سے اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ اگر کمیونسٹ اس ملک پر غالب آگئے تو جس مذہب اور ہندوستانی کلچر کی رٹ وہ لگاتے رہتے ہیں کیا وہ محفوظ رہ جائے گا؟ انھوں نے ہندو مذہب اور بھارتی کلچر کے پردے میں مسلمانوں کے خلاف جو پالیسی اختیار کر رکھی ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کے ووٹ حاصل کرکے حکومت پر قبضہ کریں لیکن اب اس غبارے سے بھی ہوا نکل گئی ہے اور وہ

(باقی صفحہ ۶۰ پر)

سُرخ اونٹوں سے بہتر

فقال انفذ علیٰ رسلک حتی تنزل بساحتھم ثم ادعھم الی الاسلام واخبرھم بما یجب علیھم من حق اللّٰہ فیہ فواللّٰہ لان یھدی اللّٰہ بک رجلا واحدا خیرلک من ان یکون لک حمر النعم

(بخاری کتاب المغازی)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم وقار و سکون کے ساتھ جاؤ اور جب ان کے میدان میں پہنچو تو اسلام کی طرف دعوت دو اور انہیں بتاؤ کہ دین اسلام میں ان پر اللہ کے کیا حقوق واجب ہوں گے۔ خدا کی قسم! تمہارے ذریعے اللہ کسی ایک شخص کو بھی ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔

حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث امام مسلم نے بھی کتاب الفضائل میں روایت کی ہے۔ اس طرح یہ ایک متفق علیہ حدیث ہے۔ میں نے اس حدیث کے صرف آخری ٹکڑے کے الفاظ اوپر نقل کیے ہیں۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔

سہل بن سعدؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ خیبر کے موقع پر فرمایا۔ میں کل یہ جھنڈا ایک ایسے شخص کو دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح عطا کرے گا وہ اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول اس سے محبت رکھتے ہیں حضرت سہلؓ کہتے ہیں کہ آپ سے یہ سنکر صحابہ رات بھر ایک اضطراب شوق میں باتیں کرتے رہے کہ معلوم نہیں وہ کون خوش نصیب ہے جس کو کل یہ جھنڈا عطا کیا جائے گا۔ جب صبح ہوئی تو تمام صحابہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ امید تھی کہ شاید اسی کو عطا کیا جائے

ان سب کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا۔ علی کہاں ہیں؟ صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! وہ آشوب چشم میں مبتلا ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ انہیں بلاؤ، صحابہ انہیں لے آئے آپ نے حضرت علی کی دونوں آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا اور ان کے لیے دعا کی وہ فوراً اس طرح صحتیاب ہوگئے جیسے انہیں کوئی تکلیف تھی ہی نہیں پھر آپ نے انہیں وہ علم عطا کیا انھوں نے کہا یا رسول اللہ میں ان سے لڑتا رہوں گا یہاں تک کہ وہ ہمارے مثل ہوجائیں (یعنی مسلمان ہوجائیں) حضرت علی کی یہ بات سنکر آپ نے وہ بات فرمائی جس کا اوپر متن میں ذکر کیا گیا ہے۔

واقعہ کی توضیح

جس واقعے کا اس حدیث میں ذکر ہے وہ یہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے تشریف لے گئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ سخت آشوب چشم میں مبتلا تھے آنکھیں اتنی جوش کر آئی تھیں کہ کچھ دیکھ بھی نہیں سکتے تھے اس حال میں وہ شرکت جہاد سے بالکل معذور تھے لیکن جب حضورؐ تشریف لے گئے تو انھوں نے کہا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں یہاں مدینہ میں پڑا رہوں؟ چناں چہ وہ کسی طرح خیبر پہنچ گئے۔ خیبر میں یہودیوں کے کئی قلعے تھے ان میں سب سے مضبوط اور مرکزی قلعہ قموص تھا۔ دوسرے قلعے تو آسانی سے فتح ہوگئے لیکن قموص کو فتح کرنے میں دیر لگی۔ ایک دن فتح خیبر کا مخصوص علم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لیا لیکن وہ واپس آئے قلعہ فتح نہیں ہوا۔ دوسرے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے علمبرداری کی لیکن قلعہ فتح نہیں ہوا۔ تب آپ نے صحابہ کو وہ بشارت سنائی جس کا ذکر اس حدیث میں ہے۔ اللہ نے حضرت علی کے ہاتھ پر فتح عطا کی۔ چونکہ قموص مرکزی قلعہ تھا اور اس کے فتح ہوتے ہی خیبر فتح ہوگیا اس لیے حضرت علی کو فاتح خیبر بھی کہا جاتا ہے۔

حضرت علی کی فضیلت

سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے فضائل و مناقب میں بہت سی صحیح حدیثیں مروی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ اس حدیث میں جس کی صحت پر امام بخاری و مسلم اور دوسرے محدثین کا اتفاق ہے۔ ان کی منقبت کے جس پھول کا ذکر ہے وہ ان کے گل دستۂ مناقب کا گل سرسبد ہے "ویحبہ اللہ و رسولہٗ (اور اللہ و رسول اس سے محبت رکھتے ہیں) ایک ایسی بشارت ہے کہ کسی مومن کے لیے اس سے بڑی کوئی دوسری بشارت نہیں ہوسکتی۔ میرے خیال میں ان کے لیے یہ بشارت، ان کے اس جذبۂ خلوص، شوق جہاد، اتباع رسول اور معیت رسول کے حرص کا ثمرہ تھی جو اس موقع پر ان سے ظاہر ہوئی۔ سخت معذوری کی حالت میں بھی ان کا دل نہ مانا کہ وہ معیت رسول اور شرکت جہاد سے محروم رہیں، وہ خیبر پہنچ گئے اور اس بشارت عظمیٰ کے مستحق قرار پائے۔ اس موقع پر حضورؐ کے لعاب دہن کی برکت اور آپ کی دعا کی فوری مقبولیت کا بھی ظہور ہوا اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ

(باقی ص ۵۸ پر)

دُعَاءٌ[1]

قرآن اور احادیث کی روشنی میں

(آخری قسط)

(سید احمد قادری)

چند قابلِ احتراز چیزیں

چند چیزیں ایسی ہیں جن سے دُعا میں احتراز کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ آداب دعا کے خلاف ہیں۔ میں اختصار کے ساتھ انہیں یہاں درج کرتا ہوں:۔

(۱) دعا میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کی شرط لگانا صحیح نہیں ہے۔ بلکہ جو کچھ مانگتا ہو پوری قطعیت اور عزم کے ساتھ مانگنا چاہیے۔ بخاری شریف میں ہے:۔

عن ابی هريرة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم اذا دعا احدکم فلا يقل اللهم اغفرلی ان شئت اللهم ارحمنی ان شئت ولكن ليعزم المسئلة فان الله لا مكره له

ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی شخص دعا کرے تو یوں نہ کہے کہ اے اللہ مجھے بخش دے اگر تو چاہے اے اللہ مجھ پر رحم کر! اگر تو چاہے بلکہ بغیر شرط قطعیت کے ساتھ دعا کرے۔ اس لیے کہ اللہ پر جبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر اللہ نہ چاہے تو زبردستی اس سے کوئی چیز حاصل نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے اس کے چاہنے کی شرط لگانا بے کار بھی ہے اور ادب دعا کے خلاف بھی ہے۔

---

[1] اس مقالے کی پہلی قسط ستمبر ۱۹۶۹ اور دوسری قسط دسمبر ۱۹۶۹ میں شائع ہوئی تھی۔

(۲) دعا میں تصنع اور تکلف کر کے مسجع و مقفیٰ الفاظ استعمال کرنا غلط ہے کیونکہ اس طرح دعا کی روح اس سے غائب ہو جاتی ہے نہ حضورِ قلب باقی رہتا ہے اور نہ تضرع کی کیفیت پیدا ہوتی ہے بلکہ ذہن قافیے اور سجع کی تلاش میں لگ جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک بار اپنے شاگرد حضرت عکرمہ کو چند ہدایتیں دیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی:-

فانظر السجع من الدعاء فاجتنبه — دعا میں سجع سے اجتناب کرو کیونکہ میں نے

فانی عهدت رسول الله صلی الله علیه وسلم — رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو ایسا

واصحابه لا یفعلون ذالك. بخاری — کرتے نہیں پایا۔

البتہ اگر بلا تکلف مسجع و مرصع الفاظ زبان سے نکلیں تو دعا ایک پارۂ ادب بھی بن جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثر دعائیہ کلمات، بہترین پارہ ہائے ادب بھی ہیں۔

(۳) دعا میں اعتداء یعنی حد سے تجاوز کرنا بھی ایک غلط کام ہے۔ سورۂ اعراف کی آیت ۵۵ میں جو اس مقالے کی قسط اول میں نقل کی گئی ہے فرمایا گیا ہے:- "اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

دعا میں حد سے تجاوز کرنے کی متعدد صورتیں ہوتی ہیں:-

(الف) ناروا چیزوں کی طلب بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ایسی چیزوں کی دعا کرنا جو ناروا اور ناجائز ہیں۔ اعتداء فی الدعا (دعا میں حد سے تجاوز کرنا) ہی کی ایک قسم ہے اور واقعہ یہ ہے کہ دعا میں حد سے تجاوز کی یہ بدترین شکل ہے۔ ایسا کرنا حقیقت دعا کی عین ضد ہے اور اس طرح کی دعاؤں سے انسان اللہ کے غضب میں گرفتار ہو سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک مسلمان جو سودی کاروبار کر رہا ہے اگر وہ اپنے اس کاروبار کی ترقی کے لیے اللہ سے دعا کرتا ہے تو وہ احمق اپنے آپ کو خدا کے غضب کا مستحق بنا رہا ہے اس لیے کہ قرآن میں سودخواروں کو اللہ و رسول سے جنگ کا چیلنج دیا گیا ہے۔ اللہ سے صرف ایسی ہی چیز مانگنی چاہیے جس کے بارے میں پورا علم ہو کہ وہ جائز ہے۔

(ب) بلا ضرورت زور زور سے دعا کرنا

بلا ضرورت بآواز بلند دعا کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ اس کی دو دلیلیں تو سورۂ الاعراف کی آیت ۵۵ میں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں چپکے چپکے دعا کرنے کا حکم ہے اور اصل قاعدے کے لحاظ سے ہر امر (حکم) وجوب کے

لیے ہوتا ہے اور اگر اس کو وجوب کے لیے نہ مانا جائے تو کم سے کم اس کا پسندیدہ اور مستحب ہونا تو ثابت ہوتا ہی ہے ۔ دوسری دلیل ان اللہ لا یحب المعتدین (اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا) کے ٹکڑے میں ہے ۔ کلبی اور ابن جریج نے کہا ہے کہ اس آیت میں اعتداء سے مراد رفع الصوت فی الدعاء ہے یعنی دعا میں آواز بلند کرنا حد سے تجاوز کرنا ہے ۔ اس آیت کے علاوہ دوسری آیات و احادیث سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کے ذکر اور دعا دونوں ہی میں آہستگی پسندیدہ ہے ۔ اللہ کے ذکر میں آہستگی کا حکم سورہ اعراف کی آیت ۲۰۵ میں ہے :۔

"اے نبی ! اپنے رب کو یاد کیا کرو دل ہی دل میں گڑگڑاتے ہوئے اور خوف کے ساتھ ۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی مدح کرتے ہوئے ان کی ایک خاص دعا کا بیان قرآن میں اس طرح ہے

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِیًّا مریم ۔ ۳ جبکہ انھوں نے اپنے رب کو چپکے چپکے پکارا

امام رازی نے لکھا ہے کہ اس آیت سے بھی یہی مستنبط ہوتا ہے کہ آہستگی کے ساتھ دعا کرنا مستحب ہے

بخاری و مسلم میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک سفر جہاد میں صحابہ کرام با آواز بلند تکبیر کہنے لگے تو حضور نے انہیں اس سے روکا اور فرمایا کہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ ایک ایسی ذات کو پکار رہے ہو جو سمیع و قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے ۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ :۔

"حضرت حسن بصریؒ کہتے تھے کہ کوئی شخص پورا قرآن حفظ کر لیتا تھا لیکن اس کے پڑوسی کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی ، اسی طرح کوئی شخص تہجد کی طویل نماز یں پڑھتا تھا اور اس کے پاس لیٹے ہوئے شخص کو اس کا شعور بھی نہیں ہوتا تھا ۔ وہ فرماتے تھے کہ ہم نے ایسے لوگوں کو پایا ہے جو اعمال خیر کے اخفا میں مبالغہ کرتے تھے ۔ ہم نے ان مسلمانوں کو دیکھا ہے جو دعا میں پوری محنت صرف کرتے تھے لیکن ان کی آواز بلند نہیں ہوتی تھی اس لیے کہ اللہ نے فرمایا ہے کہ اپنے رب کو یاد کرو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے ۔"

اس کے علاوہ انسان کا نفس دکھاوے اور شہرت طلبی کی طرف میلان رکھتا ہے اس لیے با آواز بلند دعا کرنے میں اندیشہ ہے کہ اس میں ریا کی آمیزش ہو جائے ۔ اس سے بچنے کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ چیخ چیخ کر دعا نہ کی جائے ۔ آج کل جلسوں میں اور مسجدوں میں زور زور سے دعا مانگنے کا جو رواج ہو گیا ہے وہ دعا کے اس ادب سے لاعلمی کی دلیل ہے ۔ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ جو سنن و نوافل سے فارغ ہو کر با آواز بلند دعا مانگنے لگتے ہیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے لوگوں کو جو ابھی نماز میں مشغول ہیں پریشانی ہو گی ۔ البتہ اگر

کوئی ضرورت داعی ہو تو درمیانی آواز کے ساتھ دعا مانگی جاسکتی ہے۔

(۴) دعا میں غیر ضروری الفاظ بڑھانا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نہ صرف یہ کہ خود جامع دعائیں پسند فرماتے تھے بلکہ آپ نے غیر ضروری الفاظ بڑھانے پر تنبیہ بھی کی تھی۔ ہم یہاں اس طرح کی چند حدیثیں نقل کرتے ہیں۔

عن عائشۃؓ قالت کان رسول اللہ	حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم یستحب الجوامع من الدعاء	علیہ وسلم جامع دعائیں پسند فرماتے تھے اور غیر جامع
ویدع ماسوی ذالک (مشکوٰۃ بحوالہ ابوداؤد)	کو ترک کر دیتے تھے۔

"جامع دعا" کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ آپؐ دنیا و آخرت دونوں ہی کی بھلائیاں طلب فرماتے تھے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعاؤں کے الفاظ کم لیکن معانی بہت ہوتے تھے یعنی آپ اپنی دعاؤں کو غیر ضروری الفاظ بڑھا کر طویل نہیں کرتے تھے۔ صحابہ کرامؓ نے دعا کے اس ادب کو اچھی طرح ذہن نشین کیا تھا اور وہ غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو دعا میں اعتداء (حد سے تجاوز) قرار دیتے ہیں۔ ابوداؤد وغیرہ میں ہے کہ حضرت سعد بن وقاصؓ نے اپنے ایک بیٹے کو دعا مانگتے ہوئے سنا وہ کہہ رہے تھے۔

اے اللہ! میں تجھ سے جنت مانگتا ہوں اور اس کی نعمتیں اور اس کا ریشم اور یہ اور وہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں دوزخ سے اور اس کی زنجیروں سے اور اس کے طوق سے۔

جب وہ دعا ختم کر چکے تو حضرت سعد نے ان سے کہا تم نے خیر کثیر کی دعا کی اور بہت سے شر سے پناہ مانگی اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب ایسے لوگ آئیں گے جو دعا میں حد سے تجاوز کریں گے اور بعض حدیثوں میں ہے کہ لوگ وضو میں اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ جنت کی طلب میں اس کی تمام نعمتوں اور آسائشوں کی طلب خود بخود داخل ہے۔ اسی طرح دوزخ سے استعاذہ میں اس کی تمام سزاؤں اور زحمتوں سے استعاذہ خود بخود داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت سعد نے جنت کی دعا کے ساتھ اس کی نعمتوں کی تفصیل کو اور جہنم سے استعاذے کے ساتھ اس کی سزاؤں کے ذکر کو ناپسند کیا اور ان غیر ضروری الفاظ کے اضافے کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سنا:۔

اے اللہ! میں تجھ سے قصر ابیض (سفید محل) مانگتا ہوں جنت کے داہنے جانب۔

یہ سنکر انھوں نے کہا جنت مانگو اور جہنم سے پناہ چاہو۔ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ عنقریب اس امت میں ایسے لوگ ہوں گے جو وضو اور دعا میں حد سے تجاوز کریں گے۔ اس دعا میں انھوں نے غیر ضروری قیدا ور شرط کو ادب دعا کے خلاف قرار دیا۔ وضو میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ ہے کہ بلا ضرورت ہر عضو کو تین بار سے زیادہ دھویا جائے ۔ اگر کسی شخص کو اپنی کوئی خاص اور وقتی حاجت وضرورت کی دعا رمانگنی نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ وہ "دعا ماثورہ" یعنی قرآن اور احادیث میں مذکور دعائیں مانگے۔ ان میں خاص برکت بھی ہے اور وہ ان تمام بے احتدالیوں سے محفوظ بھی ہیں جو دعا میں انسان سے ہو سکتی یا ہو جایا کرتی ہیں۔

(د) دعا کو تقریر بنا دینا

جب دعا میں غیر ضروری الفاظ کا اضافہ بھی آداب دعا کے خلاف اور حد سے تجاوز کرنا ہے تو دعاؤں کو تقریر بنا دینا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ آج کل دیکھا جا رہا ہے کہ بعض لوگوں نے دعا کو خطابت کا ایک فن بنا دیا ہے۔ دعا اور ایک لمبی تقریر میں کوئی فرق باقی نہیں رہا ہے۔ یہ دعا کے ساتھ بڑی بے ادبی کا رویہ ہے اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

(ہ) اپنی حیثیت سے زیادہ کی طلب

دعا میں حد سے تجاوز کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنی حیثیت سے بلند چیزوں کی دعا کرے مثال کے طور پر اگر ہم اللہ سے تقرب کا وہ درجہ مانگیں جو انبیاء کرام کا ہے تو یہ آداب دعا کے خلاف ہوگا' یا کوئی مسلمان ایک طرف تو اللہ کی نافرمانیاں کیے جا رہا ہو اور دوسری طرف اس سے جنت کی دعا بھی مانگ رہا ہو حالانکہ اس کو سب سے پہلے نافرمانیوں سے باز آنا چاہیے' توبہ کرنی چاہیے اور اللہ سے اطاعت و عبادت کی توفیق مانگنی چاہیے۔

آدابِ دعا

دعا کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھ سینے تک اٹھا کر دعا مانگے اور دعا ختم کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو اپنے چہرے پر پھیرلے۔ اگر دعا کرنے والا باوضو اور قبلہ رو ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ فرض نمازوں کے بعد یا سنن ونوافل کے بعد جو دعائیں مانگی جاتی ہیں ان میں ان آداب پر آسانی عمل کیا جا سکتا ہے اور مسلمان ایسا کرتے بھی ہیں۔ دعا سے پہلے اللہ کی حمد وثنا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا اور دعا کے بعد آمین کہنا بھی آداب دعا میں داخل ہے۔ دعا کے یہ آداب' احادیث رسول سے ثابت ہیں۔

میں طوالت کے خوف سے وہ حدیثیں یہاں نقل نہیں کر رہا ہوں۔

مقبولیت دعا کی ایک اور شرط

دعا کے بعد اس کی مقبولیت کی ایک اور شرط یہ ہے کہ دعا کرنے والا اس کے لیے جلدی نہ مچائے۔ امام بخاری و مسلم دونوں ہی نے حضرت ابوہریرہ رضہ سے روایت کی ہے:۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے جو شخص بھی دعا کرے اس کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ جلد بازی کرکے یہ نہ کہنے لگے کہ میں نے دعا کی لیکن وہ قبول نہیں کی گئی

امام مسلم کی روایت میں یہ ہے:۔

بندے کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک وہ کسی گناہ یا قطع رحم کی دعا نہ کرے اور جب تک وہ جلدی نہ مچائے۔ پوچھا گیا کہ استعجال (جلد بازی) کا مطلب کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ دعا گو کہنے لگے کہ میں نے دعا کی پھر دعا کی لیکن میں نہیں سمجھتا کہ وہ قبول ہوگی اور پھر وہ دعا کرنا ترک کردے۔

مقبولیت دعا میں جلد بازی چند نادانیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ایک نادانی یہ ہے کہ دعا کرنے والا دعا کی حقیقت ہی سے ناواقف ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ غلام تسلیم و رضا کا پیکر بنا ہوا اپنے مہربان آقا کے دامن سے چمٹا رہے اور اس کے سامنے احتیاج کا ہاتھ پھیلائے رہے۔ دعا عبادت بلکہ مغز عبادت ہے اور عبادت کے اجر کا محل اصلاً یہ دنیا نہیں ہے بلکہ آخرت ہے۔ جلد باز دعا گو کی دوسری نادانی یہ ہے کہ وہ اپنی دعا کو ہر طرح قابل قبول سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا ہے وہ کیوں نہیں سمجھتا کہ مقبولیت دعا کی جو شرطیں ہیں وہ پوری نہ ہوئی ہوں۔ وہ یہ جانتا ہے کہ آقا اس کا بخیل نہیں ہے اور نہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے۔ وہ رحمٰن و رحیم بھی ہے، عادل بھی ہے، حکیم بھی ہے اور جواد و فیاض بھی ہے۔ اب اگر اس کی مانگی ہوئی چیز نہیں مل رہی ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی ——— تیسری نادانی یہ ہے کہ وہ مقبولیت دعا کا صحیح مطلب نہیں سمجھتا اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بندہ جو کچھ مانگے وہ ہر حال میں اسے دے ہی دیا جائے۔ خواہ اس کی مصلحت کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ بلکہ دعا کی مقبولیت اللہ کی حکمت اور بندے کی مصلحت کے ساتھ مربوط ہے۔

انسان کی فطرت میں چونکہ جلد بازی داخل ہے اس لیے اس کے برے اثرات سے بچانے اور مطمئن کرنے کے لیے دعا کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتا دیا ہے کہ مومن کی دعا کبھی رد نہیں کی جاتی بلکہ ہمیشہ قبول

جاتی ہے البتہ قبول کرنے کی نوعیت مختلف ہوتی ہے ۔

مومن کی دعا رد نہیں کی جاتی

(۱) عن سلمان قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان ربکم حیی کریم یستحی من عبدہ اذا رفع یدیہ الیہ ان یردھما صفرا (ترمذی، ابوداؤد، بیہقی)

حضرت سلمان فارسی کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ بلاشبہہ تمہارا رب صفت حیا سے متصف اور کریم ہے جب اس کا بندہ اس کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلاتا ہے تو اسے حیا آتی ہے کہ ان ہاتھوں کو خالی لوٹا دے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندۂ مومن کے دعا میں اٹھے ہوئے ہاتھ کبھی محروم اور خالی واپس نہیں آتے بلکہ اپنے مولائے کریم سے کچھ نہ کچھ لے کر لوٹتے ہیں لیکن یہ بات ذہن سے اوجھل نہ ہونے دینا چاہیے کہ قبولیت دعا کے آداب وشرائط کا لحاظ ضروری ہے ۔ ان آداب وشرائط کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے ۔

(۲) عن ابی سعید عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما من مسلم یدعو بدعوۃ لیس فیھا اثم ولا قطیعۃ رحم الا اعطاہ اللہ بھا احدی ثلث اما ان یعجل لہ دعوتہ واما ان یدخرھا لہ فی الآخرۃ واما ان یصرف عنہ من السوء مثلھا قالوا اذا نکثر قال اللہ اکثر (ترغیب وترہیب بحوالہ مسند احمد وبزار وابویعلی)

حضرت ابوسعید خدری رضؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں ۔ جب کوئی مسلمان ایسی دعا کرتا ہے جس میں کوئی گناہ یا رشتہ کاٹنے والی بات نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اسے تین چیزوں میں سے کوئی ایک چیز عطا فرماتا ہے ۔ (۱) جو کچھ اس نے مانگا ہے دنیا ہی میں اسے دے دے ۔ (۲) اس کا اجر آخرت کے لیے ذخیرہ کر دے ۔ (۳) جو خیر اس نے مانگی تھی اسی کے مثل کوئی شر اس سے دور کر دے ۔ صحابہ نے کہا تب تو ہم بکثرت دعائیں مانگیں گے ۔ حضور نے فرمایا اللہ کا خزانہ اس سے بھی زیادہ ہے ۔

اسی مضمون کی حدیثیں حضرت عبادہ بن الصامت رضؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں ۔ ان حدیثوں میں بھی قبولیت دعا کی ایک شرط مذکور ہے یعنی یہ کہ اس کی دعا میں کسی گناہ کی طلب یا قطع رحمی کی کوئی بات نہ ہو ۔ دعا میں قطع رحمی کی ایک صورت یہ ہے کہ رشتہ داروں کے حق میں دعائے خیر کے بجائے بد دعا کی گئی ہو

یہ حدیثیں مجھ جیسے عجلت پسند انسان کو اطمینان دلاتی ہیں کہ شرائط و آداب کے ساتھ کوئی بھی مخلصانہ دعا رد نہیں کی جاتی ۔ ہم دنیا میں کوئی بھلائی مانگتے ہیں اور وہ نہیں ملتی یا کسی مصیبت اور تکلیف کو دور کرنے کی دعا کرتے ہیں اور وہ دور نہیں ہوتی تو ہم دل شکستہ اور مایوس ہونے لگتے ہیں ۔ یہ حدیثیں اس دل شکستگی اور مایوسی کو ختم کر دیتی ہیں اور ہمیں یقین دلاتی ہیں کہ مانگنے کے باوجود دنیا میں ہمیں جو کچھ نہیں ملا اس کا بدلہ آخرت میں ضرور ملے گا اور وہاں جو کچھ ملے گا وہ بہتر بھی ہوگا اور پائندہ تر بھی ۔

دعا کے بارے میں ایک بڑی غلطی کا ازالہ

فلسفۂ یونان کے اثر سے جب اسلامی عقائد اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات میں بحثیں شروع ہوئیں تو اسلامی لٹریچر میں ایک نئے علم، علم کلام کا اضافہ ہوا اور تصوف بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ فلسفہ اور علم کلام نے جو سب سے بڑا نقصان پہنچایا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی نگاہ سے قرآن اور احادیث کے دلائل اوجھل ہو گئے اور انھوں نے بھی فلسفیوں کی طرح عقلی و دماغی جمناسٹک کی مشق شروع کر دی ۔ کتاب و سنت کے معقول دلائل انسان کے دل میں اطمینان اور یقین کی کیفیت پیدا کرتے ہیں ۔ اس کے برخلاف فلسفے کے عقلی دلائل قلب کو شک اور تردد میں مبتلا کر دیتے ہیں ۔ بہرحال فلسفیانہ بحث و مباحثہ کی زد "دعا" پر بھی پڑی اور اس کے بارے میں بھی لوگوں نے عقلی تیر تکے چلانے شروع کر دیے ۔ تصوف میں بھی اس مسئلے میں متعدد اقوال پیدا ہو گئے ۔ رسالۂ قشیریہ میں جو تصوف کی قدیم اور مستند کتاب ہے وہ اقوال نقل کیے گئے ہیں

(۱) دعا کرنا افضل ہے ۔ (۲) خاموش اور راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے ۔ (۳) بہتر یہ ہے کہ بندے کی زبان دعا گو رہے اور قلب راضی برضا رہے ۔ (۴) مختلف اوقات و حالات کا حکم مختلف ہے بعض حالات میں دعا کرنا خاموش رہنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے اور بعض حالات میں خاموش رہنا دعا کرنے سے افضل ہے اور اس وقت کا یہی ادب ہے ۔ اس کا معیار یہ ہے کہ اپنے قلب کو دیکھے اگر وہ دعا کا اشارہ کرے تو دعا افضل ہوگی اور اگر سکوت کا اشارہ کرے تو سکوت افضل ہوگا ۔ (۵) اپنے حال کا لحاظ کرے ۔ اگر دعا کے وقت کیفیت بسط میں زیادتی محسوس کرے تو دعا افضل ہوگی اور اگر اس وقت کسی قسم کی اکتاہٹ اور قبض کی کیفیت محسوس ہو تو سکوت افضل ہوگا اور اگر نہ "بسط" میں زیادتی ہو اور نہ "قبض" میں تو دعا اور ترک دعا کا معاملہ برابر رہے گا ۔ (۶) اگر ارادۂ دعا کے وقت "علم" غالب ہو تو دعا افضل ہے اس لیے کہ وہ عبادت ہے اور اگر اس وقت "معرفت"، "حال" اور "سکوت" غالب ہو تو خاموش رہنا افضل ہوگا

(۷) جس دعا میں مسلمانوں کا حصہ ہو یا حق تعالیٰ کا اس پر حق ہو تو دعا بہتر ہے اور اگر اس میں خود دعا کرنے والے کا اپنے لیے حظ و نصیب ہو تو سکوت اولیٰ ہے۔

ان اقوال میں فلسفیانہ تصوف کی چند اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ وقت، حال، اشارہ، بسط، قبض، علم، معرفت، سکوت ــــــ دعا کے بارے میں قرآن و حدیث کی جو تصریحات اوپر گزریں انھیں پڑھیے اور پھر رسالۂ قشیریہ میں منقول ان اقوال پر نظر ڈالیے تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام اقوال تصوف میں فلسفے کو داخل کر دینے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ہم نہ فلسفۂ یونان کی افادیت کے قائل ہیں اور نہ ہمیں اجنبی عناصر سے مخلوط تصوف سے دلچسپی ہے اس لیے ان اقوال و اصطلاحات کی توضیح بے کار ہے۔ البتہ ایک غلطی کا ازالہ ضروری ہے جس کا تعلق حدیث نبوی سے ہے۔ دعا کے سلسلے میں دوسرا قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ خاموش اور راضی بقضا یا راضی برضائے الٰہی رہنا افضل ہے۔ اس قول کی دلیل کے طور پر رسالۂ قشیریہ میں یہ حدیث نقل کی گئی ہے۔

وقد قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم	اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ
خبراً عن اللہ تعالیٰ من شغلہ ذکری	اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جس شخص کو میرے ذکر نے مشغول
عن مسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی	کر دیا مجھ سے سوال کرنے سے، میں اس کو دوں گا
السائلین (الرسالۃ القشیریہ ص۱۱۹ مطبوعہ مصر)	اس سے بہتر جو سوال کرنے والوں کو دیتا ہوں

راقم الحروف نے مشکوٰۃ، جمع الفوائد، ترغیب و ترہیب اور کنز العمال میں یہ حدیث تلاش کی لیکن ناکام رہا البتہ قرآن کریم کی فضیلت کے بیان میں امام ترمذی اور دارمی نے یہ حدیث روایت کی ہے۔

عن ابی سعید قال قال رسول	ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ رسول اللہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول الرب	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ رب تبارک و تعالیٰ
تبارک و تعالیٰ من شغلہ القرآن عن	فرماتا ہے جس کو قرآن نے مشغول کر دیا میرے ذکر اور
ذکری ومسئلتی اعطیتہ افضل ما اعطی	دعا سے میں اس کو عطا کروں گا اس سے بہتر جو
السائلین ففضل کلام اللہ علی سائر	سوال کرنے والوں کو عطا کرتا ہوں پس دوسرے
الکلام کفضل اللہ علی خلقہ	کلاموں پر کلام اللہ کی فضیلت ایسی ہے جیسے اللہ
(ھذا حدیث حسن غریب ترمذی قبیل ابواب القرات)	کی فضیلت اس کی مخلوق پر۔

امام دارمی نے یہ حدیث باب فضل کلام اللہ علیٰ سائر کلام اللہ میں روایت کی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں :-

من شغلہ قراءۃ القرآن عن مسئلتی	جس کو قرآن کی تلاوت نے مشغول کر دیا
و ذکری اعطیتہ ثواب السائلین	مجھ سے سوال کرنے اور میرے ذکر سے میں اس کو
و فضل کلام اللہ علی سائر الکلام	دوں گا سوال کرنے والوں سے بہتر اجر اور اللہ
کفضل اللہ علی خلقہ	کے کلام کی فضیلت بقیہ دوسرے کلاموں پر ایسی
	ہے جیسے اللہ کی فضیلت اس کی مخلوق پر ۔

یہ ایک ضعیف حدیث ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے کلام قرآن مجید کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ اگر قرآن کی تلاوت میں اس درجہ مشغولیت رہی کہ قاری قرآن، اللہ کا کوئی اور ذکر اور اس سے دعا نہ کر سکا تو وہ لے مانگنے والوں کے مقابلہ میں افضل اور بہتر چیز عطا کرے گا اور اس کی یہ وجہ بھی اس میں بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کا کلام چونکہ دوسرے تمام کلاموں سے افضل ہے۔ اس لیے اس کا اجر اور اس کی برکت بھی سب سے زیادہ ہوگی اس ضعیف حدیث میں شاغل (مشغول کرنے والا) قرآن ہے اور مشغول عنہ (مشغولیت کی وجہ سے جس کی طرف توجہ نہیں کی جا سکی) ذکر بھی ہے اور دعا بھی ہے ۔ اسی حدیث میں کسی نے تحریف کر کے ان صوفیوں کو سنا دی جو ترک دعا کو افضل قرار دیتے تھے اور انھوں نے بلا تحقیق اسے قبول کر لیا اور پھر صاحب رسالہ قشیریہ نے بھی اسے اپنی کتاب میں نقل کر دیا ۔ تحریف کرنے والے نے تلاوت قرآن کو حذف کر کے ذکر کو شاغل اور دعا کو مشغول عنہ بنا دیا حالانکہ اس حدیث میں ذکر اور دعا دونوں ہی مشغول عنہ اور قرآن شاغل تھا ۔

اصل میں رضا بالقضا یعنی اللہ کے فیصلے اور اس کی مرضی پر راضی رہنے کا مطلب ان لوگوں نے صحیح نہیں سمجھا جو ترک دعا کو افضل کہتے ہیں ان کے خیال میں اللہ سے اپنے لیے کچھ مانگنا مقام تسلیم و رضا کے خلاف ہے حالانکہ یہ خیال قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف اور بالکل غلط ہے ۔ حد ہو گئی کہ ابو سلیمان دارانی نے جو اپنے وقت کے ایک بڑے صوفی تھے "رضا" کی تعریف میں یہاں تک کہہ دیا :-

قال ابو سلیمان الرضا ان لا تسال اللہ تعالیٰ الجنۃ ولا تستعیذ بہ من النار	ابو سلیمان نے کہا کہ "رضا" یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے نہ جنت کی دعا کرو اور نہ دوزخ سے پناہ مانگو

یہ قول جس کا بھی ہو اللہ و رسول کے اقوال کی عین ضد ہے اور صوفیائے کرام ہی کی تصریحات کے مطابق اسے دیوار پر دے مارنا چاہیے ۔ میں یہاں اپنے وقت کے ایک دوسرے بڑے صوفی ابو حازم الاعرج (باقی صفحہ

۳۱ سوالات

آغا شورش کاشمیری نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ سے ۳۱ سوالات کیے تھے وہ سوالات و جوابات ہم معاصر چٹان لاہور کے شکریے کے ساتھ یہاں نقل کر رہے ہیں۔ آغا صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"میں نے سوالات پوچھنا شروع کیے اور وہ اس اعتماد کے ساتھ بولتے رہے گویا ایک بند کتاب کے ورق خود بخود الٹتے اور پلٹتے جا رہے ہیں" (ادارہ)

سوال ۱۔ ملک میں آمریت کے خلاف عوامی تحریک کی جو شکلیں پچھلے دنوں پیدا ہوئیں ان سے آپ کلاً یا جزءً متفق ہیں؟ آپ کے نزدیک ان کا کون سا حصہ اصلح اور کون سا غیر اصلح ہے؟

جواب۔ ملک میں آمریت کے خلاف تحریک جمہوریت کے تحت جو عوامی جدوجہد شروع کی گئی تھی وہ بالکل صحیح طریقوں سے جاری تھی۔ اگست ۶۸ء کے آخر میں جب میں علاج کے لیے ملک سے باہر گیا اس وقت تک مجھے پورا اطمینان تھا کہ تحریک بالکل آئینی، جمہوری اور شائستہ طریقوں سے چل رہی ہے۔ بعد میں میرے پیچھے جو حالات پیش آئے ان کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا کہ ٹھیک ٹھیک کس وقت اس میں غلط رنگ داخل ہونا شروع ہوا۔ دسمبر ۶۸ء کے آخر میں انگلستان سے واپس ہو کر میں نے دیکھا کہ تحریک جمہوریت اور اس کے ساتھ شامل ہونے والی جماعتیں، جن کو ملا کر جمہوری مجلس عمل بنائی گئی تھی، تحریک جمہوریت کو پرامن آئینی طریقوں سے جاری رکھنے کی انتہائی کوشش کر رہی ہیں۔ لیکن کچھ دوسرے لوگ اس کو زبردستی تشدد کی راہ پر دھکیلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہی دوسرا حصہ غیر اصلح تھا۔ اس کو میں غیر اصلح اس وجہ سے کہتا ہوں کہ جو لوگ اس تحریک کو تشدد کی راہ پر دھکیلنا چاہتے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ کا مقصد یہ تھا کہ حکومت کے لیے تحریک کو کچل دینے کا بہانہ فراہم ہو اور دوسرے لوگوں کا مقصد وہ تھا جسے میں آپ کے دوسرے سوال کے جواب میں بیان کروں گا۔

سوال ۲۔ کیا آپ اس سے متفق ہیں کہ تحریک سے فائدہ اٹھا کر کمیونسٹوں کی واضح اقلیت نے

عوام الناس بالخصوص نئی پود کے دل و دماغ میں اپنی مخصوص اصطلاحات اور مخصوص نعرے ثبت کرنے کے علاوہ اس ڈھنگ کے ہنگامے برپا کرنے کی کوشش کی جو کمیونسٹوں کا ہمیشہ غیر کمیونسٹ ملکوں میں شعار رہا ہے۔

جواب۔ آپ کے پہلے سوال کے جواب میں میں نے جس دوسرے گروہ کا ذکر کیا ہے، اس کے متعلق میرا اندازہ یہ ہے کہ اس کے اندر کمیونسٹ اور فاشسٹ دونوں قسم کے رجحانات رکھنے والے لوگ شامل تھے اور ان کا مدعا یہ تھا کہ پرامن تحریک کو ایک خونی انقلاب کے راستے پر دھکیل دیا جائے۔ پرامن تحریک دراصل جمہوریت بحال کرنے کے لیے چل رہی تھی اور وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ تحریک اسی طریقے پر کام کرتی رہی تو آخر کار جمہوریت قائم ہو جائے گی جو ان کے مقصد کے خلاف ہے۔

خونی انقلاب کے ذریعے کبھی جمہوریت قائم نہیں ہوا کرتی۔ اس کے نتیجے میں یا تو فاشزم قائم ہوتا ہے، یا کمیونزم یا پھر ملک انارکی کا شکار ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔

سوال ۳۔ کمیونسٹوں کا شعار ہے کہ جہاں تہاں اقلیت میں ہوں وہاں دائیں بازو کی مختلف جماعتوں میں گھس کر اپنی طاقت کے اظہار و اندازہ کے لیے نہ صرف عمومی خلفشار اور سیاسی انتشار کی پالیسی اختیار کرتے بلکہ اس قوم کے معتقدات میں سے کسی ایک جز کو چھیڑ کر اپنی طاقت کا اندازہ کرتے اور اپنے نظریے کی بالادستی کو بہ لطائف الحیل قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کی بے حرمتی کے واقعہ پر انھوں نے مسلمانوں کے احتجاج کو اولاً ختم کرنا اور ثانیاً ہلکا کرنا چاہا۔ اس قسم کے واقعات میں ان کا منشا یہ ہوتا ہے کہ:۔

(ا) قومی اور مذہبی عصبیت کا اندازہ کریں

(ب) اندازہ لگائیں کہ اس قوم کی دین کے بارے میں گرفت کیا ہے؟

(ج) ان کے مدمقابل جماعتوں کی طاقت (مدافعتی و مزاحمتی) کس قدر ہے؟

(د) عوام میں اس کا ردعمل کیا ہے؟

(ی) کن کن حربوں سے اس ردعمل کا تدارک کیا جا سکتا ہے؟

جواب۔ آپ نے اپنے سوال میں دائیں بازو کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ دائیں اور بائیں بازو کی جو اصطلاح استعمال کی ہے اس سے مجھے اختلاف ہے۔ دائیں اور بائیں کی اصطلاحات

مغرب سے آئی ہیں اور ہم اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ اسلام کے حامیوں کا تعلق بائیں بازو کے مقابلے میں دائیں بازو سے ہے۔ دائیں بازو کا لفظ اصطلاحاً جاگیرداری اور سرمایہ داری کے حامیوں، مفاد یافتہ طبقوں اور سابق نظام کو بحال رکھنے کے خواہشمندوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ مسلمان جو اس ملک میں اسلام کے نظریے کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے طالب ہیں امت وسط ہیں جن کی نگاہ میں دایاں بازو بھی اتنا ہی غلط ہے جتنا بایاں بازو۔ اسلام کی صراط مستقیم، اعتدال اور حق پرستی کی راہ ہے جو نہ دائیں جانب جھکاؤ رکھتی ہے، نہ بائیں جانب۔ مسلمانوں کا مقام دنیا میں ایک جج (عادل و منصف) کا مقام ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ تحریک جمہوریت میں ایسے لوگ بھی شامل ہو گئے تھے جو واقعی دائیں بازو سے تعلق رکھتے تھے مگر اکثریت ان کی نہ تھی۔ اکثریت ان عام مسلمانوں کی تھی جو یہاں اسلام کو نافذ دیکھنا چاہتے ہیں اور جنھوں نے اپنی جان اور مال کو خطرے میں ڈال کر اس ملک کو نظریہ اسلام کے لیے حاصل کیا تھا۔

اشتراکی اور فاشسٹ عناصر نے یہ محسوس کیا کہ اگر تحریک جمہوریت کے ذریعے یہاں ایک جمہوری نظام قائم ہو گیا تو وہ لامحالہ دیر یا سویر اسلامی نظام کی شکل اختیار کرے گا۔ اس لیے انھوں نے پہلے مرحلے میں جمہوری تحریک کو تشدد کی طرف دھکیلنے کی کوشش کی اور دوسرے مرحلے میں جب انھوں نے یہ دیکھا کہ حکومت تحریک جمہوریت کے رہنماؤں سے بات چیت کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے اور عنقریب یہاں جمہوریت بحال ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں تو انھوں نے کھلم کھلا اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے کام شروع کر دیا۔ مشرقی پاکستان میں ان کی پیدا کردہ صورت حال سارے ملک کے سامنے آ گئی ہے جہاں انھوں نے سارے صوبے میں انتہائی درندگی کے ساتھ مار دھاڑ، قتل و غارت اور لاقانونیت پھیلا دی تھی۔ یہ وہ آئیڈیل صورت حال ہے جو کسی ملک میں اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لیے موزوں ہوتی ہے۔

مغربی پاکستان میں چونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ اسلام کی حامی طاقتوں کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ اس لیے انھوں نے یہاں براہ راست اسلام اور سوشلزم کے تصادم سے اپنے کام کی ابتدا کی اور آپ کا یہ اندازہ بالکل صحیح ہے کہ قرآن کی بے حرمتی کے ارتکاب سے وہ یہ اندازہ کرنا چاہتے تھے کہ یہاں میدان ان کے لیے کس حد تک سازگار ہے اور مدافعت و مزاحمت کی کتنی طاقت ہے ان کے پاس اس فعل کی مثال بالکل وہی ہے جیسے رات کے وقت چور کسی کے گھر میں پتھر پھینک کر یہ اندازہ کرتے ہیں کہ گھر والے جاگ رہے ہیں یا بے خبر سو رہے ہیں۔ اس حرکت کا بھاری ردِ عمل دیکھ کر انھوں نے جو مختلف حربے عوام کے ذہن میں الجھاؤ پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے وہ سب کے سامنے

تھی۔ ملتان میں انھوں نے فوراً ایک جھوٹا واقعہ قرآن مجید کی بے حرمتی کا گھڑا لیکن بہت جلدی اس غریب کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ پھر بھاشانی صاحب پر حملے کا افسانہ تصنیف کیا گیا تاکہ اپنے تشدد کے لیے دوسروں پر تشدد کا الزام عائد کر کے وجہ جواز پیدا کی جائے لیکن اس کا بھانڈا بھی اب پھوٹ چکا ہے، کیونکہ جن جماعتوں پر انھوں نے اس حملے کا الزام لگایا تھا ان کا کوئی فرد بھی اس واقعہ میں ملوث نہ پایا گیا۔ ان کے ان حربوں میں جو چیز ان کے لیے سب سے زیادہ مددگار ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ پچھلے دس سال کی آمریت کی عنایت سے پریس اور خبر رساں ایجنسیوں اور ریڈیو پر ایک بڑی حد تک سرخ عناصر کا قبضہ ہو چکا ہے جس کی بدولت وہ ہر جھوٹ پھیلانے اور ہر سچ کو چھپانے پر قادر ہیں۔

سوال ملک ظاہر ہے کہ دو گروہ یہاں پر تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ سوشلزم کو اس کی معنویت کے ساتھ لانا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ:۔

(۱) یہ دونوں واقعی ہم آہنگ ہیں، یا دونوں میں مقاصد و عزائم کے لحاظ سے فاصلہ ہے؟

(۲) کیا ان میں سے ایک پارٹی واقعی سوشلزم چاہتی ہے یا ان کے سامنے فرد واحد کا اقتدار ہے؟ اور کیا یہ صحیح ہے کہ "اسلام ہمارا دین ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے" کے دل فریب نعرے سے وہ نئی پود کے ذہنی ویرانے کو فکری سراب کے حوالے کر رہے ہیں؟

(۳) کیا یہ سہ قسمی نعرہ اسلامی تعلیمات کی وحدت کے منافی نہیں؟

(۴) آپ کے خیال میں یہ پارٹی واقعی اسی سوشلزم کی داعی ہے جس کا بانی کارل مارکس اور عملی رہنما لینن، اسٹالن یا ماؤ ہیں؟ یا اس کے سہ رنگے سوشلزم میں کوئی اور فلسفہ مضمر ہے؟ جواب اثبات میں ہو تو وہ فلسفہ کیا ہے؟

(۵) کیا سوشلزم اور اسلام واقعی دو متضاد نظریے ہیں؟ کیا سوشلزم کے اقتصادی نظریے کو اسلام کے منافی قرار دیا جاسکتا ہے؟

(۶) اگر یہ متضاد نظریے ہیں تو آپ کے نزدیک سرمایہ داری کی ان مضرتوں کا کیا حل ہے جن سے پوری سوسائٹی ہراساں و نالاں ہونے کے علاوہ اس کے بندھنوں کو توڑنے کی کوشش میں عقیدوں سے بھی برگشتہ ہوتی جا رہی ہے؟

(۷) آپ تسلیم کرتے ہیں کہ ابتدائی اشتراکیت سے لے کر سرمایہ داری کے اس عروج تک معاشرہ انسانی

استحصال محنت کے علاوہ نظام زر کی بے کراں خرابیوں کا شکار چلا آرہا ہے اور اسی کا نتیجہ کہ نئی نسل کے ذہنوں کا استعمال ہے ؟

(۸) آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ سوشلزم کے ہمنوا سب کے سب مادہ پرست MATERIALIST) اور دہریے (ATHEIST) نہیں ہیں بلکہ نئی تعلیم نے اپنے سانچے میں ڈھال کر جس نسل کو اپنی خاص اصطلاحوں ترکیبوں اور نظریوں کے ساتھ جنم دیا ہے وہ نظام زر یعنی سرمایہ داری (CAPITALISM) کے خلاف اپنی برگشتگی اور جد و جہد کو مخصوص و معین کرنے کے لیے سوشلزم کی اصطلاح استعمال کرتی ہے ؟ گویا اس کے نزدیک سوشلزم کا تصور دہریت یا مادیت کا تصور نہیں بلکہ سرمایہ داری نظام کی مضرتوں اور خرابیوں کے محو کر دینے کا نام ہے۔ بالفاظ دیگر دولت کی منصفانہ تقسیم استحصال محنت کا خاتمہ اور امتیازات کی بیخ کنی۔

(۹) کیا اسلام دولت کی منصفانہ تقسیم استحصال محنت کے خاتمے اور نظام زر کے امتیازات کی تنسیخ کو تسلیم کرتا ہے ؟

(۹) اسلام میں سرمایہ داری اور جاگیرداری کا جواز ہے ؟ ہے تو کس حد تک ہے اور نہیں تو سوشلزم سے اس کا ٹکراؤ کہاں ہوتا ہے ؟

(۱۱) کیا یہ صحیح ہے کہ اسلامی حکومت ان احکام کو منسوخ کر سکتی ہے جو اعتقادات و عبادات کے درجے میں نہیں آتے لیکن ان سے کسی قوم ملک یا ریاست میں طبقاتی فساد یا اجتماعی خلل پیدا ہوتا ہو

(۱۲) اگر اسلام میں سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی جنگ نہیں تو سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیاز کہاں ہے اور اس کا جواز کیونکر پیدا کیا جاسکتا ہے۔

(۱۳) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ طبقاتی نظام نے کئی صدیوں کی تاریخ میں اسلام اور مسلمانوں کو سخت قسم کی مصیبتوں سے دوچار کیا ہے پھر اس طبقاتی نظام کو منسوخ، معطل اور برباد کر دینے میں عیب کیا ہے ؟

(۱۴) سوشلزم کا مقصد اگر یہ ہو کہ :-

- دولت کی تقسیم منصفانہ ہو،
- انسانوں کو زندگی بسر کرنے کی تمام ضرورتیں مہیا کی جائیں اور ریاست پر انہیں فراہم کرنے کی

ذمہ داری ہو،

• ذرائع پیداوار ریاست کی ملکیت میں ہوں ۔ تو یہ مقصد اسلام سے کہاں متصادم ہوتا ہے ؟
• ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا بجائے خود کس بنا پر قابل اعتراض ہے ؟

(۵) جس نظام سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کیا جا رہا ہے وہ تمام تر سرمایہ داری کی عصری شکلوں سے پیدا ہوتا ہے۔ فی الجملہ سرمایہ و محنت کے استحصال کا مسئلہ صنعتی انقلاب کی پیداوار ہے جاگیرداری کے زمانے میں یہ احساس عوامی نہیں بلکہ خاص ذہنوں میں ایک تاریخی احساس کے طور پر تھا جاگیرداری کے خلاف جو احساس ابھرا، اصلاً یورپ کی سرمایہ داری کے خلاف ایشیائی قوموں کی سیاسی بیداری سے ابھرا۔ نتیجۃً "زمینیں کاشتکاروں کی ملکیت ہیں" کا نعرہ بھی وضع ہو گیا ۔ اس نعرہ یا موقف سے اسلام کے کس حصے کی نفی ہوتی ہے ؟

جواب :۔ اس سوال کا جواب میں شق وار دوں گا۔ کیونکہ اس کو آپ نے شقوں میں بیان فرمایا ہے ۔

(۱) ان دونوں گروہوں میں سے ایک تو صاف صاف اشتراکی انقلاب کا خواہشمند ہے اور وہ بھی چینی برانڈ کا ۔ جہاں تک دوسرے گروہ کا تعلق ہے اس کے رجحانات میں فاشزم غالب ہے ۔ اگرچہ یہ لوگ سوشلزم کا نام لیتے ہیں لیکن ہٹلر بھی نیشنل سوشلزم کا نام لیکر ہی میدان میں آیا تھا ۔ اس لیے محض سوشلزم کی اصطلاح کے اشتراک سے ان دونوں گروہوں کو ہم آہنگ نہیں سمجھا جا سکتا ۔

(۲) جس گروہ کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اس کا کوئی ایک ہی نعرہ نہیں ہے بلکہ وقت اور موقع کو دیکھ کر وہ مختلف قسم کے نعرے لگاتا ہے ۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کے لیڈر صاحب کے جو اقوال اخبارات میں آئے ہیں ان کو اگر جمع کر کے دیکھا جائے تو اب تک تقریباً ایک درجن مختلف اقوال سامنے آچکے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ سوشلزم اور اسلام کے بارے میں ان کا اصلی اور آخری قول کیا ہے ۔ یہ کہنا کہ "اسلام ہمارا دین ہے، سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے"، اگر فریب نہیں تو جہالت ضرور ہے ۔ ایک ہی سانس میں یہ تین باتیں کہنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام نہ کوئی معاشی نظام دیتا ہے اور نہ سیاست میں ہماری کوئی رہنمائی کرتا ہے ۔ اس کے بعد اگر وہ ہمارا دین ہے تو صرف مسجد اور چند مذہبی رسوم کی حد تک ہے ۔ یہ بات کوئی ایسا شخص نہیں کہہ سکتا جس نے کبھی دین اسلام کا مطالعہ کیا ہو اور سوچ سمجھ کر اسلام کو اپنا دین قرار دیا ہو۔ علاوہ ازیں سوشلزم ایک باقاعدہ نظام فکر کا نام ہے جو عقیدے اور اخلاق سے لے کر اجتماعی زندگی کے تمام تفصیلی

پہلوؤں تک متصادم ہے۔ اسی طرح اگر جمہوریت اسلام کے بغیر ہو تو وہ بھی سراسر مغرب کی الحادی جمہوریت ہے جو اسلام کے نقطہ نظر سے کفر کی حد تک پہنچ جاتی ہے کیونکہ اسلام کی قید سے آزاد جمہوریت کے معنے یہ ہیں کہ جمہور جس حلال کو چاہیں حرام کرسکیں اور جس حرام کو چاہیں حلال کرسکیں اور کسی خدا اور رسولؐ کے احکام کے پابند نہ ہوں لہٰذا اسلام سے الگ کر کے سوشلزم کو اپنی معیشت اور جمہوریت کو اپنی سیاست قرار دینا بیک وقت تین بالکل متضاد اور باہم متصادم مسلکوں کو جمع کرنے کا ہم معنے ہے جس کا ارتکاب اگر کوئی شخص کرسکتا ہے تو یا فریب کی غرض سے کرسکتا ہے یا پھر جہالت کی بنا پر ——— !

(۳) اس کا جواب اوپر کی شق کے جواب میں آگیا ہے۔

(۴) میرا اندازہ ہے کہ اس پارٹی کا مسلک بہت سارے فلسفوں کا مجموعہ ہے جس میں کوئی ایک رنگ واضح طور پر نہیں پایا جاتا۔ اس کے طریق کار میں جو رجحانات مجھے نظر آتے ہیں وہ جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں فاشزم کے رجحانات ہیں جس طریقے سے اس پارٹی نے فدائیوں کی تنظیم شروع کی تھی اور اس میں شریک ہونے والوں سے جس طرح حلف لیا گیا تھا اس کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہٹلر کے طرز کے طوفانی دستے (STORM TROOPERS) تیار کیے جا رہے ہیں۔ اس طریقے سے صرف ایک شخص کی آمریت ہی قائم ہوسکتی ہے۔

(۵) اسلام اور سوشلزم جیسا کہ میں اوپر اشارہ کر چکا ہوں، دو قطعی متضاد نظریے ہیں۔ اسلام کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ ہم ایک خدا کے بندے ہیں۔ اس خدا نے اپنے رسولؐ اور اپنی کتاب کے ذریعے سے ہمیں زندگی کے ہر پہلو میں جو ہدایات دی ہیں ان کے برحق ہونے پر ہمارا ایمان ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا کام انہی ہدایات کی پیروی کرنا ہے۔ ہمارے لیے یہ دنیا کی زندگی اصل زندگی نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کا اصل مقصد آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اور یہ رضا ہمیں اسی صورت میں حاصل ہوسکتی ہے جب کہ ہم اس دنیا میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی ہدایات کی پیروی کریں۔ اس عقیدے پر اسلام ایک پورا نظام اخلاق ہمیں دیتا ہے اور ایک پورا نظام عبادات دیتا ہے تاکہ ہماری زندگی عملاً اس عقیدے کے ساتھ عمر بھر وابستہ رہے۔ اس کے ساتھ اسلام ہم کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک ہمہ گیر قانون اور ضابطہ دیتا ہے جس کا دائرہ گھر اور خاندان کی زندگی سے لے کر درس گاہ اور عدالت اور پارلیمنٹ اور کابینہ اور بین الاقوامی تعلقات تک ہر چیز پر وسیع

اس کے برعکس سوشلزم کا آغاز ہی اس تصور سے ہوتا ہے کہ ہمیں کسی خدا اور کسی رسول کی رہنمائی کی حاجت نہیں ہے۔ بلکہ ہم خود اپنی زندگی کے معاملات کو طے کرنے کے لیے اپنی صوابدید کے مطابق ایک فلسفۂ حیات تصنیف کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس بنیادی تصور کی بنا پر سوشلزم اپنا ایک فلسفۂ تاریخ تصنیف کرتا ہے، ایک فلسفۂ معیشت اختیار کرتا ہے اور اس فلسفۂ معیشت کو نافذ کرنے کے لیے جن تدبیروں سے بھی کام لیا جا سکے لینا جائز سمجھتا ہے، خواہ وہ جھوٹ ہو یا بدعہدی ہو یا قتل و غارت اور خون ریزی۔ پھر اسلام جو اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے۔ سوشلزم کا تجویز کردہ اجتماعی نظام اس کی بالکل ضد ہے۔ اسلام کا اجتماعی نظام ایک فرد کی آزادی کو بنیادی اہمیت دیتا ہے لیکن اسے ایسے حدود کا پابند بناتا ہے جن سے وہ جماعت کے لیے نقصان دہ ہونے کے بجائے مفید بن سکے۔ دوسری طرف وہ اتنی ہی بنیادی اہمیت ایک صالح معاشرہ کے وجود کو دیتا ہے، جس کے اندر انفرادی انسانی فضائل کے نشو و نما کا پورا موقع ہو، افراد اور طبقوں اور گروہوں کے درمیان کشمکش اور منافرت کے بجائے باہمی تعاون، ہمدردی اور احسان کی روح کارفرما ہو اور پورا معاشرتی نظام برائیوں کو دبانے اور نیکیوں کو فروغ دینے والا ہو۔ سوشلزم اس کے برعکس عیسائیت کے اس ابتدائی تصور انسان کو اختیار کرتا ہے کہ آدمی پیدائشی گنہگار ہے اور وہ سرے سے اتنا قابلِ اعتماد نہیں ہے کہ اس کو یہ آزادی دی جائے کہ یہ پیدائشی گنہگار اور ناقابلِ اعتماد انسان کچھ وسائلِ معیشت کا مالک ہو کر اپنی صوابدید کے مطابق کام کرے۔ سوشلزم کے نزدیک وسائلِ معیشت کے معاملے میں انسانی ملکیت اور انسان کے تصرف کی آزادی ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس لیے وہ ایک ایسا اجتماعی نظام تجویز کرتا ہے جس میں تمام وسائلِ معیشت اجتماعی ملکیت میں لے لیے جائیں اور افراد کو اجتماعی مشین میں کس کر رکھ دیا جائے لیکن یہ ایک عجیب تضاد خیالی ہے کہ جو نظریہ معاشرے کے افراد کو ناقابلِ اعتماد قرار دے کر تصنیف کیا گیا ہے، وہ یہ فرض کر لیتا ہے کہ جب اجتماعی مشین کو مرکز میں چند افراد چلائیں گے تو وہ تمام عیوب سے منزہ اور سبوح و قدوس انسان ہوں گے۔ ان کے انتظام اور قبضہ و تصرف میں پورے ملک کے وسائلِ معیشت صحیح طور پر استعمال ہوں گے اور دولت کی تقسیم بھی منصفانہ ہوگی۔ اس تضاد خیالی کے غلط ہونے کو ہر معقول آدمی بادی النظر میں ہی محسوس کر سکتا ہے لیکن پچھلے ۵۰ سال کے تجربے نے عملاً بھی اس کا غلط ہونا ثابت کر دیا ہے۔ سوشلسٹ معاشرہ قائم کرنے کے دو عظیم الشان تجربے روس اور چین میں ہوئے ہیں۔ دونوں جگہ فردِ واحد کی شخصیت کو قریب قریب خدا کے مقام تک پہنچا دیا گیا۔ ایک جگہ یہ مقام اسٹالن کو دیا گیا اور اب ساری دنیا اس کے بدترین نتائج سے واقف ہو چکی ہے۔ دوسری

جاکہ شخصیت پرستی (PERSONALITY CULT) ماؤ کے معاملے میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اس کا یہ نتیجہ ساری دنیا کے سامنے آچکا ہے کہ لیوشاؤچی جیسا شخص بھی دو سال سے لعنت ملامت اور پھٹکار کا ہدف بنا ہوا ہے لیکن اسے اپنی پوزیشن صاف کرنے کا آج تک کوئی موقع نصیب نہ ہو سکا۔ اب یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اسلام عقیدے سے لے کر عمل کی تفصیلات تک ہر پہلو میں سوشلزم سے مختلف ہے۔

(۶) سرمایہ داری کا اصلی مخالف سوشلزم نہیں بلکہ اسلام ہے سوشلزم کو سرمایہ داری سے جو عداوت ہے وہ دراصل اس معنے میں ہے کہ وہ بہت سے افراد اور اداروں کے ہاتھ میں زمین اور صنعت اور تجارت کی ملکیت اور انتظام کو درست نہیں سمجھتا اور تمام سرمایہ داری اور زمینداری کو مجتمع کر کے ایک سوشلسٹ اسٹیٹ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے گویا وہ سرمائے کو اور زیادہ مرکوز کرتا ہے اور منتشر طور پر سرمایہ داروں اور زمینداروں کی جو طاقت معاشرے کے افراد کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا ازالہ وہ اس طرح کرتا ہے کہ ایک بڑا سرمایہ دار اور زمیندار اسٹیٹ وجود میں لا کر افراد کو پوری طرح اس کے ہاتھ میں بے بس کر دیتا ہے۔ اس نظام میں ایک ہی ادارہ قانونی اور سیاسی اور فوجی طاقت کا مالک بھی ہوتا ہے اور تمام معاشی ذرائع کا مالک بھی! اس سے وہ آمریت وجود میں آتی ہے جس کے مقابلے میں آج تک کی وہ تمام آمرتیں ہیچ ہیں جو کسی دوسرے نظام نے پیدا کی ہیں ـــ اسلام اس کے برعکس اس سرمایہ داری نظام کا بھی دشمن ہے جو اس وقت مغربی سرمایہ داری (WESTERN CAPITALISM) کے نام سے معروف ہے اور اس انتہائی مرتکز سرمایہ داری کا بھی دشمن ہے جسے سوشلزم وجود میں لاتا ہے۔ اس کے پیش نظر ایک ایسی آزاد معیشت کا قیام ہے جس میں افراد کو شخصی ملکیت کے حقوق دے کر ایک طرف ان کی آزادی محفوظ کی گئی ہے اور دوسری طرف دولت کمانے اور خرچ کرنے کے طریقوں میں حلال و حرام کی تمیز قائم کر کے افراد کو اس کا پابند کر دیا گیا ہے کہ وہ صرف حلال طریقے سے کمائیں اور حلال ہی طریقے سے خرچ کریں پھر وہ اپنی اخلاقی تعلیم و تربیت کے ذریعے سے افراد کو اس کے لیے تیار کرتا ہے کہ وہ رضا کارانہ طریقے سے ایک دوسرے کی ہمدردی اور دستگیری کریں اور قانونی طریقے سے بھی اس نے اس کا انتظام کیا ہے کہ دولت کو مخصوص طبقے میں مرتکز نہ ہونے دیا جائے بلکہ وہ پھیل کر معاشرے کے کمزور سے کمزور افراد تک پہنچے۔ اس نے معاشی وسائل پر ہر قسم کی اجارہ داریوں کو ممنوع قرار دیا ہے تاکہ مستقل مفاد یافتہ طبقات وجود میں نہ آسکیں۔ وہ اجتماعی زندگی میں تمام لوگوں کو ترقی کے مساوی مواقع دیتا ہے تاکہ ہر شخص اپنی قابلیت سے جتنی بھی ترقی کر سکتا ہو کرے اگر جائز

ذرائع سے کیے۔ وہ مصنوعی ذرائع سے کسی قسم کے طبقات پیدا نہیں ہونے دیتا۔ اور فطری اسباب سے جو طبقات پیدا ہوتے ہیں ان کے درمیان منافرت اور کش مکش کے بجائے تعاون اور ہمدردی کا تعلق پیدا کرتا ہے اگر اس کے اس نظام پر ہمارے ہاں ایمان داری سے عمل کیا جاتا اور یہ منافقت نہ برتی جاتی کہ نام تو اسلام کا لیا جا رہا ہے اور کام سراسر اس کے خلاف کیے جا رہے ہیں، تو آج یہ حالت نہ ہوتی کہ لوگ سرمایہ داری کے بندھنوں کو توڑنے کے لیے کسی غیر اسلامی نظام کی طرف لپکنے لگتے۔

(۷) آپ کا یہ خیال صحیح ہے۔

(۸) یہ صورت حال جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں، دراصل اس نظام تعلیم کا نتیجہ ہے جس نے ہماری نسلوں کو اسلام سے قریب قریب بالکل ناواقف رکھا اور صرف مغربی فلسفوں اور نظریات کا دودھ پلا پلا کر ان کو پرورش کیا۔ اس لیے جب قدیم نظام جاگیرداری اور جدید نظام سرمایہ داری اور ایک بددیانت بیوروکریسی کی پیدا کردہ خرابیوں کے بدترین مجموعے سے تنگ آ کر ان کو عدل اجتماعی (SOCIAL JUSTICE) قائم کرنے والے کسی نظام کی جستجو ہوئی تو ان کے ذہن اسلام کی طرف رجوع کرنے کے بجائے بیرونی نظریات کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان بیرونی نظریات میں ان کو صرف سوشلزم ہی ایک ایسا نظام نظر آیا جو سرمایہ داری کی بیماری کے علاج کا مدعی تھا۔ اس لیے انھوں نے بے اختیار اس کی طرف لپکنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک بہت ہی قلیل تعداد ایسی ہے جو حقیقت میں سوشلزم کی مادہ پرستی اور دہریت کو قبول کرتی ہے۔ وہ دراصل سوشلزم کے اس دعوے سے دھوکا کھا رہے ہیں کہ وہی دراصل سرمایہ داری کا علاج ہے۔ اس کی کثیر تعداد کو یہ احساس نہیں ہے کہ جب وہ دولت کی منصفانہ تقسیم اور محنت کے استحصال کی بیخ کنی کی خاطر ایک ایسے نظام کی طرف رجوع کریں گے۔ جو نہ صرف اپنا ایک مفصل فلسفہ اور ہمہ گیر نظام زندگی رکھتا ہے بلکہ دنیا کے بہت سے ملکوں میں عملاً رائج بھی ہے تو بالآخر وہ سوشلزم کے معاشی نظام کے ساتھ ساتھ اس کی مادہ پرستی اور دہریت کو بھی ہضم کرتے چلے جائیں گے، خواہ ان کے اندر ایسا کرنے کی خواہش ہو یا نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ جب (خدانخواستہ) ہم ایک مرتبہ سوشلسٹ نظام اپنے ملک میں قائم کر لیں گے تو لامحالہ ہم خود اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے سوشلسٹ بلاک کے ساتھ وابستہ ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔ اور اس کے دو بڑے ملکوں میں سے کسی ایک کے دائرۂ نفوذ و اثر (ORBIT) میں ہم کو جانا پڑے گا۔ اس کے بعد ہمیں نہ صرف وہ سب کچھ خواستہ یا ناخواستہ قبول کرنا پڑے گا جس پر ان ملکوں کے عقائد، اخلاق، معاملات اور طرز زندگی کی بنیاد قائم

ہے۔ بلکہ اس سے آگے بڑھ کر میں کہوں گا کہ ایک مرتبہ اس پھندے میں پھنس کر ہم اس سے نکلنا چاہیں گے بھی تو نہ نکل سکیں گے۔ ہنگری، پولینڈ، مشرقی جرمنی وغیرہ کی مثالیں اگر پرانی ہو چکی ہیں تو چیکوسلواکیہ کی مثال تو ہمارے سامنے موجود ہے۔ کیا یہ ہمیں سبق دینے کے لیے کافی نہیں ہے۔

(۹) اس سوال کا جواب یہ ہے کہ صرف اسلام ہی دولت کی منصفانہ تقسیم کرتا ہے اور اسی کے ذریعہ استحصال محنت کا خاتمہ ہو سکتا ہے اور وہی ان امتیازات کی تنسیخ کرتا ہے جن کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔

(۱۰) آپ کے اس سوال کا جواب یہ ہے کہ سرمایہ داری لغوی حیثیت سے تو صرف یہ معنے رکھتی ہے کہ آدمی کسی سرمایے کا مالک ہو، مگر اصطلاحاً اس سے مراد وہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو اس وقت مغربی دنیا میں پایا جاتا ہے۔ اسلام میں پہلی چیز کا جواز ہے اور دوسری چیز کا جواز نہیں ہے۔ مزید برآں اسلام سرمایے کی صرف اس ملکیت کو جائز رکھتا ہے جو حلال طریقوں سے حاصل ہوئی ہو، جس کے مالک نے اگر وہ بقدر نصاب سرمائے کا مالک ہے زکوٰۃ ادا کی ہو، اور جس کا مالک سرمایے کو خرچ کرنے اور اسے کسی کام پر لگانے کے معاملے میں ان حدود کا پابند ہو جو اسلام نے عائد کر دیے ہیں۔

رہی جاگیرداری تو اس سے مراد زمین کا وہ عطیہ ہے جو کسی حکومت کی طرف سے دیا گیا ہو۔ اسلام اس طرح کے صرف ان عطیوں کو جائز قرار دیتا ہے جو کسی عادل حکومت نے کسی شخص کو معاشرے کی جائز خدمات کے صلے میں، یا جائز خدمات کی خاطر ایک حدِ اعتدال کے اندر رہتے ہوئے دیئے ہوں اور یا تو افتادہ زمینوں میں سے دیے ہوں یا سرکاری املاک میں سے۔ ایک شخص کی ملکیت چھین کر دوسرے کو دے دینے کا اسلام میں کوئی جواز نہیں ہے اور نہ اس بات کا کوئی جواز ہے کہ زمین کے جائز مالکوں کے اوپر کسی شخص کو جاگیردار بنا کر اس طرح مسلط کر دیا جائے کہ وہ اس کے کاشتکار بن کر رہ جائیں۔ پھر اسلام اس طرح کے عطیوں کے بارے میں بھی یہ شرط عائد کرتا ہے کہ جسے کوئی زمین عطا کی جائے وہ تین سال کے اندر اندر اس کو استعمال کرے ورنہ عطیہ اس سے سلب کر لیا جائے گا۔

ان شرائط کو اگر آدمی غور سے دیکھے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ جو جاگیرداریاں ظالمانہ حکومتوں کے دور میں پیدا ہوئی ہیں وہ سب کی سب اسلامی نقطہ نظر سے ناجائز نوعیت کی ہیں۔

آپ کے سوال کا یہ حصہ کہ سوشلزم سے اس کا ٹکراؤ کہاں ہوتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سوشلزم سرے سے سرمائے اور زمین کی شخصی ملکیت ہی کا مخالف ہے۔ درآں حالیکہ اسلام جائز حدود کے اندر ان دونوں چیزوں

پر شخصی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے جیسا کہ میں اوپر بتا چکا ہوں۔ سوشلزم تو تمام سرمایہ داروں کو ختم کر کے ایک بڑا سرمایہ دار وجود میں لاتا ہے اور تمام جاگیرداروں اور زمینداروں کو ختم کر کے ایک بڑا جاگیردار اور زمیندار پیدا کر دیتا ہے جس کا نام اشتراکی ریاست ہے جن لوگوں کو روس میں سوشلزم کی تاریخ کا کچھ علم ہے وہ جانتے ہیں کہ وہاں بڑے زمینداروں ہی کو نہیں بلکہ چھوٹے چھوٹے مالکوں کو بھی ان کی زمین کی ملکیت سے محروم کر دیا گیا اور اجتماعی ملکیت (COLLECTIVISATION) کا نظام قائم کرنے کے لیے لاکھوں کسانوں اور کاشتکاروں کو تباہ کر کے رکھ دیا گیا۔

(۱۱) اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی قوم، ملک یا ریاست میں طبقاتی یا اجتماعی خلل جن اسباب سے پیدا ہوتا ہے ان کو رفع کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ملک میں اسلام کا پورا قانون نافذ کیا جائے اور ہر پہلو میں اصلاحات کر کے نظام معاشرہ کو ایک صالح معاشرے میں تبدیل کیا جائے۔ اس غرض کے لیے اگر سابق نظام فاسد کی پیدا کردہ خرابیوں کو دور کرنے کے لیے بعض خاص تدابیر استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئے تو وہ اس وقت تک کے لیے استعمال کی جا سکتی ہیں جب تک ان کی ضرورت رہے، بشرطیکہ وہ اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہوتی ہوں۔ اسلامی حکومت شریعت کے صرف ان ہی احکام کو منسوخ کرنے کی مجاز نہیں ہے جو عبادات سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ وہ ان احکام کو بھی منسوخ نہیں کر سکتی جو معاملات سے تعلق رکھتے ہیں۔ البتہ بعض خاص حالات میں بعض خاص خرابیوں کو رفع کرنے کے لیے وہ عارضی طور پر کچھ مباح چیزوں کو ممنوع کر سکتی ہے۔ مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً زیارتِ قبور کو منع کر دیا اور بعد میں اس کی اجازت دے دی۔ بعد کی اجازت اس بات کی دلیل ہے کہ زیارت قبور فی الاصل مباح تھی لیکن عارضی طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس لیے منع کیا کہ سابق شرک کے جو اثرات معاشرے میں ابھی باقی تھے ان کو دور کرنے کے لیے یہ عارضی ممانعت ضروری تھی۔ اسی طرح آپ نے شراب کی حرمت کے بعد ان خاص قسم کے برتنوں کے استعمال کو بھی کچھ مدت کے لیے منع کر دیا جن میں پہلے شراب بنائی اور استعمال کی جاتی تھی اور بعد میں ان کے استعمال کی اجازت دے دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت عارضی طور پر ایسی پابندیاں عائد کر سکتی ہے جو کسی اہم تر شرعی مصلحت کے لیے ضروری ہیں لیکن اول تو اس طرح کی پابندیاں عائد کرنے والی حکومت وہ ہونی چاہیے جو کسی بیرونی فلسفے سے متاثر اور مرعوب نہ ہو بلکہ اسلامی اصولوں پر کام کرتی ہو۔ دوسرے اس طرح کی پابندیوں کو مستقل قانون بنانا درست نہیں ہے انہیں صرف اس وقت تک استعمال کرنا چاہیے جب تک اسلامی قوانین کے اجراء و نفاذ سے حالات معمول پر

نہ آجائیں۔

(۱۲) سرمایہ و محنت کی بنیاد پر طبقاتی امتیاز سے مراد اگر مستقل طبقاتی امتیاز ہے جسے قانون اور انتظامی پالیسیوں کے ذریعے سے دوامی تحفظ دیا گیا ہو تو اسلام میں اس کا کوئی جواز نہیں ہے۔ البتہ وہ طبقاتی فرق جو فطری اسباب سے پیدا ہوتا ہے، اسلام اس کو ختم نہیں کرنا چاہتا۔ کیونکہ یہ فطرت سے جنگ ہے۔ مثلاً ایک آدمی اگر کسی خوش حال گھر میں یا کسی ترقی یافتہ علاقے میں پیدا ہوا ہے تو لامحالہ وہ خوش حالی یا ترقی سے بہرہ مند حالت کے مقام ہی سے اپنی زندگی کا آغاز کرے گا لیکن اگر وہ اتنی قابلیت نہ رکھتا ہو کہ آگے اپنی خوش حالی کو باقی رکھ سکے یا مزید خوش حالی حاصل کر سکے تو وہ فطری طور پر اپنے اس مقام سے نیچے چلا جائے گا جہاں وہ پیدا ہوا ہے اس کے برعکس اگر کوئی شخص کسی غریب گھر میں یا پس ماندہ علاقے میں پیدا ہوا ہو تو وہ اسی حالت سے اپنی زندگی کا آغاز کرے گا جس میں اس کی پیدائش ہوئی ہے لیکن اگر وہ اپنی قابلیت سے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے خوش حالی کے مقام پر پہنچ سکتا ہو تو اسلامی نظام معاشرہ میں اس کے لیے کوئی ایسی رکاوٹ نہیں ہے جو اسے بڑے سے بڑے بلند مقام تک پہنچنے سے روکتی ہو۔ یہ وہ فطری طبقات ہیں جو اللہ کی پیدا کی ہوئی خلقت کے لحاظ سے انسانی معاشرے میں موجود ہوتے ہیں اور فطری طریقے سے بدلتے رہتے ہیں۔ اسلام کا کوئی قانون اور ضابطہ ان کو مستقل طبقات میں تبدیل نہیں کرتا۔ مزید برآں وہ اپنے مختلف احکام و قوانین کے ذریعے سے اس امر کا پورا انتظام کرتا ہے کہ ان فطری خوشحال اور کمزور طبقوں کے درمیان طبقاتی جنگ اور منافرت نہ ہو بلکہ جو طبقے خوش حال ہیں وہ کمزور طبقوں کو اٹھانے اور سہارا دینے میں مددگار بن جائیں اور معاشرے میں کوئی طبقہ بھی ایسا موجود نہ رہے جسے زندگی کی بنیادی ضروریات مثلاً غذا، لباس، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ میسر نہ آسکیں ——

(۱۳) اوپر شق ۱۲ میں جو کچھ میں کہہ چکا ہوں اس پر غور کرنے سے اس شق کے سوال کا جواب خود مل جاتا ہے۔ مسلمانوں میں جب کبھی اسلام کے اصولوں سے ہٹ کر کوئی طبقاتی نظام پیدا ہوا تو ضرور اس نے برے نتائج دکھلائے۔ لیکن اگر ان برے نتائج سے ہم یہ نتیجہ اخذ کریں کہ زبردستی ایک بے طبقہ سوسائٹی اس نمونے پر پیدا کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے جسے سوشلزم نے اپنا آئیڈیل قرار دیا ہے اور جسے وہ فی الواقع پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا ہے تو یہ ہماری دوسری غلطی اور پہلی غلطی سے بھی بدتر غلطی ہوگی۔ فطرت سے جنگ خواہ اس شکل میں ہو جس کے برے نتائج ہم پہلے دیکھ چکے ہیں اور خواہ اس شکل میں ہو جو اب تجویز کی جا رہی ہے

بہرحال غلط ہے۔ انسان اس کا برا خمیازہ بھگت کر رہتا ہے اور آخرکار فطرت سے شکست کھا کر رہتا ہے۔ سوشلزم نے بے طبقہ سوسائٹی پیدا کرنے کو اپنا آئیڈیل قرار دیا۔ لیکن وہ اس میں کیوں کامیاب نہیں ہوا کیوں وہ پرانے طبقات کی جگہ نئے طبقات پیدا کرنے کا موجب بنا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ فطری طبقات کو کسی طرح مٹایا نہیں جا سکتا۔ فطرت سے جنگ کی خاطر سوشلزم نے یہ تو کیا کہ ایک طبقے یعنی پرولتاریہ کے نام پر اس نے قتل، جبر، ظلم، قتل و غارت اور باضابطہ ڈاکہ زنی کے ذریعے سے پرانے مفاد یافتہ طبقوں کو ہلاک و برباد کر دیا لیکن دوسرے طبقات اس کو خود پیدا کرنے پڑے اور ان نئے طبقات کی گرفت میں وہی طبقہ یعنی پرولتاریہ سب سے زیادہ مظلوم بنا جس کی حمایت کا دعوے کر کے بے طبقہ سوسائٹی بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہمارا پچھلا تجربہ اور سوشلزم کا یہ نیا تجربہ دونوں ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ہمیں ٹھیک اس فطری نظام کی طرف پلٹنا چاہیے جس کی طرف اسلام ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

(۱۴) آپ نے سوشلزم کا مقصد "اگر یہ ہو" کہنے کے بعد جو سوال کیا ہے اور پھر یہ پوچھا ہے کہ "یہ مقصد اسلام سے کہاں تک متصادم ہوتا ہے"؟ میرے نزدیک سوال کی یہ شکل بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ سوشلزم کا مقصد وہ ہے ہی نہیں جسے آپ نے لفظ "اگر" کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سوشلزم کا دعوے پہلے یہ نہیں تھا کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو بلکہ وہ یہ دعوے لے کر اٹھا تھا کہ دولت کی مساویانہ تقسیم ہو۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کو اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑا۔ اس کے بعد اس نے دولت کی تقسیم کی جو نئی صورت اختیار کی وہ منصفانہ تقسیم کی تعریف میں سرے سے آتی ہی نہیں بلکہ اس کے اوپر اگر کوئی صحیح لفظ منطبق ہوتا ہے تو وہ جابرانہ تقسیم کا لفظ ہے۔ کیونکہ منصفانہ تقسیم کے مفہوم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ انصاف کرنے والا غیر جانبدار ہو اور جن کے درمیان وہ انصاف کرنے بیٹھے، اس کی نگاہ میں وہ سب یکساں ہوں یعنی ان میں سے کسی کا وہ حامی اور کسی کا مخالف نہ ہو۔ سوشلزم میں تقسیم کا نظام ایک پارٹی کے ہاتھ میں آتا ہے اور وہ پارٹی درجہ بدرجہ محدود سے محدود تر افراد کے ہاتھ میں نظام تقسیم کے اختیارات مرکوز کرتی چلی جاتی ہے۔ اس پارٹی کے فلسفے کا آغاز ہی جانبداری کے تصور سے ہوتا ہے۔ یعنی پرولتاریہ کی حمایت اور اس کے ماسوا تمام دوسرے افراد اور گروہوں سے شدید نفرت اور ان کے خلاف جنگ کا جذبہ! اس صورت میں آپ خود سوچ سکتے ہیں کہ ایک پورے معاشرے کے درمیان منصفانہ تقسیم کا تصور کیسے کیا جا سکتا ہے؟

اس کے بعد آپ نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ محدود سے محدود تر انسانی گروہ جس کے ہاتھ میں آخرکار

نظام تقسیم پر عمل درآمد کرنے کے اختیارات مرکوز ہوتے ہیں، وہ عملاً اس مقام پر آجاتا ہے جو بادشاہی نظام میں کسی بادشاہ اور سرمایہ دارانہ نظام میں کسی سرمایہ دار اور جاگیردارانہ نظام میں کسی جاگیردار کی جباریت سے بدرجہا زیادہ سخت جبار کا مقام ہے۔ کیونکہ یہاں پوری مملکت کے تمام ذرائع پیداوار ان کے قبضے میں ہوتے ہیں اور انہی کے ہاتھ میں پوری سیاسی طاقت بھی ہوتی ہے۔ یہ صورت حال پوری دنیا میں نہ کبھی کسی سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہوئی ہے نہ کسی بادشاہی نظام میں اور نہ کسی جاگیردارانہ نظام میں۔ اس کے بعد اگر وہ لوگوں کے لیے زندگی بسر کرنے کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری لیتے ہیں تو اس میں اور اس جیلر کی حیثیت میں کوئی خاص فرق نہیں رہتا جو قیدیوں کو روٹی، کپڑا، مکان اور علاج فراہم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اسلام کا تجویز کردہ نظام اس نظام سے ہر پہلو میں متصادم ہے۔

رہا آپ کا یہ اصول کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لینا بجائے خود کس بنا پر قابل اعتراض ہے تو اس کے جواب میں میں یہ عرض کروں گا کہ اشتراکی پروپیگنڈے کے طلسم نے آج کل لوگوں کو اس غلط فہمی میں ڈال دیا ہے کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت میں لے لینا کوئی بے خطا اور تیر بہدف نسخہ ہے جس سے تمام معاشی خرابیاں دور ہو جاتی ہیں حالانکہ قومی ملکیت کا نظام لازماً بیوروکریسی کے ہمہ گیر اقتدار کا مسئلہ پیدا کر دیتا ہے جو موجودہ معاشی خرابیوں کے پیدا کردہ مسائل سے ہزار درجہ زیادہ قباحتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ یہ مسئلہ تمام اشتراکی ممالک میں پیدا ہوا ہے اور جہاں بھی قومی ملکیت کا نظام قائم ہوگا وہاں لازماً یہ پیدا ہوگا۔ کیونکہ ذرائع پیداوار کو جب بھی آپ قومی ملکیت میں لیں گے اس کا انتظام کرنے کے لیے ایک بیوروکریسی ناگزیر ہوگی۔ ہم انگریز کے دور میں اور اس کے بعد پچھلے بیس بائیس سال کی قومی حکومت کے دور میں بیوروکریسی کے جو رنگ ڈھنگ دیکھ چکے ہیں اس پر ساری قوم چیخ اٹھی ہے حالانکہ ہمارے ہاں کی یہ بیوروکریسی بہت محدود اقتدار رکھتی ہے۔ اب آپ خود اندازہ کر لیں کہ جب اس بیوروکریسی کے ہاتھ میں ملک کی تمام صنعت، تجارت، زراعت اور دوسری ساری پیداواری طاقتیں، سیاسی طاقت کے ساتھ جمع ہو جائیں گی تو اس کے ظلم اور ہماری بے بسی کا کیا عالم ہوگا۔

(۱۵) شق نمبر ۵ میں جو سوال آپ نے کیا ہے اس پر میں نے اپنی کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" میں پوری تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ اس میں میں نے یہ بتایا ہے کہ معاشی پیچیدگیوں کے سارے مسائل جاگیرداری نظام سے لے کر سوشلزم اور فاشزم تک اور پھر ان مصلحتوں COMPROMISES تک جو سوشلزم

اور کیپٹلزم کے درمیان امریکہ، انگلستان اور سکنڈے نیوین ممالک میں کی گئی ہیں۔ دراصل مغرب کی اس سوسائٹی میں پیدا ہوئے ہیں جو تمدن و اجتماع کے معاملات میں خدا کی کسی کتاب اور کسی رسولؐ کی رہنمائی سے بالکل محروم تھی اور جس نے اپنے تعصب کی بنا پر خدا اور رسولؐ کی اس رہنمائی کی طرف رجوع کرنے سے انکار کیا جو اخلاق و روحانیت کے ساتھ ساتھ انسان کی مادی زندگی میں بھی اس کو راہ راست بتلاتے آئی تھی اس راہ راست کو پانے سے محروم رہ کر مغرب کی سوسائٹی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف لڑھکتی رہی ہے اور کبھی اس نے اعتدال کا راستہ نہیں پایا ہے۔ جاگیرداری نظام جب ظلم کی انتہا پر پہنچا تو اس کے خلاف احتجاج نے سرمایہ داری نظام کی شکل اختیار کی۔ پھر سرمایہ داری نظام خصوصیت کے ساتھ صنعتی انقلاب کے بعد ظلم کی ایک دوسری انتہا پر پہنچ گیا اور اس نے اس نظام کی پیدا کردہ بیماریوں کے علاج کے لیے سوشلزم اور فاشزم کی شکل اختیار کی۔ پھر ان کی برائیوں نے جرمنی اور روس میں جب اپنے آپ کو پوری طرح عیاں کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ ان دونوں نظاموں نے ظلم کا علاج بدتر ظلم سے کیا ہے تو اہل مغرب نے مصالحتوں کی مختلف شکلیں اختیار کرنی شروع کیں لیکن کوئی مصالحت بھی اس وقت تک کامیاب ثابت نہیں ہو رہی ہے اور مختلف ممالک میں مصالحت کی جو شکل بھی اختیار کی گئی ہے وہ معاشرے کی مجموعی خرابیوں میں کمی کرنے کے بجائے اضافہ کرتی چلی جا رہی ہے۔ میرے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں اس کی ساری تفصیل آپ کے اس سوال کے جواب میں بیان کر سکوں۔ آپ کے ناظرین کو میں مشورہ دوں گا کہ وہ میری اس کتاب کو غور سے پڑھیں۔ جو بات میں مختصراً یہاں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ آخر ہم مسلمانوں نے کیوں یہ فرض کر لیا ہے کہ ہماری حالت بھی ان قوموں کی طرح ہے جو خدا اور رسول کی ہدایت سے محروم ہو کر کئی صدیوں سے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف بھٹکتی پھر رہی ہیں؟ ہمارے پاس خدا کے فضل و کرم سے صراط مستقیم موجود ہے۔ ہم کیوں وہ ساری تاریخ اپنے ہاں دہرانے کے لیے تیار ہوں۔ جس سے یہ گمراہ قومیں گزری ہیں اور گزر رہی ہیں؟ اپنی صراط مستقیم سے بھٹک کر جن گمراہ کن نعروں کی طرف ہم متوجہ ہو رہے ہیں، انہی میں سے ایک نعرہ یہ ہے کہ "زمینیں کاشتکاروں کی ملکیت ہیں" یہ ایسا ہی عجیب نعرہ ہے جیسے کوئی کہے کہ "مکان معماروں کی ملکیت ہے اور کھانا باورچیوں کی ملکیت ہے اور کپڑے درزیوں کی ملکیت ہیں۔ آخر کوئی حد تو ہونی چاہیے جہاں ٹھیر کر ہم کچھ سوچیں کہ ہم کیا الٹی سیدھی باتیں کرنے پر اتر آئے ہیں۔ کاشتکار اگر واقعی اپنی زمین کا مالک ہو اور وہ کاشت کر رہا ہو تو زمین یقیناً اس کی ملکیت ہے لیکن اگر وہ کسی دوسرے شخص کی زمین لے کر بٹائی یا اجرت

کے معاہدے پر کاشت کر رہا ہو تو محض کام کرنے کی بنا پر وہ اس کا مالک کیسے ہو جائے گا؟ اور اگر صرف اس بنیاد پر اس کو زمین کا مالک قرار دے دیا جائے تو کیا معقول وجہ ہے کہ معماروں کو اس مکان کا مالک نہ قرار دیا جائے جو وہ کسی دوسرے شخص کی خریدی ہوئی زمین پر اس کے فراہم کردہ روپے اور سامان سے تعمیر کرتے ہیں؟ بظاہر کاشتکار کو یہ نعرہ سُنکر بڑی خوشی ہوگی کہ زمین اس کی جو اس پر کاشت کرے، لیکن اگر اس میں ذرا سی بھی عقل ہوا ور وہ اس نعرے کے معنے پر غور کرے تو اس کی سمجھ میں یہ بات آجائے گی کہ کل اگر وہ مرجائے اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم ہو کر رہ جائیں، یا وہ خود بوڑھا، بیمار یا معذور ہو جائے اور اپنی زمین پر خود کاشت کرنے کے قابل نہ رہے تو اس کا اور اس کی اولاد کا حق ملکیت آپ سے آپ ساقط ہو جائے گا اور آگے جو شخص بھی اس زمین پر کاشت کرے گا وہی اس کا مالک ہو جائے گا۔ یہ پوزیشن جس وقت کاشتکار کی سمجھ میں آجائے گی وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر اس سے توبہ کرے گا۔ (باقی)

یومِ مئی کیا ہے؟

یکم مئی کو روس، چین اور دوسرے سوشلسٹ ممالک میں مئی ڈے، سرکاری طور پر منایا جاتا ہے اور غیر سوشلسٹ ملکوں میں بھی مزدوروں کی ہمدردی کے پردے میں اس دن کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ اس دن کی حقیقت یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں سرمایہ داروں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تھے، امریکہ میں بھی جاگیرداری نظام ختم ہونے کے بعد سرمایہ داری پورے معاشرے کو اپنے شکنجے میں کس رہی تھی۔ مزدوروں کی بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ منظم جدوجہد کے ذریعے اپنے حقوق منوائیں۔ اگرچہ انیسویں صدی کے نصف سے بعض جگہوں پر باقاعدہ قانونی تنظیمیں وجود میں آگئی تھیں لیکن مزدوروں کی اصل کارکردگی زیرِ زمین تھی۔ آخر اندر ہی اندر سرمایہ داروں کے خلاف نفرت کے لاوے نے اتنا زور پکڑا کہ وہ پھوٹ بہنے کو تیار ہو گیا۔ یکم مئی ۱۸۸۶ء کو مزدور رہنماؤں نے امریکہ کے شہر شکاگو میں اپنی قوت کے مظاہرے کا فیصلہ کیا۔ وہ سڑکوں پر نکل آئے اور زبردست مظاہرہ کیا۔ حکومت نے بہت سے مزدور کارکنوں اور لیڈروں کو گرفتار کیا اور ان میں سے متعدد کو پھانسی کی سزا سنادی۔ اس مظاہرے کو منظم کرنے والے بیشتر رہنما یہودی تھے۔ یومِ مئی اسی سانحے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر احسان اللہ خان صاحب

مسلمان یہ مانتے ہیں کہ اسلام ایک طریقہ زندگی ہے اور تمام ہدایات قرآن کریم سے اخذ کرتے ہیں۔ قرآن کی تشریح کے مطابق آیات کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) محکمات (۲) متشابہات
زمانہ قدیم سے محکمات کو غیر مبدل مانتے آئے ہیں مگر موجودہ دور میں مسلم ممالک نے اس میں بھی دخل اندازی کرکے نئے قوانین مرتب کیے ہیں۔ مگر متشابہات کے مفہوم کو اکثر لوگ قابل تبدیلی مانتے رہے ہیں اور اس کی مختلف زمانے میں مختلف تشریحات کی ہیں لیکن ہمیشہ سے کچھ لوگ ایسے رہے ہیں جو محکمات کو ابدی حقیقت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ متشابہات کو بھی حقیقت ہی سے موسوم کرتے رہے ہیں۔ یونانی فلسفے کے اثر سے مسلم محققین نے متشابہات کو فلسفے کا رنگ دیا اور موجودہ سائنسی دور میں بہت سے لوگوں نے جہاں بھی قرآن میں فطری قوانین کی طرف اشارات آئے ہیں ان کو سائنسی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ متشابہات میں مسلّم حقائق عرب قوم کو بتلائے گئے ہیں۔ چنانچہ سرسید کا خیال ہے کہ انسانی علم تجربات کی بنا پر دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور علم کے اضافے کے ساتھ متشابہات کی تشریح بھی بدلتی رہنی چاہیے۔

اسلامی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تنزل کے دور میں مسلمانوں نے متشابہات کی کسی خاص تشریح کو حقیقت کا درجہ دے کر فکر پر قفل لگا دیا۔ مگر اس کے برخلاف جب بھی مسلمانوں میں ترقی کی رفتار تیز ہوئی ہے۔ انہوں نے متشابہات کی اپنے زمانے کے مطابق تشریح کرنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح فکر کو قید سے آزاد رکھا گیا ہے

موجودہ مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اس زمانے میں ارتقا ایک سائنسی مسلمہ حقیقت ہے اور تخلیق مخصوص کا مفروضہ جس کو اکثر مسلم مفکرین برابر مانتے آئے ہیں غیر سائنسی ہے لہذا اس سائنسی دور میں

غیر سائنسی طرز فکر سے کسی اچھی سے اچھی بات کی بھی اشاعت مقبول نہیں ہو سکتی ہے۔

ارتقاء ایک مسلمہ حقیقت ہے نظریہ نہیں

انسان کے جسم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) دماغ (۲) اعضاء۔ دماغ سے دو قسم کی نسیں نکلتی ہیں۔ (۱) خبر رساں (SENSORY NERVE) یہ دماغ تک وہ تمام خبریں پہنچاتی ہیں جو حواس خمسہ خارجی ماحول سے حاصل کرتے ہیں۔ (۲) حکم رساں (MOTOR NERVE) یہ دماغ سے جیسا حکم ملتا ہے تمام اعضاء تک پہنچاتی ہیں اور اعضاء اسی حکم کے مطابق کام کرتے ہیں۔ اسی لیے کہا گیا ہے کہ دماغ حاکم ہے اور دوسرے اعضاء محکوم۔ مگر موجودہ دور میں یہ کہا جاتا ہے کہ دماغ کی حیثیت ایک کمپیوٹر (Computer) کی ہے جو حواس خمسہ سے فراہم کردہ معلومات کا نتیجہ نکال کر دیتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ انسان جس ماحول میں رہتا ہے اور جیسی معلومات ہوتی ہیں اس کا ذہن (ضمیر) ویسا ہی بنتا ہے۔ یہی اصول ایک سائنسداں پر بھی منطبق ہوتا ہے یعنی اگر وہ چاہے کہ تمام عمر محض مشاہدہ ہی کرتا رہے اور کوئی نتیجہ نہ اخذ کرے تو یہ غیر ممکن ہے بلکہ اس کا دماغ (COMPUTER) جیسے جیسے مشاہدات جمع ہوتے رہیں گے غیر ارادی طور پر نتیجہ اخذ کرتا رہے گا چاہے سائنسداں ارادۃً نتیجہ اخذ کرے یا نہ کرے۔ لہذا ایک سائنسداں کے کام کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

(۱) مشاہدہ کرنا۔ (۲) مشاہداتی حقائق کو ترتیب دینا۔ (CLASSIFICATION) (۳) مخصوص ترتیب اختیار کرنے کا مفروضہ (HYPOTHESIS) مرتب کرنا۔ (۴) مفروضے کی تصدیق کے لیے مزید مواد فراہم کرنا۔ اگر تمام مشاہدے اور تجربے مفروضے کے موافق ہوتے ہیں تو مفروضہ ثابت شدہ یا مسلمہ حقیقت (APPROVED. FACT) ہو جاتا ہے لیکن اگر کچھ مشاہدے یا تجربے مفروضے کے خلاف جاتے ہیں تو یہ نظریے کی حیثیت میں رہ جاتا ہے۔

ابتدا میں سائنسدانوں نے مختلف جان داروں کا انفرادی اور تقابلی مشاہدہ کیا۔ ان مشاہدات کی بنا پر ان کو مختلف انواع میں تقسیم کرنے کے کئی طریقے مرتب کیے۔ ان طریقوں میں سے جس طریقے میں ارتقاء کا مفروضہ اختیار کیا گیا وہ زیادہ موزوں معلوم ہوا اور اس مفروضے کی تصدیق کے لیے مزید مواد فراہم کیا جانے لگا۔ تین علوم نے اس سلسلے میں کافی مواد فراہم کیا جو مختصراً حسب ذیل ہیں۔

علم جنین (EMBROY OLOGY)۔ یہ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ جس وقت کسی (SPECIES) کے نر کا کوئی تخم (SPERM) اسی اسپیز کے مادہ کے کسی بیضے (OVUM) میں اچھی طرح پیوست ہو جاتا ہے۔ اسی قسم

ایک بچے کا وجود ہو جاتا ہے۔ انسان (HOMOSAPINS) کے معاملے میں تقریباً نو ماہ کے بعد بچہ مختلف شکلیں اختیار کر کے انسان کی صورت میں آزاد فضا میں سانس لیتا ہے۔ ارنس ہیکل ERNST (HAECKEL) نے اس پر کافی مشاہدے کیے ہیں اور ان کے مشاہدوں کا مجموعہ دو ضخیم کتابوں[1] کی صورت میں موجود ہے۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ انسان کے بچے کی ابتدا ایک خلیہ سے ہوتی ہے جو جلد ہی کئی خلیوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ انھوں نے انسان کے بچے کی نشو ونما کے ستائیس واضح مدارج مقرر کیے ہیں جنھیں مچھلی کے جنین کی صورت چھپکلی کے جنین کی صورت۔ سور کے جنین کی صورت اور بندر کے جنین کی صورت سے گزر کر آخر میں انسان کے بچے کی صورت میں آتا ہے۔

اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ انسان ان مدارج سے گزر کر موجودہ صورت میں آیا ہے یا اس کے آباؤ اجداد زمانۂ قدیم میں ان جانوروں کے آباء واجداد سے خاندانی طور پر منسلک تھے۔

(MORPHOLOGY) جسمانی بناوٹ کا علم۔ اس وقت دنیا میں جتنے جانور پائے جاتے ہیں ان کے ڈھانچے کے تقابلی مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں کسی طرح کی کچھ مناسبت ہے۔ مثال کے طور پر ریڑھ والے جانوروں کو دیکھا جائے تو ان میں ایک سر ہوتا ہے۔ ریڑھ کی ہڈیوں کا ایک سلسلہ گردن سے شروع ہو کر دم تک چلا جاتا ہے (دم کی ہڈی انسان میں بھی ہوتی ہے۔ مگر مختصر ہو جاتی ہے اور گوشت و پوست کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی ہے لیکن کبھی کبھی یہ ظاہر بھی ہو جاتی ہے[2]) اور ہاتھ پاؤں کی ہڈیاں بھی ہوتی ہیں مچھلی سے لیکر انسان تک اگر ان میں مختلف اقسام کی ہڈیوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے کہ مچھلی کے سر میں بہت زیادہ ہڈیاں ہوتی ہیں اور جوں جوں چھپکلی گھوڑے اور بندر سے گزر کر انسان کی طرف لے جائیں۔ ان ہڈیوں کی تعداد میں کمی ہوتی جاتی ہے مگر سامنے کی ہڈی (FRONTALS) کا حجم بڑھنے اور اس کے بلند ہونے کے ساتھ ساتھ نیچے کا جبڑا نازک ہوتا جاتا ہے۔ اسی طرح ریڑھ اور ہاتھ پاؤں کی ہڈیوں کے اعداد میں کمی کے ساتھ ساتھ ان کا ایک سرے سے جوڑ کافی مضبوط ہوتا جاتا ہے اور آگے چل کر انسان نما بندر تحت الانسان اور انسان میں دماغی ساخت کے علاوہ بقیہ دوسرے اعضاء میں بہت کم امتیاز باقی رہ جاتا ہے۔

اس علم سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے جو علم جنین سے اخذ کیا گیا ہے۔ مگر ان دونوں علوم سے یہ ثبوت ہرگز نہیں ملتا ہے کہ انسان ان مدارج سے گزر کر انسانی صورت میں آیا ہے بلکہ محض گمان غالب ہی ہے۔ لہٰذا ان

مشاہدوں سے ارتقاء کا مفروضہ ایک نظریہ (THEORY) کی حیثیت میں آجاتا ہے۔

(PAPEONTOLOGY) قدیم جانداروں کا علم۔ زمین میں تین قسم کی چٹانیں پائی جاتی ہیں، غیر تہ دار چٹان (IGNEOUS ROCKS) تہ دار چٹان (SEDIMENTARY ROCKS) اور ان دونوں سے تبدیل شدہ چٹان (METAMORPHIC ROCKS)

غیر تہ دار چٹانیں ابتداء میں زمین کی رقیق حالت سے ثقیل حالت میں تبدیل ہونے سے وجود میں آئیں اور بعد میں بھی جب کبھی زمین میں زلزلہ اور آتش فشاں وغیرہ سے شگاف آجاتا ہے تو زمین کے اندر سے رقیق مادہ نکل کر اوپر یا سطح کے نیچے جمع ہو جاتا ہے اور اس طرح ایسی چٹانوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ کسی تہ دار چٹانوں کے اوپر جمع ہو جاتی اور پھر دوسری تہ دار چٹانیں اس کے اوپر جمع ہوتی ہیں۔

گرمی، سردی، بارش اور ہوا وغیرہ کے اثرات سے چٹانوں کا اوپری حصہ متاثر ہوتا رہتا ہے اور یہ ٹوٹنے پھوٹنے لگتی ہیں اور یہ ٹوٹے پھوٹے ٹکڑے ہوا اور بارش وغیرہ کے ذریعے چٹانوں سے منتقل ہو کر نشیبی زمین (سمندر یا جھیل وغیرہ) میں پہنچ جاتے ہیں اور وہاں ایک تہ کی صورت میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے۔ ہر تہ کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے جانداروں کے ڈھانچے اور دوسرے ٹکڑے وغیرہ دفن ہوتے رہتے ہیں جو اس زمانے میں رہتے ہیں۔ اس طرح ہزاروں تہیں ایک دوسرے کے اوپر جمع ہو کر تہ دار چٹانیں بناتی ہیں۔ انہیں دفن شدہ جانوروں کے ڈھانچے سانچے اور دوسرے نشانات جو ان چٹانوں کی کھدائی کے وقت ملتے ہیں فاسل کہلاتے ہیں۔ ان فاسلس کی ارضی عمر (GEOLOGICAL AGE) وہی ہوتی ہے جو تہ کے جمع ہونے کی ہوتی ہے۔ قدیم ترین فاسل کی ارضی عمر تقریباً پانچ سو ملین سال ہے۔

بعض مقامات پر مختلف ذرائع سے غیر تہ دار اور تہ دار چٹانیں تبدیل ہو کر دوسری شکل اختیار کر لیتی ہیں اور اس طرح تیسری قسم کی چٹان (METAMORPHIC ROCKS) کا وجود ہوتا ہے۔

ذہن اس معاملے میں الجھ سکتا ہے کہ کس طرح سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ فلاں فاسل فلاں فاسل کے مقابلہ میں قدیم ہے مگر فاسل کی ارضی عمر دریافت کرنے کے کئی ترقی یافتہ سائنسی طریقے ایجاد ہو چکے ہیں جس سے اطمینان بخش طور پر فاسلس اور چٹانوں کی ارضی عمر قطعیت سے دریافت کی جا سکتی ہے[۳]۔ مثال کے طور پر دو طریقے پیش کیے جاتے ہیں۔

(C14 METHOD) کاربن چودہ کا طریقہ۔ تمام جاندار دو قسم کے کاربن (C12 & C14)

جذب کرتے ہیں جن میں C₁₂ معمولی طرح کا ہوتا ہے مگر C₁₄ ریڈیائی ہوتا ہے اور اس کی مقدار معمولی کاربن کے مقابلے میں ایک ملین (۱۰ - ۱۲) چھوٹی ہوتی ہے۔ جب کوئی جاندار مرتا ہے تو موت کے وقت جتنی مقدار میں یہ دونوں کاربن ہوتے ہیں اس کے ساتھ دفن ہو جاتے ہیں لیکن معمولی کاربن اتنی ہی مقدار میں برقرار رہتی ہے جبکہ ریڈیائی کاربن مدت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک مقررہ تناسب سے ختم ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح کسی فاسل کے دفن ہونے کا وقت معمولی کاربن اور ریڈیائی کاربن کے تناسب (RATIO) سے قطعی طور پر معلوم ہو جاتا ہے۔ مگر ریڈیائی کاربن کی تعداد بہت کم ہوتی ہے لہذا اس طریقے سے اب تک ان تمام فاسلس کی ارضی عمر معلوم ہو سکتی ہے۔ جن کی مدت تقریباً ساٹھ ہزار سال تک ہے اور اس سے قدیم فاسلس کی مدت اس طریقے سے یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔

(LEADRATIO MOTHOD) سیسہ کے تناسب پر مبنی طریقہ۔ غیر تہ دار چٹانیں جب رقیق حالت میں ہوتی ہیں تو ان میں جو منرلس (MINE RALS) ہوتے ہیں وہ الگ الگ نہیں ہوتے ہیں لیکن جیسے جیسے رقیق حالت سے ثقیل حالت میں تبدیل ہوتی ہے۔ ان میں منرلس بننے شروع ہو جاتے ہیں اسی طرح سے یورنیم (URINIUM) جو ایک ریڈیائی منرل ہے وہ بھی بنتا ہے۔ لیکن یہ منرل دوسرے منرلس کے مانند جیسے بنتا ہے قائم نہیں رہتا ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اس منرل کا ایک ملین گرام ایک سال میں سیسہ کا $\frac{1}{7600}$ گرام پیدا کرتا ہے۔ لہذا ایک غیر تہ دار چٹان کی ارضی عمر سیسہ اور یورنیم کے تناسب سے معلوم کی جا سکتی ہے اور اس طریقے سے قدیم ترین چٹان کی بھی ارضی عمر معلوم کی جا سکتی ہے۔

تقریباً پانچ سو ملین سال سے اب تک ہزاروں تہ دار چٹانیں عالم وجود میں آچکی ہیں اور ان کے تہوں میں انواع و اقسام کے جانداروں کے فاسلس پائے جاتے ہیں۔ ان ہزاروں چٹانوں اور ان میں پائے جانے والے فاسلس کا بہت حد تک تفصیلی مطالعہ ہو چکا ہے اور ان کی ارضی عمر دریافت کی جا چکی ہے۔ اس بنا پر ان کو چار وسیع ادوار (قدیم۔ درمیانی۔ جدید اور موجودہ) میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ابتدا میں کچھ خاص قسم کے غیر ریڑھ دار جانور (   ) سمندر میں پیدا ہوتے ہیں یا پیدا کیے جاتے ہیں۔ یہ ایک خاص مدت تک کافی ترقی کرتے ہیں (اعداد میں اضافہ ہوتا ہے) اور سمندر کے مختلف حصوں میں بہت تیزی سے پھیل جاتے ہیں۔ پھر ان کا تنزل شروع ہوتا ہے۔ (اعداد میں کمی کے ساتھ ساتھ دور دراز الگ تھلگ مخصوص مقامات

میں رہنے لگتے ہیں) اور ان کی جگہ دوسرے غیر ریڑھ دار جانور لے لیتے ہیں جو ان سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتے ہیں (GANGALIA) دماغ کے حجم میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تیز رفتاری میں اضافہ) مگر ایک مدت کے بعد ان کا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور یہ سلسلہ ابتدائی ڈیڑھ سو ملین سال تک محض غیر ریڑھ دار جانوروں میں محدود رہتا ہے اور اس وقت تک کسی ریڑھ دار جانور کا کوئی فاسل نہیں ملتا ہے۔ اس کے بعد تقریباً ساڑھے تین سو ملین سال قبل سے ریڑھ دار جانوروں (VERLEBRATE) کے فاسلس سمندری تہ دار چٹانوں MARINE SEDIMERTARY ROCKS) میں ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ان ابتدائی ریڑھ دار جانوروں میں مچھلی (PISEES) اور مینڈھک (AMPHIBIAN) قسم کے جانوروں کے فاسلس پائے جاتے ہیں (ان کی ارضی عمر کی تعیین مذکورہ بالا طریقے کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی طے پائی ہے) لیکن قدیم دور میں ان جانوروں کے جو اسپیسز (SPECiS) عالم وجود میں آتی ہیں وہ دریائی دور تک تقریباً تمام کی تمام ختم (EXTINCT) ہو جاتی ہیں اور ان کی جگہ انہیں کے خاندان کی دوسری اسپیسز جو جسمانی اور دماغی لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہیں لے لیتی ہیں۔ اسی طرح جدید اور موجودہ دور میں نئی اسپیسز عالم وجود میں آتی ہیں اور اس کے قبل کی اسپیسز ختم ہو جاتی ہیں۔ تقریباً ڈھائی سو ملین سال قبل سے چھپکلی (REPTILE) قسم کے جانوروں کے فاسلس ملنے لگتے ہیں ان میں بھی ہر دور میں نئی اسپیسز قدیم اسپیسز کی جگہ لیتی رہتی ہیں۔ تقریباً ڈیڑھ سو ملین سال قبل سے دودھ پلانے والے جانوروں (MAMMALS) کے فاسلس ملنے شروع ہو جاتے ہیں مگر ان کے ابتدائی جانوروں میں مختلف بڑے گروہوں (گھوڑے۔ بیل۔ بندر وغیرہ) کا امتیاز کرنا غیر ممکن ہوتا ہے لیکن تقریباً ساٹھ ملین سال قبل سے ایسے فاسلس ملنے لگتے ہیں جو موجودہ بندر سے قریبی تعلق ظاہر کرتے ہیں۔ پھر تقریباً تین ملین سال قبل سے انسان نما بندر کے فاسلس ملنے لگتے ہیں۔ اور تقریباً ڈیڑھ ملین سال قبل سے تحت الانسان (SUBHUMAN) کے فاسلس ملنے لگتے ہیں۔ (تحت الانسان کی نسل تقریباً چالیس ہزار سال قبل ختم (EXTNCT) ہو گئی) اور بالکل آخر میں تقریباً پچاس ہزار قبل سے انسان (Homo sapiens) کے فاسلس ملنے لگتے ہیں۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں تقریباً پانچ سو ملین سال قبل غیر ریڑھ دار جانور سمندر میں پیدا ہوئے۔ تقریباً ساڑھے تین سو ملین سال قبل مچھلی اور مینڈھک قسم کے جانور عالم وجود میں آئے۔ تقریباً ڈھائی سو ملین سال قبل چھپکلی قسم کے جانور پیدا ہوئے۔ تقریباً ڈیڑھ سو ملین سال قبل دودھ پلانے والے جانور۔ آخر میں تقریباً ساٹھ ملین سال قبل بندر۔ تقریباً تین ملین سال قبل انسان نما بندر۔ تقریباً ڈیڑھ ملین سال قبل تحت الانسان اور بالکل آخر میں تقریباً پچاس ہزار قبل حضرت انسان عالم وجود میں آئے۔

اس کی اور زیادہ وضاحت کے لیے ان جانوروں کا خاندانی شجرہ ایک خاکے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے

ادوار	وسعت مدت	مختلف اقسام کے جانور
موجودہ دور کی زندگی	10000 سال	انسان، تحت الانسان، انسان نما بندر، بندر، گائے گھوڑے وغیرہ، چھپکلی وغیرہ، مینڈھک وغیرہ، مچھلی، کوڑی گھونگھا وغیرہ
جدید دور کی زندگی	60M.YRS.	50000 YRS; 1.5M YRS; 3 M YRS; 60 M.YRS
درمیانی دور کی زندگی	125 M.YRS	150 M.YRS.
قدیم دور کی زندگی	325 M.YRS	250 M.YRS; 350M.YRS; 500 M.YRS

بچے کی نشوونما اور جسمانی بناوٹ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی تھی کہ ممکن ہے انسان نے مختلف مدارج سے گزر کر انسان کی صورت اختیار کی ہو مگر قدیم جانوروں کے فاسلس کے مطالعے سے یہ بات یقین کی حد تک ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان مختلف مدارج سے گزر کر موجودہ انسانی صورت میں آیا ہے اور اس طرح سے جانوروں کے انفرادی اور تقابلی مشاہدے کے بعد جو مفروضہ پیش کیا گیا تھا وہ بچے کی نشوونما اور جانوروں کے جسمانی بناوٹ کے مطالعے سے نظریہ کی حیثیت تک پہنچ گیا تھا اور قدیم جانوروں کے فاسلس کے مطالعے سے ایک مسلمہ حقیقت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ سوائے چند شبہات کے جو لوگوں کے ذہن میں باقی رہ جاتے ہیں اور عوامل ارتقاء کے ذہنی مشاہدے کی شکل میں پیش کرنے کے جو مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

عام طور سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ چند مختلف دبی ہوئی ہڈیوں کو جمع کر کے یا جوڑ کر یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انسان ان مدارج سے گزر کر موجودہ صورت میں آیا ہے زیادہ وزنی نہیں ہے مگر قریب ترین فاسلس کے تقابلی مطالعہ اور ان کے تعلق کو قریب ترین جانوروں سے متعین کرنے میں جتنی احتیاط برتی جاتی ہے اور جتنی جستجو اور تحقیق کی جاتی ہے وہ یونانی اور مسلم دور کے طریقہ تحقیق سے کہیں زیادہ بہتر اور ترقی یافتہ ہے۔ اسی بنا پر (CUVIER (1769 - 1832) نے انیسویں صدی کی ابتدا میں اتنی مہارت حاصل کر لی تھی کہ جس جانور کو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا محض اس جانور کے ایک دانت کے مطالعہ سے وہ اس جانور کی پوری تصویر بنا دیتا تھا۔ اور اس طرح اس نے بہت سے ایسے جانوروں کی پوری تصویر بنائی تھی جن کے ڈھانچے کے فاسل اس کے زمانے میں دریافت نہیں ہو سکے تھے مگر بعد کی معلومات اس کی پیشین گوئی کے عین مطابق ثابت ہوئیں۔ علاوہ ازیں پلٹ ڈاؤن مین (PILTDOWN MAN) کے معاملے میں کچھ لوگوں نے سائنس دانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی مگر مختلف طریقہ سے تحقیق کر لی گئی کہ اس معاملے میں کتنی چالاکی سے دھوکہ دینے کی کوشش کی گئی تھی کہ پلٹ ڈاون مین ایک فاسل مین ہے جس میں انسان نما بندر اور انسان کی خصوصیات عجیب و غریب تناسب میں موجود ہیں۔

قدیم جانوروں کے فاسلس کے مطالعے سے لوگ یہ تو ماننے لگے ہیں کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام جانور ایک ہی وقت میں نہیں پیدا کیے گئے ہیں جیسا کہ توراۃ میں بیان کیا گیا ہے بلکہ ترقی یافتہ جانور بتدریج پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ فاسلس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے لیکن ہر اسپیز الگ الگ پیدا ہوئی ہیں اور ترقی یافتہ اسپیز اس سے کم ترقی یافتہ اسپیز سے پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یعنی ہر اسپیز تخلیق مخصوص کا نتیجہ ہیں اور انسان آمیبہ کے درجے سے بتدریج مختلف مدارج سے گزر کر انسان کی صورت میں نہیں آیا ہے بلکہ خاص طور پر الگ سے پیدا کیا گیا ہے۔

اس الجھن کو دور کرنے کے لیے حسب ذیل سطروں میں کچھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے۔
سائنس دانوں نے حقیقت کی وضاحت کے لیے اب تک دو طریقے اختیار کیے ہیں اور ہر ایک کی تین قسمیں کی ہیں۔ (۱) عمومی (عینی مشاہدے) (۲) مخصوص عام (آلاتی مشاہدے) (۳) مخصوص خاص (ذہنی مشاہدے)
ایک طریقہ یہ ہے کہ تجربے کے بعد ایک حقیقت آشکارا ہوتی ہے مگر اس کو ذہنی مشاہدے کی شکل دینے کے لیے ریاضی فارمولا (MATHEMATICAL FORMULA) تیار کیا جاتا ہے۔ اس فارمولے پر آلات بنتے ہیں، اور ان آلات کی مدد سے فیکٹری تیار ہوتی ہے جس سے کچھ عام استعمال کی چیزیں تیار کی جاتی ہیں اور اس طرح آشکارا حقیقت ذہنی آلاتی اور عینی مشاہدے کی شکلیں اختیار کر لیتی ہے اور عام و خاص اس کو مسلمہ حقیقت تسلیم کرنے لگتے ہیں۔ اس کی ایک عام فہم مثال EXPO 67 (۱۹۶۷ء میں عالمی نمائش جو کناڈا میں لگی تھی) میں امریکہ نے اپنے سامان کی نمائش کے لیے جو گنبد نما عمارت تعمیر کی تھی اس کو فلر (R.B. FULLER) نے پہلے ایک خاکہ اپنے ذہن میں تیار کیا تھا پھر اس کے لیے ایک ریاضی فارمولا تیار کیا اور اس فارمولے کے بدل پر گنبد نما عمارت تعمیر کی گئی۔ دوسرے طریقے میں یہ عمل بالکل مختلف سمت سے چلتا ہے یعنی ابتدا میں عینی مشاہدے کیے جاتے ہیں اور اس سے جو حقیقت سامنے آتی ہے اس کی آلاتی مشاہدے سے تصدیق کی جاتی ہے اور اگر آلاتی مشاہدے عینی مشاہدے کے خلاف ہوتے ہیں تو عینی مشاہدے کو ٹھکرا دیا جاتا ہے اور آلاتی مشاہدے کی حقیقت کو تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ مگر عوام کو سمجھانے کے لیے کوئی عینی مشاہدے کی شکل پیش کی جاتی ہے مثلاً عینی مشاہدے سے یہ حقیقت تسلیم کی جاتی تھی کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے اور سورج اس کے گرد چکر کاٹتا ہے مگر آلاتی مشاہدے سے یہ حقیقت معلوم ہوئی کہ زمین سورج کے چکر لگاتی ہے۔ لہذا عوام کو اس حقیقت کے سمجھانے کے لیے یہ بات کہی جاتی ہے کہ ٹرین میں سفر کرنے والے کو ٹرین کے بجائے راستے میں پڑنے والے درخت وغیرہ چلتے نظر آتے ہیں لیکن ایسی صورت میں جبکہ آلاتی مشاہدے عینی مشاہدے کی تصدیق کرتے ہیں تو پھر اس کی ذہنی مشاہدے سے تصدیق کی جاتی ہے یعنی کوئی ریاضی فارمولا تجویز کیا جاتا ہے اور جب تک فارمولا تیار نہیں ہوتا اس وقت تک عینی اور آلاتی مشاہدے کے ثبوت میں جتنی باتیں کہی جاتی ہیں محض لفظی اور استدلالی بحث کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ذہنی مشاہداتی حقیقت نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اب تک کے مطالعے سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ عینی اور آلاتی مشاہدوں سے ارتقا ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہاں پر چند سائنس دانوں کے خیالات اور مشاہدات اس ثبوت میں پیش کیے جا رہے ہیں کہ ارتقا کیسے ایک ذہنی مشاہداتی حقیقت بھی ہے

یونانیوں نے ارتقاء کے خیال کو جنم دیا۔ اناکسمنڈر (ANAXIMANDER) نے تقریباً 551B.C میں پہلی مرتبہ ارتقاء کے تصور کو پیش کیا۔ امپیڈاکلس (EMPEDOCLES 495-435 B.C.) وہ پہلا شخص ہے جس نے یہ خیال پیش کیا کہ قدرت غیر ترقی یافتہ جانداروں کو ارتقائی طور پر ترقی یافتہ بناتی ہے اور اس کا زیادہ امکان ہے کہ 'اصلح' کی پیدائش اتفاقی طور پر ہوئی ہو اس کے شاگرد ڈیموکریٹس 460-357 B.C , DEMOCRATUS نے ان خیالات کی کافی اشاعت کرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اور اضافہ کیا مگر ارسطو (ARISTOTLE, 384-322 B.C) نے اگرچہ تخلیق مخصوص کی مخالفت کی لیکن اس پر زور ڈالا کہ جانداروں میں جو ارتقاء پایا جاتا ہے وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت وجود میں آیا ہے اور اتفاقیہ طور پر نہیں ہوا ہے لہٰذا غیر ترقی یافتہ جان دار کا ترقی یافتہ شکل اختیار کرنے میں جاندار کے اپنے داخلی بہتری کے رجحان کا دخل ہے۔

یونانیوں کے بعد مغربی ممالک میں عیسائیت کے غلبہ کی بنا پر تخلیق مخصوص کا مفروضہ جو یہودی تعلیم سے لیا گیا تھا چھا گیا تھا اور وسطی ایشیا کے علاقے میں جہاں اسلام کا غلبہ تھا اور یونانی فلسفہ کی کافی مقبولیت تھی معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر ارتقاء کا تصور مقبول نہیں ہو سکا۔ بلکہ تخلیق مخصوص کا مفروضہ چھایا رہا محض سینٹ آگسٹن اور ابن خلدون کی تحریروں میں ارتقاء کے کچھ اشارے ملتے ہیں۔ مگر موجودہ دور کی ابتدا میں بکین (BACON) ڈسکارٹیز (DESCARTES) لیبنٹز (LEIBNITZ) اور کانٹ (KANT) نے دلائل سے ارتقاء کی حقانیت ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس کے ساتھ ساتھ بہت سے سائنس دانوں نے اس کے جواز میں مشاہدی حقیقت اور اپنے خیالات پیش کرنے شروع کر دیے جو مختصراً حسب ذیل ہیں۔

لینس (LINNAEUS, 1707-78) یہ وہ سائنس داں ہیں جو تخلیق مخصوص پر یقین رکھتے تھے اسی بنا پر اس وقت جتنی زندہ اسپیشیز معلوم تھیں ان کا باقاعدہ نام مقرر کیا۔ انھوں نے نام مقرر کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا وہ بہت مقبول ہوا اور اب تک اسی کو اختیار کیا جا رہا ہے۔

بافن (BOFFON, 1707-1788) کا وہ دور تھا جس میں تخلیق مخصوص کے خلاف آواز اٹھانا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا لہٰذا اگرچہ انھوں نے اپنے خیالات کے اظہار میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی لیکن پیچیدگی اختیار کی اس طرح اس طریقہ تحریر نے ایک طرف ان کو عیسائی علماء کے گرفت سے بچا رکھا اور دوسری طرف سائنسدانوں نے ان کے خیالات کو اچھی طرح سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ ماحول کے دباؤ سے

جانداروں کے اعضا میں تبدیلی آتی ہے اور یہ تبدیلی وراثۃً منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ بقائے زندگی کے لیے جد و جہد ہوتی رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں آبادی ضرورت سے زیادہ نہیں بڑھنے پاتی ہے۔

ارسمس ڈاروِن (E. DARWIN, 1731-1802) یہ چارلس ڈاروِن کے دادا ہیں۔ ان کا یہ خیال تھا کہ تمام جانور اپنے ارادے اور کوشش سے ترقی کرتے ہیں اور جو کچھ بھی ترقی وہ کرتے ہیں وہ وراثۃً منتقل ہوتا رہتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر جانور کو خدا نے جتنی صلاحیت ودیعت کی ہے وہ اتنی ہی کوشش کر سکتا ہے لیکن بقائے زندگی کی کوشش شدید تر ہوتی ہے۔ لہٰذا آبادی ضرورت سے زیادہ نہیں بڑھنے پاتی ہے۔ لہٰذا تمام موجودہ جاندار ابتدائی ایک خلیہ والے جاندار سے زمانہ دراز سے بقائے زندگی کی کوشش کے نتیجے میں وجود میں آئے ہیں۔

لیمارک (LAMARK, 1744-1829) یہ بلند پایہ فطرت داں ہیں مگر اپنی غربت کی وجہ سے اور کیویر (CUVIER, 1769 - 1832) کی شہرت کی وجہ سے جس کو تخلیق مخصوص ماننے کی وجہ سے عیسائی علما نے خوب اچھال رکھا تھا۔ یہ اپنے زمانے میں زیادہ مقبول نہ ہو سکے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ماحول کے دباؤ سے کچھ اعضا زیادہ استعمال میں آتے ہیں اور کچھ بالکل استعمال نہیں ہوتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلسل استعمال میں آنے والے اعضا نشو و نما پاتے ہیں اور غیر مستعمل اعضا دھیرے دھیرے ختم ہو جاتے ہیں اور پھر جو شکل بنتی ہے وہ وراثۃً منتقل ہوتی رہتی ہے اور اس طرح نئی اسپیشز قدیم اسپیشز سے عالم وجود میں آتی ہے۔

سینٹ ہیلیر (G. ST. HILAIRE, 1772 - 1844) نے لیمارک کے نظریہ کی تردید کی اور کہا کہ ارتقا دھیرے دھیرے نہیں آتا ہے بلکہ یکایک جست (SALTATION) کی صورت میں ہوتا ہے۔

چارلس ڈاروِن (C. DARWIN, 1809 - 1882) ان کا یہ خیال تھا کہ جانداروں کی پیدائش اس سے کہیں زیادہ ہوتی ہے جتنی دنیا میں ان کے رہنے اور کھانے کی گنجائش ہے۔ لہٰذا ہر فرد کو بقائے زندگی کے لیے جد و جہد کرنی پڑتی ہے اور اس جد و جہد میں اصلح باقی رہتا ہے اور دوسرے ختم ہو جاتے ہیں یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے اور اس طرح نئی اسپیشز پرانی اسپیشز سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

ہیوگ ڈی وریز (HUGE DE VRIES, 1848-1935) نے یہ خیال پیش کیا کہ تبدیلیاں ایک ہی سمت میں نہیں ہوتی ہیں بلکہ مختلف سمت میں ہوتی ہیں۔ اور یہ تبدیلیاں دھیرے دھیرے نہیں بلکہ یکایک تبدیلی (MUTATION) سے ہوتی ہیں اور اس طرح نئی اسپیشز پیدا ہوتی ہیں۔

مارگن (T. H. MORGAN, 1866-1945) نے MENDEL کے تجربے کے اصول پر جین (GENE) کا نظریہ پیش کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ فرد کے تمام خصوصیات جین میں ہوتے ہیں اور ہر جین کے دو حصے ہوتے ہیں اور یہ دونوں الگ الگ ماں باپ کے خصوصیات الگ الگ جمع کیے ہوتے ہیں۔ یعنی بچہ اپنے والدین کے خصوصیات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن اس میں ماں یا باپ کی وہی خصوصیات اجاگر ہوتی ہیں جو طاقتور ہوتی ہیں۔ مثلاً اگر ماں کا قد چھوٹا اور باپ کا لمبا تو بچہ اسی صورت میں لمبا ہوگا جب باپ کی لمبائی کا جین طاقتور ہوگا لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو بچہ یا تو چھوٹے قد کا ہوگا یا درمیانی قد کا۔ اسی طرح تمام دوسرے خصوصیات پر قیاس کیا جا سکتا ہے۔ مگر حمل کے ابتدائی ایام میں ماحول کے دباؤ کا بچے پر کافی اثر ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ایک ہی والدین کے بچے مختلف خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں اور اس طرح سے نئی اسپیسیز پرانے اسپیسیز سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

اس وقت تک اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ارتقا کے ثبوت میں جتنے خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ دلائل کے حدود میں رہے ہیں اور کوئی بھی ایسا ثابت نہیں ہے جو ارتقا کے عینی اور آلاتی مشاہدوں کی مسلّمہ حقیقت کو ذہنی مشاہدے کی شکل دے۔ لیکن موجودہ دور میں جین کے نظریے پر جو تجربہ کیا جا رہا ہے اس سے گمان غالب ہے کہ جلد ہی وراثتی فارمولا (GENETIC CODE) معلوم کر لیا جائے اور اس طرح ذہنی مشاہدے کی شکل نکل آئے کیونکہ جین کے اصول کے مطابق جانوروں اور پودوں پر جو تجربہ کیا جا رہا ہے اس کے نتیجے میں بہتر قسم کے جانور اور اناج پیدا کیے جا رہے ہیں اور وراثتی فارمولے کے عینی مشاہدے سامنے آ رہے ہیں۔ حالانکہ ابھی تک وراثتی فارمولا قطعی طور سے معلوم نہیں کیا جا سکا ہے۔

اس وقت تک یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ سائنس دانوں نے مختلف طریقے اس لیے تجویز کیے ہیں کہ کیسے ترقی یافتہ اسپیسیز اس سے کم ترقی یافتہ اسپیسیز سے پیدا ہوتی ہے لیکن آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہو کہ اس وقت تک اسپیسیز کی کوئی جامع تعریف نہیں ہے[4]

مائر (MAYER) نے پانچ مروجہ تعریفوں کو بیان کر کے ان پر تنقید کی ہے اور کہا ہے کہ ان میں کوئی بھی معیار پر صحیح نہیں اترتی[5]۔ خان (KHAN) نے بھی بہت سے تجربہ کار سائنس دانوں سے گفتگو کے بعد اس پر اتفاق کیا ہے کہ اسپیسیز کا تعین کرنا تجربہ کار سائنس داں کے اپنے ذوق پر ہے۔ کیونکہ دو قریب تر اسپیسیز کے درمیان حد فاصل قائم کرنا کار محال ہے۔ حالانکہ اگر اسی گروہ کے تین مسلسل اسپیسیز کو ملا کر دیکھا جائے تو پہلی اور آخری میں واضح فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ درمیانی اسپیسیز کو ان دونوں سے مشکل سے ممتاز کیا جا سکتا ہے یعنی اس میں کچھ

ترقی یافتہ اور کچھ غیر ترقی یافتہ اسپیشیز کی خصوصیات ہوں گی۔ اسی طرح ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے ممتاز کیا جا سکتا ہے لیکن اگر دونوں گروہ ایک مشترک گروہ سے منسلک ہوں تو ان دونوں گروہوں کے ابتدائی اسپیشیز کو ممتاز کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ مثال کے طور پر اس کو ایسے سمجھا جا سکتا ہے جیسے ایک بہت بڑا درخت ہو جس میں بہت سی شاخیں ہوں جس کی ہر شاخ الگ الگ تو پہچانی جا سکتی ہے لیکن اگر ایک ہی شاخ دیکھی جائے تو اس کا شروع سے آخر تک ایک ہی سلسلہ معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ ہر شاخ الگ الگ درخت ہے تو شاید کوئی نہ مانے۔ سوائے ان لوگوں کے جن کو محض ایک ہی شاخ کا علم ہو مگر اس کے برخلاف بہت سے لوگ یہ کہتے ہوئے قباحت محسوس نہیں کرتے کہ ہر اسپیشیز کا الگ الگ وجود ہوا ہے۔

مندرجہ بالا معلومات سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ اب تک جتنے مشاہدے یا تجربے سائنس دانوں نے کیے ہیں کوئی بھی ارتقاء کے خلاف نہیں ہے۔ لہٰذا موجودہ دور میں سائنس داں ارتقاء کو مسلمہ حقیقت (APPROVED FACT) کہتے ہیں۔ حالانکہ نظری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ آئندہ کچھ ایسے مشاہدے یا تجربے ہوں جو اس کو دوبارہ ایک نظریے میں بدل دیں۔ یا نظریے کی حیثیت سے بھی رد کرنے پر مجبور کر دیں۔ سائنس کے طریقہ تحقیق میں یہ امکان کبھی ختم نہیں ہوتا۔ لہٰذا جہاں بھی قرآن کریم میں تخلیق آدم کا تذکرہ آیا ہے موجودہ دور میں اس کا ارتقاء آدم ہی کا مفہوم لینا چاہیے اور تخلیق مخصوص کا نظریہ جو قدیم معلومات کی بنا پر اختیار کیا گیا تھا اب رد کیا جا چکا ہے اسی بنا پر کھل کر تنقید کرنا چاہیے تاکہ قرآنی آیات کی غلط تشریح کو حقیقت کا درجہ دے کر ذہن پر جو قفل لگا دیا گیا ہے کھولا جا سکے۔

ارتقاء کی مخالفت کیوں؟

ارتقاء کا تصور ابتداءً یونانیوں نے پیش کیا لیکن تقریباً دو ہزار سال تک یہ تصور دبا رہا ہے۔ پھر موجودہ دور کے ابتداء میں اس پر کام شروع ہوا حالانکہ اس وقت حسب ذیل تین دوسرے تصورات بھی چھائے ہوئے تھے۔

(۱) ETERNITY OF PRESENT CONDITION) موجودہ حالات کے ہمیشہ قائم رہنے کا تصور یہ کہ دنیا اور اس پر بسنے والے تمام مخلوقات ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ مگر مذہبی علماء نے قیامت کا تصور پیش کیا جس کی وجہ سے اس کی مقبولیت کم ہونے لگی۔

۲۔ (SPECIAL CREATION) تخلیق مخصوص، تقریباً پانچویں صدی میں جب تورات لکھی گئی تھی اس وقت یہودی علوم و فنون عالم عروج پر تھے لہٰذا جب تخلیق کا تذکرہ تورات میں لکھا گیا تو اسی یہودی علم کو ملحوظ رکھا

گیا جو اس زمانے میں مقبول تھا کہ خدا نے تمام زمین و آسمان اور مخلوق چھ دن میں پیدا کی۔[1] پھر عیسائی علماء نے اس کی خوب اشاعت کی۔ فادر سوریز (Father Suarez 1549-1617) نے اس کو بڑی تفصیل و وضاحت سے بیان کیا مگر فاسلس کے مطالعہ سے یہ تصور کمزور پڑنے لگا۔

۳۔ عالمگیر تباہی (Catastrophism) جب فاسلس کا مطالعہ عام ہو گیا اور سائنسداں مختلف مقامات پر مختلف زمانے کے فاسلس کا مطالعہ کرنے لگے تو ان کو اندازہ ہوا کہ ایک زمانے کی چٹانوں میں ایک خاص قسم کے جانوروں کے فاسلس ملتے ہیں اور دوسرے زمانے کی چٹانوں میں دوسری خاص قسم کے جانوروں کے فاسلس۔ اس پیچیدگی کو حل کرنے کے لیے کیور (Curier, 1769 - 1832) نے عالمگیر تباہی کا نظریہ پیش کیا اور ان کے شاگردوں نے اس کی خوب وضاحت کی کہ ایک مدت میں کچھ مخلوق پیدا کی گئی اور وہ تمام کی تمام ختم کر دی گئی۔ اس کے بعد دوسری مخلوق پیدا کی گئی اور وہ پھر کچھ مدت کے بعد ختم کر دی گئی اس طرح دنیا میں اب تک کئی مرتبہ عالمگیر تباہی آ چکی ہے۔

ان تصورات کے ساتھ ساتھ ارتقاء پر یقین رکھنے والے بھی کام کرتے رہے اور اسپنسر کے ارتقاء کے متعلق لکھتے رہے مگر چونکہ عیسائی علماء سائنسی دلائل اور مشاہدات سے ارتقاء کی مخالفت کرتے رہے لہٰذا یہ تصور غالب نہیں ہونے پا رہا تھا اور یونیورسٹیوں میں وہی سائنسداں جگہ پاتے تھے جن کا رجحان مذہبی ہوتا تھا اس طرح کم تر سائنس داں بلند پایہ سائنس داں کے مقابلے میں اعلیٰ جگہوں پر مقرر ہوتے تھے یہاں تک کہ چارلس لائل (Charles Lyell) جیسے سائنس داں کو بھی اس کی شکایت تھی۔[2] یہ کیفیت انگلینڈ کے مقابلہ میں فرانس میں زیادہ نمایاں تھی جس کی وجہ سے ذہین طبقہ کافی بیزار تھا۔ حکومت اور مذہبی علماء کے اس گٹھ جوڑ نے ذہین طبقے کو بہت پریشان کر رکھا تھا اور یہ لوگ کسی موقع کی تلاش میں تھے مگر Bridge Water Treatises (جس کو اس وقت کے آٹھ بڑے سائنس دانوں نے تیار کیا تھا جس میں اس وقت کے سائنسی معلومات کے مطابق مذہبی خیالات کی تائید کی گئی تھی) کے مقابلہ میں کوئی مدلل چیز پیش کرنے سے قاصر تھے لہٰذا جیسے ہی ڈارون کی Origin Of Species چھپی اس طبقے نے اس کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مذہبی طبقے کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا۔ ہکسلے (T.H. Huxley) اور ہیکل (E.Haeckel) نے معجزے کے خلاف شرارت انگیز انداز میں لکھنا شروع کر دیا۔ ادھر Origin Of Species کی اتنی مقبولیت ہوئی کہ مذہبی طبقے میں بھی یہ اچھی نظر سے دیکھی جانے لگی Dean Of St. Paul's نے اس

کی تعریف کی (Life, 1894) - F.J.A. HORT نے لکھا کہ اس کا جواب دینا مشکل ہے
(Life 1896) اور Charles Kingsley نے اس کی تعریف میں ڈارون اور ہکسلے
کو خطوط لکھے (Life 1877) ارتقاء کی مقبولیت نے پورے تورات کے بیانات کو مشکوک بنایا
اس کی وجہ سے عیسائی علماء بوکھلا گئے اور بوکھلاہٹ میں چاروں طرف مناظرے ہونے لگے۔ ان مناظروں
میں T.H. Huxley اور عیسائی عالم Samuel Wilberforce کا مناظرہ کافی
مشہور ہے۔ اس موقع پر عیسائی عالم نے غیر شائستہ زبان اختیار کی اور ہکسلے نے اس کے برخلاف بہت ہی
مدلل طریقے سے اپنی بات پیش کی۔ مثال کے طور پر عیسائی عالم نے کہا کہ جو لوگ اپنے آباء و اجداد میں انسان نما بندر
کو شمار کرتے ہیں کیا وہ اپنی والدہ کے معاملے میں بھی ایسی ہی نسبت پسند کریں گے جس کے جواب میں ہکسلے نے
کہا کہ وہ بندر کو اپنے آباء و اجداد میں شمار کرنے والوں کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر سمجھتے ہیں جو اپنی تمام
صلاحیتوں کو حق پر پردہ ڈالنے میں صرف کریں۔ زبانی مناظرے کے بعد تحریری بحث کا دور شروع ہوا مگر
اس میں بھی عیسائی علماء نے اکثر و بیشتر مشاہدات سے انکار کا رویہ اختیار کیا جس کا اور بھی برا اثر پڑا
جس کی وجہ سے Cardinal Newman نے خاموشی اختیار کرنے کی تلقین کی[9]۔ کیونکہ اس
وقت تک عیسائی علماء کا سائنسی مطالعہ کم تھا اور ان کے لیے یہ طے کرنا ممکن نہ تھا کہ کن چیزوں کا اقرار
کریں اور کن چیزوں کا انکار مگر نیم ملاؤں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا اپنے طریقہ تقریر اور تحریر سے ذہین طبقہ
کو مذہب سے بیزار کرتے رہے کچھ دنوں کے بعد Canon Hedley نے جو رومن کیتھولک تھے لکھا
کہ انسان کے علاوہ بقیہ تمام جانور آموبہ یا غیر جاندار سے ارتقاء کر کے اپنی موجودہ شکلوں میں آئے ہیں[10]۔ تھوڑے
ہی عرصہ بعد R.A. Moore نے جو انگلیکن تھے لکھا کہ انسان کا جسم دوسرے جانوروں کی طرح ارتقاء
کا نتیجہ ہے لیکن روح خدا کی عنایت کردہ ہے[11]۔ اس طرح عیسائی علماء نے تورات کی تحریف شدہ حقیقت
کو تسلیم کر لیا A.R. Wallace جو ڈارون کے ہم خیال تھے Moore کے خیالات کی تائید کی[12]
مگر ہکسلے نے ان دونوں سائنس دانوں کو برا بھلا کہا[13]۔ حالانکہ J. Huxley جو T.H. Huxley
کے پوتے ہیں Wallace کو قدامت پسند نہیں مانتے ہیں[14]۔ مگر موجودہ دور میں روح کو جسم سے کوئی الگ
چیز تصور نہیں کیا جاتا ہے بلکہ اس کو انسانی صلاحیت (Potentialities) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
لہذا روح کوئی انسان ہی کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ہر جانور میں پائی جاتی ہے مگر وہ انسانی روح کے

مقابلے میں کم تر ہوتی ہے۔ اسی کو ڈاروِن اور ہکسلے نے کافی واضح کیا اگر عیسائی علماء ماننے سے انکار کرتے رہے۔ مگر موجودہ دور میں عیسائی علماء ارتقاء کو مسلمہ حقیقت تسلیم کرنے لگے ہیں۔

مشرقی ممالک میں مغربی تہذیب کے ساتھ ساتھ سائنس اور مذہب کا ٹکراؤ بھی آیا۔ مگر مشرقی ممالک کے مذہبی رہنما مغربی ممالک کے مذہبی رہنماؤں کے مقابلے میں سائنس سے بالکل ناآشنا تھے لہذا اول تو مشرقی ممالک کے علماء اس مسئلے کی گہرائی تک پہنچ ہی نہ سکے اور محض سطحی طور پر مغربی ممالک کے مذہبی رہنماؤں کی کورانہ تقلید شروع کر دی۔ لہذا اس مسئلے میں یا تو طنز یہ طور اختیار کیا اور علمی بحث سے گریز کیا یا پھر اس سے آسان طریقہ اختیار کر کے اس علم ہی پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی علماء اور مغربی تعلیم حاصل کرنے والوں کے درمیان بعد پیدا ہوتا گیا اور چونکہ روزمرہ کے کاروبار میں مغربی تعلیم یافتہ افراد ہی چھاتے گئے لہذا مذہبی علماء محض مساجد کے امام بنکر رہ گئے لیکن اگر مذہبی علماء پوری تیاری کے ساتھ اس علمی جنگ میں اترے ہوتے اور گہرے مطالعہ و فکر کے بعد کسی ترقی یافتہ فکری تشکیل کی ہوتی تو اس کے ذریعے ان کو ویسی ہی علمی فتح حاصل ہوتی جیسی کہ فکر یونان سے علمی جنگ میں نحیتیابی حاصل کی تھی اور پوری امت اس علمی جنگ میں ایسی پسپائی اختیار نہ کرتی۔ لیکن یہ نہایت خوش کن ہے کہ بیسویں صدی میں چند مذہبی علماء نے اس مسئلے کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی ہے اور وہ کہاں تک پہنچے ہیں مختصراً حسب ذیل ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رح

انھوں نے قرآن کی تفسیر لکھتے وقت Embryology کو موجودہ تحقیق کے مطابق بیان کیا اور اس سے ارتقاء کی حقانیت کی طرف اشارہ کیا ہے[16] اور پھر بعد میں واضح طور سے ارتقاء کی حقیقت کو تسلیم کیا[17]

سید قطب رح

انھوں نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ انسان کا حیوانی ارتقاء اسی طرح ہوا ہو جس طرح ڈارون نے بیان کیا ہے[18]۔ مگر انسان کو خدا نے کچھ مخصوص صلاحیتیں دی ہیں۔ ان مخصوص صلاحیتوں کے سلسلے میں وہ قرآن کریم کی وہ آیت پیش کرتے ہیں جس میں اللہ تعالے نے کہا ہے کہ میں نے اس میں اپنی روح پھونکی۔ ارتقاء کا امکان تسلیم کرتے ہوئے انھوں نے یہ بھی لکھا ہے اگرچہ وہ اس بارے میں کوئی قطعیت نہیں اختیار کرتے مگر ان کا ذاتی رجحان یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا ہے[19]

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نفس ارتقاء کے منکر

نہیں ہیں لیکن ہر اسپیشیز کے پہلے فرد کی براہ راست تخلیق کے قائل ہیں۔[21]

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

انھوں نے ابھی تک تحریری طور پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے مگر گزشتہ مئی میں علیگڈھ میں منعقدہ علمی بحث کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے ارتقار کی حقانیت تسلیم[22] کی تھی۔ شاید ان پر مولانا ابوالکلام آزاد کی صحبت کا کافی اثر ہے۔

مندرجہ تاریخی پس منظر سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ مغرب میں کس طرح سے ارتقار کی مخالفت کی جارہی تھی اور کن مدارج سے گزر کر اس کی حقیقت کو تسلیم کیا گیا اور مشرق میں کس طرح سطحی مخالفت کے بعد اس کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کون عالم کس حد تک اس کے وزن کو محسوس کرتا ہے لیکن امید ہے کہ مشرقی علمار بھی عیسائی علمار کی طرح اس کی حقیقت تسلیم کرکے سائنسی دور میں طریقہ تبلیغ کی اصلاح کرکے انسانیت کی خدمت کریں جس کے لیے وہ اپنی زندگیاں وقف کر چکے ہیں۔

صحیح موقف

ارتقار کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ مذہبی علمار سوء اور حکومت کے گٹھ جوڑ کی گرفت ڈھیلی ہونی شروع ہوگئی اور اس طرح جمہوریت کے پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ مگر اس کے ساتھ ہی فیکٹری کے سرمایہ داروں نے بقائے اصلح کا غلط استعمال شروع کر دیا اور مزدوروں کے حقوق غصب کرنے لگے جس کے خلاف مزدوروں میں بے زاری شروع ہوئی اور آخر کار کارل مارکس نے مزدوروں کی ہمدردی میں طبقہ واری جنگ کی شکل میں بقائے اصلح کا مفہوم پیش کیا اور اس طرح بقائے اصلح جو محض فرد تک محدود تھا گروہ کی شکل اختیار کرکے قومیت کی شکل میں یورپ کے مختلف ممالک میں پھیل گیا۔ پھر یورپ کے ممالک اپنی فیکٹریوں کی ترقی کے لیے دوسرے غیر یورپی ممالک پر اپنا قبضہ کرنے کے لیے جدوجہد کرنے لگے جس کے نتیجے میں دو عالمی جنگیں ہوئیں۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہٹلر نے اپنی قوم کو بہترین نسل بنانے کے لیے بہتر جین Gene کے اصول پر کچھ قوانین وضع کیے۔ مثلاً ذہین مرد محض ذہین عورت سے شادی کر سکتا ہے تاکہ ذہین نسل پیدا ہو سکے اور ملک کی ذہنی قیادت کر سکے۔ جسمانی طاقتور مرد جسمانی طاقتور عورت سے شادی کرے تاکہ طاقتور نسل پیدا ہو کر بہترین جنگ لڑ سکے۔ جو مرد یا عورت ذہنی اور جسمانی حیثیت سے معیار سے کمتر ہو اس کو اولاد پیدا کرنے

سے بے کار کر دیا جائے اسی بنا پر دوسری جنگ عظیم شروع ہونے کے قبل جرمن قوم ایک اعلیٰ ترین قوم بن چکی تھی مگر جب تمام دنیا کی دوسری طاقتوں کے مقابلے کی تاب نہ لا کر ہٹلر جنگ ہار گیا تو جرمنی کے اس وقت تک جتنے مشہور سائنس داں باقی رہ گئے تھے ان کو روس اور امریکہ نے اغوا کر لیا اور انہیں جرمن سائنسدانوں کی مدد سے اب یہ دونوں ممالک طاقتور بنتے جا رہے ہیں۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا کہ انسانی آبادی مسلسل بڑھ رہی ہے جبکہ ان کے کھانے اور رہنے کی گنجائش اس زمین میں زیادہ نہیں ہے لہذا ضبط ولادت کو عام کرنے کا ایک عالمی پروگرام بنایا گیا مگر اس کی ناکامی دیکھ کر مغربی ممالک میں بے چینی شروع ہوئی اور انھوں نے ایک طرف ہٹلر کے اصول پر عمل کرنا شروع کر دیا تاکہ بہترین قوم بنا سکیں اور دوسری طرف چاند اور دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈالنا شروع کر دیں تاکہ اگر یہاں پر زمین تنگ ہو جائے تو پھر دوسری زمین پر جا کر آباد ہوں لیکن اگر اس زمین میں اتنی گنجائش نہ ہو تو پھر اپنی قوم کے بہترین افراد کو وہاں پر رہنے کا عادی بنایا جائے اور پھر اس سرزمین کو جو آبادی کے اضافے کی وجہ سے ناقابل آباد ہوتی جا رہی ہے برباد کر دیا جائے اور اس نکمی نسل کے ختم ہو جانے کے بعد پھر آ کر اس کو دوبارہ آباد کیا جائے اور انسانی ارتقار کا دوسرا سنہرا دور شروع ہو لیکن یہ ذہنیت ابھی زیادہ اجاگر ہو کر سامنے نہیں آئی ہے اس لیے کہ ابھی کوئی ملک اس موقف میں نہیں ہے کہ اکیلا وہی ایسا کر سکے دوسرے خود اسی ملک کے لوگوں کی مخالفت سامنے ہے اور دوسرے ممالک کے مقابلے میں اپنی برتری کا معاملہ بھی درپیش ہے لیکن اگر محض ایک ہی ملک ایسی سبقت لے جاتا ہے اور آبادی کی زیادتی پریشان کن حد تک پہنچ جاتی ہے تو اس پلان پر عمل کرنے سے اسی طرح کوئی نہیں روک سکتا ہے جس طرح دو بڑی عالمی جنگیں محض چند لوگوں کے فیصلے پر ہی لڑی گئی تھیں۔ ایسی صورت میں بقائے اصلح کا مفہوم فرد اور گروہ کے بجائے پوری انسانیت (Homo sp. [illegible]) کے سیاق میں لیا جائے تو زیادہ صحیح ہے کیونکہ انسان تمام دوسرے جانوروں سے اعلیٰ و افضل ہے اور ایسا طریقہ عمل استعمال کیا جانا چاہیے جس سے پوری انسانیت کی بھلائی ہو۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ایک ایمان دار سائنس داں کی طرح یہ حقیقت تسلیم کر لیا جائے کہ ابتدا میں خدا نے ایک یا ایک سے زائد جرثومہ پیدا کیا اس کے بعد ارتقار کا سلسلہ شروع ہوا[23] اس ایمان دارانہ حقیقت کو اس زمانے کے ذہین طبقے نے محض وقتی طور پر ترک کیا تھا تاکہ مذہبی علماء کا زور توڑا جائے اور ماحول کو سازگار بنایا جائے لیکن ابھی ماحول سازگار ہونے بھی نہ پایا تھا کہ ہوا نے دوسرا رخ بدلا اور فیکٹری کے سرمایہ داروں نے سائنسی علماء سوء کو

اسی طرح اچھالنا شروع کر دیا جیسا بادشاہوں نے مذہبی علماء سوء کو اس کے قبل اچھال کر اپنا الو سیدھا کیا تھا لیکن اب پھر تبدیلی آ رہی ہے اور لوگ ماننے لگے ہیں کہ پہلا جرثومہ اتفاقیہ طور پر پیدا نہیں ہوا بلکہ ایک مقصد کے تحت پیدا کیا گیا تھا۔[۲۴] اور تمام عالم بے مقصد وجود میں نہیں آگیا ہے بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت پیدا کیا گیا ہے۔[۲۵] اگر اس بدلتی ہوئی فضا کو نہ سنبھالا گیا[۲۵] تو پھر پوری انسانیت برباد ہونے سے بچ نہیں سکتی ہے کیونکہ ہزاروں سال کے زرعی دور میں حکومت اور مذہبی علماء سوء کے گٹھ جوڑ نے جتنا نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ اس سے کئی گنا نقصان صنعتی دور کے تھوڑے ہی عرصہ میں سائنسی علماء سوء اور حکومت کے گٹھ جوڑ نے پہنچایا ہے۔

REFERENCES

1- Ernst Haeckel 1866, Evolution Of Man. 2 vols

2- H Sahni, M.R. 1952, Man In Evolution. P. 203, fig. B.

3- Ernst Mayor 1942, Systematic and Origin Of Species

4- Khan, E. 1969, Mammaliam palaeontology as a most modern tool for dating the Pleistocene deposits. Ann. Dept. Geol. M. U. Aligarh.

5- Khan, E. 1966, Ovibos pallanti rhenanus non. subsp. Mitt. Bayer Staatsamml. Palaont. hist. Geol., 6, p. 133-142.

6- Sutcliffe, E.F. 1953, A catholic com-mentry on Holy Scripture

7- Gillispie, C.C. 1951, Genesis and Geology. Cambridge.

8- Vernon, H.M. & D. 1909 A history of the Oxford museum. Vol. 59.

9- Newman. J.H. 1913, Apologia pro Vita sua, 353-354.

10- Canon Hedley 1871, Evolution and Faith. Dublin Review.

11- Moore, R.A. 1889, Science and Faith.

12- Wallace, A.R. 1871, On the genesis of species.

13- T.H. Huxley. 1871, Quarterly Review.

14- Huxley, Julian. 1921, Dict. Nat. Biogr.

15- Muller, C.C. 1962, Science and Faith.

16- مولانا ابوالکلام آزاد 1936, ترجمان القرآن جلد دوم - پہلا ایڈیشن صفحہ ۵۴۴ - ۵۴۰

17- " 1964. " " اول دوسرا ایڈیشن صفحہ ۷۷ - ۷۶

18- سید قطب 1967 فی ظلال القرآن جلد ۶ پارہ ۱۸ صفحہ ۱۷

19- " 1967, " جلد ۳ پارہ ۸ صفحہ ۱۴۹

20- مولانا ابوالاعلیٰ مودودی 1967, رسائل و مسائل حصہ چہارم - دہلی صفحہ ۴۰

21- " 1958, تفہیم القرآن جلد دوم دہلی صفحہ ۱۲

22- مولانا سید احمد اکبر آبادی 1970, ماہنامہ زندگی جنوری ۷۰ء صفحہ ۴۲

23- Darwin, C. 1929, Origin of Species, P408, Thinker's Library.

24- Milne, E.A. 1952, Modern cosmology and Christian idea of God.

25- Moody, P.A 1953, Introduction to evolu-tion.

اب تک نظریہ ارتقاء کے خلاف "زندگی" میں جو مضامین شائع ہوئے ہیں یہ مقالہ ان کا جواب نہیں ہے بلکہ خود فاضل مقالہ نگار کی اس مختصر تحریر کی محض توضیح ہے جو زندگی جنوری ۰ ۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ توضیح جیسی کچھ ہے قارئین زندگی کے سامنے ہے۔ اس نظریے کے خلاف زندگی میں جو کچھ شائع ہو چکا ہے ابھی وہی جواب طلب ہے اس لیے انہیں اعتراضات کو دہرانا بے کار ہے۔ البتہ چند ایسی باتیں بہت اختصار کے ساتھ پیش کر رہا ہوں جن کا اس مقالے اور ہماری بحث سے خاص تعلق ہے۔

(۱) فاضل مقالہ نگار نے جو مبہم تمہید لکھی ہے وہ خود ان کے مقالے کے لیے بھی مفید نہیں ہے۔ سب سے پہلے انہیں یہ بتانا چاہیے تھا کہ محکمات کون سی آیتیں ہیں اور متشابہات کون سی ــــــ ان دونوں قسموں کی تعریف و توضیح کیے بغیر ان پر اظہار خیال بے کار ہے۔ قارئین سمجھ نہیں سکیں گے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں

سورۂ آل عمران میں جہاں آیات قرآنی کی دو قسمیں محکمات اور متشابہات بیان کی گئی ہیں وہیں متشابہات کے بارے میں پوری صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ

"جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں۔ حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔" (آیت ۷)

اس سے واضح ہوا کہ متشابہات کی حقیقت و ماہیت تک رسائی انسان کے علم و فہم اور اس کے تجربات کی دسترس سے باہر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ان پر بحث و تمحیص ہمیشہ قابل احتراز رہی ہے چہ جائیکہ ان کے مفہوم کو قابل تبدیلی مانا جائے یا مختلف زمانوں میں ان کی مختلف تشریح کی جائے۔

متشابہات کے بارے میں قرآن کے اس بیان کے بعد موصوف کی تمہید کے سلسلے میں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ "اکثر لوگ" کون ہیں جو متشابہات کو قابل تبدیلی بھی مانتے رہے ہیں اور مختلف زمانوں میں ان کی مختلف تشریح بھی کرتے رہے ہیں۔ راقم الحروف کو ایسے "اکثر لوگوں" کا کوئی علم نہیں ہے۔ سرسید مرحوم نے بھی یہ نہیں لکھا ہے کہ "علم کے اضافے کے ساتھ ساتھ متشابہات کی تشریح بھی بدلتی رہنی چاہیے" یہ مقالہ نگار کی اپنی عبارت ہے۔ دوسرا سوال اس تمہید کے بارے میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ موصوف کے مقالے سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اگر موصوف کے نزدیک تخلیق آدم سے متعلق آیات محکمات میں داخل ہیں تو یقیناً ان کا مفہوم و مدعا معلوم و متعین ہو گا اور وہ قابل تبدیلی بھی نہ ہو گا۔ اور اگر وہ متشابہات میں داخل ہیں تو پھر ان کی کیفیت و

حقیقت دریافت کرنے کے درپے ہونا انہیں لوگوں کا کام ہوسکتا ہے جن کے دل مریض ہیں۔ اسی طرح جو لوگ ارتقاءِ آدم کو قرآن کی آیتوں سے برآمد کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی روش بھی صحیح نہیں ہوسکتی — اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تمہید کا مقالے سے کیا تعلق ہے اور اس سے اس پر کیا روشنی پڑتی ہے۔

(۲) جب موصوف یہ امکان تسلیم کرتے ہیں کہ آئندہ ارتقاءِ آدم بحیثیت نظریہ کے بھی رد کیا جا سکتا ہے تو پھر آج اس کو حقیقت (فیکٹ) بلکہ مسلمہ حقیقت کہنا کس طرح صحیح ہوگا؟ کیا سائنس میں "حقیقت" بھی قابلِ رد ہوا کرتی ہے؟ کوئی نظریہ تو بے شک رد ہوسکتا ہے لیکن حقیقت رد نہیں ہوسکتی۔ ارتقاءِ آدم کے رد کیے جانے کا امکان، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ حقیقت نہیں بلکہ محض ایک نظریہ ہے اور یہ نظریہ بھی جیسا کچھ ہے اس کی حقیقت زندگی کے متعدد شماروں میں ظاہر کی جا چکی ہے۔

(۳) ارتقاءِ آدم کے رد کیے جانے کا امکان و احتمال تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہ متعلقہ آیاتِ قرآنی کی تشریح موجودہ سائنس کی تحقیق کے مطابق کرنی چاہیے اور تخلیقِ مخصوص کے نظریہ پر کھل کر تنقید کرنی چاہیے۔ کوئی معقول بات نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کے یہ معنی ہوں گے کہ جب موصوف کے پسندیدہ سائنس داں کوئی دوسری تحقیق پیش کریں تو آیات کی تشریح بدل کر اسی کے مطابق ہو جانی چاہیے گویا یہ تشریح سائنس دانوں کی تحقیق کے تابع ہوگی کہ جب وہ بدلے تو آیتوں کی تشریح بھی بدل جائے۔ میں اس طرزِ عمل کے مضمرات کی توضیح غیر ضروری سمجھتا ہوں اور حسنِ ظن رکھتا ہوں کہ موصوف نے یہ بات غیر شعوری طور پر لکھ دی ہے۔

(۴) یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ تخلیقِ مخصوص کا نظریہ کچھ قدیم معلومات کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے بلکہ علماء نے ہمیشہ اس سلسلے کی مجموعی آیات ہی سے یہ نظریہ اخذ کیا ہے، نیز یہ کہ تخلیقِ مخصوص کا نظریہ صرف موصوف کے پسندیدہ سائنس دانوں نے رد کیا ہے، تمام سائنس دانوں نے اسے رد نہیں کیا ہے بلکہ محقق سائنس دانوں کے نزدیک ارتقاءِ آدم ابھی بحیثیت نظریہ کے بھی ثابت شدہ نہیں ہے۔

(۵) موصوف نے ارتقاءِ آدم کی حمایت میں چند علماء کے نام پیش کیے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بارے میں فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ترجمان القرآن ہمارے پاس نہیں ہے۔ سید قطب شہیدؒ نے اپنی تفسیر میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ترجمہ محترم نجات اللہ صدیقی نے کر لیا ہے اور وہ آئندہ زندگی میں شائع ہوگا میں اسی وقت اس پر اظہارِ خیال کروں گا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا نام موصوف نے کیوں لیا ہے۔ یہ میں نہیں سمجھ سکا نفسِ ارتقاء کا انکار ہم میں کس نے کیا ہے؟ یہ کون کہتا ہے کہ امیبا، مچھلی، گدھا، گھوڑا، چیونٹی اور

یعنی سب ایک ہی درجے کے جانور ہیں ۔ اور بیک وقت وجود میں آئے ہیں ؟ جب مولانا مودودی بشر کے پہلے فرد کی براہ راست تخلیق کے قائل ہیں تو پھر ارتقاء آدم کی بحث میں ان کا نام کس مقصد سے لیا گیا ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے بارے میں روایت خود فاضل مقالہ نگار ہی کی ہے ۔ علی گڑھ کے سفر میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس مسئلے پر اسلام پسند اساتذہ کے اجتماع کی جو رپورٹ زندگی میں شائع ہوئی ہے وہ ناقص ہے اور غلط فہمی پر مبنی ہے ۔

(بقیہ ارشادات رسول)

پھر عمر بھر آنکھوں کی کسی تکلیف میں مبتلا نہیں ہوئے ۔

جہادِ اسلامی کا مقصد اس حدیث سے اسلامی جہاد کے اصل مقصد پر روشنی پڑتی ہے ۔ اس کا مقصد کسی کے مال و دولت اور جائداد و زمین پر قبضہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لایا جائے اور ان کو جہنم کے عذاب سے بچایا جائے ۔ اگر مال و دولت پر قبضہ کرنا مقصود ہوتا تو عین میدان جنگ میں بھی اسلام قبول کرنے کی دعوت کبھی نہ دی جاتی ۔ کیونکہ فریق مقابل کے مسلمان ہوتے ہی اس کی جان و مال دونوں محفوظ ہو جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ اگر وہ صرف زبان سے بھی ایمان کا اقرار کرے تو اسے یہ حفاظت حاصل ہو جاتی ہے ۔

داعی کا اجر کسی کی دعوت و تبلیغ اور سعی و جہد سے اگر کوئی گمراہ راہ راست پر آ جائے تو اس کے اجر کی تعبیر سرخ اونٹوں سے کی گئی ہے ۔ ابو داؤد نے جو روایت کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں

عن سهل بن سعد عن النبي	سہل بن سعدؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے
صلی اللہ علیہ وسلم قال واللہ لأن	روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا ۔ بخدا تمہاری
يهدى الله بهداك رجلا واحدا	رہنمائی کی وجہ سے، اللہ کسی ایک شخص کو بھی
خير لك من خير النعم	ہدایت دے دے تو یہ تمہارے لیے سرخ اونٹوں
(ابو داؤد ج ۲ کتاب العلم ص ۱۵۹ مطبوعہ مجیدی)	سے بہتر ہے ۔

عہد رسالت میں سرخ اونٹوں کا شمار عرب کے سب سے قیمتی اور نفیس مال میں تھا اسی لیے ان کے کلام میں کسی بہت ہی نفیس قیمتی اور اعلیٰ درجے کی چیز کے لیے سرخ اونٹوں کی مثال دی جاتی تھی ــــــ قرآن و احادیث

میں آخرت کے اجر کا ایک تصور دینے کے لیے دنیوی اشیا کی مثالیں دی گئی ہیں ورنہ حقیقت میں پوری دنیا وہاں کے کم سے کم اجر کی بھی ہم رتبہ نہیں ہے اور نہ وہاں کے کسی اجر کو دنیا کے کسی پیمانے سے ناپا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا متناہی، محدود اور فانی ہے اور آخرت غیر متناہی، لامحدود اور ابدی ہے۔ ظاہر ہے کہ غیر متناہی کو متناہی سے ناپا نہیں جا سکتا۔ اس حدیث میں داعی کے اجر کو سمجھانے کے لیے عرب کی نفیس ترین شے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ کسی کی دعوت و تبلیغ سے کسی دوسرے کے ہدایت یافتہ ہو جانے کا اجر بہت بڑا ہے اور جب وہاں کے چھوٹے اجر کو ناپ تول نہیں سکتے تو بڑے اجر کو ناپنے تولنے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ دعوت و تبلیغ کے کثیر و کبیر اجر کی ایک بڑی وجہ ذیل کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من دعا الی ھدی کان لہ من الاجر مثل اجور من یتبعہ لا ینقص ذالک من اجورھم شیئا (مسلم)

حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص کسی ہدایت کی طرف دعوت دیتا ہے اس کو ان لوگوں کے مثل اجر ملتا ہے جو اس ہدایت پر عمل کرتے ہیں اور ان عمل کرنے والوں کے اجر میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔

یہی بات ایک دوسری حدیث میں اس طرح کہی گئی ہے۔

عن ابی مسعود البدری قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من دل علی خیر فلہ مثل اجر فاعلہ (مسلم)

ابومسعود بدریؓ کہتے ہیں جو شخص کسی خیر کی طرف رہنمائی کرتا ہے اس کو اس خیر پر عمل کرنے والے کی طرح اجر ملتا ہے۔

یہ دونوں حدیثیں امام ترمذی نے بھی ابواب العلم میں روایت کی ہیں۔

بہت بڑی ترغیب و تحریک

ان دونوں حدیثوں سے معلوم ہوا کہ اگر کسی مسلم کی سعی سے کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرے تو اسلام کا داعی اس نومسلم کے ایمان و اسلام، اس کی نماز، اس کے روزوں، اس کی زکوٰۃ، اس کے حج، اس کی تلاوت قرآن، اس کے ذکر و تسبیح و استغفار اور اس کے ہر اس عمل خیر کے اجر میں برابر کا شریک ہو جائے گا جو وہ زندگی بھر کرتا ہے جبکہ عمل کرنے والے کے اجر میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی بلکہ داعی کو اللہ تعالےٰ اپنے خزانۂ فضل و کرم سے اجر عطا کرے گا۔ یہ اتنی بڑی بشارت و سعادت

ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہر اس مسلمان کو اٹھ کھڑا ہونا چاہیے جو دوسروں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اگر خوش نصیبی سے دو چار افراد اسلام قبول کرلیں تو داعی کے اجر کا حساب لگانا بھی مشکل ہوگا۔

بعد موت بھی اجر کا تسلسل عمل خیر اور حصول اجر کا سلسلہ موت کے بعد بند ہوجاتا ہے لیکن کچھ اعمال ایسے ہیں کہ ان کے اجر کا سلسلہ موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ ان اعمال میں سب سے اہم اور بڑے اجر والا عمل، دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت ہے۔ ذیل کی حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے۔

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان مما یلحق المومن من عملہ وحسناتہ بعد موتہ علماً علمہ ونشرہ	حضرت ابوہریرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا مومن کے ان اعمال حسنات میں جن کا اجر موت کے بعد بھی اس کو ملتا ہے وہ علم ہے جس کی اس نے تعلیم دی اور جس کو اس نے پھیلایا۔
(ترغیب و ترہیب مطبوعہ ہند صفحہ ۳۹ بحوالہ ابن ماجہ وغیرہ)	

قرآن و حدیث میں علم سے مراد شرعی و دینی علوم ہیں اور ان علوم کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت میں سب سے اہم اور بنیادی تعلیم اسلام کی تعلیم اور اس کی نشر و اشاعت ہے۔

(بقیہ اشارات)

ہندو مذہب کے نام پر اور مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو اشتعال دلا کر ان کے ووٹ حاصل نہیں کرسکیں گے اور ہندوستان پر ان کی پارٹی کی حکومت کا خواب شرمندۂ تعبیر ہی رہے گا۔ انہیں مسلمانوں کی خاطر نہیں بلکہ خود اپنے لیے اور اس ملک کی خاطر جس کی محبت کا وہ دعوے کرتے ہیں، اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔ ۱۳ را پریل سنہ

(بقیہ دعا) کے اس قول پر ختم کرتا ہوں۔ انھوں نے فرمایا۔

"میرے لیے دعا کی عدم مقبولیت سے زیادہ سخت بات یہ ہوگی کہ میں دعا ہی سے محروم ہوجاؤں۔"

(رسالہ قشیریہ)

اسرائیل کی تعمیر میں

اشتراکی ممالک کا کردار

تالیف ڈاکٹر ابراہیم الشریفی

(ترجمہ :- جناب خلیل احمد حامدی)

(۲)

یہودیوں کی آباد کاری کے لیے اکثر سرمایہ کمیونسٹ ممالک نے فراہم کیا

اس معاملے میں برطانوی سامراج اور اشتراکیت کے درمیان ملی بھگت کا عجیب منظر ہمارے سامنے آتا ہے برطانوی حکام نے دورانتداب میں فلسطین کے دروازے یہودیوں کے لیے چوپٹ کھول کر صیہونی تنظیموں کو یہ ہمت دلادی کہ وہ یورپ کے یہودیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں لاکر فلسطین میں آباد کریں اور ان زمینوں کا انہیں مالک بناتے جائیں جو یہودی ایجنسی انتداب کی مدد سے حاصل کر رہی تھی یا عرب باشندوں کو بھاری قیمتوں کا لالچ دے کر ان سے خرید رہی تھی۔ دوسری طرف اگر ہم ان اعلامیوں کو دیکھیں جو پیرس زیورچ اور امسٹرڈیم میں دوسری جنگ عظیم سے پہلے یہودی اداروں کی طرف سے جاری کیے گئے تھے اور پروفیسر ناندا کی مشہور کتاب "ارض موعود" کی طرف (مطبوعہ پراگ ۱۹۳۷ء) اور رابانڈ شینرر کی تالیف "اسٹالن سے وائس مین تک" (مطبوعہ پیرس ۱۹۳۹ء) کا مطالعہ کریں تو ہمیں بآسانی معلوم ہو جائے گا کہ وہ بھاری بھرکم سرمایہ جو فلسطین کے اندر یہودیوں کے قدم جمانے، ان کے لیے زمینیں خریدنے، کالونیاں قائم کرنے اور مثالی بستیاں آباد کرنے کے لیے ۱۹۳۹ء تک مختلف ممالک سے فراہم کیا گیا۔ اس کا ملک وار تناسب یہ تھا۔

سوویت یونین سے	۴۰ فی صد	مشرقی یورپ سے	۸۲۴ فی صد۔
مغربی یورپ سے	۱۶ فی صد	متحدہ امریکہ سے	۱۹ فی صد

لاطینی امریکہ سے ۴ فی صد

برطانوی انتداب کے دور میں عربوں کی مجاہدانہ کوشش

اس مرحلے میں صیہونی سیلاب کو روکنے کے لیے عربوں کی طرف سے غیر معمولی مخالفت کی گئی۔ انھوں نے ظالمانہ استعماری سیاست کا بھرپور مقابلہ کیا، اور صیہونی منصوبوں کا سامنا کیا۔ اس دور میں عربوں کی تحریک مقاومت ایمان اور جہاد اسلامی کی روح سے لبریز تھی اور الحاج امین الحسینی مفتی اعظم فلسطین کی قیادت میں کام کر رہی تھی۔ اس مرحلے میں عربوں کی طرف سے تین مرتبہ انقلابی کوششیں عمل میں آئیں۔ ایک سنہ ۱۹۲۰ء میں دوسری ۱۹۲۹ء میں اور تیسری جو فلسطین کی "بغاوت عظمیٰ" کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۶ء میں۔

برطانیہ کا قرطاس ابیض

یہ بات قابل ذکر ہے کہ میونخ کانفرنس کے بعد جو ۱۹۳۸ء میں عالمی امن کی بحالی کی خاطر ہٹلر کے ساتھ اختلافات رفع کرنے کے سلسلے میں منعقد کی گئی تھی۔ برطانیہ اور فرانس دونوں نے ملی بھگت کر کے مشرق وسطیٰ سے متعلق نیا منصوبہ وضع کیا اور اپنی سابقہ پالیسی کے اندر بنیادی تبدیلیاں طے کیں۔ ان نئی تبدیلیوں کی وجہ دو بنیادی امور تھے۔

اولاً: برطانیہ اور فرانس کے سربراہوں (چیمبرلین اور ڈالا ڈے) کو یقین ہو گیا کہ ہٹلر کسی حد پر رکنے والا نہیں ہے اور دوسری جنگ لامحالہ چھڑ کر رہے گی۔

ثانیاً: دونوں نے محسوس کیا کہ مشرق عربی کی شورشیں اور اضطرابات اس وقت تک اطمینان بخش حالات میں تبدیل نہیں ہو سکتیں جب تک عرب اقوام کی خواہشات کے تحت ان حالات کی اصلاح نہیں کی جاتی۔

چنانچہ حکومت برطانیہ نے اس فیصلے کے بعد بلا تاخیر ۱۹۳۹ء میں قرطاس ابیض شائع کر دیا اور فلسطین کے بارے میں اپنی نئی سیاست کی یہ بنیادیں وضع کیں۔

۱۔ برطانیہ اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ دس سال کے اندر اندر "فلسطینی ریاست" قائم کی جائے۔

۲۔ عوامی انتخاب کی بنیاد پر ایک مجلس قانون ساز کی تشکیل کی جائے گی۔

۳۔ مخصوص علاقوں کے اندر یہودیوں کے ہاتھ زمینوں کی فروخت ممنوع ہو گی۔ یہ علاقے فلسطین کے مختلف حصوں میں نشان زد کر دیے گئے ہیں۔

۴۔ یہودی ہجرت کی تحدید (یعنی فلسطین میں داخل ہونے والے یہودی مہاجروں کی سالانہ تعداد معین کر کے

جائے گی)

قرطاس ابیض کی منسوخی

عربوں نے ابتداءً اس قرطاس ابیض کی اسکیم کو قبول کرنا چاہا۔ مگر حکومت برطانیہ نے اس کے نفاذ کو حالات کی مناسبت کے ساتھ مشروط کر دیا۔ چنانچہ اس شرط نے اور یہودی ہجرت کی تحدید کے فقرے نے عربوں کی نگاہ میں برطانوی حکام کی نیتوں اور جدید برطانوی سیاست کو مشکوک کر دیا۔ آخر کار عربوں نے پہلے قرطاس ابیض کو مسترد کر دینے کا فیصلہ کیا اور پھر اس کو تسلیم کر کے اس کی تنفیذ کا مطالبہ کیا۔ یہودی حلقوں کے اندر قرطاس ابیض سے کھلبلی مچ گئی لیکن ان کی یہ کھلبلی بہت جلد اطمینان میں تبدیل ہو گئی۔ جب انہیں یہ خوش خبری مل کہ قرطاس ابیض ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا گیا ہے[1]

اس پوری تاریخ کے بطن میں کچھ ایسے حقائق موجود ہیں جو عام نگاہوں سے اوجھل ہیں اور جنہیں ایسے خفیہ ہاتھ نے مستور کر رکھا ہے جس کے پیچھے ایک ایسی چھڑی کام کر رہی ہے جو حالات سے ہر وقت ناجائز استفادہ کرتی رہی ہے اور انہیں اپنی منشا کے مطابق ڈھالتی رہی ہے۔ ان حقائق کو سمجھنے کے لیے ذرا پس پردہ جھانک کر دیکھنا چاہیے۔

روس کی صدارتی کونسل میں یہودی اثرات

آج ہم جن واقعات سے دوچار ہیں۔ ان کا سلسلہ ماضی کے واقعات و حالات سے مرتبط ہے۔ لہٰذا ہمیں جمعیت اقوام کے گزشتہ ریکارڈ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ کیونکہ یہی ریکارڈ قضیۂ فلسطین کی تاریخ کے دوسرے اور تیسرے باب کو مکمل کرتا ہے۔ اس کا پہلا باب ان بین الاقوامی سازشوں پر مشتمل ہے۔ جن کے ہیرو صیہونی سرمایہ دار اور وہ یہودی کمیونسٹ اور انقلاب پسند تھے۔ جنہوں نے روس کے اندر کمیونسٹ اسٹیٹ کی تاسیس کی۔ امید ہے کہ یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہوگی کہ لینن کے عہد میں صدارتی مجلس کی اکثریت یہودی ممبروں پر مشتمل تھی۔ سٹالن کے دور میں خود اسٹالن اور مولوٹوف اور فوروشیلوف کے ماسوا اس مجلس کے باقی تمام ارکان یہودی تھے۔ خروشیف سے ہوتے ہوئے کوسیجن کے حالیہ عہد تک مجلس کے نصف ارکان یا تو خالصۃً یہودی ہیں یا یہودی الاصل ہیں۔ بلکہ مشرقی یورپ کے جن ممالک میں اشتراکی نظام قائم کیا گیا ہے وہاں کی مشاورتی کونسلوں اور انتظامی مجالس کے اندر یہودی اشتراکیوں کا غلبہ ہے۔ رومانیہ، بلغاریہ، یوگوسلاویہ، ہنگری، پولینڈ، چیکوسلواکیہ کے اندر

---

[1] ملاحظہ ہو حایم وائزمین کی ڈائری (لندن اور یہودی ایجنسی کی خفیہ مراسلت)

یہودیوں کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے جو کلیدی اسامیوں پر قابض ہے۔

فلسطین کی تقسیم اور اسرائیل کی تاسیس سے پہلے کے مرحلے میں جو بات زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس زمانے میں فلسطین برطانوی انتداب کے تحت تھا اور یہودی مار دھاڑ کر کے اسے اپنے قبضے میں لانے کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت انھوں نے باقاعدہ فوجی یونٹ بنا لیے تھے۔ ان یونٹوں میں اکثریت جن یہودیوں کی تھی وہ روس، یوگوسلاویہ، پولینڈ کے مہاجر تھے جو فلسطین میں آباد کیے گئے تھے۔ اور بیشتر تعداد ان لوگوں کی بھی تھی جو اس یہودی بٹالین میں رہ چکے تھے جس نے برطانوی فوج کے دوش بدوش العالمین اور صحرائے لیبیا کی جنگ میں جرمن اور اطالوی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ اسی یہودی بٹالین کے افسروں میں سے ایک موشے دایان اور دوسرا اسحاق رابین تھا۔ اول الذکر آج اسرائیل کا وزیر جنگ ہے اور ثانی الذکر افواج کا کمانڈر انچیف ہے۔

(باقی آئندہ)

پاکستان میں الکشن کی مہم

مسٹر بھٹو کی پی پلز پارٹی میں زیادہ تر پاکستان کے ناپسندیدہ عناصر اکٹھا ہو گئے ہیں ہفتہ وار مشرق لندن ۹ مئی کے شمارے میں یہ خبر شائع ہوئی:-

> پی پلز پارٹی کے سکریٹری جنرل مسٹر جے اے رحیم قرآن مجید کو فرسودہ کتاب سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں ان کی جماعت کے لیے اسلام کے ایسے اصول ہرگز قابل قبول نہیں ہو سکتے جو سوشلزم سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس بات کا انکشاف میجر اسلم جان نے کیا جو حال ہی میں اس پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں اشتراکی عناصر پوری کوشش کر رہے ہیں کہ انتخابات منعقد ہی نہ ہوں، وہ تشدد اختیار کر کے ملک میں افراتفری پھیلانے کے لیے سرگرم ہیں۔ ان کے مقابلے میں اسلام پسند پارٹیاں کوشش کر رہی ہیں کہ ہر قیمت پر انتخابات منعقد ہوں۔ اپریل کے دوسرے ہفتے میں جماعت اسلامی پاکستان کے نائب امیر میاں طفیل محمد صاحب صوبہ سندھ کا ایک ہفتہ کا دورہ مکمل کر کے لاہور واپس آئے۔ انھوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ ان کے اجتماعات میں ہر جگہ چالیس فی صد سے زیادہ نوجوان شریک ہوتے رہے۔ اور پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ۸۵ فی صد کے لگ بھگ تھی۔ اس طرح معاشرے کے باشعور طبقے نے پوری توجہ اور یکسوئی سے ان کی بات سنی۔

میاں صاحب نے سندھ میں جماعت اسلامی کی انتخابی پوزیشن کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ سندھ میں نظم اور کام کے لحاظ سے جماعت اسلامی ایک نمایاں پوزیشن کی حامل ہے۔ یہ غریب عوام کی جماعت ہے اس میں دیانت امانت صلاحیت کار اور اسلام سے والہانہ لگاؤ رکھنے والے افراد ہزاروں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور یہی ہمارا سرمایہ ہیں۔
(ایشیا لاہور)

تفہیم القرآن

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- ★ دور حاضر کے استدلالی ذہن کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرنے۔
- ★ مغربی افکار سے مرعوبیت کو دور کرنے۔
- ★ قرآن کی مرکزی دعوت اور تمام اہم مسائل حیات سے اس کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے۔
- ★ اسلام کے جامع نظام حیات کی طرف بصیرت افروز رہنمائی کرنے۔
- ★ قرآن کی انقلابی دعوت کو دل نشیں انداز میں پیش کرنے کے لئے۔

جلد اول

الفاتحہ ... ... الانعام

ہدیہ مع جلد 12/- روپیہ

جلد دوئم

اعراف ... ... بنی اسرائیل

ہدیہ مع جلد 15/- روپے

جلد سوئم

کہف ... ... روم

ہدیہ مع جلد 17/- روپے

جلد چہارم

لقمان ... ... الاحقاف

ہدیہ مع جلد 16/- روپیہ

ملنے کا پتہ —

منیجر مکتبہ زندگی و کانتی۔ رامپور۔ یو۔ پی

Monthly 'ZINDGI' Rampur, June 1970, Regd. No.L-688

تاریخ ابن خلدون

حصہ ششم — غزنوی اور غوری سلاطین

سلطان محمود غزنوی اور ہندوستان میں پہلی سلطنت کے بانی شہاب الدین غوری کی فتوحات کے مستند حالات—

صفحات ۵۶۸ —قیمت صرف ۱۵ روپیے

حصہ ہفتم — سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین اور فتنۂ تاتار—

سلجوقی اور خوارزم شاہی خانوادوں کے حالات و کوائف' خانہ جنگیوں' عیسائیوں کا مقابلہ' قفار کوچ اور قبچاق کی جد و جہد' ترکوں کی یورش' تاجداران سلجوقیہ اور سلوک خوارزم کی مدافعانہ کوششیں' چنگیز خاں کا خروج' تاتاریوں کا عالمگیر طوفان— ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی کی عبرتناک داستان—

قیمت صرف ۱۲ روپیے

ملنے کا پتہ—

مکتبہ زندگی و کانتی - رامپور - یو - پی

Only Title Printed at Shanker Press, Rampur

اقامتِ دین کا داعی

سالانہ دس روپے
فی پرچہ ایک روپیہ

ماہنامہ

مدیر: سید احمد قادری

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۰۰—/۱۵
پاکستان سے ۰۰—/۱۵
ششماہی
ہندوستان سے ۰۰—/۵
پاکستان سے ۰۰—/۵
قیمت فی پرچہ ایک روپیہ

سالانہ چندہ
غیر ممالک سے
دو ڈالر
ہوائی ڈاک سے

جلد:- ۴۹ | جمادی الاولیٰ ۹۲ھ مطابق جولائی ۷۲ء | شمارہ:- ۱

اس دائرہ ○ سرخ نشان کا مطلب ہے

کہ آپ کی مدت خریداری اس شمارے کے ساتھ ختم ہو رہی ہے۔ براہ کرم آئندہ کے لیے چندہ ارسال کریں یا خریداری کا ارادہ نہ ہو تو مطلع فرمائیں۔ اگر آپ کی طرف سے چندہ یا رسالہ بند کرنے کے لیے خط نہ مل سکا تو اگلا پرچہ ان شاء اللہ وی پی سے حاضر ہوگا۔ امید ہے کہ وی پی وقت پر وصول فرمائیں گے۔ منیجر "زندگی" رامپور

مالک جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر سید احمد قادری۔ پرنٹر پبلشر احمد حسن۔ مطبع ناظمہ پریس بانار نصر اللہ خاں رامپور۔
مقام اشاعت۔ دفتر زندگی رام پور۔ یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

مکّہ اور اس کے آس پاس کا ماحول[1]

مکّے میں اسلامی تحریک نے جو کارنامہ انجام دیا تھا اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے مکّہ اور اس کے ارد گرد کے ماحول کو سمجھنا ضروری ہے۔ ماحول کو سمجھنے سے مراد یہ ہے کہ عہد جاہلیت کے عقائد و اعمال کا مطالعہ کیا جائے اور اس دور کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، تمدنی اور اخلاقی حالات پر گہری نظر ڈالی جائے۔ یہ مطالعہ ہمیں بتائے گا کہ اس زمانے میں نہ صرف مکّہ، نہ صرف جزیرۃ العرب اور اس کے ہم سرحد ملکوں میں بلکہ دنیا بھر میں کفر و شرک کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ انسانیت کی کوئی کل سیدھی نہیں رہی تھی اور وہ ظلم و استبداد کے شکنجے میں کسی ہوئی کراہ رہی تھی۔ طاقتور لوگ کمزوروں پر مسلط تھے اور کوئی امید نہ رہی تھی کہ انسانی مساوات کا بجھا ہوا چراغ پھر روشن ہو سکے گا۔ انسانی اخوت و مرحمت و مواسات کی فضا پھر کبھی پیدا ہو سکے گی اور حق و انصاف کا نظام پھر کبھی برپا ہو سکے گا۔ امانت و دیانت اس طرح رخصت ہو چکی تھی کہ اس وقت کسی شخص کا "امین" ہونا معجزے سے کم نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انسان کے ہاتھ سے توحید کا رشتہ چھوٹ گیا تھا اور شترِ بے مہار کی طرح زندگی بسر کر رہا تھا۔ آخرت کو وہ بھول چکا تھا اور یہی دنیا اس کی زندگی کا مقصود بن گئی تھی۔ جس اعلیٰ مقصد کے لیے وہ دنیا میں بھیجا گیا تھا وہ اس کے ذہن و دماغ سے اس طرح گم ہو گیا تھا کہ اس کا کوئی دھندلا

---

[1] یہ مقالہ نوجوانوں کے ایک اجتماع کے لیے لکھا گیا تھا۔

تصور بھی باقی نہ رہا تھا۔ دنیا پرستی اس کے رگ ریشے میں پیوست ہو گئی تھی۔ انسان ایک طرف اپنے ہی ہم جنس دوسرے انسانوں کی غلامی میں گرفتار تھا اور دوسری طرف بت پرستی اور اوہام پرستی کے جال میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ خدا کا منکر نہ تھا لیکن اس نے خدا کی ذات و صفات اور اس کے مخصوص حقوق میں بے شمار چیزوں کو شریک قرار دے رکھا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کو دو بڑے خانوں میں بانٹ دیا تھا۔ ایک خانہ دنیوی اور مادی زندگی کا تھا اور دوسرا روحانی اور مذہبی زندگی کا۔ اس کے مادی خانے پر قوم کے سردار اور طاقتور افراد مسلط تھے اور مذہبی خانے کو اس نے بزعم خویش بتوں، جنوں، فرشتوں اور گذرے ہوئے انسانوں کی روحوں کے حوالے کر دیا تھا۔

سیاسی ماحول

مکہ کا سیاسی ماحول یہ تھا کہ وہاں قبیلہ قریش کی مختلف شاخوں کی چھوٹی سی شہری مملکت قائم تھی اور انھوں نے اہم امور میں مشورے اور فیصلے کے لیے اپنی ایک چھوٹی سی پارلیمنٹ "دارالندوہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ جزیرۃ العرب میں حجاز کا علاقہ کسی بیرونی طاقت کا محکوم نہ تھا لیکن اس کے جو علاقے ایران و شام سے قریب تھے وہ ایرانی اور رومی حکومتوں کے محکوم ہو گئے تھے اور وہی علاقے سرسبز و شاداب اور تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ترقی یافتہ تھے۔ انہیں علاقوں میں عربوں کی بڑی بڑی حکومتیں قائم رہی تھیں لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت ان علاقوں کے امراء و رؤساء پرشین و رومن امپائر کے تحت زندگی بسر کر رہے تھے۔

معاشی ماحول

مکہ ایک بنجر علاقہ تھا جسے خود قرآن نے وادی غیر ذی زرع (بے آب و گیاہ وادی) کہا ہے۔ (ابراہیم : ۳۷) قریش کا ذریعۂ معاش یا تو تجارت تھا یا وہ نذرانے جو حج کے موقع پر یا دوسرے مواقع پر تمام عرب قبیلوں سے انہیں ملتے تھے۔ عام طور پر فقر و افلاس کا عالم یہ تھا کہ بعض افراد قتل اولاد تک کا جرم کر گزرتے تھے۔

مذہبی ماحول

مکہ کا مذہبی ماحول یہ تھا کہ شرک چھایا ہوا تھا اور ان کی بت پرستی اس حد کو پہنچ گئی تھی کہ انھوں نے کعبہ میں جو توحید کا مرکز تھا۔ ۳۶۰ بت جا رکھے تھے۔ ان کے گھروں میں جو بت تھے وہ الگ تھے —

جزیرۃ العرب میں شرک کی تمام قسمیں موجود تھیں۔ یمن کا قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا تھا۔ قبیلہ کنانہ چاند کا پجاری تھا۔ بنو تمیم دبران (ایک ستارے کا نام) کو اپنا معبود سمجھتے تھے۔ قیس، اسد، لخم اور جذام کے قبیلے بالترتیب، شعریٰ (ایک ستارے کا نام جس کا ذکر سورۃ النجم میں ہے) عطارد اور مشتری کو پوجتے تھے۔ عرب کے لوگ انوا (نجھتر) کو بارش وغیرہ کے لیے موثر حقیقی سمجھتے تھے۔ قریش کا سب سے بڑا بت ہبل تھا جس کو انھوں نے کعبہ کی چھت پر نصب کیا تھا اور لڑائیوں میں اسی کی جے پکارتے تھے۔ اس کے بعد لات اور عزیٰ کا درجہ تھا۔ ان کی اوہام پرستی نے کاہنوں، منجموں، تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کا روبار کرنے والوں کا ایک گروہ پیدا کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اوہام پر وہ بطور خود بھی عمل کرتے تھے مثلاً:۔

۱۔ اگر کوئی شخص سفر کے لیے گھر سے نکلے اور پھر پلٹ کر پیچھے دیکھے تو اس کا سفر تمام نہ ہوگا۔

۲۔ اگر کوئی شخص خرگوش کا ٹخنہ گلے میں لٹکائے تو اس پر سحر کا اثر نہ ہوگا اور نہ اس کو کسی کی نظر لگے گی۔

۳۔ اگر کسی ایسے گاؤں کے پاس پہنچ گیا جس میں کوئی وبا ہے تو اس کے دروازے کے پاس کھڑا ہو کر گدھے کی طرح آواز نکالے تب اس میں داخل ہو ایسا کرنے سے وبا کا اثر اس پر نہیں ہوگا

۴۔ اگر کوئی شخص راستہ بھول جائے تو اپنے کپڑے الٹ پلٹ کرلے، راستہ مل جائے گا۔

۵۔ جب کوئی عرب سفر کرتا تھا تو کسی درخت کی شاخ میں گرہ لگا دیتا تھا۔ جب سفر سے واپس آتا تو وہاں جا کر اس شاخ کو دیکھتا اگر گرہ کھلی ہوئی پائی جاتی تو کہتا کہ میری بیوی نے خیانت کی ہے اور اگر گرہ اپنی جگہ ہوتی تو کہتا کہ میری بیوی محفوظ رہی۔

۶۔ گائیں جب پانی پینا چھوڑ دیتی تھیں تو وہ بیلوں کو پیٹتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جن بیلوں پر سوار ہو جاتے ہیں اور وہی گایوں کو پانی پینے سے روکتے ہیں۔

۷۔ ان کا خیال تھا کہ جب کسی کو قتل کر دیا جاتا ہے تو اس کے سر سے ایک الو نکلتا ہے اور اس کی قبر پر اس وقت تک اسقونی، اسقونی (مجھے سیراب کرو، مجھے سیراب کرو) چیختا رہتا ہے جب تک مقتول کا انتقام نہ لیا جائے۔

یہ ان کی اوہام پرستی میں سے چند چیزیں ذکر کی گئی ہیں ورنہ ان کی زندگی کے بکثرت اعمال و

افعال میں اس طرح کی اوہام پرستی کا ثبوت ملتا ہے مثلاً انھوں نے سات تیر بنائے تھے اور ہر تیر پر کوئی بات لکھ دی تھی اور ضرورت کے وقت انہیں پانسوں کی طرح پھینک کر احکام حاصل کرتے تھے جیسے کسی تیر پر نَعَمْ (ہاں) لکھا ہوتا تھا اور کسی پر لَا (نہیں) کہیں سفر کرنا ہے تو پانسے پھینکے اگر "نعم" والا تیر نکلا تو سفر کیا اور لا والا تیر نکل آیا تو سفر ملتوی کر دیا۔

معاشرتی و تمدنی ماحول

نسل و نسب پر بے حد غرور کی وجہ سے انسانی مساوات کا تصور ہی ختم ہو گیا تھا۔ ننگ و عار کے احمقانہ تصورات نے ان میں سے بہت سے لوگوں کو اتنا بے رحم اور سنگ دل بنا دیا تھا کہ اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے تاکہ کسی کو داماد بنانے کا ننگ گوارا نہ کرنا پڑے۔ عورتوں کی ذلت و رسوائی اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کی بیویاں سوتیلے بیٹوں کے درمیان جائداد منقولہ کی طرح تقسیم ہو جاتی تھیں اور ان میں سے بعض اپنی سوتیلی ماں سے نکاح بھی کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ انھوں نے نکاح کی ایسی قسمیں بھی رائج کر رکھی تھیں جن کو بدکاری کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ان کے معاشرے میں یہ بات بھی جائز سمجھی جاتی تھی کہ جس طرح جانوروں سے اچھی نسل حاصل کرنے کے لیے کسی اچھی نسل کے نر سے جفتی کرائی جاتی ہے اسی طرح کوئی دیّوث اپنی بیوی کو اعلیٰ نسل کے کسی شخص کے پاس بچہ حاصل کرنے کے لیے بھیجتا تھا اور اس وقت تک خود اس سے مباشرت نہیں کرتا تھا جب تک اس سے حمل قرار نہ پا جائے۔

نکاح کی کوئی حد مقرر نہ تھی، نہ طلاق کی۔ ایک شخص دس عورتوں سے نکاح کر سکتا تھا اور جب کسی بیوی سے ناراض ہو جاتا تو اسے طلاق دے کر رجوع کر لیتا اور مسلسل یہی کرتا رہتا وہ اس عورت سے نہ خود تعلق قائم کرتا اور نہ اسے آزاد کرتا کہ وہ کسی اور سے نکاح کر سکے غلامی کا رواج عام تھا اور غلاموں سے برتاؤ جانوروں سے بھی بدتر تھا۔

اخلاقی ماحول

شراب خواری، قمار بازی اور زنا کاری عام تھی، بے حیائی کا حال یہ تھا کہ عورتیں بھی ننگی ہو کر کعبہ کا طواف کرتی تھیں۔ عورتوں اور یتیم بچوں پر ظلم کرنے اور طاقت ور لوگ کمزور حق داروں کو محروم کر کے ان کی میراث خود ہڑپ کر لیتے۔ لوٹ مار قتل اور رہزنی کی وجہ سے جزیرۃ العرب درندوں کا مسکن بن گیا

بن گیا تھا۔ جنگ کے موقع پر قیدیوں کو زندہ جلا دیتے۔ عورتوں کے پیٹ پھاڑ ڈالتے۔ یہاں تک کہ معصوم بچوں کو قتل کر دیتے۔ بیرونی تاجروں سے بدمعاملگی کرتے اور ان کا مال ہڑپ کر لیتے۔ ابوجہل بھی جو قریش کا بہت بڑا سردار تھا اس جرم کے ارتکاب سے نہ شرماتا۔ ابولہب جو قریش کا ایک دوسرا بڑا سردار تھا کعبہ کے محفوظ مال میں چوری کرتا۔ غرض یہ کہ معاشرے کو بگاڑنے والی ہر طرح کی بداخلاقی رائج تھی۔

عرب کی خوبیاں

ان حد سے بڑھی ہوئی برائیوں کے ساتھ ساتھ قبیلہ قریش میں بالخصوص اور حجاز کے دوسرے قبائل میں بالعموم چند ایسی خوبیاں بھی تھیں جنہیں نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہے۔ ان کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ غلامانہ ذہنیت اور اس سے بنے ہوئے ذلیل کردار سے ناآشنا تھے۔ انھوں نے ہمیشہ آزاد فضا میں سانس لی تھی اور کسی بیرونی طاقت کی غلامی و محکومی برداشت نہیں کی تھی۔ وہ مغلوبیت اور محکومیت سے نفرت کرتے اور آزادی کے دل دادہ تھے۔ ان کے حاکم خود انہیں کے اپنے سرداران قبائل تھے یا وہ اپنے آپ حاکم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی حمیت و غیرت، شجاعت و سخاوت، جرأت، اقدام اور خطرات کے مقابلے میں ثبات اور حلم و ہمت کی اچھی صفات پوری طرح ان کے اندر موجود تھیں وہ مہمان نواز بھی تھے اور ان کی عزت کو اپنی عزت سمجھتے تھے۔ اگر ان کے مہمان پر کوئی ٹیڑھی نگاہ ڈالتا تو وہ اس کی حفاظت کرتے اور اپنی جان پر کھیل جاتے تھے۔ ذہین اور صاحب فہم تھے۔ خدا کے قائل تھے اور اسی کو مدبر کائنات مانتے تھے۔ کڑے وقت اور مشکل اوقات میں اس سے دعا بھی مانگتے تھے۔ کعبے کا طواف کرتے اور موسم حج میں حج بھی ادا کرتے۔ وہ برائیوں میں لت پت تھے لیکن نیکی اور بدی کے فرق سے ناواقف نہ تھے۔ ظالم اور خوں خوار تھے لیکن ظلم کو عدل اور بہیمیت کو انسانیت قرار نہیں دیتے تھے۔ ان میں گنے چنے ایسے افراد بھی موجود تھے۔ جو شرک و کفر و معصیت اور گندگی و بداخلاقی سے نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ حالات بدلیں اور عرب کے لوگ اصل ملت ابراہیمی کی طرف پلٹیں۔ شاید اسی تلاش حق کی بنا پر عرب کے متعدد قبیلوں نے نصرانیت یا یہودیت اختیار کر لی تھی۔ خود مکہ میں قریش کے بعض افراد نے عیسائیت اختیار کر لی تھی اور توریت و انجیل کے علم میں بہت اونچا درجہ حاصل کر لیا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل، اپنے آخری نبی و رسول کی بعثت اور اپنی آخری کتاب کے نزول کے لیے اسی قوم کو منتخب فرمایا۔ یہ ماحول تھا کہ کوہ فاران کی چوٹی سے وحی الٰہی کا نور چمکا اور سیدنا محمد آفتاب ہدایت بنکر وادی بطحا میں اترے صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وبارک وسلم

مکے میں تحریک اسلامی کی سب سے پہلی مہم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جن اخلاق حسنہ سے آراستگی اور جن اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے پیدا کیا اور انسان سے اس کے جو مطالبات ہیں ان کی بجا آوری کے لیے سب سے پہلی ضروری چیز یہ ہے کہ انسان کے دل و دماغ کو کفر و شرک و معصیت کی آلودگی سے پاک کیا جائے۔ اسے انسانوں کی غلامی، اپنے نفس کی بندگی اور اوہام کے پھندوں سے آزاد کیا جائے اور اس کے دل و دماغ میں یہ حقیقت پیوست کی جائے کہ دنیا کی زندگی ایک آزمائشی اور عارضی زندگی ہے۔ جس طرح اسے اس کا یقین ہے کہ موت برحق ہے اسی طرح اسے یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی چاہیے کہ موت کے بعد کی زندگی بھی برحق ہے۔ وہی زندگی ابدی ہے اور آخرت کی کامیابی ہی اصل کامیابی ہے۔

قرآن کا مطالعہ اور مکے کی اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے یہی مہم چلائی۔ انھوں نے انسان پر انسان کی خدائی ختم کرنے اور اسے سب طرف سے کاٹ کر خدا کے ساتھ جوڑ دینے کی جد و جہد شروع کی۔ توحید کا صاف ستھرا اور مکمل تصور پیش کیا۔ خدا کی کامل بندگی اور اپنی مکمل اطاعت کا مطالبہ ان کے سامنے رکھا اور آخرت کے آرام و آلام کو نوع بنوع انداز میں اس طرح پیش کیا جیسے قیامت اور آخرت آنکھوں کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

اس نظریاتی اور اساسی مہم کے ساتھ ساتھ دوسری مہم جو آپ نے چلائی وہ برے اخلاق سے پاکی، اچھے اخلاق سے آراستگی، مرحمت و مواسات، کمزوروں اور مظلوموں کی دست گیری و چارہ سازی کی مہم تھی۔

مخالفت کا آغاز

ابن ہشام نے اپنی سیرت میں لکھا ہے کہ مشرکین مکہ کے مخالفت کا آغاز اس وقت کیا جب آپ نے ان کے معبودان باطل پر تنقید شروع کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ معبودان باطل پر تنقید حق کے فروغ اور

اس کی اشاعت میں کوئی مضر یا غیر ضروری طرزِ عمل ہوتا تو قرآن کا سکھایا ہوا طریقۂ تبلیغ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ اس سے خالی ہوتا۔ یہ بات بھی ثابت ہے کہ آپ کی تنقید گالی ہرگز نہ تھی اور نہ اس کا انداز اور لب و لہجہ ناموزوں تھا لیکن اس کے باوجود مخالفت کا آغاز ہو گیا۔ انسانی عقل بھی یہی کہتی ہے کہ جب تک باطل عقیدوں اور نظریات و خیالات کے بت پاش پاش نہ ہوں انسان کا کعبۂ دل پاک صاف نہیں ہو سکتا اور نہ حق اس میں جاگزیں ہو سکتا ہے۔

آپؐ حکمت، موعظۂ حسنہ اور جدالِ احسن کے ساتھ حق کی تبلیغ کرتے رہے اور مخالفت بڑھتی رہی جیسے جیسے حق کا نور پھیل رہا اور باطل کی تاریکی سمٹ رہی تھی مفاد پرست سردارانِ قریش آتش زیر پا ہوتے جا رہے تھے۔ اسلام ایک دینِ فطرت ہے اور قرآن اللہ کا کلام، اس لیے وہ تمام لوگ جن کے دل تعصب، گھمنڈ اور مفاد پرستی سے زنگ آلود نہیں ہوئے تھے قرآن کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔ آپؐ جس توحید اور جس بندگیِ رب کی دعوت دے رہے تھے اس کا اجمالی بیان یہ ہے:

انہیں بتایا گیا کہ اللہ ایک ہے اور اس کی الوہیت میں کوئی اس کا شریک نہیں نہ اس کی ذات میں کوئی شریک ہے اور نہ صفات میں، وہ ایک ہے اور اس کی اکائی ناقابلِ تقسیم ہے۔ وہ یکتا ہے اور اس کی یکتائی کا کوئی سہیم نہیں۔ وہ رب ہے اور اس کی ربوبیت میں کوئی اس کا ساجھی نہیں۔ وہ کائنات کا صرف خالق و مدبر ہی نہیں ہے بلکہ ساری کائنات کا حاکم بھی ہے جس طرح سورج اور چاند پر اس کی حکومت ہے اسی طرح انسانوں کا حکمراں بھی وہی ہے۔ آسمان کا خدا بھی وہی ہے اور زمین کا خدا بھی وہی ہے ——— جس طرح اس کی ذات ناقابلِ تقسیم ہے اسی طرح اس کی حاکمیت بھی غیر منقسم ہے۔ اس کو اپنا الٰہ اور رب ماننے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی اس کے حوالے کر دے اور وہ مکمل طور پر اس کا بندہ بن جائے۔ انسان کو اس کا حق نہیں کہ اپنی زندگی کا قانون آپ بنائے، اس کی بندگی کا تقاضا یہ ہے کہ ہر شعبۂ حیات میں اللہ کے قانون کی پیروی کرے۔ اسی کی رضا کے حصول کو اپنی زندگی کا مقصد اور اپنی تمام سعی و جہد کا حاصل قرار دے۔ اسی کے سامنے جھکے، اسی کے سامنے سجدہ ریز ہو۔ اسی سے دعا کرے اور مصائب کے وقت اسی کو مدد کے لیے پکارے۔ تمام اختیار و اقتدار کا

مالک تنہا وہی ہے، جس کے پاس جو کچھ ہے اسی کا عطیہ ہے۔ انسان اپنی تمام قوتوں سمیت اسی کی ملک ہے اس لیے وہ اپنے نفس کا بھی مالک نہیں کہ مالک حقیقی کی اجازت کے بغیر اس میں کوئی تصرف کر سکے۔ ایک دن آئے گا جب اسے اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہوگا۔ اگر اس نے فرماں برداری اور اطاعت کی ہوگی تو خدا کی رضا کا مستحق ہوگا اور اگر بغاوت و نافرمانی کی ہوگی تو اس کے غضب میں گرفتار ہوگا۔ انسانوں کی ہدایت کا قانون خدا نے ہمیشہ اپنے رسولوں کے ذریعہ بھیجا ہے اس لیے اس کے رسولوں کی پیروی و اتباع ہی وہ واحد ذریعہ ہے جس سے دنیا و دین دونوں ہی کی فلاح حاصل ہو سکتی ہے۔

عقیدہ توحید کے اس اجمالی بیان کی تفصیلات تمام کی سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان تمام سورتوں میں سے اگر ہم صرف تین سورتوں۔ الانعام، ہود اور الشوریٰ کا مطالعہ کریں تو ان میں بھی عقیدۂ توحید کی تفصیلات مل جائیں گی۔ سورۃ الانعام کا تفصیلی مطالعہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ مکہ میں تحریک اسلامی کے آخری دور کی سورت ہے اور بیک وقت پوری سورت نازل ہوئی ہے۔ اس میں ان بہت سے توہمات اور ظالمانہ و مشرکانہ اعمال و افعال کا بھی ذکر ہے جن میں مشرکین عرب مبتلا تھے۔

(باقی)

جماعت اسلامی
کا
مطلوبہ صالح انقلاب

(۲)

(ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی، علی گڈھ)

ہمارا مقصود انسانی زندگی میں اخلاقی مقاصد کی بحالی ہے ہندوستان میں جہاں ایسے لوگ کم ہی ملیں گے جنہوں نے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کر لیا ہو کہ وہ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف خدا کی بندگی کریں گے۔ اللہ کی حکومت اور اس سے متعلق سوالات پر بحث میں وقت صرف کرنے کی بجائے دانشمندی کا کام یہ ہوگا کہ ہم اس بات کا جائزہ لیں کہ انسانی زندگی میں وہ بنیادی تبدیلی کیا ہے جو بندگی رب کے فیصلے کے نتیجے میں رونما ہوگی۔ ہمارے نزدیک اس انقلاب کا پہلا اور سب سے دور رس اثر مادہ پرستی کا خاتمہ اور انسانی زندگی میں اخلاقی مقاصد کی بحالی ہے۔ انسانوں کا یہ چلن بدل جائے گا کہ ان کے نزدیک وزن کی حامل قدر کی مستحق اس بات کے لائق کہ اسی کے حصول کی کوشش کی جائے صرف مادی ساز و سامان ہیں۔ اس تبدیلی کے بعد مادی وسائل اور مادی قدروں کو اعلیٰ ترین مقاصد کا مقام نہ حاصل رہے گا بلکہ یہ درجہ دوسرے مقاصد کو حاصل ہو جائے گا اور مادی ساز و سامان ان دوسرے برتر مقاصد کے لیے ذرائع کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔

غور کیجیے کہ آج آٹے میں کھریا مٹی اور زیرے میں زہریلے بیج کیوں ملائے جاتے ہیں۔ رشوت ستانی کیوں عام ہے۔ باوجود اس کے کہ قحط کے سبب انسان فاقہ کشی کی موت مر رہے ہیں، غلہ کی ذخیرہ اندوزی

اور غلہ کی تجارت میں بے جا نفع خوری کیوں جاری ہے۔ اسی لیے کہ ایسا کرنے والوں کی نظر میں دولت انسانی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ انھیں ذاتی نفع کے مقابلے میں انسانوں کا دکھ درد دور کرنے، یا کسی اور اخلاقی مقصد کی کوئی پروا نہیں۔ دولت، قوت و اقتدار، جاہ و منزلت ۔ ۔ ۔ ۔ یہی انسانوں کے مقاصد ہیں۔ انھی کو ان کی نظروں میں وزن حاصل ہے۔ وہ انھی قدروں کے شیدائی ہیں۔ ہم جب تبدیلی کے خواہاں ہیں اس کے نتیجے میں یہ مقاصد اعلیٰ ترین قدروں کے مقام سے گر جائیں گے — کیوں؟ اس کے جواب میں آخرت کا تصور کیجیے اور بندہ اور اس کے رب کے درمیان تعلق پر غور کیجیے۔ وہ سماج جس کے افراد اس بات پر مطمئن ہوں کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ وہاں سارے اعمال کا حساب دینا ہے اور وہاں مصیبت سے بچنے اور آرام کی زندگی حاصل کرنے کے لیے دنیا میں اخلاقی رویہ اختیار کرنا لازم ہے۔ ان قدروں کو اپنا آخری مقصود نہیں بنا سکتا۔ اس کے افراد ایسے کام نہیں کریں گے جن کے بارے میں وہ جانتے ہوں کہ ان سے اللہ ناخوش ہوگا اور آخرت بگڑے گی۔ ہر فرد جانتا ہے کہ یہ وہ خرابیاں ہیں جن سے ہر مذہب نے منع کیا ہے۔ ہر مذہب نے بالخصوص اسلام نے ان کاموں کو برا بتایا ہے۔ ان سے روکا ہے، ان کو بڑے گناہوں میں شمار کیا ہے۔ اشیاء تجارت میں آمیزش، رشوت، ضرورت کے باوجود غلہ کی ذخیرہ اندوزی تاکہ اس کا نرخ گراں ہو۔ بھائی بھوکوں مر رہا ہو، پھر بھی اپنی فاضل روٹی اسے نہ دینا ۔ ۔ ۔ یہ سب ان کاموں میں سے ہیں جن کے بارے میں صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ ان سے اللہ ناخوش ہوتا ہے اور وہ اس کی سزا دے گا۔ آج اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ لوگوں کو ان طریقوں کے بدلنے پر آمادہ کیا جائے۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ صرف قانون سے ان خرابیوں کا ازالہ ممکن نہیں۔ خاص طور پر اسی صورت میں جبکہ قانون نافذ کرنے والے ہاتھ بھی انھی خرابیوں سے آلودہ ہوں۔ کیا لوگ صرف کہنے سے تقریریں سن کر، ان کاموں کو چھوڑ دیں گے۔ ان سے کہا جاتا ہے کہ ان کاموں سے سماج کو عام انسانوں کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس لیے ان کو چھوڑ دو۔ مگر انسانوں کا بھلا کون چاہتا ہے؟ ہر فرد اپنا بھلا چاہتا ہے، اپنے خاندان کی ترقی چاہتا ہے۔ دولت، قوت و اقتدار، جاہ و منزلت یہ سب کچھ وہ اپنے لیے، اپنے اہل خاندان کے لیے، اپنی ذات برادری کے لوگوں کے لیے چاہتا ہے۔ وہ دوسروں کی پروا نہیں کرتا۔ غور سے جائزہ لیجیے آج ہندوستان میں کون سی پارٹی ہے جس کی اپیل پر لوگ اپنی ان محدود اغراض سے نظریں ہٹا سکیں۔ صرف قومی مفاد ایسی اپیل کی بنیاد

نہیں ہو سکتا۔ بہت سے انسانوں کے مادی مفاد کا حوالہ دے کر ایک آدمی کو اپنا مادی مفاد قربان کرنے پر آمادہ کرنا کس طرح ممکن ہے جب اس کی نظریں صرف دنیا کی زندگی پر اور اس زندگی میں بھی صرف مادی مفادات پر گڑی ہوئی ہوں۔ اس بگاڑ کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدلا جائے۔ ناپنے کے پیمانے تبدیل کیے جائیں۔ خدا پرستی اور ترجیح آخرت کی اس دعوت کا جسے ہم لیکر اٹھے ہیں، یہی منشا ہے۔ اس ملک کے اکثر افراد خدا اور آخرت کا تصور رکھتے ہیں مگر یہ تصور مدھم پڑ گیا ہے اور بعض دوسرے تصورات نے اسے عملاً بے اثر بنا دیا ہے۔ سرچشمہ وحی سے آبیاری ہی ان تصورات میں جان ڈال سکتی ہے اور توحید خالص کی تعلیم ہی منفی تصورات کو ختم کر کے انسانوں میں وہ احساس ذمہ داری اور قوت ارادی پیدا کر سکتی ہے جو اخلاقی رویہ کی بنیاد ہے۔ آج خدا پرست اور آخرت پسند انسانوں کو بھی اس فریب میں مبتلا کر دیا گیا ہے کہ تمہارے یہ عقائد سیاسی اور معاشی زندگی سے، اجتماعی امور و مسائل سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہم اس فریب کو توڑنا چاہتے ہیں۔

ہم ہر ہندوستانی کو اپنا مخاطب بنانا چاہتے ہیں۔ ہم اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہماری باتوں پر کان دھریئے۔ یہ نہ دیکھیے کہ کہنے والا مسلمان ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسی قوم سے ہے جس کے ساتھ ماضی میں آپ کی 'قوم' سیاسی کشمکش میں الجھی رہی ہے۔ اس بات کو سنیے کہ جس خدا کو آپ مانتے ہیں اس کی نظر جس طرح پوجا پاٹ پر ہوگی اسی طرح اس بات پر بھی ہوگی کہ آپ کے دوسرے اعمال کیا ہیں۔ آپ انسانوں سے کس طرح پیش آتے ہیں۔ انہیں تکلیف پہنچاتے ہیں یا ان کی خدمت کرتے ہیں، اس خدا نے یقیناً کچھ اخلاقی ہدایات بھی دی ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھ رہا ہے کہ آپ ان تعلیمات پر کس حد تک عمل کرتے ہیں۔ اسلام خدا اور آخرت کا اور وحی و رسالت کا جو تصور پیش کرتا ہے، خدا کی جو تعلیمات سامنے لاتا ہے ان کو دیکھیے۔ آپ انسانی تاریخ سے ان تعلیمات کی اثر انگیزی اور صلاحیت کا ثبوت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ صرف ایک مثال لے لیجیے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ اسلام نے انسانی مساوات کا درس دیا ہے۔ ایسی انسانی مساوات جو بے لوث اور بے آمیز ہے۔ اس تعلیم کی روشنی میں اپنے ملک کو دیکھیے، آج کی دنیا کا جائزہ لیجیے۔ ہمارا ملک وہ ملک ہے جس میں انسان اونچے اور نیچے طبقات میں تقسیم تھے۔ کچھ لوگ دیکھنے کے لائق بھی نہ سمجھے جاتے تھے۔ جنہیں اگر ایک اعلیٰ ذات کا ہندو دیکھ لیتا تو ہا

تو اس کا دھرم نشٹ ہو جاتا تھا۔ ایسے آدمی اگر ان اعلیٰ ذات کے آدمیوں کے سامنے آ جاتے تو ان کی سزائیں مقرر تھیں۔ کچھ لوگ اچھوت تھے۔ باوجود قانون کی مداخلت کے ہمارے سماج میں اب بھی بہت سی درجہ بندیاں برقرار ہیں۔ صرف اپنے ملک کا یہ حال نہیں۔ امریکہ کو دیکھیے جو مادی ترقی میں دنیا کا امام بنا ہوا ہے آج بھی سفید رنگ کے لوگوں کو سیاہ فام لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا نہیں گوارا ہے۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر سفر نہیں کر سکتے۔ اس دنیا میں آج سے سیکڑوں سال پہلے اسلام نے یہ تعلیم دی تھی کہ لوگو! تمہارا خدا ایک ہے۔ تم ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہو اور رنگ و نسل، زبان و وطن اور دوسرے اختلافات کے باوجود تم سب انسان ایک دوسرے کے برابر ہو۔ جب انسانوں کا رشتہ ان کے خدا کے ساتھ جڑ گیا تو انھوں نے برضا و رغبت انسانوں سے برابری کا رشتہ قائم کرنا قبول کر لیا۔ رنگ و نسل، قبیلہ و وطن زبان وغیرہ کے اختلافات کو نظر انداز کر کے برابر کے انسانوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیش آنے لگے۔ آج بھی اگر آپ انسانی مساوات قائم کرنا چاہتے ہیں تو انسانوں کا مزاج بدلنا ہوگا۔ یہ مزاج صرف قانون کے ذریعے نہیں بدلا جا سکتا۔ ایک پارٹی کی حکومت کی جگہ دوسری پارٹی کی حکومت قائم کرنے سے یہ مسائل نہیں حل ہو سکتے۔ آپ یہاں کانگریس کی جگہ کمیونسٹ پارٹی کی، پی اس پی کی، جن سنگھ کی جس پارٹی کی بھی حکومت قائم کرا دیں افراد انسانی کا مزاج نہیں بدل جائے گا۔ جو تکلیف آج ہمارے سماج کے کروڑوں انسانوں کو سڑک پر چلتے وقت ہوٹلوں اور چائے خانوں میں بازاروں میں اور کارخانوں میں دوسرے انسانوں کے احساس برتری سے، اس بات سے کہ وہ ان کو ذلیل اور کم درجے کا انسان سمجھتے ہیں ..... ہر آن ہوتی رہتی ہے اس کو اسی طرح دور کیا جا سکتا ہے کہ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل جائے۔ آپ تلاش کیجیے اس بنیادی تبدیلی کا اہتمام ہندوستان کی کون سی پارٹی کر رہی ہے۔

ہندوستانی سیکولرزم اور بندگی رب کی دعوت

ہماری بات پر کان دھرنے سے آپ کو یہ بات بھی روکتی ہے کہ ایک سیکولر ملک میں ایک دینی جماعت کی طرف آنا اور یہ بات سننا کہ خدا کی ہدایت زندگی کے تمام امور میں اختیار کی جائے آسانی کے ساتھ ممکن نہیں۔ اجتماعی امور و مسائل میں مذاہب اور اہل مذاہب کا دخل اختلافات، کشیدگیوں اور تصادم کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ لوگوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا کرنے کے نتیجے میں تاریک خیالی کا دور دورہ ہوگا، عقل و تجربے کی روشنی گل ہو جائے گی اور زندگی کے عملی مسائل ہزاروں سال پرانی کتابوں میں

لکھے مبہم جملوں کی مختلف فیہ تعبیروں کی روشنی میں حل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہم آپ سے خلوص کے ساتھ یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ اندیشے بے بنیاد ہیں اور ان تہمتوں کی کوئی اصلیت نہیں۔ اسلام بھی زندگی کے نت نئے مسائل کے حل کے لیے عقل و تجربے ہی کو راہنما بنانے پر زور دیتا ہے۔ وہ بھی آج کے مسائل کو آج کے تجزیے کی روشنی میں حل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ مگر یہ انسانی زندگی تمام تر نئے مسائل کا مجموعہ نہیں ہے، نہ اس کے حالات تمام تر نئے حالات ہیں۔ انسان قدیم ہے، اس کی فطرت کی ترکیب میں کچھ ازلی عناصر بھی شامل ہیں اور انسانی زندگی کے کچھ احوال بھی مستقل ہیں اور کچھ مسائل بھی۔ جس مسئلے کا ابھی ذکر ہو رہا تھا کہ ایک انسان دوسرے انسان کو کس نظر سے دیکھے۔ اپنے برابر کا انسان، بندۂ خدا، آدم کا بیٹا سمجھے، یا جِلد کے رنگ، نسل، زبان، وطن، برادری کے اختلاف کی بنا پر اسے اپنے سے حقیر تر یا برتر جانے۔ اس مسئلے کو لے لیجیے۔ یہ نئے حالات کا پیدا کردہ سوال نہیں ہے۔ نہ اس کا جواب نئے تجزیے کا محتاج ہے۔ اسلام آپ کو زندگی کے مستقل مسائل میں مستقل رہنمائیاں دیتا ہے۔ زندگی کے دائروں کی تفصیلی ضابطہ بندی کرتا ہے جو احوال و ظروف کی تبدیلی سے زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ جیسا کہ ہم نے مختصراً واضح کیا ہے۔ فرد انسانی کی تربیت، اس کے مزاج اور نقطہ نظر کی اصلاح اور خاندان کی تنظیم ایسے ہی امور ہیں جن میں قرآن و سنت نے تفصیلی رہنمائی کی ہے۔ سیاست و معیشت جیسے اجتماعی امور میں وہ بنیادی رہنمائی دے کر چند اصولی ضوابط دے کر انسان کو آزاد چھوڑتا ہے کہ تفصیلی نظام وہ عقل و تجربے کی روشنی میں خود وضع کرے۔ اگر سیکولرزم کا منشا یہی ہے کہ پرانی کتابوں اور صدیوں پہلے کے شاستروں سے آزاد ہو کر انسان اپنے روزمرہ کے مسائل کو عقل و تجربے کی روشنی میں حل کر سکے تو یہ منشا اسلام کی آغوش میں داخل و خارج میں تضاد پیدا کیے بغیر ضمیر کے اطمینان کے ساتھ حاصل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اسلام جس کتاب ہدایت کی طرف بلاتا ہے اس نے خود ان امور میں تفصیلی ضابطہ بندی نہیں کی ہے۔

مگر افسوس کہ اجنبی تصورات کے زیر اثر ہندوستان کے بسنے والے سیکولرزم کے اس تصور سے مرعوب ہو جاتے ہیں جو مغرب کی مخصوص فضا کا پروردہ ہے، جسے مشرق کے دینی تجربات اور اس کی تاریخ سے کوئی مناسبت نہیں۔ بالکل غلط طور پر یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے ایک سیکولر اسٹیٹ ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں دین و مذہب کی بات نہ کی جائے، انسانوں کو بندگی رب کی طرف نہ بلایا جائے

اور خدا کی ان ہدایات کا ذکر نہ کیا جائے جو اس نے معاشی اور سیاسی زندگی سے متعلق دی ہیں۔ ہندوستان
صرف ان معنے میں ایک سیکولر اسٹیٹ ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کے درمیان مذہب کی بنا پر کوئی تفریق
امتیاز نہ برتے گی۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے بعض لیڈروں نے مشرق کے دینی ورثہ سے غافل
ہونے اور مغربی افکار کے پروردہ ہونے کے سبب ہندوستان کو سیکولرزم کے کسی وسیع تر جارحانہ تصور کا
سبق سکھانا چاہا ہو لیکن ان انفرادی رایوں کا ہندوستان کے دستور سے کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا ملک
ایک جمہوری ملک ہے۔ یہاں کسی بندۂ خدا سے اس کا یہ فطری حق نہیں سلب کیا جا سکتا کہ وہ بندگانِ خدا
کو اللہ کی بندگی کی طرف اور اس بندگی میں یکسوئی کی طرف بلائے۔ اسی طرح کسی کو اس دعوت کے قبول
کرنے میں اس بنا پر کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے کہ ایسا کرنا ملک کے سیکولر کردار کے منافی ہوگا۔ اپنے
ضمیر کی آواز کو مصنوعی تصورات سے مرعوب ہو کر نہ دبائیے۔ خیر خواہی کا تقاضا ہے کہ جس طریقے میں
آپ ملک اور اہل ملک کی بھلائی دیکھتے ہوں اسی کی طرف سب کو بلائیے۔ ایک جمہوری ملک میں اختلاف
رائے کوئی گھبرانے کی بات نہیں۔ یہ بات البتہ تشویش کی موجب ہوگی کہ کچھ لوگ اپنی رائے کو زبردستی
دوسروں پر مسلط کرنا چاہیں۔ اس بارے میں ہم اپنا موقف، اسلام کا موقف آپ پر واضح کر چکے ہیں
دین کے معاملے میں جبر و اکراہ نہیں۔ پھر کشیدگی اور تصادم کا اندیشہ کس بات سے ہے۔ یہ اندیشہ تو
ان لوگوں کی طرف سے ہونا چاہیے جو سیکولرزم کے مذہب دشمن جارحانہ تصور کو زبردستی ہمارے سر تھوپنا
چاہتے ہیں اور اس سے اختلاف کے اظہار کو قوم دشمنی اور تخریب کاری سے تعبیر کرتے ہیں۔

ملک کے دستور، اس کے سیکولر کردار اور جمہوریت کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے باوجود بعض
مسلمانوں کو ہماری دعوت کے سلسلے میں یہ تردد لاحق ہے کہ اس ملک میں اس کے مقبول ہونے کا کوئی
امکان نہیں۔ وہ ان عصبیتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو صدیوں کی تاریخ نے اسلام اور اس کے
نام لیواؤں کے خلاف پیدا کر رکھی ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اس ملک میں دین کے قیام کا کوئی امکان نہیں
نظر آتا تو اس کی دعوت لے کر اٹھنا بہت سی غلط فہمیاں پیدا کرنے اور بہت سی عصبیتوں کو ابھارنے کا
سبب بن سکتا ہے۔ ایسی دعوت لے کر اٹھنا موجودہ حالات میں دانشمندی کے خلاف ہے۔ کہاں یہ ہندوستانی
مسلمان اور ان کی بدعملی، کہاں یہ فسادات اور معاشی بدحالی اور کہاں یہ حوصلہ کہ مسلمان اس ملک میں
صالح انقلاب کا لفظ زبان پر لائیں۔

یہ بات بہت نازک ہے۔ اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا ضروری ہے۔ اس طرح سوچنے والے مسلمانوں سے میری پہلی عرض تو یہ ہے کہ یہ طرزِ فکر آپ کے اسلامی جذبے کے لیے کینسر سے کم خطرناک نہیں ہے اگر آپ نے اس کو اپنے جسم دینی میں پرورش پانے دیا تو یہ اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کر کے رکھ دے گا۔ کوئی بندۂ خدا اس انداز سے سوچنے کا حق نہیں رکھتا۔ اس کا تو یہی مشن ہونا چاہیے کہ بندگی رب کی دعوت لے کر اٹھے اور اس دعوت کے مقبول ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔ اللہ اپنے بندوں کو اپنی ہدایت قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے یا نہیں دیتا ہے اور کب توفیق دیتا ہے۔ یہ سب اسی کے اختیار میں ہے۔ ہمارا کام بغیر کسی کوتاہی اور تقصیر کے اس کے پیغام کو پیش کر دینا ہے اور اس طرح پیش کر دینا ہے جیسا کہ اس پیغام کا حق ہے۔ زبان و قلم کے ذریعے بھی اور کردار کے ذریعے بھی۔ انفرادی حسن عمل کے ذریعے بھی اور مسلمانوں کی اصلاح کر کے ان کی معاشرتی زندگی کے ذریعے بھی۔

ان حضرات کے لیے یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ جن عصبیتوں اور غلط فہمیوں کی طرف سے انہیں اندیشہ ہے وہ بندگی رب کی دعوت کی پیدا کردہ ہیں یا مسلمانوں کے قومی طرزِ عمل اور ان کی تاریخ کے غیر اسلامی رجحانات کی؟ اس ملک میں مسلمانوں کی تاریخ صرف قومی مفادات کے لیے، سیاسی کش مکش کی یا دنیوی اغراض کے تحت بادشاہی کی تاریخ نہیں رہی ہے بلکہ ایسے بندگانِ خدا بھی پائے جاتے رہے ہیں جنھوں نے تمام اغراض و مفادات سے کٹ کر عام انسانوں کو توحید کا درس دیا اور اسلام کی طرف بلایا۔ کیا اس بات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے کہ ان کی دعوت کا ردعمل عصبیتوں کے ابھار کی صورت میں نمودار ہوا۔ ہمیں شبہہ ہے کہ ایسے اندیشے حقیقی اسلام کی طرف دعوت اور اس کے مقصد و منہاج کو ٹھیک طور پر نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پہلے ان امور کے بارے میں ذہنوں کو صاف کر لیا جائے۔

دینی نصب العین کی حیات آفرینی

فرض کیجیے کسی کا تجزیہ اسے اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ اس ملک میں دین نہیں قائم ہو گا۔ پھر بھی یہ لازم نہیں آتا کہ وہ اس کو اپنا نصب العین نہ بنائے اور اس کے حصول کا عزم لے کر نہ اٹھے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ ہمارا تجزیہ بے لاگ ہونا چاہیے اور اس پر ہماری خواہشات کا ذرا بھی پرتو نہیں پڑنا چاہیے حالات کا غیر جانبدارانہ جائزہ لیجیے، اسباب کا معروضی تجزیہ کیجیے اور آپ جس نتیجے تک بھی پہنچیں اسے اپنے

سامنے بھی رکھے اور دوسروں کے سامنے بھی۔ مگر یہ نہ بھول جائیے کہ آپ کے جائزہ اور تجزیے کا موضوع انسان ہے۔ اس کے افکار و خیالات ہیں، جذبات و رجحانات ہیں۔ پتھر کی چٹانیں نہیں ہیں، یہ حالات بدل سکتے ہیں، نئے اسباب فراہم ہو سکتے ہیں۔ موجودہ حالات اور کارفرما اسباب و علل کے تجزیے کا صحیح مصرف یہ ہے کہ آئندہ ان حالات کو بدلنے اور نئے اسباب فراہم کرنے کی فکر کی جائے۔ پھر اصل بات تو یہ ہے کہ یہ نصب العین ہم نے ایک فریضہ سمجھ کر اختیار کیا ہے، اسے اختیار کرنے کا مقصد اس نصب العین سے ماورا آخرت کی فلاح اور اللہ کی رضا ہے۔ اس آخری مقصود کے حصول میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہمارا عزم صادق ہو اور سعی و جہد مخلصانہ ہو۔ کوئی سیاسی پارٹی، کوئی اکثریت، کسی ملت کی بدعملی اس فرد کو اس کے اس اخروی مقصود کے حصول سے نہیں روک سکتی۔ اگر وہ خود اس کی طلب میں صادق ہو۔ جس جنت کا اللہ نے مرد مومن سے وعدہ کیا ہے اسے کوئی اکثریت نہیں چھین سکتی۔ اگر آپ کی نگاہیں اس پر ہیں تو وہ صرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور آپ اپنے ایمان و عمل سے اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

کسی نصب العین کی قدر و قیمت صرف اس کے حصول پر ہی منحصر نہیں ہوتی۔ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس کو اپنانے والوں پر ایسا کرنے کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار کرنے کے لیے ان میں تازہ حوصلہ پیدا کرنے کے لیے، ان کا اضمحلال دور کرنے کے لیے اگر کوئی نسخہ ہے، کوئی لائحہ عمل ہے تو یہی ہے جسے جماعت اسلامی ہند پیش کر رہی ہے بندگی رب کا یہ فیصلہ کر لینے کی دعوت دینے کا یہ مشن جس کا ہم آپ کو علم بردار بنانا چاہتے ہیں۔ ملت اسلامیہ ہند کے لیے ایک تاریخ ساز کردار کی پیش کش ہے۔ یہ ان کو کاہلی کی جگہ محنت پر، اپنے میں گھرے رہنے کی بجائے عام انسانوں کے درمیان مصروف عمل ہونے پر اور دنیوی مسائل میں ایک فریق بنکر سامنے آنے کے بجائے ان کے حل میں شریک بنکر خوددار رہنے پر آمادہ کرے گی۔ اپنی اور دوسروں کی عداوت کو بھول کر دعوت کا یہ کام صبر آزما ضرور ہے لیکن جس درجہ بھی اس کی توفیق ہو جائے یہ ملک و ملت دونوں کے لیے ایک نئے دور کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

آخر میں، میں اپنے غیر مسلم بھائیوں سے یہ بھی عرض کروں گا کہ آپ نے یقیناً جماعت اسلامی ہند کے بارے میں بہت سی مخالفانہ باتیں بھی سنی ہوں گی یا آئندہ سنیں گے۔ پریس ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ ریڈیو سے ہماری تقریریں نہیں نشر ہوتیں۔ ہم ملک میں بڑے عہدوں پر نہیں فائز ہیں کہ وہاں سے ہماری باتیں سنی جا سکیں۔ آپ

آپ ہمارے بلانے پر یہاں تشریف لائے۔ ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔ یہاں آپ نے جو باتیں سنی ہیں ان کی روشنی میں ہمارے بارے میں رائے قائم کیجیے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ دوسروں کی باتیں نہ سنیے لیکن اگر کوئی ہماری طرف ان باتوں کے خلاف باتیں منسوب کرتا ہے جو آپ نے یہاں سنی اور دیکھی ہیں تو یقیناً آپ کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے بارے میں مزید تحقیق کریں۔ فرقہ پرستی کا الزام ہو یا وطن دشمنی کا، خفیہ سرگرمیوں کا اتہام ہو یا تخریبی کارروائیوں کا، اگر اس کے حق میں اس عارضی بستی کے اندر جو تین دن سے یہاں بسی ہوئی ہے، ان بہت سی تقریروں میں جو یہاں کی جا رہی ہیں، ان ہزاروں افراد کے شب و روز میں جو آپ کی نظروں کے سامنے ہیں ایک دلیل بھی نہ مل سکے، ایک علامت بھی نہ پائی جائے، تو آپ کیوں اسے سنتے ہی دل میں جگہ دے دیں! جائزہ لیجیے۔ ہمارے لٹریچر کا مطالعہ کیجیے۔ آئندہ دوسرے اجتماعات میں بھی شرکت کیجیے۔ ہمارے کارکنوں کے ساتھ کچھ وقت گذاریے۔ ہمارے دفتروں اور لائبریریوں میں تشریف لائیے۔ ہمارے غریب خانے حاضر ہیں۔ قریب سے دیکھ کر رائے قائم کیجیے۔ ہماری تمنا ہے کہ آپ ایسا کریں تاکہ ہمارے دل کا درد محسوس کر سکیں۔ خدا گواہ ہے کہ ہمارا محرک نہ ذاتی اغراض ہیں نہ گروہی مفادات اور قومی عصبتیں۔ ہم اللہ کے بندے ہیں اور آپ سے اسی اللہ کے بندوں کی حیثیت سے رشتہ محسوس کرتے ہیں۔ اسی حیثیت میں آپ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ ہمارا اور آپ کا خدا الگ نہیں ہے۔ ایک ہی ہے، خواہ آپ اسے کسی اور نام سے پکارتے ہیں اور ہم کسی اور نام سے۔ ناموں کے فرق سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔ آپ ہماری طرف نہیں، اپنے خدا کی طرف واپس آیئے۔ عمر گذر رہی ہے، زندگی ختم ہو رہی ہے۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے جب کچھ کرنے کا موقع نہ باقی رہے گا۔ وہاں نہ کوئی لیڈر ہوگا، نہ کوئی پارٹی، نہ وطن ہوگا، نہ قوم ہوگی۔ بس آپ ہوں گے اور آپ کا خدا ہوگا۔ اور خدا اس دنیا میں آپ کا طرزِ عمل دیکھ کر اس دنیا میں آپ کا فیصلہ کرے گا۔ اس فیصلہ کی گھڑی کو دھیان میں رکھیے۔ کوئی دم جاتا ہے اور یہ گھڑی آتی ہے۔ ہر آن کوئی نہ کوئی اسی دنیا سے گذر جاتا ہے صحت کی حالت میں بھی اور مرض کی حالت میں بھی۔ جوانی میں بھی اور بڑھاپے میں بھی۔ پتہ نہیں کب میرا وقت آ جائے، پتہ نہیں کب آپ کا وقت آ جائے۔ اس گھڑی کے لیے جو کچھ کرنا ہو آج کر لیجیے۔

میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں غفلت سے بچائے، اپنی پہچان عطا کرے اور اپنی اور صرف اپنی بندگی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اسلام میں والدین کے حقوق

(آخری قسط)

(مولانا جلال الدین عمری)

والدین کے منصوص حقوق اور فقہاء کے استدلالات

قرآن وحدیث میں والدین کی اطاعت کے جو احکام دیے گئے ہیں اور فقہاء نے ان سے جو استدلالات کیے ہیں ہم نے تفصیل سے ان کو پیش کر دیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان جو نسبتاً فرق پایا جاتا ہے اسے کسی بھی وقت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن وحدیث سے فقہاء نے جو مسائل اخذ کیے ہیں ان میں سے ہر مسئلہ دلائل کے لحاظ سے بہت زیادہ قوی اور مضبوط نہیں ہے بلکہ ان میں سے بعض پر عقلی اور نقلی حیثیت سے اعتراضات کیے بھی گئے ہیں اور اب بھی کیے جا سکتے ہیں۔ ان اعتراضات کو یہ کہہ کر رد کر دینا صحیح نہ ہوگا کہ وہ بے وزن اور ناقابل التفات ہیں۔ فقہاء نے اس موضوع پر جو تفصیلات فراہم کی ہیں ان کے پیچھے یہ تصور کارفرما رہا ہے کہ اولاد کا والدین سے خصوصی تعلق رہا ہے۔ وہ ان کے ساتھ اس طرح کا برتاؤ نہیں کر سکتی جس طرح کا برتاؤ عام افراد کے ساتھ اس کے لیے صحیح اور جائز ہے۔ والدین کی طرف سے اگر کسی معاملے میں زیادتی بھی ہو جائے تو اولاد کا فرض ہے کہ ان سے انتقام نہ لے اور معاف کر دے۔ اس کے بغیر اس معروف حسن سلوک کی تکمیل نہیں ہو سکتی جس کی اسلام نے تاکید کی ہے۔ اس سلسلے کی بعض تفصیلات کے فراہم کرنے کے بعد جصاص لکھتے ہیں :-

اذ کان جمیع ذالک من الصحبۃ بالمعروف وفعل ضدہ ینافی مصاحبتھما فی المعروف[1]	اس لیے کہ یہ سب باتیں مصاحبت بالمعروف کے حکم میں شامل ہیں اور اس کے خلاف رویہ اختیار کرنا اس حکم کے منافی ہے

[1] احکام القرآن ۳/ ۴۳۳

والدین کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کی اس تعلیم میں فقہاء نے اس قدر مبالغہ کیا ہے اور اس کو قاعدوں اور ضابطوں میں اس قدر باندھ دیا ہے کہ آدمی اس پر عمل کرنے میں بسا اوقات خاصی زحمت محسوس کرتا ہے۔ اس میں والدین کی شخصیت تو ہر معاملے میں نمایاں اور چھائی ہوئی ہے لیکن اولاد کی شخصیت اور انفرادیت دب گئی ہے۔ والدین کے حقوق اور مفادات پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اولاد کے حقوق اور مفادات مجروح ہوگئے ہیں۔ فکر کا استقلال اور عمل کی آزادی انسان کا فطری حق ہے۔ یہ حق اس کو والدین کے مقابلے میں بھی حاصل ہونا چاہیے اور اس پر کوئی ایسی بے جا پابندی اور رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس حق سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ فقہاء نے اس میں شک نہیں اس کے اس حق کا انکار نہیں کیا ہے لیکن عملاً اسے دیا بھی نہیں ہے۔ بلاشبہ والدین کے جو حقوق نصوص سے ثابت ہیں وہ ان کو لازماً حاصل ہوں گے۔ لیکن فقہاء نے ان نصوص سے جو استدلالات کیے ہیں ان پر اس پہلو سے بھی غور کرنا چاہیے کہ ان کی بنیاد پر ظالم اور جاہل ماں باپ اولاد پر اپنی مرضی نہ مسلط کر دیں اور شادی بیاہ تعلیم و تربیت، تجارت اور لین دین میں ان کو صحیح اور معقول اقدامات تک سے نہ روک دیں، جو صریحاً ظلم اور قرآن و حدیث کے منشا کے بالکل خلاف ہے۔ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ فقہاء کو والدین کی طرف سے اس قسم کی ممکنہ زیادتیوں کا احساس نہیں ہے اور انھوں نے اس کے تدارک پر غور نہیں کیا ہے۔ انھوں نے والدین پر پابندیاں بھی لگائی ہیں اور اولاد کو ان کے ظلم سے بچانے کی تدبیریں بھی نکالی ہیں لیکن ان کے خیالات سے بحیثیت مجموعی والدین اور اولاد کے تعلق کی جو تصویر بنتی ہے اس میں والدین جابر و قاہر حاکم معلوم ہوتے ہیں اور اولاد محکوم اور بے بس رعیت نظر آتی ہے۔ ظاہر ہے یہ تصویر بہر حال صحیح نہیں ہے۔

پھر یہ کہ فقہاء نے جن حالات میں یہ تفصیلات مرتب کی تھیں اب وہ بہت کچھ بدل چکے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں ان کا ہو بہو انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً آج غلامی کا سسٹم عملاً ختم ہو چکا ہے اس لیے یہ سوال خارج از بحث ہو جاتا ہے کہ اولاد کی غلامی میں والدین آ جائیں تو ان کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے جنگ کا وہ انداز بدل گیا ہے جس میں باپ اور بیٹے کے ایک دوسرے کے بالمقابل ہونے کا امکان تھا۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ والدین کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اولاد پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ اس نفقہ کو پورا کرنے کی پوزیشن میں نہ بھی ہوں تو انھیں والدین کو اپنے گھر کے افراد کی حیثیت سے رکھنا ہوگا لیکن اب فلاحی ریاست کی یہ ذمہ داری سمجھی جاتی ہے کہ وہ نادار اور محتاج افراد کی کفالت کرے اس لیے اولاد کی یہ ذمہ داری ہلکی ہو سکتی ہے

اسی طرح فقہا نے باپ اور ماں دونوں کے درمیان فرق کیا ہے۔ وہ باپ کے بارے میں تو یہ دیکھتے ہیں کہ وہ روزگار حاصل کر رہا ہے یا نہیں لیکن ماں کو وہ اپاہج، مان کر سلوک کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان کے خیال میں کسی حال میں کسب معاش نہیں کر سکتی۔ ابن عابدین لکھتے ہیں :-

ولا یخفی ان الام بمنزلۃ	یہ بات بالکل واضح ہے کہ ماں کی حیثیت
الاب الزمن لان الانوثۃ	اپاہج باپ کی سی ہے۔ اس لیے کہ اس کا محض عورت
بمجردھا عجز[1]	ہونا ایک عجز ہے۔

لیکن اب عورت کمانے لگی ہے اور بعض اوقات وہ اولاد پر بوجھ بننے کے مقابلے میں اپنے ذریعہ معاش کو باقی رکھنا پسند کر سکتی ہے۔ ان بدلے ہوئے حالات میں کئی سو سال پہلے مرتب کی ہوئی تفصیلات کام نہیں آسکتیں۔ اس کے لیے نئے اجتہاد اور نئے استنباط کی ضرورت ہے۔ ہاں اس کام میں فقہاء کے غور و فکر اور فراہم کردہ مواد سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔

والدین کی اطاعت کے حدود

اب اس سوال کو لیجیے کہ والدین کی اطاعت کا حکم مطلق ہے یا شریعت نے اس پر کوئی پابندی لگائی ہے؟ دوسرے الفاظ میں عقوق والدین جس سے شریعت نے روکا ہے، اس کی تعریف کیا ہے اور اس کے حدود کیا ہیں؟ اس کا جواب قرآن مجید نے ان الفاظ میں دیا ہے :-

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ	ہم نے انسان کو تاکید کی کہ وہ اپنے
حُسْنًا وَإِن جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ	والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرے لیکن اگر وہ تم
بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا	پر زور ڈالیں کہ تم میرے ساتھ ایسی چیز کو شریک
(العنکبوت:)	کرو جس کا تمہیں علم نہیں ہے تو تم ان کی اطاعت نہ کرو

مطلب یہ کہ بلاشبہہ والدین کی اطاعت تم پر فرض ہے لیکن اگر وہ تمہیں اللہ کے دین سے پھیرنے اور شرک کی راہ پر لگانے کی کوشش کریں تو تم ان کے سامنے نہ جھکو اور ان کی بات نہ مانو۔ چاہے یہ کوشش ان میں سے صرف کسی ایک ہی کی طرف سے نہیں بلکہ دونوں کی طرف سے کیوں نہ ہو اور آخری حد تک کیوں نہ ہو اور اس کے لیے وہ تم سے جنگ پر کیوں نہ آمادہ ہو جائیں اور تمہیں ان سے لڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ اس لیے کہ عقیدہ اور دین کی

[1] ردالمحتار علی الدرالمختار ۲/۱۳۲

بنیاد "علم" پر ہونی چاہیے نہ کہ باپ دادا کی اطاعت اور تقلید پر۔ جب اللہ کے سوا کسی معبود کا تمہیں علم نہیں ہے تو تمہارے لیے اس کی عبادت بھی صحیح نہیں ہے۔ امام نخعی کہتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ والدین کی اطاعت تم پر واجب ہے لیکن اگر یہ تمہیں میرے ساتھ شرک تک پہنچا دے تو تم اس میں ان کی اطاعت نہ کرو۔"

شرک سے مراد محض وہ عقیدہ نہیں ہے جو توحید کے بالمقابل اختیار کیا جاتا ہے بلکہ وہ پورا دین مراد ہے جو اس عقیدے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے۔ چنانچہ ابن کثیر نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ " اگر والدین تمہیں اپنے دین کی پیروی پر ابھاریں جبکہ وہ مشرک ہوں تو تم اُن سے بچے رہو اور ان کی اطاعت نہ کرو۔"[۱]

ایک دوسری جگہ اسی تعلیم پر مزید اضافہ کیا گیا ہے۔

وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا	ان کے ساتھ دنیا میں اچھا برتاؤ رکھو
وَاتَّبِعْ سَبِيلَ مَنْ أَنَابَ إِلَيَّ	(لیکن دین کے معاملے میں) ان لوگوں کے طریقے
ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ	کی پیروی کرو جو میری طرف رجوع ہیں۔ اس
(لقمٰن : ۱۵)	لیے کہ پھر تمہیں میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔

'دنیا میں' کے الفاظ دو باتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ عقائد کی کش مکش کی وجہ سے والدین کے ساتھ اس دنیا میں بدسلوکی کی تمہیں اجازت نہیں ہے۔ یہاں تمہیں ان کے ساتھ اچھے سے اچھا سلوک کرنا ہوگا۔ دوسری بات یہ کہ اگر والدین خدا کے دین سے منحرف ہیں تو ان کی اطاعت محض دنیا کے معاملات میں ہوگی، دین کے معاملات میں نہیں۔ جہاں ان کا کوئی حکم اللہ کے دین سے ٹکرائے، ان کی اطاعت تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ تم اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ان کی اطاعت کرو گے اس کے لیے اپنا دین نہیں چھوڑ دو گے۔

اس کے بعد صاف الفاظ میں ہدایت کی کہ دین کے معاملے میں تمہیں ان لوگوں کی راہ اختیار کرنی چاہیے جو خدا کی طرف رجوع کرنے والے اور اس کے فرماں بردار ہیں، چاہے وہ غیر اور اجنبی ہی کیوں نہ ہوں۔ اس معاملے میں ان افراد کا رویہ تمہارے لیے نمونہ نہیں بن سکتا جو خدا سے دور اور اس کے دین سے برگشتہ ہیں خواہ وہ

---

[۱] خازن۔ لباب التاویل فی معانی التنزیل ۵/ ۱۷۹

[۲] ابن کثیر: تفسیر القرآن ۳/ ۴۰۵

اپنے والدین اور بھائی بند ہی کیوں نہ ہوں۔ زمخشری لکھتے ہیں:۔

"مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دین کے معاملے میں مومنوں کے راستے کی پیروی کرو۔ اس راستے کی نہیں جو تمہارے والدین نے اختیار کیا ہے۔ اگرچہ تم اس دنیا میں ان کے ساتھ حسن سلوک کے پابند ہو"[1]

اس سلسلے میں ہمیں حضرت ابراہیم کے اسوہ سے بھی راہنمائی ملتی ہے جسے قرآن مجید نے تفصیل سے پیش کیا ہے انھوں نے باپ کے دین کو بے چون وچرا قبول نہیں کیا بلکہ بغور دیکھا کہ وہ حق پر ہے یا نہیں اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ اس کا طریقہ غلط ہے اور خدا کی نافرمانی اور بغاوت تک پہنچانے والا تو انھوں نے باپ کے ادب احترام کی پوری رعایت کے ساتھ اس پر بھرپور تنقید کی اور اس کو باطل قرار دیا۔ اس کے نتیجے میں باپ ان کا جانی دشمن ہو گیا لیکن انھوں نے اس کی پروا نہیں کی اور اس راہ میں جو بھی مشکلیں پیش آئیں ان کو صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیا۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖۤ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (الزخرف ۲۶-۲۸)	یاد کرو اس وقت کو جبکہ ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا تھا کہ تم جن کی عبادت کرتے ہو ان سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا تعلق صرف اسی ایک ذات سے ہے جس نے مجھے پیدا کیا اور وہی مجھے راہ دکھائے گا اور یہی بات وہ اپنے پیچھے اپنی اولاد میں چھوڑ گیا تاکہ وہ اس کی طرف رجوع کریں۔

دوسری طرف پیغمبروں ہی کے اسوے سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر باپ دادا خدا کے دین کے حامل اور اس کے علمبردار ہیں تو وہ قابل تقلید ہیں ان سے ہدایت و راہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ حضرت یعقوبؑ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے بچوں سے پوچھتے ہیں۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ	تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟

وہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں۔

نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ	ہم بندگی کریں گے اس خدا کی جو آپ کا

---

[1] الکشاف عن حقائق التنزیل سورہ لقمان ۲/۳۰۴۔۱۱

اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ	اور آپ کے باپ دادا ابراہیم و اسمٰعیل اور
اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ	اسحٰق کا خدا رہا ہے اس لیے کہ وہی ایک معبود
البقرہ ۱۳۳	ہے اور ہم اس کے فرماں بردار ہیں

اپنی اولاد کی زبان سے اس جواب کو سن کر وہ خوش اور مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کے اندر حق پر قائم رہنے اور اپنے خدا ترس اور صالح بزرگوں کی اتباع کا عزم و ارادہ موجود ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام اپنے قید کے ساتھیوں سے یہی بات اس طرح کہتے ہیں۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ	میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا ہے
بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ	جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے
وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ	ہیں۔ اس کی جگہ میں نے اپنے باپ دادا۔ ابراہیم
وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ مَا كَانَ	اسحٰق اور یعقوب کے طریقے کی پیروی اختیار کی ہے
لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ	ہمارے لیے یہ بات صحیح نہیں ہے کہ ہم اللہ کے
ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا	ساتھ کسی بھی چیز کو شریک کریں۔ یہ اللہ کا فضل
وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ	ہے ہم پر بھی اور سارے انسانوں پر بھی (کہ
النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝	اس نے کسی دوسرے کے سامنے
(یوسف - ۳۷، ۳۸)	جھکنے کی اجازت نہیں دی) لیکن
	بیشتر لوگ اللہ کا شکر نہیں کرتے

اتنی بات بالکل واضح ہے کہ والدین کی اتباع میں شرک و کفر اور الحاد و دہریت کا اختیار کر لینا بالکل غلط ہوگا۔ ہاں اگر وہ اللہ کے دین کے اتباع کا حکم دیں تو اس کی پیروی کی جانی چاہیے۔ اس سے خود بخود یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ والدین کا ہر طرز عمل اولاد کے لیے اسوہ نہیں ہوتا۔ اس لیے آنکھ بند کر کے اس کی تقلید صحیح نہ ہوگی بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کا کون سا عمل خدا کے دین کے مطابق ہے اور کون سا اس کے دین کے خلاف جا رہا ہے اور پھر اسی کی تقلید صحیح نہ ہوگی بلکہ یہ دیکھنا ہوگا کہ ان کا کون عمل خدا کے دین کے مطابق ہے اور کون سا اس کے دین کے خلاف جا رہا ہے اور پھر اسی کے مطابق اپنا رویہ متعین کرنا ہوگا۔ ان کے عمل اور ان کی روش ہی کی طرح ان کے ہر حکم کی تعمیل بھی ضروری ہے۔ ان کے جو احکام قابل قبول ہوں گے وہ لازماً قبول

کیے جائیں گے اور جو رد کر دیے جانے کے قابل ہوں گے وہ رد کر دیے جائیں گے۔ یہ چونکہ قرآن و حدیث سے نکلنے والی صریح ہدایات ہیں اس لیے ہمیشہ غیر اختلافی رہی ہیں۔ شیخ ابن عبدالسلام لکھتے ہیں:۔

لا یجب طاعتھما فی کل ما یامران به وینھیان عنه باتفاق العلماء ۱	ہر اس بات میں ان کی اطاعت واجب نہیں ہے جس کا وہ حکم دیں یا جس سے وہ منع کریں۔ اس پر علماء کا اتفاق ہے۔

اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ شریعت نے سوائے خدا کے کسی بھی شخص یا گروہ کی مطلق اطاعت کی بالکل اجازت نہیں دی ہے بلکہ امر فی معروف، میں اطاعت کا حکم دیا ہے۔ معروف میں وہ تمام احکام شامل ہیں جن کو خدا کے دین نے پسندیدہ قرار دیا ہو اور جو معصیت کی تعریف میں نہ آتے ہوں۔ یہی اصول والدین کی اطاعت پر بھی منطبق ہوگا۔ جصاص لکھتے ہیں:۔

طاعة الوالدین واجبة فی المعروف لا فی معصیة اللہ فانہ لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق ۲	والدین کی اطاعت واجب ہے معروف میں، نہ کہ اللہ کی نافرمانی اور معصیت میں۔ اس لیے کہ جہاں خالق کی معصیت لازم آئے وہاں مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

اسی بات کو امام رازی نے ذرا مختلف انداز میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"تم پر والدین کی خدمت اور اطاعت واجب ہے جب تک کہ اس سے اللہ کی اطاعت کو چھوڑنا نہ پڑے لیکن اگر اس کی وجہ سے اللہ کی اطاعت چھوڑنی پڑے تو ان کی اطاعت نہ کرو۔" ۳

اس اصول کی روشنی میں علماء نے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ زندگی کے وسیع دائرے اور چھوٹے بڑے مختلف معاملات میں والدین کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، ان کی اطاعت کے حدود کیا ہیں اور کہاں سے ان کی نافرمانی کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ ابن صلاح کہتے ہیں "شریعت نے والدین کی جس نافرمانی کو حرام قرار دیا ہے اس کا تعلق ان کاموں سے ہے جن سے ان کو سخت تکلیف پہنچے اور ان کا کرنا انسان کے لیے واجب نہ ہو" اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جن چیزوں پر عمل کرنا ضروری قرار دیا ہے ان پر لازماً عمل کیا جائے گا۔ اگر وہ اس سے منع کریں تو ان کی بات نہیں مانی جائے گی اس سے

---

۱ نووی شرح مسلم ۱/۶۵ ۲ احکام القرآن ۲/۲۳۵ ۳ تفسیر کبیر ۶/۷۷ھ

اس سے ان کو سخت تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے۔ مزید فرماتے ہیں کہ اس کی حد بندی ان الفاظ میں بھی کی گئی ہے کہ "وہ تمام کام جو معصیت کے کام نہیں ہیں ان میں والدین کی اطاعت واجب ہے۔ اس طرح کے کاموں میں ان کی مخالفت، نافرمانی سمجھی جائے گی۔[۵۱]

بعض چیزوں کا معصیت ہونا بالکل واضح ہے لیکن بعض چیزوں کے بارے میں یہ فیصلہ کرنے میں خاصی زحمت پیش آتی ہے کہ وہ معصیت کی تعریف میں آتے ہیں یا نہیں ؟ اس طرح کے معاملات میں انسان کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ امام غزالی فرماتے ہیں :۔

"اکثر علماء کے نزدیک ایسے تمام معاملات میں والدین کی اطاعت واجب ہے جن کا حلال یا حرام ہونا مشتبہ ہو البتہ حرام محض میں ان کی اطاعت واجب نہیں ہے۔ یہاں تک کہ اگر تمہارے الگ تھلگ کھانا کھانے کی وجہ سے ان کو تکلیف پہنچے تو تمہارے لیے ضروری ہے کہ ان کے ساتھ مل کر کھاؤ (اس لیے کہ ڈر ہے کہ کہیں یہ بھی عقوق کی حد میں نہ آجائے۔) شبہات سے بچنا عین تقوی ہے اور والدین کی رضاجوئی ضروری ہے۔ اسی طرح تمہیں کسی مباح اور نفل کام کے لیے ان کی اجازت کے بغیر سفر نہیں کرنا چاہیے حج فرض ہے لیکن اس میں جلدی کرنا نفل ہے۔ اس لیے وہ تاخیر سے بھی ادا ہو سکتا ہے جب تاخیر کی گنجائش ہے تو ان کی اجازت کے بغیر حج کے سلسلے میں جلدی کرنا صحیح نہیں۔ اسی طرح طلب علم کے لیے سفر کرنا نفل ہے۔ الا یہ کہ تمہارے سامنے نماز اور روزہ جیسے بنیادی فرائض کا سیکھنا ہو اور جہاں تم رہتے ہو ان، فرائض کی تعلیم دینے والا کوئی نہ ہو یہ صورت حال اس شخص کو پیش آسکتی ہے جو کسی شہر میں پہلی مرتبہ اسلام قبول کرے اور وہاں اسلام کی تعلیم دینے والا کوئی فرد موجود نہ ہو۔ اس طرح کے حالات میں اس کو وطن سے باہر کسی ایسی جگہ جانا ضروری ہوگا جہاں وہ یہ مسائل سیکھ سکے اس کے لیے وہ والدین کی اجازت کا پابند نہ ہوگا۔[۵۲]

شیخ بلقینی امام غزالی کے ہم خیال ہیں لیکن بعض باتیں جن کا امام غزالی نے غیر مشروط ذکر کیا ہے

---

[۵۱] نووی: شرح مسلم ۱/۶۵

[۵۲] احیاء علوم الدین ۲/۱۹۴ مطبوعہ مصر

وہ ان پر کسی قدر پابندی عائد کرتے ہیں۔ وہ پہلے تو اصولی طور پر یہ کہتے ہیں کہ " والدین کو اتنی سی تکلیف پہنچانا بھی عقوق اور نافرمانی ہے جتنی تکلیف کسی دوسرے کو پہنچانا محض ایک صغیرہ گناہ سمجھا جاتا ہے" گویا ان کے نزدیک والدین کو چھوٹی سے چھوٹی تکلیف کا پہنچانا بھی کبیرہ گناہ ہے۔ اس قاعدے کو بیان کرنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ کسی مہم پر جانے سے آدمی کو روکتے ہیں جس میں اس کی جان کے جانے یا کسی عضو کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے تو اسے نہیں جانا چاہیے (اس لیے کہ اس سے ان کو نفسیاتی تکلیف اور صدمہ پہنچے گا۔) ہاں اگر یہ بات محسوس ہو کہ وہ کسی برے ارادے سے منع کر رہے ہیں تو ان کی بات کو نہ ماننا نافرمانی نہیں ہوگا۔ اسی میں وہ ایسے سفر کو بھی شمار کرتے ہیں جس پر جانا والدین کو شاق گذرے اور انسان کے لیے وہ کوئی فرض اور واجب نہ ہو۔ اسی طرح وہ طویل غیر حاضری بھی ان کے نزدیک اسی حکم میں ہے جو نہ تو کسی علم نافع کے سلسلے میں ہو اور نہ کسب معاش کے سلسلے میں۔ یا یہ کہ اس غیر حاضری سے آدمی کی بدنامی کا امکان ہو (جو بالواسطہ خود ان کی بدنامی کا سبب بن سکتی ہے)" [1]

حقیقت یہ ہے کہ یہ سب ہی تجزیے ناکافی ہیں۔ والدین کی اطاعت کے سلسلے میں صرف یہ دیکھنا کافی نہیں ہے کہ وہ کسی معصیت کا حکم دے رہے ہیں یا نہیں بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ اس میں کتنی معقولیت ہے اور اس کے اچھے یا برے کیا نتائج برآمد ہو سکتے ہیں؟ ہر اس معاملے میں ان کی حکم عدولی کو غلط قرار دینا صحیح نہ ہوگا جس کو اصطلاح شرع میں جائز کہا جائے۔ ایک چیز کے حلال اور جائز ہونے کے باوجود ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر حال میں اختیار ہی کی جائے یا لازماً اس سے اجتناب ہی کیا جائے اس کا انحصار انسان کے حالات پر ہوگا۔ وہ اگر اس کو مفید سمجھے گا تو اختیار کرے گا ورنہ نہیں کرے گا فرض کیجیے والدین کسی ایسی بات کا حکم دیتے ہیں جو فی نفسہ ناجائز یا حرام نہیں ہے لیکن اولاد پر اس کے بہت ہی غلط اثرات پڑنے کا امکان ہے۔ ایسی صورت میں اولاد کو والدین کے حکم کا پابند بنانا اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اس سلسلے میں ابن حجر ہیتمی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ وہ والدین کے ہر حکم کی اطاعت کو 'عقوق' نہیں سمجھتے بلکہ اسی حکم کی مخالفت ان کے نزدیک 'عقوق' کی تعریف میں آتی ہے جس کی اہمیت اور معقولیت کو سمجھ دار لوگ تسلیم کریں اور اس کی مخالفت کو 'عقوق' تصور کریں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:-

---

[1] الزواجر عن اقتراف الکبائر ۲/۶۲

"والدین کے ان احکام کی مخالفت کی جا سکتی ہے جوان کی عقل کے ضعف اور رائے کی کمزوری کا نتیجہ ہوں اور جن کو عقلمند لوگ غیر اہم اور بہت معمولی سمجھیں اور ان میں ان کی مخالفت کو ایذا رسانی نہ تصور کریں۔" [1]

اس سلسلے میں ایک حدیث سے بحث کرنا مفید ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں۔ "میری ایک بیوی کو، جس سے مجھے محبت تھی، میرے والد حضرت عمرؓ ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اسے طلاق دے دوں لیکن میں نے طلاق نہیں دی۔ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ فرمایا تو آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میں اسے طلاق دے دوں۔" [2]

اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے امام شوکانی لکھتے ہیں:۔

"یہ صریح دلیل اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کا باپ اس کی بیوی کو طلاق کا حکم دیتے تو اس کو طلاق دے دینی چاہیے، چاہے وہ اس سے محبت ہی کیوں نہ کرتا ہو۔ اس لیے کہ محبت طلاق نہ دینے کے لیے عذر نہیں بن سکتی۔ یہی جیسا حکم ماں کا بھی ہے۔" [3]

اس حدیث سے مطلق یہ نتیجہ نکالنا غالباً درست نہ ہوگا کہ ماں یا باپ کا حکم ہو تو طلاق اور اس جیسے اہم اقدامات بھی ضروری ہیں بلکہ اس سے صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے صاحب زادے سے یہ کیوں کہا کہ وہ بیوی کو طلاق دے دیں! کیا اس کے پیچھے کچھ معقول اسباب تھے یا یہ ان کا ایک بے بنیاد مطالبہ تھا؟ بظاہر حضرت عمرؓ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ انھوں نے محض جذبات میں یا کسی وقتی اور ہنگامی محرک کے تحت اتنے بڑے اقدام کا حکم دیا ہوگا بلکہ زیادہ قرین قیاس بات یہ ہے کہ یہ ان کی ایک سوچی سمجھی اور دلائل پر مبنی رائے رہی ہوگی اور اسی کو وہ حضرت عبداللہ کے حق میں بہتر سمجھتے رہے ہوں گے کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہی خیال ہوتا ہے کہ آپ نے حضرت عبداللہ کو محض والد کے حکم کی اطاعت میں بیوی کو چھوڑ دینے کا حکم نہیں دیا ہوگا بلکہ اس 'ابغض الحلال' پر عمل کرنے کی ہدایت اسی وقت کی ہوگی جبکہ آپ نے حضرت عمرؓ کی رائے کو صائب اور صحیح سمجھا ہوگا ورنہ حضرت عبداللہ کو حکم

[1] الزواجر عن اقتراف الکبائر ۲/۶۲

[2] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی برالوالدین۔ ترمذی و ابن ماجہ ابواب الطلاق　[3] نیل الاوطار ۶/۴

دینے سے پہلے آپ حضرت عمرؓ کو سمجھاتے کہ تمہاری رائے غلط ہے اس پر اصرار نہ کرو۔

اس کے علاوہ یہ ساری بحث اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ یہ بات مان لی جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ کو اپنے والد کی اطاعت کا حکم دیا تھا نہ کہ مشورہ۔ لیکن اگر یہ مشورہ تھا تو اس سے یہ استدلال ہی صحیح نہ ہوگا کہ اس قسم کے احکام میں والدین کی اطاعت ضروری ہے۔ اسی نوعیت کے ایک دوسرے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالباً یہ حکم نہیں مشورہ تھا۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابو درداء سے شکایت کی کہ میرے والد نے سخت اصرار کے بعد ایک جگہ میری شادی کی۔ اب وہی یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اسے طلاق دے دوں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟

حضرت ابو درداء نے جواب دیا کہ "میں نہ تو تمہیں اپنے والد کی نافرمانی کا حکم دوں گا اور نہ یہ کہوں گا کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو۔ البتہ تم چاہو تو ایک حدیث سنا دوں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ باپ جنت کا بہترین دروازہ ہے۔ اب تم چاہو تو اس کی حفاظت کرو۔ یا اسے ضائع کردو۔"[1]

اس واقعہ میں حضرت ابو درداءؓ یہ نہیں فرماتے کہ جب باپ کا حکم ہے تو بیوی کو فوراً طلاق دے دو، بلکہ ان کے انداز بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے لیے باپ کے حکم کی تعمیل کو بہتر تو سمجھتے ہیں لیکن ضروری نہیں سمجھتے۔ پھر اس کے بارے میں یہ کہنا شاید صحیح نہ ہوگا کہ وہ ہر حال میں والدین کی اطاعت کو افضل سمجھتے تھے اور بغیر کسی مضبوط بنیاد کے محض ان کے حکم پر اپنے آباد گھر کو اجاڑ دینا اور خانگی مصیبت میں مبتلا ہو جانا ضروری خیال کرتے تھے اسی وجہ سے بالعموم فقہاء کی یہی رائے ہے کہ والدین کے حکم پر آدمی کے لیے اپنی بیوی کو طلاق دینا ضروری نہیں ہے۔ ابن حجر ہیتمی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ

"اگر ایک شادی شدہ شخص کو اس کے والدین اس بات کا حکم دیں کہ وہ اپنی بیوی کو، جس سے کہ وہ محبت کرتا ہے، طلاق دے دے اور وہ ان کے اس حکم کو نہ مانے تو گنہگار نہ ہوگا، چاہے وہ یہ حکم اس کی بیوی کے باعفت نہ ہونے ہی کی وجہ سے کیوں نہ دے رہے ہوں۔"[2]

اس رائے میں مبالغہ محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن و حدیث کا منشا یہ ہرگز نہیں ہے

---

[1] ترمذی، ابواب البر والصلۃ، باب الفضل فی رضا الوالدین۔ ابن ماجۃ و ابن حبان

[2] الزواجر عن اقتراف الکبائر ۲/۶۲

تعلیمی نظریات پر ایک نظر

(سید منظور الحسن ہاشمی - ناظم درسگاہ)

یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی سرگرمیاں ہر دور میں انسانوں کی توجہ کا مرکز بنی رہی ہیں لیکن علمی سرمایہ کسی ایک ملک یا کسی ایک قوم کے پاس مقید نہیں رہا بلکہ بڑھتا رہا اور پھیلتا رہا۔ کبھی ایک قوم نے اس کی سرپرستی کی تو کبھی دوسری قوم نے۔ تاریخ کا مطالعہ اس حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے کہ جس قوم نے علوم و فنون کی قدردانی کی اور ان سے صحیح معنے میں استفادہ کیا وہ امامت کے منصب پر فائز رہیں اور جن قوموں نے انہیں نظر انداز کیا، یا ان سے غلط استفادہ کیا وہ اپنے بلند مقام کو بہت جلد کھو بیٹھیں اور انہیں دوسروں کا مطیع و فرماں بردار بنکر رہنا پڑا۔ مصر کی تہذیب، چین کا تمدن، یونان کی شائستگی، روما کی عظمت۔ ان سب نے اپنے دور میں علم کی سرپرستی کی اور بام عروج کو پہنچیں اور جب وہ قومیں عیش و عشرت اور رقص و سرود کی محفلوں میں کھو کر علمی کاوشوں سے دور ہوگئیں تو ان کی امامت اور ان کی بلندی افسانہ پارینہ بنکر رہ گئی۔

علم اور امامت کے رشتے کی مولانا مودودی نے اپنی تصنیف "نیا نظام تعلیم" میں اس طرح وضاحت کی ہے:-

"امامت کا دامن ہمیشہ علم سے وابستہ رہے گا۔ جو طبقہ یا گروہ علم کی صفت میں دوسرے طبقے یا گروہوں سے آگے بڑھ جائے گا وہ اسی طرح ان سب کا امام بنے گا جس طرح انسان من حیث النوع دوسری انواع ارضی پر اسی چیز کی وجہ سے خلیفہ بننے کا اہل ہوا ہے۔"

قوموں کے عروج و زوال کو دیکھ کر ذہن میں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کونسا علم ہے جو قوموں کو بام عروج تک پہنچاتا ہے۔ اور وہ کونسی لغزش ہے جو قوموں کو تاریکیوں میں دھکیل دیتی ہے۔

علم کے بارے میں مختلف مفکرین نے مختلف انداز سے باتیں کہی ہیں۔ یہاں ان سب کے خیالات کو پیش کرنا نہ صرف مشکل، بلکہ ناممکن ہے۔ صرف چند مفکرین کے نقطہ ہائے نظر پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

سترھویں صدی میں انگلستان کے ایک بڑے ماہر نفسیات جان لاک نے علم کے بارے میں اس طرح لکھا ہے :۔

"ہمارے مشاہدات جو بیرونی اشیاء کے احساسات پر مبنی ہوں یا اپنے دماغ کی اندرونی کاوشوں سے متعلق ہوں یہی مشاہدات غور و فکر کے لیے مواد فراہم کرتے ہیں۔ یہی صلاحیتیں علم کا سرچشمہ ہیں جہاں سے وہ تمام تخیلات ابھرتے ہیں جو ہمارے اندر پہلے سے موجود ہوں یا فطری طور پر پیدا ہوسکتے ہوں"

جان لاک کے اس اقتباس کو پڑھ کر مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیئے جاسکتے ہیں :۔

۱۔ بیرونی اشیاء جو وجود رکھتی ہیں وہی ہمارے علم کا ماخذ بن سکتی ہیں۔

۲۔ ان کو جب تک آنکھوں سے نہ دیکھا جائے، ان کی آوازوں کو جب تک کانوں سے نہ سنا جائے، ان کے ذائقوں کو جب تک چکھا نہ جائے، ان کی سطحی ماہیت کو جب تک ہاتھوں سے چھوا نہ جائے، ان کی خوشبو یا بدبو کو جب تک سونگھا نہ جائے، اس وقت تک علم یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتا۔

۳۔ ان مادی اشیاء کے علاوہ علم کا ماخذ دماغی کاوشیں بھی ہیں۔

۴۔ دماغی کاوشوں کی بنیاد اندرونی جذبات ہیں ان جذبات سے متاثر ہوکر انسان جو کچھ سوچے اور جن نتائج پر پہنچے وہ علمی نتائج کا سرمایہ بن سکتا ہے۔

مندرجہ بالا نتائج اخذ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خدا پرست جان لاک نے توہم پرست یورپ کو فکر و دانش کے بہت اچھے اصول عطا کیے۔ غور و فکر اور عملی تجربات کے لیے دروازے کھولے مگر ان کے نظام تعلیم میں ایمان بالغیب کی کوئی قیمت اور اہمیت نہیں ہے۔ ان افکار کی بنیاد پر علم اور ادب کی جو بھی عمارت تعمیر ہوگی۔ اس میں خالق کائنات کا تصور، خالقِ کائنات کے احکامات، اس کی بنائی ہوئی جنت اور دوزخ۔ حشر و نشر سے متعلق اس کی تنبیہیں اور سزا و جزا کے بارے میں اس کے قوانین کوئی اہمیت نہیں رکھیں گے۔

ان افکار کے مطابق جو بھی نظام تعلیم مرتب ہوگا وہ بھی خالص سیکولر ہوگا۔ اس میں دین کی کوئی قابل

لحاظ آمیزش نہ ہو گی، اس نظام تعلیم سے تربیت پائے ہوئے نوجوان اچھے قسم کے انجینئر، ماہر معاشیات، ماہر سیاسیات پیدا ہو سکتے ہیں، مگر خدا سے ڈرنے والے آخرت کی جواب دہی کا احساس رکھنے والے اور للہیت کے ساتھ کام کرنے والے پیدا نہ ہوں گے۔

اب ہم انقلاب فرانس کے بانی انفرادیت پسند روسو کے خیالات آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں یہ فرانسیسی مفکر اٹھارویں صدی کے اوائل ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ نظام تعلیم میں نیچریت کی داغ بیل اسی شخص نے ڈالی ہے۔ اپنی ایک تصنیف ایمائل میں روسو نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے،

"نظم قدرت کے تحت تمام انسان مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا مشترک پیشہ انسانیت ہے۔ جو شخص اس طور پر اچھی طرح تربیت حاصل کرے وہ کبھی کسی پیشے کو بری طرح انجام دے ہی نہیں سکتا۔ مجھے اپنے طالب علم کے مستقبل کے بارے میں کوئی فکر نہیں ہے کہ وہ کیا بنے گا خواہ وہ فوج میں داخل ہو یا عبادت گاہ میں رہے یا وکیل کی حیثیت سے زندگی گذارے۔ بلالحاظ اس کے کہ باپ کا پیشہ کیا ہے قدرت اسے انسانی فرائض انجام دینے کے لیے آواز دے رہی ہے، مجھ سے جدا ہونے کے بعد مجھے یقین ہے کہ وہ پہلے مجسٹریٹ یا سپاہی یا مبلغ نہیں بنے گا بلکہ سب سے پہلے وہ انسان بنے گا۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھا ہے:۔

"قدرت کا مشاہدہ کرو اور اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلو"

اسی کتاب میں ایک اور جگہ لکھا ہے:۔

"میں کتاب سے نفرت کرتا ہوں۔ وہ صرف ہمیں ان چیزوں کے بارے میں بحث کرنا سکھاتی ہے جن کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے"

اپنی ایک کتاب "انسان ایک مشین" میں لکھتا ہے:۔

"اے خدائے قادر مطلق انسانوں کے دماغ تیرے قبضے میں ہیں۔ ہمیں اپنے آباء و اجداد کے علوم و فنون سے نجات دے۔ ہمیں جہالت، معصومیت اور غربت پھر سے واپس دیدے یہی وہ تین چیزیں ہیں جو ہمیں مسرت دے سکتی ہیں اور جو تجھے بھی عزیز ہیں"

مندرجہ بالا چند اقتباسات سے روسو کا ذہن اور انداز فکر کافی حد تک سامنے آگیا ہے۔ روسو کے

کے خیالات کی ترتیب اس طرح ہوسکتی ہے :۔

۱۔ تمام انسان ایک دوسرے کے برابر ہیں خواہ امیر ہوں، یا غریب، کالے ہوں یا گورے۔ وہ انسان کو انسان بنانے کا متمنی ہے۔

۲۔ ایسے تمام علوم و فنون جو انسان کو فضول بحثوں میں الجھا دیں ان سے پناہ مانگتا ہے۔

۳۔ اس کی نگاہوں میں تمام کتابیں لایعنی معلومات سے بھرپور ہیں اور انسانیت سے یکسر خالی ہیں سوائے ایک کتاب کے جو رابن سن کروسو ہے۔

۴۔ دانشوروں کا طبقہ اور دولت مندوں کا طبقہ انسانیت سوز زندگی کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ ان سب سے پناہ مانگتا ہے اور جہالت و غربت کو ترجیح دینے پر مجبور ہے۔

۵۔ تمام فلسفوں اور مذہبی تعلیمات سے پیچھا چھڑا کر وہ اپنے شاگردوں کو تعلیم دیتا ہے کہ قدرت کے بتائے ہوئے راستے پر چلو

۶۔ کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم کا آغاز کسی پیشے سے نہ ہو اور نہ کسی پیشے کا رجحان پیدا کیا جائے، بلکہ سب سے پہلے انسان کو انسان بنایا جائے

اس میں شک نہیں روسو کی تحریروں میں خلوص ہے، سادگی ہے اور اس کی آواز ایک دکھے ہوئے دل کی آواز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی تحریروں نے یورپ کے ایک بڑے حصے پر بہت برا اثر کیا۔ اس نے نظام تعلیم کے چند بڑے اچھے اصول دیے۔ معصوم بچوں کو ظالم اور بے شعور استادوں کے ظلم سے نجات دلائی مگر محسوس کرنے والے محسوس کر سکتے ہیں کہ وہ انتشار ذہن کا شکار رہے۔ اگرچہ خدا کا منکر نہیں ہے لیکن مذہب سے برگشتہ ہے۔ کیونکہ مذہب پرست نہ جانے کتنے گروہوں میں بٹ چکے تھے، وہ آپس میں برسرپیکار رہتے اور مذہب کی بنیاد پر نہ جانے کتنی خون ریز جنگیں لڑ چکے تھے۔ دوسری طرف دولتمندوں کا طبقہ انتہائی مغرور عیش پسند اور ظالم و جابر بنا ہوا تھا۔ ان کے کتے عیش کرتے، مگر غریب انسانوں کو روٹی میسر نہ ہوتی تھی۔ ان حالات کے تحت اس نے ماضی سے پوری طرح بغاوت کی اور نیچر کو اپنا رہنما بنا کر صرف اسی سے سب کچھ حاصل کرنا چاہا۔ کاش وہ دین فطرت اسلام کا بھی مطالعہ کرتا تو معلوم ہوتا کہ کئی سو سال پہلے اللہ کی کتاب نے تمام انسانوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ اللہ کے رسول نے عملی شکل میں ایک ایسے معاشرے کی بنیاد رکھی تھی جہاں امیر و غریب، کالے اور گورے سب برابر تھے۔ بہرحال روسو کے نظریات نے زندگی کے

دھارے کو جس طرف موڑتا وہ خدا پرستی سے دور اور نیچر پرستی سے قریب ہوتا گیا وہ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتا تھا کہ بارہ سال تک بچے کو کوئی کتاب نہ پڑھاؤ۔ تربیت کے لیے بالکل نیچر کے حوالے کردو۔ اور اگر وہ ٹھوکر کھانے یا آگ میں انگلی جلانے جا رہا ہو تو اسے ہرگز نہ روکو' اسے خود تجربہ حاصل ہوگا اور پھر خود بخود راہ راست پر آجائے گا۔ مگر تجربے نے بتایا کہ انسان کو پوری طرح جب نیچر کے حوالے کردیا جائے تو وہ انسان نہیں رہتا بلکہ آہستہ آہستہ حیوان میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

لیجیے اب ایک اور ماہر تعلیم پستالوزی کے نظریات کا جائزہ لیں جو سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا اور جس نے تعلیمی نفسیات میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا تھا۔ سال پیدائش ۱۷۴۶ء ہے۔ بڑے اچھے خیالات اور پاکیزہ جذبات کا انسان تھا۔ اس کی دو تصانیف بہت زیادہ مشہور ہیں۔ ایک راہب کی شام' دوسری کتاب لونارڈ اور گرٹ روڈ۔

ایک جگہ اس نے لکھا ہے ۔۔۔ " انسان صرف اسی وقت انسان بن سکتا ہے جبکہ اس کا اندرون بیدار ہو اور اس میں روحانی زندگی پیدا ہو"

روسو کے نظریات سے بڑی حد تک متاثر تھا مگر اس کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کیا کہ بچے کو تربیت کی خاطر بالکل ہی نیچر کے حوالے کر دیا جائے۔ تجربہ کرنا اور خمیازہ بھگتنا' والا نظریہ اس نے بالکل ہی مسترد کر دیا۔ اس نے اس بات پر زور دیا کہ عمل کیا جائے اور سیکھا جائے۔ بچہ کی فطرت کو اس نے تعلیم کا مرکز قرار دیا اور اس نے ہدایت کی کہ مقرون اشیاء کے ذریعے تعلیم دی جائے اور عمل کرنے اور سیکھنے کی قوتوں کو نفسیاتی طریقوں سے ترقی دی جائے۔

اخلاقی تربیت کے سلسلے میں پستالوزی کے نظریات عیسائی رہبانیت سے زیادہ متاثر تھے۔ بچپن میں اسے ایسے استادوں نے تعلیم دی تھی جو خود پاکیزہ تھے مگر راہبانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ راجرز نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے:۔

> "طلبہ پر پروفیسروں کا اتنا اچھا اثر تھا کہ وہ دولت عیش و آرام اور تن آسانیوں سے نفرت کرنے لگے تھے' انہیں کسی چیز کی پرواہ نہ تھی صرف روح اور دماغ کی مسرتوں کو حاصل کرنا چاہتے تھے حق اور انصاف کے لیے سعی پیہم کرتے تھے۔ ایک عرصے تک پستالوزی اور اس کے ساتھی بغیر بستر کے زمین پر لیٹتے رہے۔ سوائے جسم کے کپڑوں کے اوڑھنے کے لیے کوئی چیز نہ ہوتی تھی۔ گوشت ترک

کردیا تھا صرف ترکاری اور روٹی پر زندگی بسر کرتے تھے۔

اس مختصر سے اقتباس کے پڑھنے کے بعد پستالوزی کی ایک زندہ تصویر سامنے آگئی ہے۔ وہ سراپا ایثار و قربانی تھا مگر اس کے نظریے یورپ کی زندگی کا ساتھ نہ دے سکے وہ یورپ جو سائنسی میدان میں غیر معمولی ترقی کا پروگرام رکھتا تھا وہ بھلا ایسی بے مزہ خشک راہبانہ زندگی کو کس طرح قبول کر سکتا تھا۔ یہ تصادم اور ٹکراؤ دراصل اس لیے پیدا ہوا کہ عیسائی مذہب نے دین اور دنیا کو بالکل الگ الگ بانٹ دیا۔ کچھ لوگ دنیا سے بالکل کٹ گئے اور خانقاہوں میں بیٹھ گئے اور باقی انسان مادی دنیا میں اس قدر لت پت ہوئے کہ انھیں اس بات کا ہوش نہ رہا کہ حرام کونسی چیز ہے اور حلال کون سی؟

دنیا نے دیکھا کہ پستالوزی جیسے HUMANIST کے نفسیاتی نظریوں کا بڑا خیر مقدم کیا گیا۔ اسکولوں میں وہ طریقے رائج ہوئے اور ان سے بڑی حد تک استفادہ کیا گیا مگر اخلاقی تربیت کے روحانی طریقے سب کے سب دھرے رہ گئے۔

اب آئیے ایک اور ماہر نفسیات اور ماہر تعلیم کے اصولوں کا مطالعہ کریں۔ یہ جرمنی کی مشہور و معروف شخصیت فروبل ہے جو ۱۷۸۲ء میں پیدا ہوا تھا۔ اسے "بابائے کنڈر گارٹن" کہا جاتا ہے۔ یہ شخص IDEALISM فلسفہ سے کافی متاثر تھا۔ کانٹ، فشتے، شلنگ اور ہیگل کے خیالات سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ IDEALISM کے حامی عیسائی مذہب اور خالق کائنات کے وجود کو اپنے نظام تعلیم میں مرکزی حیثیت دیتے تھے۔ چنانچہ فروبل اس حقیقت پر کامل یقین رکھتا تھا کہ ساری کائنات کا نظم ایک قادر مطلق کے ہاتھ میں ہے۔

اس کا نفسیاتی نقطہ نظر یہ تھا کہ ایک بچہ جو آگے چل کر جس قسم کا انسان بننے والا ہے وہ ساری صلاحیتیں اس کے اندر موجود رہتی ہیں۔ استاد کا یہ فریضہ ہے کہ ان صلاحیتوں کو پہچانے اور اسی کے مطابق تعلیم دے۔

فروبل نے کھیل کے طریقے سے تعلیم دینے کے بڑے عمدہ اصول مرتب کیے اور بہت سے تعلیمی آلات بھی ایجاد کیے جو بچوں کے لیے دلچسپ کھلونا ہوتے تھے اور جن کے ذریعے تعلیم بھی دی جا سکتی تھی۔

فروبل نے معلم کو ایک باغبان سے تشبیہ دی ہے جس طرح ایک مالی کو پیڑوں سے محبت ہوتی ہے وہ اپنے باغ کو سرسبز و شاداب رکھنے کے لیے ہر وقت لگا رہتا ہے۔ وقت پر آبیاری کرتا ہے۔ خودرو

گھاس کا اکھاڑنا، پودوں کے حسن کو برقرار رکھنا، پھولوں اور پھلوں کی نگہداشت کرنا اس کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہوتا ہے اسی طرح بچوں کے باغ میں ایک معلم باغبان کی حیثیت سے ہر وقت چوکنا رہتا ہے
اس کے نصاب تعلیم میں مذہبی تعلیم کو اولیت حاصل تھی۔ اس کے بعد سائنس اور ریاضی تھی
بعد میں زبان اور آرٹ شامل تھے۔

امریکہ فروبل کے اصولوں سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ تقریباً دس ہزار امریکیوں نے جرمن اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی ان سب نے جرمنی کے نظام تعلیم کو بہت پسند کیا اور اسے امریکہ میں رائج کرنے کی پُرزور سفارش کی۔

فروبل کے تعلیمی اصول آج بھی زندہ ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں کثرت سے کنڈرگارٹن قائم ہیں جس میں چھ سال کے کم عمر بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ان اسکولوں میں زیادہ تر فروبل کے اصولوں کی کارفرمائی ہے لیکن پستالوزی کی طرح اس کے تصورات مذہب کے بارے میں جو کچھ تھے اسے دنیا نے بہت کم اختیار کیا ہے۔ ایک معصوم بچے میں جس انداز سے خدا کا تصور وہ بٹھانا چاہتا تھا آج وہ بالکل مفقود ہے۔ عیسائی مشنریز آج کل بھی خدا کا تصور اور مذہبی روح پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن ان کی کوششیں رائگاں ہو جاتی ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ اور امریکہ نے دنیا اور دین کو علیحدہ علیحدہ خانوں میں بانٹ دیا۔ رفتہ رفتہ دنیا غالب آجاتی ہے۔ اور دین دھندلا اور مغلوب ہو کر بالکل غائب ہو جاتا ہے۔

۱۷۷۶ء میں ایک دوسرا ماہر تعلیم جرمنی میں پیدا ہوا تھا یہ تھا ماہر نفسیات ہربارٹ اسے "بابائے نفسیات جدید" کہتے ہیں اسے پستالوزی کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے اس نے پستالوزی کے مقابلے میں زیادہ بہتر طریقے سے نفسیاتی اصول مرتب کیے۔ اسے "بابائے نظام تعلیم جدید" کہا جاتا ہے۔ افلاطون کی طرح اس نے پہلے ایک استاد کی حیثیت سے عملی طور پر تجربات حاصل کیے۔ اس کے بعد فلسفہ تعلیم مرتب کیا۔ ۱۸۰۶ء میں نظام تعلیم پر اس نے جو کتاب مرتب کی تھی آج بھی ماہرین تعلیم اس کا بہت احترام کرتے ہیں اور ان کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے گویا آج کے زمانے کو پیش نظر رکھ کر اس نے کتاب لکھی تھی۔ ایک جگہ لکھتا ہے۔

"انسان کی قدر و قیمت اس کے جاننے میں اتنی نہیں ہے جتنی کہ اس کی قوت ارادی میں

ہے۔ قوت ارادی اس کے تخیلات سے پیدا ہوتی ہے۔

ہربارٹ نے نفسیاتی نقطہ نظر سے پڑھانے کے اصول مرتب کیے۔ ایک معلم کے درس کو اس نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے:۔ (۱) تیاری (۲) پیش کش (۳) ارتباط (۴) تعمیم (۵) استعمال

موجودہ نظام تعلیم ہربارٹ کے اصولوں کا بہت کچھ ممنون احسان ہے۔

سماج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے ہربرٹ اسپنسر نے عمرانی تحریک کا آغاز کیا۔ وہ ۱۸۲۰ء میں انگلستان میں پیدا ہوا تھا۔ اس نے پیشہ ورانہ مہارت اور شہری تربیت پر بہت زیادہ زور دیا۔ روحانی تربیت کو اس نے بے معنی قرار دیا اور انسانی زندگی کو اسی حالت میں دیکھنا چاہا جس طرح کہ نظر آتی ہے اس نے بتایا کہ انسانی اقدار معاشرے سے حاصل ہوتی ہیں۔ ایک فرد بہترین حیثیت اس وقت تک حاصل نہیں کرسکتا جب تک کہ وہ سوشل نہ بن جائے۔

بچے کے اندر پوشیدہ صلاحیتوں سے اس نے انکار کیا اور کہا کہ تمام انسانی اوصاف کسبی ہوتے ہیں۔ سماج ایک کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر طالب علم کے لیے ضروری ہے۔ یہ انداز فکر خدا اور مذہب کے خلاف ایک کھلی ہوئی بغاوت تھی۔ اب تک ماہرین تعلیم خدا کا نام لیتے تھے۔ روحانی تربیت پر زور دیتے تھے۔ اخلاقی اقدار کی بنیاد مذہب پر رکھتے تھے۔ مگر ہربرٹ اسپنسر نے مذہب کو خیرباد کہا اور نظام تعلیم کو بالکل سیکولر بنا دیا۔

پہلی جنگ عظیم نے جرمنوں کے خلاف نفرت کا جذبہ کئی ممالک میں پیدا کر دیا تھا وہ ممالک جو فروبل کے اصولوں کے مداح تھے اب ان سے متنفر ہو گئے۔ ان دنوں مادام مانٹی سوری کے دلکش اصولوں نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس ماہر تعلیم خاتون کے بارے میں آئندہ پھر کبھی کچھ لکھا جائے گا۔ اب ہم آپ کو امریکہ کے ماہر تعلیم ڈیوی DEWEY کے بارے میں کچھ بتائیں گے جو انیسویں صدی کا ایک بڑا ماہر نفسیات ہے اس کی پیدائش ۱۸۵۹ء میں ہوئی تھی۔ اس نے امریکہ کے نظام تعلیم کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ اسے جمہوریت اور تجربیت PRAGMATISM کا علمبردار کہتے ہیں۔ شگاگو یونیورسٹی میں جب وہ پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتا تھا تو اس نے شگاگو ہی میں نئے طرز پر الیمنٹری اسکول کی بنیاد رکھی اس کا فلسفہ تعلیم انفرادیت اور عمرانیات کے اصولوں کا ایک دلچسپ امتزاج تھا۔ اس نے اس بات پر بڑی شدت کے ساتھ زور دیا کہ بچے کے تجربات معروضی اور ٹھوس ہونے چاہییں اور انھیں تجربات

کو تعلیم کا مرکز بنانا چاہیے۔ تعلیمی اداروں میں بچوں کو اس انداز سے تیار کیا جائے کہ وہ جمہوری معاشرے کے ڈھانچے میں عمدگی کے ساتھ فٹ ہو سکیں۔ اسکول کو اس نے سماجی زندگی کا گہوارہ قرار دیا۔ ایک ایسا مقام جہاں زندگی کی پیچیدگیاں اور الجھے ہوئے مسائل سلجھائے جائیں انہیں پاکیزگی عطا کی جائے اور ان میں توازن پیدا کیا جائے۔

ڈیوی کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم عملی زندگی اور علوم و فنون کا امتزاج تھا جہاں زندگی کو مرکزیت حاصل تھی اور طلبہ اسکول کی چار دیواری میں ان سب مسائل کا حل اپنے عمل کے ذریعے خود نکالتے تھے۔ تجربیت کی اس تحریک نے دنیا کو بہت جلد اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

قدیم آئڈیلیسٹ قسم کے لوگ یونانی اور لاطینی زبانیں سکھانا اور پڑھانا، قدیم فلسفوں میں الجھنا اور بحثیں کرنا معیارِ شائستگی اور معیارِ قابلیت سمجھتے تھے۔ مگر ڈیوی کے تجرباتی اصولوں نے ان رجحانات کو ایک دم بدل دیا اور اب دنیا ڈیوی کے بنائے ہوئے اصولوں کی طرف تیزی کے ساتھ لپکی۔

غور و فکر کے بارے میں ڈیوی نے ذہن کے مندرجہ ذیل پانچ اقدامات دلچسپ انداز میں بیان کیے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے کسی مسئلے کی دشواری یا ضرورت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔
۲۔ اس مسئلے پر دماغ پھر سوچنا شروع کر دیتا ہے۔
۳۔ پھر اسے حل کرنے کے لیے دماغ کچھ تدبیریں پیش کرتا ہے۔
۴۔ ہر تدبیر کے بارے میں تفصیلات سامنے آتی ہیں اور کسی ایک کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔
۵۔ مزید مشاہدات اور تجربات اس حل کے قبول کیے جانے یا مسترد کیے جانے کی طرف لے جاتے ہیں۔

جان ڈیوی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا ہے ـــــــ :۔ "ایک بچے کی صلاحیتیں، دلچسپیاں اور عادتیں نفسیاتی انداز میں دیکھ کر اس کی تعلیم و تربیت کا آغاز کرنا چاہیے۔ ان قوتوں، دلچسپیوں اور عادتوں کی مسلسل وضاحت کرنی چاہیے اور ہمیں جاننا چاہیے کہ ان کا کیا مطلب ہے۔ پھر سماجی زندگی کی اصطلاحات میں ان کی تعبیر کرنی چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ سماجی خدمات کے لیے وہ کس قسم کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ڈیوی دماغ کو سوشل بنانا چاہتا تھا۔ ایک جگہ لکھتا ہے :۔ " ایک سوشل دماغ ایک قوت ہے

جو مسائل کو اجتماعی انداز میں سمجھ سکتا ہے" اور اسی مفہوم میں دماغ کو سوشیل کنٹرول کا ایک ذریعہ قرار دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ "اسکول ایک جمہوری سوشیل ادارہ ہے اور تعلیم ایک سوشیل طریقہ کار ہے"

ڈیوی کے نظریات کی بنیاد پر کلپیٹرک نے پراجکٹ میتھڈ کا آغاز کیا جس میں کسی ایک مسئلے کو بنیاد بنا کر تمام طلبہ اس کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اسے اجتماعی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں تمام علوم کے سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً ایک کیاری پراجکٹ کے طور پر پیش نظر ہو تو طلبہ اس میں پھول اور ترکاری اگانے کے سلسلے میں مصروف رہتے ہیں اس کام میں وہ لمبائی چوڑائی ناپیں گے، رقبہ معلوم کریں گے، نباتیات کا علم انہیں حاصل ہوگا، جغرافیہ کے اصول سے بھی واقفیت ہوگی، سائنس کے آلات سے بھی سابقہ پڑے گا کیمیائی کھاد کا مشاہدہ کریں گے۔ اشتراک اور تعاون کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اجتماعی اخلاق تربیت پائیں گے۔ اس کام کے سلسلے میں طلبہ مضامین لکھیں گے، تقریریں کریں گے۔ اس طرح زبان اور ادب کی تعلیم ہوگی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بھی ڈاکٹر ذاکر حسین کی نگرانی میں پراجکٹ میتھڈ استعمال کیا ہے۔ اس ادارہ نے اس طریقہ کار میں ایک دلچسپ تجربہ یہ بھی کیا کہ اسے اسلامی رخ پر لے جانے کی کوشش کی۔ مثلاً میلاد پر پراجکٹ رکھا گیا جس کے ذریعے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کے مختلف پہلو سامنے آئے۔

بلاشبہ ڈیوی نے جدید نظام تعلیم میں بڑا اونچا مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے اصولوں نے طریقہ تعلیم میں حیرت انگیز انقلاب برپا کیا۔ کتابوں کے صرف کیڑے بنے رہنا اور عملی زندگی سے بے تعلق رہنے کا اصول ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ طلبہ جمہوری انداز میں اسکولوں اور کالجوں میں زندگی کے تجربات حاصل کرتے ہیں۔ تمام حسی قوتیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ انھیں پروان چڑھایا جاتا ہے اور وہ بڑی کامیابی کے ساتھ سائنسی اصولوں کو زندگی سے مربوط کرتے ہیں۔

دنیا اس توقع میں تھی ان اصولوں کی بنیاد پر نیا معاشرہ دنیا کے لیے مسرتیں لے کر آئے گا۔ اس میں شک نہیں امریکہ کے نئے نظام تعلیم نے ایسے سائنس داں اور ماہر معاشیات پیدا کیے جنھوں نے سرزمین امریکہ کو فرحت گاہ بنا دیا ہے۔ بڑے بڑے کارخانے دن رات کام کر کے نئے نئے آلات اور نئی نئی مشینیں بنا رہے ہیں۔ جنھوں نے انسانوں کے کھانے پینے پہننے، سفر کرنے کی تمام ضروریات کو بڑی خوبصورتی سے حل کر دیا ہے زراعت کے بڑے بڑے فارم، دریاؤں کے بڑے بڑے پراجکٹ غلہ نہیں، سونا اگا رہے ہیں۔ سائنس کی تعلیم

نے انہیں کرۂ ارضی سے اٹھا کر چاند کی سطح پر پہنچا دیا ہے۔ مگر اخبارات کے صفحات بتا رہے ہیں کہ امریکہ میں اسباب عیش و راحت کی فراوانی کے باوجود جو چیز ڈھونڈے سے نہیں ملتی وہ ہے ذہنی سکون۔

بڑے بڑے ماہرین نفسیات دن رات سوچتے رہتے ہیں کہ امریکہ کے نوجوان بے چین کیوں ہیں۔ توڑ پھوڑ اور ہنگاموں کے واقعات کیوں بڑھتے جا رہے ہیں بے حیائی اور عریانی نقطہ عروج پر کیوں پہنچ رہی ہے جرائم کی تعداد میں روز بروز اضافہ کیوں رہا ہے۔ ان سوالات کے جوابات مختلف انداز سے لوگ سوچتے ہیں مگر ان کا صحیح حل ابھی تک نہیں معلوم ہو سکا۔

ان حالات کو پڑھ کر مذہب پرست لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ سب نتائج ہیں مذہب بیزاری کے۔ اگر مذہبی تعلیم ہوتی تو یہ آوارگی اور بے راہ روی نہ ہوتی مگر تاریخ کے طالب علم کے سامنے زندگی کا وہ رخ بھی موجود ہے کہ مذہب پرستوں نے مذہبی جنون کے تحت خدا اور خدا کے رسول کا نام لے کر نہ جانے کتنا خون بہایا، کتنا ظلم کیا۔ روحانیت کی آڑ میں نہ جانے کتنے گناہ اور کتنی سیاہ کاریاں ہوئیں۔ یورپ کے عیسائیوں اور یہودیوں نے ایسا ہی کیا اور مسلمانوں میں بھی سیہ کاروں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے۔

ان سب حالات پر غور کرنے سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جس طرح لادینی ادارے دنیائے انسانیت کو تباہ کرتے ہیں اسی طرح دینی ادارے بھی غلط انداز سے مذہبی تعلیم دے کر انسانوں کو ناکارہ بنا دیتے ہیں اور انسانیت کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اس موقع پر اورنگ زیب کی گفتگو کا ایک حصہ پیش کر دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ یہ گفتگو . . . . . . سے ہوئی تھی جس کا ایک طویل اقتباس "مسلمانوں کا عروج و زوال" میں مولانا سعید احمد صاحب نے نقل فرمایا ہے

"اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا اور رائے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا یا مجھے وہ باتیں پڑھاتے جن سے روح کو عظمت حاصل ہوتی ہے یا وہ اصول بتلاتے جن سے حوادث زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کر سکتے ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کرا دیتے۔ یا مجھے دنیا کا، اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے۔"

اورنگ زیب کی تعلیم کے لیے اس دور کے بہترین اساتذہ مقرر کیے گئے ہوں گے۔ ان کی تعلیم و تربیت ہی کی بدولت وہ ایک بہترین قسم کا سپاہی، بیدار مغز شہنشاہ اور منکسر المزاج مومن بنا۔ لیکن بعض اساتذہ سے اسے شکایت رہی جن میں ایک وہ تھے جن کے بارے میں اقتباس دیا گیا ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس سے نظام تعلیم کے بارے میں اورنگ زیب کے نقطہ نظر کے حامل مندرجہ ذیل اصول مرتب کیے جا سکتے ہیں:۔

۱۔ نظام تعلیم نفسیات کی بنیاد پر ہونا چاہیے جو انسانی فطرت کے رموز سے واقف کرائے۔

۲۔ نظام تعلیم صرف نظری نہ ہو بلکہ عملی اور تجرباتی ہو۔

۳۔ اس کے اصولوں میں اتنی قوت اور پاکیزگی ہو کہ روح کو عظمت حاصل ہو سکے۔

۴۔ اس کے اصول اتنے جاندار ہوں کہ متعلم میں جرأت، استقلال اور انکسار پیدا ہو سکے۔

۵۔ اس نظام تعلیم میں شریعت کے اصولوں کے علاوہ تاریخ، جغرافیہ، سیاسیات وغیرہ کی تعلیم بھی شامل ہو۔

مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں اسلامی نظام تعلیم یقیناً جاندار تھا۔ اس کے شاندار نتائج دنیا کے سامنے آئے۔ ان کی تفصیلات دینے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ ان شاء اللہ آئندہ کبھی تفصیل سے لکھا جائے گا۔ لیکن مسلمانوں کے زوال کے مختلف اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم تعطل اور جمود کا شکار ہو گیا۔ قدیم ترین مسائل، قدیم ترین انداز مناظرہ، قدیم منطق، قدیم فلسفہ آج تک بہت سے دینی اداروں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ جہاں سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جو بے معنی قسم کی بحثیں تو کر سکتے ہیں مگر جدید حالات اور جدید مسائل سے بالکل ناواقف ہیں۔

اب آئیے دیکھیں، مولانا مودودی نے نظام تعلیم کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ مضمون کے ابتدائی حصہ میں تعلیم کے بارے میں مولانا مودودی کا نقطہ نظر پیش کر چکا ہوں۔ اب ایک دوسرا اقتباس پیش کیا جا رہا ہے۔

"نیا نظام تعلیم" میں مولانا نے تحریر فرمایا ہے:۔

"علم سے کیا مراد ہے۔ اس مسئلے کا حل سمع بصر اور فواد کے الفاظ ہی میں پوشیدہ ہے۔ کلام الٰہی میں یہ تینوں لفظ مجرد سننے دیکھنے اور سوچنے کے معنے میں استعمال نہیں ہوئے ہیں۔ بلکہ سمع سے

مراد دوسروں کی فراہم کردہ معلومات حاصل کرنا ہے۔ بصر سے مراد خود مشاہدہ کرکے واقفیت بہم پہنچانا ہے اور فواد سے مراد ان دونوں ذرائع سے حاصل کی ہوئی معلومات کو مرتب کرکے نتائج اخذ کرنا ہے۔"

اس اقتباس کے مطالعہ سے تعلیم کے مندرجہ ذیل اصول مرتب ہوتے ہیں:۔

۱۔ اسلامی نظام تعلیم میں حواس کا استعمال اور اس کی تربیت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔
۲۔ نفسیاتی انداز سے تعلیم دینا الہامی طریقہ کار ہے۔
۳۔ تمام سابقہ علوم و فنون سے استفادہ کو نہ صرف مفید بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے
۴۔ نئے نئے مشاہدات اور تجربات نہ صرف دنیا کے نقطہ نظر سے بلکہ دینی نقطۂ نظر سے بے انتہا ضروری ہیں۔
۵۔ سوچنا غور و فکر کرنا اس نظام تعلیم کا ایک اہم ترین رخ ہے

ان پانچ باتوں کی اگر مزید وضاحت کی جائے تو اس میں جدید مغربی نظام تعلیم کے تمام فلسفوں کے اچھے پہلو آجاتے ہیں۔

IDEALISM کا یہ پہلو کہ خالق کائنات انسانی اقدار کا سرچشمہ ہے اس میں موجود ہے ـــــ HUMANISM کا یہ پہلو کہ تقوی اور انسانیت کا احترام نظام تعلیم کی بنیاد ہے اس کی روح بھی یہاں کارفرما ہے۔

ENCY COPAEDISM کا یہ رخ کہ کتابی علوم ذہنی تربیت کے لیے بہت ضروری ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی اسلامی نظام میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

NATURALISM کا یہ انداز کہ بچے کو فطرت کے حوالے کر دیا جائے فطرت اسے خود تعلیم دے گی اگر اس میں غلو نہ ہو تو اسلامی نظام تعلیم فطرت کی کتاب پڑھنے اور سبق حاصل کرنے پر کافی زور دیتا ہے

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم جو ساری دنیا کی قیادت کرنے والے تھے آپ کی ابتدائی تربیت بھی ایک کھلی ہوئی دیہاتی فضا میں پہاڑوں اور میدانوں میں بکریاں چراتے ہوئے فطری انداز میں ہوئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا یہ دور بھی نظام تعلیم کو چند بہترین فطری اور نفسیاتی اصول عطا کر سکتا ہے

REALISM کی الحاد پرستی کا اسلامی نظام تعلیم بالکل ضد ہے اور اس نے جو فساد دنیا میں پھیلا رکھا ہے اسے بڑی قوت اور دانش مندی کے ساتھ اسلامی نظام دور کرنے کی صلاحیت اور قوت رکھتا ہے۔ لیکن اس نظام نے سائنس پر جس قدر زور دیا ہے اسلامی نظام اس سے پیچھے نہیں ہے۔

ڈیوی نے جس PRAGMATISM تجربیت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اس کی بھی اسلامی نظام تعلیم میں اچھی خاصی گنجائش موجود ہے۔ البتہ اسلام ان تجربات پر پابندی عائد کرتا ہے جو حیا سوز اور انسانیت سوز ہوں یا کسی اور لحاظ سے حرام چیزوں کے دائرے میں آرہے ہوں۔

مغربی نظام تعلیم نے مخلوط تعلیم کا تجربہ کیا۔ جدید نصاب تعلیم نے خشتیہ افسانے اور ناولیں پڑھائیں۔ جنسی معلومات بہم پہنچانے کے لیے جنسی مضامین، تصاویر اور فلم وغیرہ دکھائے۔ جذبات کے احترام میں انفرادی آزادی کو کھلی چھٹی دے دی۔ آرٹ کے نام پر عورت کو عریاں کرکے کینوس پر پیش کیا۔ پھر اسے اسٹیج پر گھسیٹ لائے۔ شادی سے پہلے کورٹ شپ کی اجازت دی۔

ان سب تجربات کا انجام کیا ہوا؟ جنسی انارکی، اخلاقی بے راہ روی، ذہنی انتشار۔ اسلام اس قسم کے تجربات کی کبھی اجازت نہ دے گا۔ کیونکہ خالق کائنات اچھی طرح جانتا ہے کہ کون سی باتیں انسان کے لیے مفید ہیں اور کون سی مضر؟

ہمارے ملک میں مغربی تعلیم کی اندھی تقلید نے ایسے نوجوانوں کی ایک فوج تیار کرلی ہے جو قابلیت تو کم رکھتے ہیں مگر قابلیت کا زعم ان میں بہت زیادہ ہے۔ لڑکیوں کو چھیڑنا، استادوں کو مارنا، قتل کی دھمکی دینا۔ مذہب کا مذاق اڑانا، بے ٹکٹ سفر کرنا۔ جوا کھیلنا، شراب پینا، بدکاریوں میں لت پت ہونا، اب آئے دن کا مشغلہ بن گیا ہے۔ افسوس ٹیگور، گاندھی جی اور رادھا کرشنن جیسے مخلص مفکرین کی مذہب پسندی بھی آنے والے سوشل نظام کو نہیں روک سکی۔

مسلمانوں کے اسکولوں اور کالجوں میں اسلامیات کا ایک چھوٹا سا دم چھلا لگا دیا جاتا ہے اور سب مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے حق ادا کر دیا۔ مگر اس تضاد اور ٹکراؤ کو دیکھیے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے اسلامیات کے گھنٹہ میں مولوی صاحب بتاتے ہیں کہ کائنات اور کائنات کی تمام اشیاء کو پیدا کرنے والا ایک خدا ہے۔ سائنس اور جغرافیہ کے گھنٹے جب ہوتے ہیں تو پروفیسر صاحبان ان ہی لڑکوں کو پڑھاتے ہیں کہ کائنات اور کائنات کی تمام چیزیں خود بخود وجود میں آگئیں۔ بتلائیے لڑکے کس کی بات مانیں گے

اور ان کے ذہن میں جو فکری ٹکراؤ اور انتشار پیدا ہو رہا ہے اس کی وجہ سے ان کا ذہن اور ذہن کا انداز فکر کیا ہوگا۔

کاش ان حالات کو دیکھ کر اسلام پسند طبقہ کچھ تو جھرجھری محسوس کرے۔ آنکھوں سے ہم دیکھیں کہ ہمارے معصوم بچے تباہی کے تاریک گڑھوں کی طرف تیزی سے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر بھی ہم کچھ نہ کریں، طاغوتی نظام ہماری پوری نسل کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کرے اور ہم یونہی افسوس کرتے رہیں۔

اسلامی نظام تعلیم دنیا کو تباہی سے اب بھی بچا سکتا ہے بشرطیکہ اسلام کا نام لینے والے اسے قائم کرنے کی کچھ تو کوشش کریں۔

سبق پھر پڑھ، صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا، تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

(بقیہ صفحہ) کہ والدین کے ہر حکم کی بے چون وچرا اور آنکھ بند کر کے اطاعت کی جائے۔ البتہ وہ یہ ضرور چاہتے ہیں کہ ان کی کسی معقول بات کو رد نہ کیا جائے۔ ان کی ہدایات کا احترام کیا جائے اور اپنی حد وسع کے اندر ان کو خوش رکھنے اور ان کو آسائش و راحت فراہم کرنے کی کوشش کی جائے۔

خوش حال بے چینی

تہذیب جدید کے مرکز سے امن و ایمان کے مرکز تک

از محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)

برلن میں، میں اور میری بیوی عارضی طور پر مقیم رہے جہاں میرا ارادہ تھا کہ سیاسی جغرافیائی اکیڈمی کے لیکچر زپورے کرلوں اور ساتھ ہی اسلامیات کا مطالعہ جاری رکھوں۔

میرے پرانے دوست اور رفیق دوبارہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، مگر ہمارے لیے گزشتہ تعلقات کو اسی آن بان سے باقی رکھنا آسان نہ تھا جس حال پر ہم نے مشرق وسطیٰ کے سفر کے وقت اُسے چھوڑا تھا حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک دوسرے سے بہت دور ہو چکے تھے۔ ہماری عقلیت کی زبان بھی مختلف تھی، خاص طور پر میں اپنے کو اس بارے میں قاصر پاتا تھا کہ اپنے دوستوں کو اسلام کے ساتھ اپنی فریفتگی اور مشغولیت کی وجہ سمجھا سکوں۔

جب میں اسلام کی عقلی اور اجتماعی شرح ان کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتا تو وہ حیرت سے سر ہلاتے۔ اگرچہ بعض اوقات وہ بعض اسلامی خیالات کی تائید بھی کرنے لگتے تھے۔ لیکن بیشتر لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ادیانِ قدیمہ زمانۂ قدیم کے ساتھ مخصوص تھے۔ ہمارے زمانے کو ایک نئے انسانی نظریہ کی ضرورت ہے لیکن وہ لوگ بھی جو ایک باقاعدہ دین کی ہر صلاحیت کے منکر نہیں تھے وہ بھی اس مغربی خیال سے متاثر تھے کہ اسلام کو (باوجود دنیاوی امور کی طرف توجہ کرنے کے) بہرحال ان چیستانوں اور پہیلیوں کے ناقابل فہم عقائد و مسائل کی ضرورت ہے جو ان کی نظر میں ایک دین میں ضرور پائی جانی چاہییں اور جن کے بغیر کوئی دین، دین نہیں معلوم تھا۔

مجھے سخت حیرت تھی کہ جس شعبے نے شروع ہی سے مجھے اسلام سے متاثر کیا یعنی روح اور مادہ کی

عدم تقسیم اور عقل کی افادیت اور ضرورت پر زور اس حیثیت سے کہ وہ ایمان کا ایک ذریعہ ہے، وہ مفکرین کی ایک بہت محدود تعداد کو متاثر کر سکا، وہ مفکرین جو عقل سے زندگی میں اس کی استعداد و صلاحیت سے زیادہ اور بڑا کام انجام دینے کا مطالبہ کرتے تھے، بات یہ ہے کہ وہ صرف ذہنی دائرے کے اندر فوری طور پر اپنے عقلی اور عملی موقف سے پیچھے ہٹ جاتے تھے اس حیثیت سے میں اپنے ان قلیل التعداد دوستوں کے درمیان جو ذہنی رجحانات رکھتے تھے اور ان کثیر التعداد اشخاص کے درمیان جن کے یہاں محض ایک جامد تقلید کا نام تھا، کوئی فرق نہ کر سکا

جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ میں اسلام کی طرف کھنچ رہا ہوں لیکن ایک آخری تردد مجھے قطعی فیصلے سے باز رکھتا تھا۔ اسلام قبول کرنا درحقیقت ایک ایسے پل سے گذرنا تھا جو ایک ایسے گڑھے پر قائم ہے جس کا ایک سرا ایک دنیا میں ہے اور دوسرا دوسری دنیا میں، یہ اتنا طویل پل تھا کہ جس کا دوسرا سرا اس وقت تک نظر آنا مشکل تھا جب تک کہ آدمی اتنی دور پہنچ جائے جہاں سے واپسی ناممکن ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اگر میں مسلمان ہو گیا تو مجھے اس دنیا سے جس میں، میں نے پرورش پائی تھی ہر تعلق منقطع کر لینا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی نتیجہ نہیں تھا۔ اس لیے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر لبیک بھی کہے اور اپنے ان داخلی روابط و تعلقات کو بھی برقرار رکھے جو اس کو ایسے معاشرے سے وابستہ کرتے ہیں جن کے اصول و مبادی براہ راست اسلام سے متصادم ہیں۔

لیکن کیا اسلام واقعی خدا کا پیغام ہے ؟ یا وہ محض ایک بڑے آدمی کی دانائی اور نتیجہ فکر ہے جو غلطی سے پاک نہیں۔

خوش حال بے چینی

ستمبر ۱۹۲۶ء میں ایک مرتبہ اپنی بیوی کے ساتھ برلن کی زمین دوز ٹرین پر سوار تھا کہ اچانک میری نظر ایک آدمی پر پڑی جو میرے سامنے والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا وہ کوئی دولتمند اور خوش حال تاجر معلوم ہوتا تھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بیگ اس کی گود میں رکھا تھا اور ہیرے کی ایک بڑی سی انگوٹھی اس کی انگلی میں نظر آ رہی تھی، دفعۃً مجھے خیال آیا کہ یہ دراصل اس خوش حالی اور فارغ البالی کا عکس ہو جو ان دنوں وسط یورپ میں ہر شخص میں دیکھی جا سکتی تھی اس خوش حالی سے پہلے افراط زر کے بھیانک دور سے گزرے تھے جنھوں نے اقتصادی زندگی کو بالکل درہم برہم کر دیا تھا اور بدحالی اور بے ہیئت میں

رہنما بھی اصول بن گیا تھا۔ لیکن اب لوگوں کی اکثریت اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ شخص جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا لوگوں سے کچھ مختلف اور نیا نہ تھا لیکن جب میں نے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی مطمئن اور پرمسرت چہرے کو نہیں دیکھ رہا ہوں وہ مجھے بےچین اور غیر مطمئن نظر آیا، صرف بےچین ہی نہیں بلکہ بہت زیادہ غمزدہ اور حرماں نصیب بھی۔ اس کی نظریں کھوئی ہوئی خلا کو گھور رہی تھیں اور اس کے ہونٹ کے دونوں کنارے کسی تکلیف سے بھنچے ہوئے تھے۔ ایک غیر جسمانی تکلیف۔

اگر بداخلاقی اور بدتمیزی پر محمول نہ کیا جائے تو میں کہوں کہ اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیا، اس کے پہلو میں ایک مہذب خاتون بھی بیٹھی ہوئی تھیں، ان کے چہرے پر بےچینی اور بےاطمینانی کے آثار تھے جیسے وہ کسی ایسی چیز کے متعلق سوچ رہی ہوں جس کے سوچنے سے انہیں تکلیف ہو رہی ہو۔ ایک پھیکی مسکراہٹ، ان کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی تھی جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کا تعلق عادت سے تھا پھر میں نے کمپارٹمنٹ میں لوگوں کی طرف نظر دوڑائی اور ان سب کے چہروں کو نگاہوں سے ٹٹولنے لگا جو بلا استثناء خوش حال نظر آ رہے تھے اور خوش پوشاک تھے، ہر چہرہ پر میں نے ایک پوشیدہ الم کی جھلک دیکھی اتنی پوشیدہ کہ خود ان سب کو بھی اس کا احساس نہ ہو گا۔

درحقیقت یہ ایک عجیب بات تھی، ایک جگہ پر اتنے بہت سے غمزدہ چہروں کو دیکھنے کا اتفاق مجھے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا؟ یا یوں کہیے کہ اس سے پہلے میں نے اس کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بات نے مجھ پر اتنا اثر کیا کہ میں نے اس کا ذکر اپنی بیوی سے کیا وہ بھی ایک ماہر فن کار اور آرٹسٹ کی طرح تمام لوگوں کے چہروں کو دیکھنے لگی پھر حیرت کے ساتھ میری طرف رخ کر کے کہنے لگی۔

آپ بالکل صحیح کہتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ سب جہنم کی تکلیفیں برداشت کر رہے ہوں میں یہ سوچتی ہوں کہ ان پر جو گذر رہی ہے ان کو اس کی خبر بھی نہیں ہے۔

میں جانتا تھا کہ ان کی اس کو خبر نہیں ہے۔ اگر خبر ہوتی تو وہ اس طرح اپنی زندگی اور طاقت و صلاحیت کو ضائع نہ کرتے ان حقائق پر ایمان کے بغیر جو زندگی کے منتشر اجزاء میں ربط پیدا کرتے ہیں معیار زندگی بلند کرنے اور زیادہ سے زیادہ مادی اسباب و وسائل فراہم کرنے اور زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنے کے علاوہ کسی اور مقصد کے بغیر۔

معمہ کا جواب

جب میں گھر واپس آیا تو اتفاقاً میری نظر میز پر پڑی۔ سامنے قرآن کا ایک نسخہ رکھا ہوا تھا جو میرے مطالعہ میں رہتا تھا۔ میں اس کو بند کر کے کسی دوسری جگہ رکھنا ہی چاہتا تھا کہ غیر شعوری طور پر اچانک میری نگاہ کھلے ہوئے صفحے پر پڑ گئی۔ اس میں یہ سورۃ لکھی تھی۔

أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُونَ عِلْمَ الْيَقِينِ ○ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيمَ ○ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِينِ ○ ثُمَّ لَتُسْأَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ ○

غفلت میں رکھا تم کو بہتات کی حرص نے یہاں تک کہ ملے تم قبروں سے۔ ہرگز نہیں، عنقریب تم جان لوگے۔ پھر ہرگز نہیں، کاش کہ اگر تم جانو جاننا یقین کا۔ البتہ دیکھو گے تم دوزخ کو۔ پھر البتہ دیکھو گے تم اس کو دیکھنا یقین کا۔ پھر البتہ پوچھے جاؤ گے اس دن نعمتوں سے۔

میں ایک لمحے کے لیے گم سم سا ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ کتاب میرے ہاتھ میں جنبش میں تھی۔ پھر میں نے اپنی بیوی سے کہا دیکھو سنو، کیا یہ اس کا جواب نہیں ہے جو رات کو ریل پر ہم نے دیکھا تھا۔

ہاں وہ ایسا قطعی جواب تھا کہ سارے شکوک و شبہات ایک دم سے ختم ہو گئے۔ اب میں نے یقینی طور پر سمجھ لیا کہ یہ کتاب جو اس وقت میرے ہاتھ میں ہے۔ خدا ہی کی نازل کی ہوئی ہے۔ وہ اگرچہ آج سے تیرہ سو برس پہلے ایک انسان کو عطا کی گئی تھی لیکن اس میں بہت وضاحت کے ساتھ ایک ایسی چیز کی پیشین گوئی تھی جو ہمارے اس پیچیدہ اور مشینی دور سے زیادہ واضح طور پر کسی اور دور میں سامنے نہ آئی تھی۔

تکاثر یعنی مال و دولت کی حرص و ہوس اور مسابقت تاریخ کے ہر دور میں پائی جاتی رہی لیکن اتنی کبھی نہیں کہ وہ محض اشیاء کو جمع کرنے کا شوق بن جائے یا ایک ایسا کھلونا یا بہلاوا بن جائے یا ایک ایسا کھلونا یا بہلاوا بن جائے جو کسی اور حقیقت کی طرف دیکھنے ہی نہ دیتا ہو، دولت اور اقتدار کا حصول، عمل ایجاد و اختراع کا سلسلہ جس کا کوئی علاج نہیں۔ کل سے زیادہ آج، اور آج سے زیادہ کل، ایک بھوت ہے جو لوگوں کے سروں پر سوار ان چمکیلے مقاصد کی طرف کوڑے مار مار کر بھگا رہا ہے جو

دور سے بہت شان دار معلوم ہوتے ہیں لیکن ہاتھوں میں آنے کے بعد حباب کی مانند غائب ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ وقت آجاتا ہے جس کے متعلق قرآن حکیم کہتا ہے :۔ كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ -

اب مجھے یقین ہو گیا کہ قرآن کسی انسان کی حکمت و دانائی کا نتیجہ نہیں ہے جو دور دراز جزیرۃ العرب میں تاریخ کے کسی دور میں تھا۔ اس لیے کہ یہ انسان لاکھ سمجھدار حکیم اور دانا سہی مگر پھر بھی وہ اس عہد کی پیش گوئی نہیں کرسکتا تھا جو بیسویں صدی کی خصوصیت ہے۔ مجھے قرآن کے اندر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے زیادہ اونچی اور گہری آواز سنائی دے رہی تھی ۔

اسلام کی آغوش میں

اس بات کا واضح اور کھلا نتیجہ یہ تھا کہ میں اپنے ایک مسلمان ہندوستانی دوست کے پاس گیا جو اس وقت برلن میں مسلم انجمنوں کے صدر تھے اور ان سے اسلام قبول کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے اپنا دایاں ہاتھ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی اپنا داہنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا، اور دو گواہوں کی موجودگی میں میں نے کہا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" میرے دوست نے کہا کہ آپ کا نام (LEO POLD) لیو کے معنی یونانی میں شیر کے ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم آج سے آپ کو "محمد اسد" کہیں گے ۔

چند ہفتہ بعد میری بیوی نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ جب میں نے اپنے والد کو اپنے قبول اسلام کی اطلاع دی تو انھوں نے میرے خط کا جواب نہیں دیا۔ اس کے بعد میں نے ان کو دوسرا خط لکھا جس میں میں نے ان کو یہ لکھا کہ اسلام لانے کی وجہ سے ان کے ساتھ میرے رویہ یا محبت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے اس کے برخلاف اسلام کی مجھے ہدایت ہے کہ میں والد کی سب سے زیادہ عزت اور محبت کروں لیکن اس خط کا جواب بھی مجھے نہیں ملا ۔

میرے والد پر دین کا کوئی گہرا اثر نہ تھا اور میرا خیال ہے کہ جتنا وہ مجھے اپنے ماحول اور اپنے کلچر (جس میں انھوں نے پرورش پائی تھی اور جس سے ان کو محبت تھی) باغی یا مرتد سمجھتے تھے اتنا وہ مجھے اپنے مذہب کا باغی نہیں سمجھتے تھے ۔

اسلام لانے کے کچھ ہی عرصہ کے بعد میں نے اور میری بیوی نے یورپ کو ہمیشہ کے لیے خیرباد

کہہ دیا۔ اس لیے کہ وہاں رہنا اب ہمارے لیے بار تھا۔

اسلامی دنیا کی طرف

۱۹۲۷ء جنوری کے اوائل میں مع اپنی بیوی اور چھوٹے بچے کے مشرق کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ مجھے یہ احساس تھا کہ اب کبھی واپس نہ ہوں گا۔

کئی دن بحر روم کے سفر میں گزرے۔ نیچے پانی ہی پانی تھا اور اوپر آسمان، بعض اوقات بہت دور زمین کے کچھ کنارے دکھائی پڑتے تھے۔ کبھی ان جہازوں کا دھواں نظر آتا تھا جو اس راستے سے گزرتے تھے۔ یورپ اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور کم از کم ہمارے لیے بالکل فراموش سا ہو گیا تھا۔ چونکہ یہ جہاز مشرق بعید جا رہا تھا۔ اس لیے اس کے زیادہ تر مسافر چینی تھے۔ چھوٹے تاجر اور کاریگر جو یورپ میں کئی سال کی سخت محنت کے بعد اپنے وطن چین واپس ہو رہے تھے۔ یورپین بندرگاہ کی بو باس ابھی تک ان کے دماغوں میں بسی ہوئی تھی گویا وہ ابھی تک انھیں دنوں میں تھے جب ان کے گندمی ہاتھ انگلینڈ امریکہ اور ہالینڈ کی بھٹیوں میں کوئلے جھونکنے کا کام کرتے تھے۔

وہ یورپین شہروں کا برابر ذکر کر رہے تھے (نیویارک، بونس، ایرس) اور کبھی کبھی ہمبرگ۔ ایک نامعلوم مستقبل کے اشتیاق نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ وہ پہلے عدن کی بندرگاہ میں جہازوں کو ٹھنڈا ڈالنے اور بھٹی سلگانے کے کام میں لگ گئے۔ اور اپنی مانوس دنیا سے نکل کر ایک اجنبی اور تصور سے ماورا دنیا میں پہنچ گئے لیکن جہاز جلد ہی عدن واپس ہو جائے گا اور وہ شب و روز بھی ماضی کی داستان بن جائیں گے اور وہ لوگ ہیٹ کے بجائے عمامہ اور کوفیہ استعمال کرنا شروع کر دیں گے۔ کل ان کے پاس صرف ایک پرانی یادگار کی حیثیت سے باقی رہ جائے گا۔ ہر شخص اپنے اپنے گاؤں کی راہ لے گا۔ لیکن جس طرح وہ نکلے تھے اسی طرح واپس ہو رہے ہیں یا وطن چھوڑنے کے بعد اب وہ نہیں رہے جو پہلے تھے۔ مغرب نے ان پر اپنا پورا تسلط جما لیا تھا یا صرف ان کے احساسات اور جذبات کو چھو کے رہ گیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے مسئلے نے میرے دماغ کو اس حد تک الجھا دیا کہ میں اس سے زیادہ وسیع اور زیادہ بڑے مسئلے پر غور کرنے پر مجبور ہو گیا۔

(بشکریہ تعمیر حیات لکھنؤ)

مال جمع کرنے کے مسئلے میں

حضرت ابوذرؓ کا مسلک

محمد الغزالی، مصر کے ایک مخلص مسلمان اور اسلام کو ایک مکمل نظام حیات کی حیثیت سے پیش کرنے والے نامور ادیب ہیں۔ متعدد کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی کتابیں خاصی مقبول ہیں۔ مسائل پر تقلید سے آزاد ہو کر غور کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب میں مال کے متعلق حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کے مسلک پر گفتگو کی ہے۔ عام طور سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ اس مسئلے میں ان کا ایک مخصوص مسلک تھا اور صحابہ میں سے کسی نے اس کی تائید نہیں کی ہے۔ محمد الغزالی کا خیال یہ ہے کہ ان کا مسلک وہی تھا جو حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کا تھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اتفاق ضروری نہیں لیکن پڑھنے والے کے سامنے ایک سوال ضرور آکھڑا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر حضرت ابو ذرؓ کا مسلک جمہور صحابہؓ کے خلاف تھا تو اس کا ظہور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی خلافتوں میں کیوں نہیں ہوا، حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں کیوں ہوا؟ پھر یہ کہ مدینے کے بجائے شام میں ان کے مسلک کا اعلان اس وقت کیوں ہوا جب وہاں کے والی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے؟ جو لوگ حضرت ابو ذر کے مسلک کو جمہور صحابہ کے خلاف کہتے ہیں ان کے پاس اس سوال کا کیا جواب ہے؟ ان کا مسلک یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ مال کو جمع کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے زائد جو مال ہو اس کو بہر حال فی سبیل اللہ یعنی وجوہِ خیر میں خرچ کر دینا ضروری ہے۔ اگر حضرت ابوذرؓ کا واقعی یہی مسلک تھا تو یہ یقیناً جمہور صحابہ اور جمہور امت کی رائے کے خلاف ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا وہ ہر حال میں زائد مال کو خرچ کر دینا ضروری قرار دیتے تھے یا بعض مخصوص حالات میں ایسا کرنا ضروری قرار دیتے تھے — ؟ حضرت ابو ذرؓ کی رائے مطلق تھی یا مقید؟ محمد الغزالی کا خیال یہ معلوم ہوتا ہے

کہ وہ مخصوص حالات میں ایسا کرنا ضروری قرار دیتے تھے، ہر حال میں ایسا کرنا ضروری قرار نہیں دیتے تھے۔ ان کا مسلک چونکہ صحیح طور پر سمجھا نہیں گیا اس لیے اشتراکیت زدہ مسلمان اشتراکیت کی تائید میں ان کا نام اچھالتے ہیں اور علما ان کی رائے کو شاذ قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ ان کی رائے کا اشتراکیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ ان کی رائے جمہور صحابہ کی رائے کے خلاف ہے۔

ملک شام میں جب حضرت ابو ذرؓ نے بیت المال میں حضرت معاویہ کے تصرفات دیکھے اور جب انھوں نے یہ دیکھا کہ مسلمان معاشرے میں معاشی اونچ نیچ بڑھتی جا رہی ہے عوام غریب ہوتے جا رہے ہیں اور خواص مال دار ہوتے چلے جا رہے ہیں تو انھوں نے اس کے خلاف اپنی آواز بلند کی اور چاہا کہ ملک میں وہی معاشی و اقتصادی پالیسی رائج رہے جو حضرت ابو بکر و عمر کے زمانوں میں رائج تھی۔ انھوں نے عوام میں یہ احساس پیدا کرنا شروع کیا کہ اسلام نے انہیں کیا حقوق دیے ہیں اور یہ کہ انہیں اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا چاہیے۔ ان کی اس جد و جہد کو حضرت معاویہ نے پسند نہیں کیا۔ ان کے خلاف حضرت عثمان کو رپورٹ بھیجی اور اسی رپورٹ کی بنیاد پر حضرت عثمان نے حضرت ابو ذر کو مدینہ بلا لیا محمد الغزالی لکھتے ہیں کہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے عام باشندوں نے ان کا ایسا استقبال کیا اور اس طرح ان کے گرد جمع ہو گئے کہ جیسے انھوں نے ان کو اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہ ہو۔ مدینہ پہنچکر بھی حضرت ابو ذر نے اپنی جد و جہد ختم نہیں کی اور نہ اپنے خیالات کے اظہار سے باز آئے آخر کار حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان کو ربذہ (مدینہ سے کئی منزل کے فاصلے پر ایک مقام) جلا وطن کر دیا۔ انھوں نے امیر المومنین کے حکم کی اطاعت کی اور خاموشی کے ساتھ ربذہ چلے گئے۔

محمد الغزالی نے اس معاملے میں حضرت معاویہ پر سخت تنقید کی ہے اور اس ضمن میں حضرت عثمان کے طرز عمل سے بھی تعرض کیا ہے۔ ہم اس حصے کو نظر انداز کرتے ہیں۔ انھوں نے حضرت ابو ذر کے مسلک کی تائید میں چند حدیثیں اور روایات نقل کیے ہیں ہم ان میں سے بعض اقتباسات کا ترجمہ و تلخیص پیش کرتے ہیں:۔

حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ میں ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا اور آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جا رہے تھے۔ جب جبل احد ہمارے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا:۔

"اگر میرے پاس احد پہاڑ کے برابر سونا ہو تو پسند نہیں کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور

اس میں سے میرے پاس ایک دینار بھی بچ رہا ہو الا یہ کہ میں تھوڑا سا کسی دین کو ادا کرنے کے لیے رکھ چھوڑوں مجھے مسرت اس سے حاصل ہوگی کہ میں احد پہاڑ کے برابر سونے کو اللہ کے بندوں میں یوں اور یوں اور یوں لٹا دوں۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے دہنے، بائیں اور پیچھے کی طرف اشارہ فرمایا"۔ تھوڑی دور اور آگے چل کر آپ نے فرمایا:۔ قیامت کے دن کثیر مال رکھنے والے اجر کے لحاظ سے قلیل ہوں گے البتہ وہ مال دار مستثنیٰ ہیں جو اپنے اموال، دہنے اور بائیں اور پیچھے یوں اور یوں اور یوں لٹائیں لیکن ایسے مال دار بہت کم ہیں"۔

اسی معنے کی روایتیں ابوہریرہ، ابن مسعود اور دیگر صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی تعلیم و تربیت حضرت ابو ذر کے مسلک کی دلیل اور اس کا ماخذ ہے۔ اس کے علاوہ کتاب و سنت دونوں ہی میں انسان کی اکرمیت و افضلیت اور مسلمان معاشرے میں اس کے تقدم و تاخر کا معیار تقویٰ اور اس کی اخلاقی و علمی صلاحیتوں کو قرار دیا گیا ہے، مال و دولت کو نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں یہ حقیقت صحابہ کو ذہن نشین کرا دی تھی۔ چنانچہ اسی معنے کی ایک حدیث حضرت ابو ذرؓ سے بھی مروی ہے:۔

"روایت ہے کہ ایک بار حضورؐ نے ابو ذرؓ سے پوچھا کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی کثرت ہی تونگری ہے؟ میں نے کہا۔ ہاں یا رسول اللہ! پھر آپ نے فرمایا:۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ مال کی قلت ہی کا نام محتاجی ہے؟ میں نے کہا، ہاں، یا رسول اللہ، تب حضور نے فرمایا: بے شک دل کا غنا ہی حقیقی غنا ہے اور حقیقی فقر، دل کا فقر ہے" پھر آپ نے مجھ سے قبیلہ قریش کے ایک شخص کے بارے میں سوال کیا:۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟ میں نے کہا، ہاں، یا رسول اللہ! آپ نے پوچھا تمہارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میں نے کہا وہ اس مرتبے کے آدمی ہیں کہ اگر مانگیں تو انہیں دیا جائے اور کسی مجلس میں پہنچیں تو انہیں شریک مجلس کیا جائے۔

ابو ذر کہتے ہیں کہ پھر آپ نے مجھ سے اہل صفہ کے ایک شخص کے بارے میں دریافت کیا۔ کیا تم فلاں شخص کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں یا رسول اللہ! بخدا میں اسے نہیں جانتا۔ آپ اس شخص کا حلیہ اور دوسری علامتیں بیان فرمانے لگے۔ یہاں تک کہ میں اسے پہچان گیا میں نے کہا یا رسول اللہ اب میں اسے پہچان گیا۔ آپ نے پوچھا اس کے بارے میں تمہاری کیا

رائے ہے۔ میں نے کہا اہلِ صفہ میں وہ ایک مسکین و محتاج آدمی ہیں۔ تب حضور نے فرمایا۔
"اس قریشی جیسے زمین بھر آدمیوں سے وہ مسکین بہتر ہے"
اسی معنے کی حدیثیں حضرت ابوہریرہ اور سہل بن سعد رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہیں۔ حضرت ابوذر اور ان جیسے دوسرے لوگوں کو جس چیز نے برافروختہ کیا تھا وہ یہ تھی کہ ایک طرف ان کے سامنے حضور کے یہ ارشادات تھے اور دوسری طرف یہ منظر تھا کہ "دل کے محتاج" اگلی صفوں میں پہنچ گئے تھے اور جس چیز نے انہیں آگے بڑھایا تھا وہ صرف ان کے اموال تھے اور "دل کے غنی" پچھلی صفوں میں پہنچا دیے گئے تھے اس لیے کہ ان کے پاس مال کم تھا۔ مسلمان ممالک کو کئی صدیوں سے اسی مادی فلسفے نے پچھاڑ رکھا ہے اور جمہور امت میں زندگی، مقابلہ اور اقدام کے عناصر پر موت طاری ہے۔

ایک دن حضرت عمر فاروق رضؓ اپنے گھر سے افسردہ و مغموم باہر نکلے۔ راستے میں حضرت ابوذر سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے پوچھا۔ کیا بات ہے؟ میں آپ کو افسردہ و مغموم دیکھ رہا ہوں؟ جواب ملا کہ میں افسردہ و مغموم کیوں نہ ہوں جبکہ میں نے بشر بن عاصم کو یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس شخص کو مسلمانوں کی چھوٹی سی حکومت و ولایت بھی ملی ہو اسے قیامت کے دن جہنم کے پل پر کھڑا کیا جائے گا۔ اگر وہ ایک اچھا (محسن) والی و حاکم رہا ہوگا تو نجات پائے گا اور اگر برا (مسی) حاکم و والی رہا ہوگا تو پل پھٹ جائے گا اور وہ جہنم میں گر جائے گا۔"

حضرت ابوذر نے حضرت عمرؓ سے پوچھا۔ کیا آپ نے خود رسول اللہ سے یہ حدیث نہیں سنی ہے؟ انھوں نے جواب دیا۔ میں نے خود نہیں سنی ہے۔ حضرت ابوذر نے کہا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص کسی ایک مسلمان کا بھی والی و حاکم ہو وہ قیامت کے دن جہنم کے پل پر لایا جائے گا۔ اگر اس نے اپنی ذمہ داری اچھی طرح پوری کی ہوگی تو نجات پائے گا اور اگر اس نے بری روش اختیار کی ہوگی تو پل پھٹ جائے گا اور وہ سیاہ اور تاریک جہنم میں گر جائے گا"۔۔۔۔ پھر انھوں نے حضرت عمر سے پوچھا ان دونوں حدیثوں میں سے کس حدیث سے آپ کے قلب کو تکلیف پہنچی۔ انھوں نے کہا۔ یہ دونوں میرے قلب کو لرزانے والی ہیں۔ تم ہی بتاؤ مسلمانوں کی

ولایت، حکومت کا حق کون پورا کر سکتا ہے؟ حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ اس کا حق وہ پورا کر سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو ایک خدا کے سامنے جھکا دیا ہو۔ متواضع اور خاکسار ہو اور جہاں تک آپ کی خلافت و امارت کا تعلق ہے ہمیں خیر اور بھلائی کے سوا کسی دوسری چیز کا علم نہیں، ہاں اگر آپ نے خلافت کسی ایسے شخص کے سپرد کردی جو انصاف نہ کرے تو بے شک آپ اس کے گناہ سے نہ بچ سکیں گے

یہ ہیں حضرت ابوذر جنھوں نے حضرت عمر کی سیاست و حکومت کی صرف تائید ہی نہیں کی بلکہ انہیں یہ ترغیب بھی دی کہ وہ یہ بوجھ اٹھائے رہیں محض اس خوف سے کہ کہیں خلافت کسی ایسے شخص کو نہ مل جائے جو اس کا حق ادا نہ کر سکے۔

حضرت عمر کی مالی و اقتصادی سیاست اپنی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئی تھی وہ گردش دولت پر کڑی نظر رکھتے تھے اور اس کی نگرانی کو اجتماعی و سیاسی اصلاح کی بنیاد قرار دیتے تھے۔ بلاشبہہ معاشی و اقتصادی اضطراب، اپنے ساتھ انتشار اور انارکی لاتا ہے وہ امت کے مختلف طبقوں کے درمیان مضبوط ترین رشتے کو کمزور کرتا، ان میں تفرقہ ڈالتا اور ان کے دلوں میں ایک دوسرے سے نفرت اور بغض پیدا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر نے اسلامی مملکت کے اقتصادیات کی باگ اپنے آہنی ہاتھوں میں تھام رکھی تھی اور کسی کی مجال نہ تھی کہ عوام کے حقوق غصب کر سکے۔

(محمد الغزالی: الاسلام المفتری علیہ بین الشیوعیین والراسمالیین)

ایک ضروری اعلان

مسلم پرسنل لا کے مسئلے نے جو نزاکت اور اہمیت حاصل کر لی ہے اس کا تقاضا ہے کہ اس موضوع پر ماہنامہ زندگی کا ایک سیر حاصل اور جامع نمبر شائع کیا جائے۔ ہم اسی تقاضے کے پیش نظر ایک ایسا نمبر نکالنا چاہتے ہیں اس کا کم سے کم اندازہ دو ڈھائی سو صفحات کا ہے۔ یہ نمبر کتنی تعداد میں چھپوایا جائے اس کے لیے ضروری ہے کہ زندگی کی ایجنسیاں اپنی اپنی تعداد کے آرڈر سے ہمیں مطلع کریں۔ اس کے بعد آخری فیصلہ کیا جائے گا۔ منیجر زندگی رامپور

ایک مبارک اقدام

(از استاد حبیب ریحان ندوی البیضا لیبیا)

کل بتاریخ ۲۲ ربیع الاول ۱۳۹۲ھ مطابق ۶ مئی سے ان شاء اللہ بیضا لیبیا میں لیبین یونیورسٹی کے شریعہ کالج کے ماتحت ایک اہم شریعت کی کانفرنس ہو رہی ہے۔ شیخ ابوزہرہ مدظلہ اور قانون شریعت کے بہترین عرب علماء پہنچ چکے ہیں۔ ان شاء اللہ آٹھ دن تک یہ کانفرنس ہوگی اس کی مختصر روداد ان شاء اللہ ارسال کروں گا۔

یہ سب اسلامی شریعت کے قانون کو نافذ کرنے کا جو گورنمنٹ کا گزشتہ سال کا اعلان تھا۔ اس سے متعلق شرعی قوانین پر بحث و مباحثہ اور گفتگو کا پہلا عملی اقدام ہے۔ اس سے پہلے حکومت نے شراب کو قطعی طور پر ملک میں حرام کرنے کا قانون نکالا تھا جس پر سختی سے عمل ہے۔ پھر زکوٰۃ کے اجراء کا تفصیلی قانون بھی نکل چکا ہے اور نافذ بھی ہو چکا ہے اور اس سے بھی قبل شریعت کو مدنی و دینی تجارتی و معاملاتی امور میں پیشوا بنانے کا اعلان ہوا تھا اور تجارتی و جنائی اور مدنی قوانین رائج الوقت میں مراقب کی تین کمیٹیاں بھی بنادی گئی تھیں جن میں حدود کے نفاذ کا اشارہ بھی تھا اور یہ کمیٹیاں اپنا کام بڑی سرعت سے کر رہی ہیں۔ بہرحال خدائے پاک اگر اس کوشش کو کامیاب فرمادیں تو یہ اس صدی کی سب سے کامیاب اور حق کی طرف لوٹنے والی مبارک و بامراد کوشش کہی جائے گی۔

اسلامی حکومتوں خصوصاً عرب ملکوں میں اس وقت ساری ہی حکومتیں اسلامی قانون و شریعت کے مطالبے کے پیش نظر اس انداز پر سوچ رہی ہیں۔ مصر کے جدید قانون میں شریعت اسلامیہ کو ساری تشریعات مدنیہ جنائیہ اور زندگی کے شعبوں پر ثابت کیا گیا ہے اور اس کی روشنی میں عمل کرنے کی طرف

ابھارا گیا ہے ۔ عملی اقدام ابھی زیادہ تیز نہیں ہے لیکن مصر کی موجودہ صالح قیادت انوار السادات کی دینی تربیت اور آبائی اسلامی تعلیم کی وجہ سے خیر کی طرف مائل نظر آتی ہے ۔ بہرحال مستقبل کے لیے کوئی یقینی فیصلہ کرنا ابھی مشکل ہے لیکن امید افزا خبریں یہ ہیں کہ جامعہ ازہر کو اس کی پوری حریات اور اختصاصات واپس کر دیے گئے ہیں ۔ ڈیڑھ کروڑ پونڈ سے ایک غیر سودی بنک کا افتتاح مصر کی گورنمنٹ نے کیا ہے ۔ بڑھاپے کی پنشن کا قانون ساری رعایا کے لیے آنے والا ہے وغیرہ وغیرہ ۔

الجزائر میں بھی ہواری بومدین نے اسلامی شریعت سے قوانین اخذ کرنے پر زور دیا ہے اور سارے عالم عربی میں خصوصاً ایک حرکت اور زندگی کے آثار یکدم نظر آنے لگے ہیں ۔

ان آثار اور اہم تبدیلیوں تک اسلامی حکومتوں کو پہنچانے میں مصر کے داعی علماء عظیم رجال شریعت اور مفکر قانون اور خلافت الٰہیہ کے قیام و شریعت اسلامیہ کی مانگ کرنے والے سارے اہل علم و فضل و تقویٰ کی سعی کا کتنا ہاتھ ہے ۔ یہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں —— اور یہاں میرا سر فخر سے اونچا ہو جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ سرزمین ہند کے فاضل و نامور سپوت اور عالم اسلامی کے گوہر شب چراغ مولانا مودودی کی ان سارے مسائل شریعت و قانون و نظام حکومت اسلامیہ کے قیام اور مغربی تہذیب کی خامیوں اور سود جیسی لعنت اور برتھ کنٹرول کی وبا اور خصوصاً تطبیق شریعت کے سلسلے کی مفصل آراء اور ان کے عربی ترجموں کا اس تبدیلی میں کتنا ہاتھ ہے ۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے کوئی میزان نہیں ہے ۔ ہاں قسطاس مستقیم میں مالک ہی اس کا اندازہ لگا کر قیامت کے دن میزان حق میں تول کر اس کی اجرت ادا کر سکتا ہے ۔

مسلم اقلیت والے ممالک میں توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ جن شریعت کی چیزوں پر بھی عمل کیا جا سکے بہتر ہے اور جن جزوی اصلاحات اور تعمیرات پر زور دیا جائے بہتر ہے لیکن اسلامی ملکوں میں اگر ایک بار اسلام کا عقائدی، عباداتی، معاملاتی کلی نظام یعنی شریعت کا قانون اپنے شمول کے ساتھ امین ہاتھوں سے نافذ ہو جائے تو جزوی اصلاحات کی دو صد سالہ کوششوں سے زیادہ بہتر ہوگا ۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دین کے دوسرے کام اور اہم کام ختم ہو جائیں گے یا ان کی ضرورت باقی نہیں رہے گی مدرسے بند ہو جائیں گے ۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ضرورت باقی نہ رہے گی بلکہ یہ ہوگا کہ قانون شریعت جب شمس عالمتاب بن کر طلوع ہو جائے گا تو قمقمے، چراغ، موم بتیاں یعنی

باطل تحریکیں فنا کا سبق سیکھیں گی اور سچی اسلامی خدمات اور کام چاند بنکر روشنی حاصل کریں گے۔
اسلامی تاریخ نور سے کیوں معمور رہی؟ نظام حکومت بار بار بدلے رسول و نبی کی امانت و حکومت کے بعد ابو بکر رضؓ کی خلافت راشدہ قائم ہوئی پھر اموی خلافت عباسی خلافت ترکی خلافت شکلیں بدلیں اشخاص بدلے اقتدار بھی قدرے بدلے۔ انتخاب خلیفہ کے طریقے بدلے۔ لیکن امت اسلامیہ نور کا پیکر بنی رہی۔ صحابہ کرام اور امت کے بعض اصول اور اجتہادی اختلافات اور خلافت کی شکل بدلنے سے جو حضرات اسلامی تاریخ میں غیر اسلامی اور جاہلی اثرات کا تداخل ثابت کرتے ہیں وہ علمی اصول اور تاریخی دیانت کے بجائے ایک خاندان کی برتری اور نسلی تفوق اور اسلامیت کے شاید قائل ہیں۔ اور اسلام نے اس خاندانی پاپائیت کا دروازہ قرآنی احکام سے اور صحابہؓ نے حضرت صدیق رضؓ کے انتخاب کے ذریعہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہے۔ سارے صحابہ کی غلطیاں اور عشرہ مبشرہ امہات المومنین کتاب وحی سب اگر ملوث ہوتے ہیں تو ہو جائیں لیکن حضرت علیؓ کی افضلیت یا معصومیت کی وجہ سے اجتہادی یا سیاسی سہو و نسیان و غلطی سے بھی بری ہوں منصف اہل تاریخ کا یہ مسلک نہیں ہونا چاہیے۔

اہل سنت کا مسلک ویقین کی صداقت لیکن اجتہادی غلطی کا امکان اس طرح کہ دونوں گروہ اپنے مسلک کو صحیح سمجھ رہے ہیں یہی اس مشکل کا تاریخی اور منصفانہ حل ہے اگر صرف انسانی فرماں برداری کی تاریخ کے طور پر صحبت کے فیض کو ہٹا کر تاریخ لکھنی شروع کر دی جائے تو پھر نعوذ باللہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات پر بڑے بڑے الزامات واتہامات ثابت ہو سکتے ہیں۔ جو کوئی صحیح العقیدہ مسلمان نہ حضرت علیؓ کے لیے جائز سمجھتا نہ حضرت عثمان و طلحہ و زبیر و معاویہ اور عائشہ رضی اللہ عنہم کے لیے ۔۔۔۔ یہ جملہ معترضہ تھا میں لکھ رہا تھا کہ امت اسلامیہ نور کا پیکر بنی رہی صرف اس لیے کہ اشکال واشخاص کے ان اختلافات اور رد و بدل کے باوجود اصل چیز یعنی حاکمیت صرف خدا کے لیے باقی رہی اور شریعت کا قانون نافذ رہا اور ہر خلیفہ چاہے وہ زاہد شب زندہ دار ہو۔ تاریخ کے مفروضات پرستی و ہوس میں مبتلا ہو۔ اس کی جرأت کبھی نہ کر سکا کہ اپنی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان کر دے یا شریعت کے قانون سے ہٹ جانے کا ارادہ ظاہر کرے۔

شریعت اسلامیہ کا قانون صرف آخرت میں کامرانی بخشنے کے لیے نہیں ہے اور نہ صرف عبادات

کی چند مخصوص صورتوں کا نام ہے بلکہ یہ دائمی قانون دنیا کو جنت نشان بنانے کا دعویدار ہے اور ساتھ ہی ساتھ عبادات سے لے کر معاملات اور دین و دنیا اور حکومت و سیاست تک میں انسانیت کی صحیح ترجمانی کا ذمہ دار بھی ہے۔ کیونکہ شریعت ان مکمل تعلیمات کا دوسرا نام ہے جو پیغمبر کی زبان حق ترجمان کے ذریعے قرآن و سنت میں وارد ہوئی ہیں اور توحید و رسالت وغیرہ کے عقائدی اقرار کے بعد سب سے زیادہ نافع اور مفید کام ان احکام کی تعمیل کرنی ہے جو شریعت نے مقرر کیے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی غیر اسلامی تشریع پر اسلامی نظام کی بنیاد رکھنا کفر، ظلم و فسق کے ثانوی صنم کی پوجا کے مرادف ہے۔ لیکن آسمانی شریعت نور سے ماخوذ ہے۔ نور سے متصل ہے اس لیے خود بھی نور ہے اور جو سوسائٹی بھی اسے اپنالے اس کے لیے تنویر قلب و نظر کا باعث ہے۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ (مائدہ: ۱۵-۱۶) اور شریعت اسلامیہ کا اتباع بھی نور ہے اور شرح صدر کے ساتھ یہ گویا اسلام کے حقیقی مفہوم سے سمجھا ہے۔ کیونکہ اسلام مکمل سپردگی طاعت اور زندگی کے ہر شعبے میں خدا کی رضامندی پر چلنے کا نام ہے۔ افمن شرح اللّٰہ صدرہ للاسلام فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ (زمر: ۳۹)

(صدق جدید لکھنؤ)

تحمل کی اعلیٰ مثال

ایک دن امام ابو حنیفہ مسجد میں درس دے رہے تھے۔ ایک شخص نے جس کو ان سے کچھ عداوت تھی، عام مجلس میں ان کی نسبت نازیبا الفاظ کہے۔ انھوں نے کچھ التفات نہ کی اور اسی طرح درس میں مشغول رہے۔ شاگردوں کو بھی منع کر دیا کہ اس کی طرف متوجہ نہ ہوں۔ درس سے اٹھے تو وہ شخص ساتھ ہوا اور جو کچھ منہ میں آتا تھا بکتا جاتا تھا۔ امام صاحب اپنے گھر کے قریب پہنچے تو کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ بھائی یہ میرا گھر ہے۔ کچھ باقی رہ گیا ہو تو اٹھا نہ رکھو کہ اب میں اندر جاتا ہوں اور تم کو موقع نہ ملے گا۔

(سیرۃ النعمان)

رسائل و مسائل

شاہ نعمت اللہ ولی کے نام پر جعل سازی

خط

جناب ڈاکٹر مقصود عالم ایم اے، اعظم گڈھ سے لکھتے ہیں :۔

"زندگی" ماہ مئی ۱۹۷۲ء کے شمارے میں شاہ نعمت اللہ قادریؒ کے اشعار اور پیشین گوئیوں کے بارے میں ایک استفسار کا جواب دیتے ہوئے آپ نے اس سلسلے کی تمام بوالفضولیوں کی تحقیق و تردید کی طرف متوجہ کیا ہے۔ مجھے بھی اس بارے میں برابر تشویش رہی کہ پھیلتی ہوئی ان بدعقیدگیوں کی بنیاد کیا ہے؟ اگر فی الواقع ایسی کوئی پیشین گوئی ہو تو حالات کی تصدیق نے اس کو اور راسخ بنا دیا ہے لیکن جس تفصیل اور جس انداز کی پیشین گوئی مشہور کی جا رہی ہے ویسی پیشین گوئی تو خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہیں فرمائی ہے۔ پھر کیا کسی بزرگ کو حضورؐ سے بڑھ کر علم غیب عطا کر دیا گیا تھا؟ بنا بریں شاہ نعمت اللہ ولی کے قصائد کی تحقیق کے لیے میں نے بھی دیرینہ کرم فرما جناب مولوی محبوب حسین صاحب لائبریری اسسٹنٹ خدا بخش خاں اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ کو خط لکھا۔ موصوف نے اپنی عالمانہ بصیرت اور لائبریری کے تجربات کی روشنی میں پوری تحقیق کی اور شاہ نعمت اللہ ولی کے دیوان سے ۵۶ اشعار کا وہ قصیدہ نقل کر کے مجھے بھیجا۔ اس ایک قصیدہ کے علاوہ ان کے کسی قصیدے میں کوئی پیشین گوئی نہیں پائی جاتی۔ موصوف نے اپنے خط میں مجھے لکھا ہے :۔

"دیوان ضخیم ہے، خط پاکیزہ اور اچھے حال میں ہے۔ غزل، قصائد، قطعات،

رباعیات اور ترجیع بند پر مشتمل ہے۔ پیشین گوئی اس قصیدے کے علاوہ دوسرے قصیدوں میں نہیں پائی جاتی۔ عام طور پر اخبارات میں جو اشعار پیشین گوئی پر مشتمل شائع ہو رہے ہیں وہ سب الحاقی ہیں کسی معتبر دیوان میں ان کا وجود نہیں ہے۔

پھر اس دیوان کے بارے میں بطور سند درج فرماتے ہیں:۔

"میرے یہاں کا نسخہ بہت قدیم ہے اور مستند ہے۔ اس نسخے کے ہر ورق پر شاہجہاں بادشاہ کی مہر ثبت ہے اور یہ عبارت درج ہے:۔

"کتاب دیوان شاہ نعمت اللہ ولی بخط نستعلیق با سکہ عالم پناہ جلد سیاہ بابت اسد خاں فرزند نواب مصطفےٰ خاں مرحوم جمع کتاب خانہ عامرہ شد بتاریخ ۱۶ رجب ۱۰۵۹ھ تاریخ کتابت نسخہ ہذا ۹۴۲ھ کاتب العبد ابن عارف حسین الحسینی"

اس طرح کل ۶۵ اشعار کا قصیدہ ان پیشین گوئیوں کی تردید کرتا ہے جو ان کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اصل میں کچھ لوگ جعلی پیشین گوئیاں شائع کر کے مسلمانوں کو اسلام کے بتائے ہوئے طریق جہد و عمل سے پھیر کر ان کو فکری و عملی انتشار میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں اور پیشین گوئیوں کا سہارا لیں۔"

نوٹ:۔

جناب ڈاکٹر مقصود عالم صاحب نے مجھے ۶۵ اشعار کا وہ قصیدہ بھیج دیا ہے۔ اس قصیدے کے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں شاہ نعمت اللہ نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کے انتشار اور باہمی جنگ و جدال کا نقشہ کھینچا ہے اور دوسرے حصے میں یہ پیشین گوئی کی ہے کہ عنقریب امام مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا دور شروع ہونے والا ہے ۔۔۔ ظاہر ہے کہ ان کی یہ پیشین گوئی پوری نہیں ہوئی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اب تک نہ امام مہدی ظاہر ہوئے اور نہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام آسمان سے اترے

(مدیر زندگی)

تنقید و تبصرہ

اسلام مکمل دین مستقل تہذیب مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ صفحات ۴۰ کتابت، طباعت، کاغذ، عمدہ۔ قیمت پچاس پیسے۔ ناشر: مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

اس پمفلٹ کے پیش لفظ میں مولانا محمد الحسنی ندوی نے لکھا ہے کہ یہ کتابچہ درحقیقت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی تین اہم تقریروں کا خلاصہ ہے۔ اس میں تینوں تقریروں کے ضروری حصے اس طرح جمع کر دئے گئے ہیں کہ انھوں نے ایک مربوط مضمون کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ایک تقریر بنارس میں دوسری رنگون (برما) میں اور تیسری کالی کٹ (کیرلا) میں کی گئی تھی۔ "اسلام، مکمل دین، مستقل تہذیب" کے عنوان ہی سے ظاہر ہے کہ اس رسالے میں کیا ہوگا۔ اس وقت خود مسلمانوں کے ایک موقع پرست طبقے کی طرف سے اسلامی تہذیب پر جو حملے کئے جا رہے ہیں، یہ رسالہ ان کا ایک مؤثر جواب ہے۔ "لازوال امامت اور عالمگیر دعوت" کے ذیلی عنوان کے تحت، مولانا نے ابراہیمی، محمدی دعوت کی تشریح کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے۔

"اس دعوت کی اساس، عقیدہ میں توحید پر، اجتماعی زندگی میں انسانیت کے احترام اور مساوات پر، اخلاقیات کے شعبہ میں تقوی، حیا اور تواضع پر" میدان عمل میں آخرت کے لئے جد و جہد اور جہاد و قربانی پر، میدان جنگ میں شجاعت کے ساتھ رحم دلی اور سفقت پر، اور انتظام حکومت کے دائرہ میں ہدایت کے پہلو کو مالیات و آمدنی پر ترجیح دینے اور خدمت لینے کے بجائے خدمت کرنے، اور نفع اٹھانے کے بجائے نفع پہنچانے پر ہے۔

یہ انسانیت کی سنجیدہ اور مخلصانہ خدمت، اور جاہلیت کے حملوں اور گمراہ کن و تخریبی تحریکوں سے اس کی حفاظت میں پوری تاریخ سے ممتاز ہے اور ساری دنیا میں اس کے حسین و جمیل آثار و نقوش قائم و دائم اور ہر جگہ اس کی خیر و برکت عام ہے" ص ۲۱۔ امید ہے کہ اس کتابچے سے عام طور پر استفادہ کیا جائے گا۔

ت کیسے کی جائے

مرتبہ جناب محمد عبد الحی صفحات ۱۶۰ قیمت دو روپے اسی پیسے
شائع کردہ مکتبہ "الحسنات" رام پور یو۔پی

یہ کتاب چار مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین پہلے "الحسنات" کے خاص نمبر میں شائع ہو چکے ہیں اور اب انہیں کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں پہلا مضمون بات کیسے کی جائے؟ مرتب کتاب جناب ابو سلیم محمد عبد الحی کا ہے۔ دوسرا مضمون "ذہنوں کے موڑ"، جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب کا ہے۔ تیسرا "دردناک پکار"، جناب شمس نوید عثمانی صاحب کا اور چوتھا "طریقۂ گفتگو" جناب ابو محمد امام الدین رام نگری کا ہے۔
غیر مسلموں سے اسلام کا تعارف کیسے کرایا جائے اور ان سے بات کیسے کی جائے؟ یہ سوال ان ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے جو یہ کام کرنا چاہتے ہیں اور یہ کام ہر مسلمان کو کرنا چاہئیے جسے اللہ تعالیٰ نے بات کرنے کی صلاحیت عطا کی ہو۔ یہ کتاب اسی سوال کا جواب مہیا کرتی ہے۔ چاروں مقالات پڑھنے کے لائق ہیں اور ان سے غیر مسلموں تک اسلام کا پیغام پہنچانے کے کچھ طریقے اور بات کرنے کے کچھ نکتے معلوم ہوتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ مجموعہ اس کام کے لئے مفید ثابت ہو گا۔

اقامت دین کیا اور کیسے

ابو سلیم محمد عبد الحیٔ صفحات ۲۰۰ کتابت طباعت کاغذ بہتر مجلد دلکش گرد پوش کے ساتھ قیمت تین روپے اسی پیسے
ناشر:۔ مکتبہ الحسنات۔ رام پور۔ یو پی

"اقامت دین" کے موضوع پر متعدد علمی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیات، احادیث اور عربی عبارتوں سے گراں بار نہیں ہے بلکہ سادہ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے اور دلائل بھی اپنی ہی زبان میں دئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب ان لوگوں کے لئے پڑھنے کے لائق ہو گئی ہے جو سنجیدہ اور ٹھوس علمی انداز کی کتابیں پڑھنے سے گھبراتے ہیں یا کم پڑھے لکھے ہیں اور اونچی علمی زبان سمجھ نہیں سکتے۔ دوسری خصوصیت اس کتاب کی یہ ہے کہ اس میں صرف اقامت دین کی فرضیت و اہمیت ہی بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اقامت دین کا کام کرنے والوں میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں اور انھیں کن عیوب سے پاک ہونا چاہئیے۔ ہندوستان میں جو ہمارا وطن ہے اقامت دین کا طریقہ کیا ہو اس پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں جو الجھنیں پیش آتی ہیں انھیں بھی دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور حیلوں بہانوں کو بھی معقول انداز میں رد کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ آسان اور جامع کتاب پسند کی جائے گی اور اس سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

مسلم پرسنل لا

مولانا منت اللہ رحمانی صفحات ۷۰ کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ قیمت ۲۵-۱
ناشر مکتبہ امارت شرعیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ (بہار)

اس وقت مسلم پرسنل لا کی ترمیم و تنسیخ کے خواہش مند افراد نے اس مسئلے کو وقت کا موضوع گفتگو بنادیا ہے اس لئے ضروری تھا کہ علماء اور دوسرے مخلص مسلمان اس کا نوٹس لیں اور ان افراد کی کوششوں کو ناکام بنانے کی سعی کریں۔ اس کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ دین اسلام میں اس کی اہمیت واضح کی جائے زیر تبصرہ کتابچے نے بھی یہی خدمت انجام دی ہے۔ فاضل مصنف نے پہلے یہ بتایا ہے کہ مسلم پرسنل لا سے مراد کیا ہے نیز یہ کہ انگریزوں کے عہد میں اور موجودہ دستور ہند میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ اس کے بعد اس اصل محرک کی نشاندہی کی ہے جس کی بنا پر اس کی تبدیلی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے اجتہاد پر بھی مختصر گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ اجتہادی مسائل میں صحابہ کرام کے عہد سے لے کر موجودہ زمانے تک غور و فکر ہوتا رہا ہے اور نئے مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل دریافت کیا جاتا رہا ہے لیکن یہ کام علماء اور ماہرین شریعت کے کرنے کا ہے۔ اجتہاد کرنا "ہر ایرے غیرے نتھو خیرے" کا کام نہیں ہے۔ فاضل مصنف نے بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ مسلم پرسنل لا میں ترمیم کے مطالبے کا اصل محرک یہ ہے کہ دستور میں دئے گئے بنیادی حق (مذہبی اور ثقافتی آزادی) کو ختم کیا جائے اور ملی امتیازات کو مٹا کر پورے معاشرے میں یکسانیت پیدا کر دی جائے (ص ۱۶)۔ اور انھوں نے یہ بھی صحیح لکھا ہے کہ مسلم پرسنل لا کے نام سے جو قانون سرکاری عدالتوں میں جاری ہیں ان میں ترمیم کے امکانات بہت محدود نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جزئیات و تفصیلات میں کچھ ایسے مسائل نکلیں جن پر حالات کی روشنی میں علماء کو غور کرنا پڑے (ص ۶۶) عربی عبارات کے ترجموں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتابچہ مطالعے اور استفادے کے لائق ہے۔

تنقید کی آزادی

شام کے سفر میں جب حضرت عمرؓ نے مجمع عام میں حضرت خالد کی معزولی کی وجہ اور اپنی برارت بیان کی تو ایک شخص نے وہیں اٹھ کر کہا: "اے عمر! خدا کی قسم تم نے انصاف نہیں کیا۔ تم نے رسول اللہ کے عامل کو موقوف کر دیا۔ تم نے رسول اللہ کی کھینچی ہوئی تلوار کو نیام میں ڈال دیا تم نے قطع رحم کیا۔ تم نے اپنے چچیرے بھائی پر حسد کیا۔" حضرت عمر نے یہ سب سنکر صرف یہ کہا کہ "تم کو اپنے بھائی کی حمایت میں غصہ آگیا۔" (الفاروق)